

READING SECTION
Online Library For Pakistan

خواتین اور دو شیزاؤں کیلئے ایگزٹنگ پڑھنا
WWW.PAKSOCIETY.COM

مارچ 2016

جس کا سب سے

ایک سو ساڑھی
ڈرافٹ گام

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY

خواتین ڈائجسٹ

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

بانی و مدیر اعلیٰ — محمود ریاض

سجادہ کالون

قدر ریاض

رضیہ جمیل

امت الصبور

التیس بجٹی

گن

رکن آل پاکستان نوزہ بیگم زوسمانی

رکن کونسل آف پاکستان نوزہ بیگم زایہ عزیز

MEMBER
APNS
CPNE



Downloaded From
Paksociety.com

READING
Section



14 مسید

کہنی سنتی
کرن کرن روتی
ہمارے نام

15 ادارہ

274 نادرہ خاتون

166 نسر احمد 'نمل'

132 بریم سمیر 'سفرتا تمام'

80 امہ القزیز شہزاد 'شہر آشوب'



20 ہم تقریر کرنے کے حصراتیں 'انشائیہ'



120 ایکسلی رضا

68 نسیم شریف

74 بریم ہشتاد

244 مسرت سلیم

249 فرحین اظفر

259 تمثیلہ زاہد

خوشبو
من کا کھانا
نکی جی ہاں
نین تارا
مفاد پرست



268 امت الصبور 'میری ڈائری سے'



29 خاتین رحیم 'باتیں عمران اشرف سے'



22 شاینہ رحیم 'مجموعہ احمد سے ملاقات'

26 امت الصبور 'انجمن کارنگ'

33 ادارہ 'خاتمی کو زبان بے'

263 حیات علی شاہ

264 قابل اجیری

263 جون ایلیا

264 محمود شام

غزل
غزل
نظم
غزل



220 عمیرہ احمد 'آب حیات'

36 آمنہ ریاض 'دشمن جنوں'

پاکستان (سالانہ) 700 روپے
انڈیا (سالانہ) 8000 روپے
امریکا (سالانہ) 7000 روپے

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے یہ جملہ ماہنامہ شائع اور ادارہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نوعی جعلیہ ڈراما اور ایسی تکفیل اور سلسلہ وار قطع کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے بلاشرعہ تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔

READING Section



286 خالہ جیلانی

موتھ کے پھول

265

شگفتہ جہا

رنگازنگ سیرلس

284

ام ہالہ

آپ کا باورچی خانہ

282

واصفہ آہل

خیریں و خیریں



290

بیوں کس کے مشورے

271

خالہ جیلانی

آپ کی بیاض سے



ساج 2016

جلد 43 نمبر 11

قیمت 60 روپے

288

عدسان

نفسیاتی ادویات کی کھچھیں

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - آر، بازار، ٹراپی -

پبلشر آزر ریاض نے ایمن حسن پر تنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ٹائم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

READING
Section

مذہب کچی کھیتی

خواتین کو جمع کرنا اور کامیابی کا شمارہ لے کر حاضر ہیں۔
انسانی معلوم تاریخ میں موجود کسی دانا بادشاہ کا قول ہے۔ کامیابی کی کنی ہے صبح وقت پر صبح فیصلہ۔
اور یہ وہ حقیقت ہے کہ جو انسانوں کی انفرادی زندگی کے ساتھ ساتھ قوموں کی اجتماعی زندگی میں بھی فیصلہ کن
اہمیت رکھتی ہے۔

23 مارچ 1947ء پر مغرب کے مسلمانوں کی تاریخ کا ایسا ہی فیصلہ کن موڑ تھا جس نے تاریخ کے دھارے بدل دیے۔
مسلمانوں کے لیے ایک نیا آزاد وطن کا مطالبہ جو آگے چل کر پاکستان کے قیام کی بنیاد بنا۔ آزادی کے متوالوں نے
ہر تعلق خاطر سے رشتہ توڑ کر نیا ملک بسایا تھا۔ آنکھوں میں بہت سے خواب تھے اور تیشیں صاف تھیں۔ یہ وہ دور
تھا جب سیاست کا دروازہ نہیں مٹی اور دونوں میں حب الوطنی کا جذبہ موجزن تھا لیکن وہ تہذیبی عمل جسے نسل در نسل
منتقل ہونا تھا، وہ آگے نہ بڑھ سکا، معاشی ناہمواریوں نے اس تعمیری اور مثبت انداز فکر کو گھبراہٹ سے ہی نہ دیا۔ فتنہ
انہماک کے چراغ روشن نہ ہو سکے۔ منفی جذبات کو ہوا دی گئی جس نے منافرت کی فضا کو جنم دیا۔ اور مثبت قوتیں پسپا
ہوتی گئیں۔ اللہ تعالیٰ کا کہہ سب کے کہ ایک بار پھر ایسے چراغ فرقاں ہوتے ہیں۔ بہتری کے آثار نمودار ہو رہے ہیں۔
دعا کریں کہ یہ کوششیں باقائے ہوں اور ملک میں امن اور خوش حالی آئے۔ آمین۔

مضغین سے درخواست

اپریل کا شمارہ ساگرہ نمبر ہوگا۔ مضغین سے درخواست ہے اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوائیں تاکہ سالگرہ نمبر میں
شامل ہو سکیں۔

قارئین سے سروے

ہماری قارئین بے حد ذہین اور باصلاحیت ہیں۔ ہر ماہ جو خطوط ہمیں موصول ہوتے ہیں، انہیں پڑھ کر نماندہ ہوتا
ہے کہ بیشتر قارئین بہت عمدہ تخلیقی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان کی صلاحیتوں کو سامنے لانے کے لیے ہم ہر ماہ موقع پر
اپنی قارئین سے سروے کرتے ہیں۔

اس بار بھی ساگرہ نمبر میں سروے شامل ہوگا۔ اس کے سوالات یہ ہیں۔

- ① ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے لکھنے والوں کی صلاحیتیں سامنے لانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس سال بھی بہت
سے نئے نام سامنے آئے۔ آپ کس مضغین کو اس سال کی بہترین دریافت قرار دیں گی؟
- ② صاف گوئی اچھی بات ہے لیکن کبھی کبھی یہ عادت دوسروں کے لیے بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ کوئی ایسی بات
جو آپ نے کہی تو وہی لیکن بعد میں اس پر آپ کو پچھتاوا ہوا؟
- ③ آپ دن روزہ منل دیکھنا پسند کرتی ہیں یا تقریبی پوسل اچھے لگتے ہیں؟ ٹی وی پر چھٹے تیز تیز بولنے کی عادت
کی ایسی عیبی کرتے جرب زبان اینگریز کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا آپ ان اینگریز کی باتوں
پر یقین کرتی ہیں؟ یا اپنی رائے رکھتی ہیں۔ کون سے اینگریز آپ کو بہت بُرے لگتے ہیں؟
- ④ تاریخ واقعات میں مطالعہ کے علاوہ کون سی چیز زیادہ خوشی دیتی ہے۔ گھومنا پھرنا، دوستوں سے
گپ شپ، ٹی وی دیکھنا یا شاپنگ کرنا۔
- ⑤ کوئی ایسی دعا یا خواہش جو پوری نہ ہوئی تو اس وقت بہت دکھ ہوا لیکن اب احساس ہوتا ہے کہ اس
کے پورا نہ ہونے میں ہی بہتری تھی۔
- ⑥ ہماری مضغین نے بہت سے ایسے کردار تخلیق کیے ہیں جو غیر معمولی تھے۔ بہت مضبوط، دلچسپ، جان دار
آپ کو کون سا کردار بہت پسند آیا؟ اور دل میں یہ خواہش تھی کہ آپ اس کردار کی طرح ہوتیں؟
ان سوالات کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ یا شیخ مارچ تک ہمیں موصول ہو جائیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور اوھوری ہے اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں وہ ہم نے ان ہی چھ معتد کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کون و شنی

ادارہ

جنت میں درخت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس رات مجھے معراج کرائی گئی میری ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی تو انہوں نے فرمایا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اپنی امت کو میری طرف سے سلام پیش کہجیے اور ان کو بتلا دیجیے کہ جنت کی مٹی پاکیزہ اور عمدہ ہے اس کا پانی میٹھا ہے اور وہ ایک چٹیل میدان ہے اور۔“

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”جو شخص سبحان اللہ و بحمہ کے اس کے لیے جنت میں ایک کھجور کا درخت لگا دیا جاتا ہے۔“ (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے)

سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ

روکنا وہاں

درخت لگانا ہے۔“ (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔)

فائدہ : اللہ کی جنت اتنی وسیع ہے کہ اس کا تصور بھی ہم نہیں کر سکتے لہذا اللہ کی تسبیح و تحمید پر درختوں کا لگانا کوئی مشکل امر نہیں۔ اس لیے اسے حقیقت پر محمول کرنے میں کوئی امر مانع نہیں۔ البتہ بعض لوگ اسے مجاز پر محمول کرتے ہوئے اس سے مراد اجر کا اثبات اور اس کی کثرت لیتے ہیں جو کہ درست نہیں ہے کیونکہ آئندہ حدیث سے بھی پہلے معنی کی تائید ہوتی ہے۔

درخت لگانا

فوائد و مسائل : قلعان کی جمع ہے : صاف ہموار زمین جس پر کوئی درخت نہ ہو۔
1۔ اللہ کی تسبیح و تحمید سے جنت کی چٹیل زمین میں درخت لگ جاتے ہیں۔ جو شخص جتنا زیادہ اللہ کا ذکر

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

حالتوں میں یعنی ہر وقت اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔

تمام اوقات

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام اوقات میں اللہ کا ذکر فرمایا کرتے تھے (مسلم)

سونے اور بیدار ہونے کے وقت کی دعا

حضرت حذیفہ اور حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے بستر پر استراحت فرما ہوتے تو یہ دعا پڑھتے تھے۔
”یا سمک اللہم! اموت و احیا۔“

”تیرے نام سے (اے اللہ!) میں مرتا اور زندہ ہوتا ہوں۔“ اور جب بیدار ہوتے تو فرماتے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَحْيَانَا بَعْدَ
مَا اَمَاتَنَا وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ

”تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں مارنے کے بعد زندہ کیا اور اسی کی طرف سب نے اکٹھا ہونا ہے۔“ (بخاری)

فائدہ : صبح و شام کے ان وظیفوں کی پابندی کا یہ بہت بڑا فائدہ ہے کہ انسان ہر وقت اللہ کو یاد کرتا اور رکھتا ہے۔

ذخیرہ اندوزی

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”بازار میں مال لانے والے کو رزق ملتا ہے اور ذخیرہ اندوزی کرنے والا ملعون ہے۔“

گناہ گار

حضرت معمر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”گناہ گاری ذخیرہ اندوزی کرتا ہے۔“

کرے گا اس کا حصہ زمین جو اسے جنت میں ملے گا۔
انتاہی درختوں سے معمور اور شاداب ہوگا۔

جنت کا خزانہ

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کیا میں تجھے جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانے کی خبر نہ دوں؟“ تو میں نے کہا: کیوں نہیں اے اللہ کے رسول! آپ نے فرمایا۔

”یہ خزانہ (لا حول ولا قوۃ الا باللہ ہے) یعنی برائی سے بچنے اور نیکی کرنے کی طاقت اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ (بخاری و مسلم)

قواند و مسائل : 1۔ اس میں لا حول ولا قوۃ الا باللہ کو جنت کا ایک خزانہ یعنی وہاں کا ایک نہایت بیش قیمت اور نفیس ذخیرہ قرار دیا گیا ہے اس کی فضیلت کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس میں انسان اپنی بے بسی اور بے چارگی کا اظہار اور ہر طرح کی قوت و اختیار کا سرچشمہ صرف اللہ کی ذات کو ماننے کا اعلان کرتا ہے اور یہ بات اللہ کو بہت پسند ہے۔

2۔ اس کلمے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا وہ کسی شر سے بچ سکتا یا کسی نیکی کی توفیق سے بہرہ ور ہو سکتا ہے تو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے ارادہ و مشیت ہی سے ہو سکتا ہے۔

اللہ کا ذکر

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے اول بدل کر آنے جانے میں عقل مندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ وہ جو کھڑے بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر (سوتے ہوئے) اللہ کو یاد کرتے ہیں۔“ (آل عمران 190-191)

فائدہ آیات : انسان کی تین ہی حالتیں ہوتی ہیں یا تو وہ کھڑا ہوتا ہے، چاہے چل رہا ہو یا کسی ایک جگہ کھڑا ہو، یا بیٹھا ہوا ہوتا ہے یا پھر لیٹا ہوا۔ عقل مند لوگ جن کو رب کی معرفت حاصل ہوتی ہیں وہ تینوں

کر دیا۔ (پھر ایسا ہوا کہ) ان کے سردار کو بچھونے کاٹ لیا، چنانچہ وہ لوگ ہمارے پاس آئے اور کہا۔
”کیا تم میں سے کوئی شخص بچھو کاٹنے کا دم کر سکتا ہے؟“ میں نے کہا۔ ”ہاں“ میں (کر سکتا ہوں) لیکن جب تک تم ہمیں بکریاں نہیں دو گے میں اسے دم نہیں کروں گا۔“

انہوں نے کہا۔ ”ہم تمہیں تیس بکریاں دیں گے (تم دم کرو) ہم نے ان کی یہ پیش کش قبول کر لی۔
میں نے سات بار سورۃ فاتحہ پڑھ کر اس (مریض) پر دم کیا تو وہ صحت یاب ہو گیا اور ہم نے بکریاں وصول کر لیں، پھر ہمارے دل میں شک پیدا ہوا۔ (معلوم نہیں) یہ بکریاں ایسا جائز تھا یا نہیں) ہم نے کہا۔
”جلدی نہ کرو حتیٰ کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جائیں۔ جب ہم لوگ حاضر خدمت ہوئے تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ میں نے یہ کام کیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔
”کیا تجھے معلوم نہ تھا کہ یہ (سورت) دم ہے؟“ بکریاں تقسیم کر لو اور میرا بھی حصہ رکھو۔“

دوسری دو سندوں سے بھی یہ روایت حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مروی ہے۔

جائز رزق

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”انسان کے دل کی ایک ایک شاخ ہر وادی میں ہوتی ہے (وہ دعویٰ مغلو کے لیے ہر راستے پر چلنے کے لیے تیار ہوتا ہے) جس شخص کا دل ہر وادی کے پیچھے پڑ جاتا ہے (دنیا کے لیے ہر مشغولیت میں گرفتار ہو جاتا ہے) اللہ کو اس کی پروا نہیں ہوتی کہ اسے کس وادی میں تباہ کر دے اور جو اللہ پر توکل کرتا ہے (اللہ کی طرف توجہ رکھتے ہوئے یقین کرتا ہے کہ جائز رزق اس کے لیے کافی ہو گا) اسے اللہ تعالیٰ انتشار سے بچا لیتا ہے (اور وہ اطمینان کی زندگی گزارتا ہے۔“

فوائد و مسائل : ذخیرہ اندوزی کا مطلب یہ ہے کہ جب عوام کو کسی چیز کی زیادہ ضرورت ہو، تا جرات اس وقت اپنا مال روک لے تاکہ قیمت اور بڑھ جائے اس میں لالچ اور خود غرضی پائی جاتی ہے۔ ایسے شخص کے دل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ عوام مصیبت میں مبتلا ہوں تاکہ وہ دولت جمع کر سکے۔ اس قسم کی خواہشات ایک مسلمان کی شان کے لائق نہیں۔

ذخیرہ اندوزی شرعاً ”منوع“ ہے اور ممنوع کام کے ارتکاب سے روزی میں حرام شامل ہو جاتا ہے۔
گناہ گار کے لفظ میں یہ اشارہ ہے کہ ایسا غلط کام وہی کر سکتا ہے جو گناہوں کا عادی ہو چکا ہو۔ جس سے کبھی کبھار کوئی گناہ کا کام ہو جاتا ہے وہ اتنے بڑے جرم کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔

اپنی ذاتی ضروریات کے لیے مناسب مقدار میں چیز خرید کر رکھ لینا ذخیرہ اندوزی میں شامل نہیں، مثلاً اگر کوئی شخص اپنے گھر میں استعمال کے لیے سال بھر کی ضروریات کے مطابق فصل کے موسم میں غلہ خرید لیتا ہے تو وہ مجرم نہیں۔

افلاس

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔ ”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا۔
”جو مسلمانوں سے کھانے پینے کی چیزوں کی ذخیرہ اندوزی کرے گا اللہ تعالیٰ اسے جدام اور افلاس میں مبتلا کرے گا۔“

دم کرنے والے کا اجرت لینا

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم تیس سواروں کو ایک فوجی مہم پر بھیجا۔ (راستے میں) ہم کچھ لوگوں کے ہاں (ان کی کشتی میں) ٹھہرے۔ ہم نے ان سے کھانا مانگا۔ انہوں نے (ہماری مہمانی کرنے سے) انکار

اچھا گمان

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”ہر شخص کو اس حال میں موت آتی چاہیے کہ وہ اللہ کے بارے میں اچھا گمان رکھتا ہو۔“

فوائد و مسائل :

1- انسان کو اللہ کی رحمت کی امید اور اس کی ناراضی کا خوف دونوں کی ضرورت ہے۔ امید اسے نیکیوں کی رغبت دلاتی ہے اور خوف اسے گناہ سے باز رکھتا ہے۔

2- زندگی میں امید پر خوف کا غالب رہنا چاہیے لیکن وفات کے وقت امید کا پہلو غالب ہونا چاہیے۔

3- اللہ سے حسن ظن کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے بارے میں یہ امید رکھے کہ اس کی توفیق سے زندگی میں جو نیک کام ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں قبول فرمائے گا اور کوتاہیوں سے درگزر فرمائے گا۔

4- امید کا یہ مطلب نہیں کہ زندگی میں اللہ کی نافرمانی کی عادت ہو اور نیکیوں کی طرف رغبت نہ ہو۔ جب نصیحت کی جائے تو کہہ دے۔ اللہ بہت رحم کرنے والا ہے یہ امید کا غلط تصور ہے۔

ایثار

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہیں بھوک کا سامنا کرنا پڑا جب کہ وہ سات افراد تھے۔ وہ فرماتے ہیں۔

”مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سات بھجوریں عنایت فرمائیں۔ ہر آدمی کے لیے ایک بھجور۔“

فوائد و مسائل : 1- معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی ان کی ضرورت کی خوراک نہیں تھی، اس کے باوجود جو چند بھجوریں موجود تھیں، وہی دے دیں۔

2- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے تھے۔ قائد کو اپنے ساتھیوں کا اسی طرح خیال رکھنا

چاہیے۔
3- تھوڑی چیز تقسیم کرتے وقت بھی انصاف اسی طرح ضروری ہے جس طرح زیادہ مال کی تقسیم میں۔
4- صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کا صبر و ایثار بے مثال ہے کہ ایک ایک بھجور ملی تو اسی پر اکتفا کر لیا، کسی نے زیادہ حصہ لینے کی خواہش ظاہر نہیں کی۔

روز قیامت

حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اپنے والد حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں انہوں نے کہا۔ ”جب یہ آیت نازل ہوئی۔

ثم لتسعلن يومئذ عن النعيم۔

ترجمت پھر اس دن تم سے نعمتوں کے بارے میں ضرور سوال ہوگا۔“

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا۔ ”ہم سے کون سی نعمتوں کے بارے میں سوال ہوگا؟

ہمیں تو صرف پانی اور بھجوریں ہی میسر ہیں۔“
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”آگاہ رہو! یہ (سوال) ضرور ہوگا۔“

فوائد و مسائل : 1- جو نعمتیں ہماری نظر میں معمولی ہیں، غور کیا جائے تو وہ بھی بڑی نعمتیں ہیں لہذا ان کا شکر کرنا ضروری ہے۔

2- معمولی سے معمولی غذا بھی بھوکا رہنے کے مقابلے میں بہت بڑی نعمت ہے۔

3- ”آگاہ رہو! یہ ضرور ہوگا۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ اگر آج تمہارے پاس نعمتوں کی فراوانی نہیں ہے تو عن قریب یہ ہو جائے گی، یعنی فتوحات ہوں گی اور تمہیں وافر مقدار میں غنیمتیں حاصل ہوں گی لہذا تمہیں بہت سی نعمتیں میسر ہوں گی۔ دوسرا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ ہر ایک انسان کو دنیا میں تھوڑا بہت مال و متاع ملا ہی ہے، یعنی کسی کو کم، کسی کو زیادہ، لہذا قیامت کے دن ہر شخص سے اس کو دی جانے والی ہر

نعت کے بارے میں سوال ہو گا، ہماری رائے میں دوسرا مفہوم راجح ہے۔ واللہ اعلم۔

میت برودے کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازے میں شریک تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک خاتون کو دیکھا (جو رو رہی تھی) تو اسے بلند آواز سے منع کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”عمر! اسے روئے دو“ آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں، دل کو غم پہنچا ہے اور وقت زیادہ نہیں گزرا (غم نازہ ہے)۔“

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبیلہ بنو عبدالمطلب کی عورتوں کے پاس سے گزرے، وہ جنگ احد میں ہلاک ہونے والے اپنے اقارب پر رو رہی تھیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”لیکن حمزہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) پر رونے والیاں کوئی نہیں۔“ (یہ سن کر انصار کی خواتین آکر حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر رونے لگیں۔)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ زینب کو فرمایا۔ ”افسوس! یہ ابھی واپس نہیں گئیں، انہیں غم سے کہ واپس چلی جائیں اور آج کے بعد کسی مرنے والے پر نہ روئیں۔“

فوائد و مسائل : حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنگ احد میں شہید ہو گئے، ان کے گرانے کی خواتین ابھی ہجرت کر کے مدینے نہیں آئی تھیں اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اظہارِ ترحم کے لیے فرمایا ”حمزہ روئے والا کوئی نہیں۔“ اس کا مقصد رونے والیوں کے عمل کی تعریف کرنا نہیں تھا بلکہ ان کی بے کسی کا اظہار تھا کہ اس موقع پر ان کے اہل خانہ بھی موجود نہیں ہیں جن کو فطری طور پر سب سے زیادہ صدمہ ہوتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اشاہد پر فدا ہونے والے تھے

یہ ان کی محبت کا مکمل تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی بات فرمائی جس سے انہیں محسوس ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے ہیں کہ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے رویا جائے تو انصار کی خواتین فوراً ”تیار ہو کر آئیں کیونکہ ان کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دل گیر ہونا اپنے غم و حزن سے زیادہ تکلیف دہ تھا اس لیے انہوں نے اس غم ملی وجہ سے آواز سے رونا شروع کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح فرمایا کہ میرا مقصد یہ نہیں تھا اس لیے ان خواتین کو واپس چلے جانے کا حکم دے دیا۔ میت کے گرج جو ہو کر رونا، بیٹنا اور نوحہ کرنا منع ہے بلکہ نوحہ کے بغیر بھی میت والوں کے گرج منع ہوتا ہے۔ دیکھیے (سنن ابن ماجہ، حدیث ۱۳۳) جو شخص تعزیت کے لیے آئے تو وہ تعزیت کر کے چلا جائے۔ حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

مصیبت پر صبر کرنے کا بیان

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”صبر ابتداء صدمہ کے وقت ہی ہونا ہے۔“

فائدہ : وہ صبر جو شرعاً ”مطلوب“ ہے یہ ہے کہ جب مصیبت آئے یا غم پہنچے اس وقت اپنے آپ کو غلط حرکات و اقوال سے بچائے کیونکہ جذباتِ غم کی شدت کے موقع پر اپنے آپ پر قابو رکھنا اور جائز و ناجائز کے فرق کا خیال کرنا بہت مشکل ہے۔ جو شخص اس موقع پر احکامِ شریعت کو ملحوظ رکھتا ہے اصل صبر اسی کا ہے جس پر اسے وہ تمام انعماتِ خداوندی حاصل ہوں گے جن کا قرآن و حدیث میں وعدہ کیا گیا ہے۔ بعد میں جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے خود بخود صبر آنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ صبر کوئی ایسی چیز نہیں جس پر کسی کی تعریف کی جائے یا اسے ثواب کی امید ہو۔

ہم تقریر سے گھبراتے ہیں

انشائیہ

کالج والوں تک کیسے پہنچ سکی کہ انہوں نے ہمیں ایک مباحثے کا بیج بنا دیا۔ ہم نے بہت غور کیا کہ ہم تو خود بولنے سے قاصر رہتے ہیں۔ سچی کیا کریں گے۔ جواب ملا کہ ابھی پچھلے دنوں فلاں کالج والوں نے بھی تو ایک مشاعرے کی صدارت ایک ایسے صاحب سے کرائی جو شعر کہنا تو درکنار ایک مصرع بھی موزوں نہیں پڑھ سکتے۔

اس پر ہم لاجواب ہو گئے۔ دلائل ان لوگوں کے پاس اور بھی تھے۔ لیکن اندیشہ پیدا ہوا کہ جوں جوں وہ سامنے آئیں گے ہمارا ازالہ حیثیت عریضی ہو گا۔ نیک نامی کا کوئی امکان نہیں۔ ہم نے کہا ”اچھی بات ہے لیکن ایک بات کی ضمانت دیجیے کہ فیصلے کے بعد مقابلے میں شریک ہونے والے اور انعام نہ پانے والے ہمیں تازیں گے نہیں۔“ کیونکہ ایک بار تھیو سوفیکل ہال کی چھت پر ہم نے تقریروں کے ایک مقابلے میں مصحفی کی تھی۔ ایک صاحب نے جن کے اسکول کو انعام نہ ملا۔ آنکھیں بند کر کے اور منہ کھول کر ایسی تقریر کی کہ اگر وہ ہماری شان میں نہ ہوتی تو ہم سہلا انعام ان ہی کو دیتے۔

ایک موقع پر ایک صاحب زادے کا رد عمل بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔ ان کو انعام نہ ملا تو مٹھیاں بھینچ کر بولے۔

”اب دکھوں گا آپ کیسے جیکب لائن سے گزرتے ہیں۔ روز چلے آرہے ہیں ترکی ٹوپی لگائے، قوالی سننے۔“

جن لوگوں کا خیال ہے کہ ہمارا تصوف سے شغف کم ہو گیا ہے۔ وہ غلطی پر ہیں، اب ہم قوالوں کو اپنے گھر بلا لیتے ہیں۔

ہمیں اسکول سے نکلے (خود نکلے تھے، نکالے نہیں گئے تھے) اتنے دن ہو گئے ہیں کہ کچھ اندازہ نہ تھا کہ زبان اردو کتنی ترقی کر گئی ہے۔ ہم پرانے مولویوں سے پڑھے تھے۔ جو لب سڑک اور فوق البھڑک وغیرہ تک کو غلط قرار دیتے ہیں۔ ادب اور صحافت کے کوچے میں مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم ایسے سخت گیموں سے پالا بڑا، جنہوں نے ایک افسانہ نگار کی عظمت کو محض اس لیے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ اس نے زور بیان میں ہیرو کی زبان سے

ہم تقریر کرنے سے کتراتے ہیں، بلکہ مشاعرہ بھی اسی باعث نہیں پڑھتے کہ شعرا ارشاد کرنے سے پہلے شاعر کا تقریر کرنا اب قریب قریب آداب میں داخل ہو گیا ہے۔ یہ بات نہیں کہ ہم تقریر نہیں کر سکتے۔ ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔ لیکن اس کے لیے ذرا اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک تو یہی کہ ہماری ٹانگوں کو کسی ستون یا کرسی کے پائے سے کس کر باندھنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ہمارے دوسرے اعضاء رئیس کی طرح یہ بھی ایسی خدا ترس واقع ہوتی ہیں کہ جہاں تقریر کا موقع آیا، تھر تھر کانپنے لگیں۔ نرم دلی کے باعث آواز میں بھی رقت آجاتی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اب روئے کہ تب روئے، دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمیں دلائل پر قابو نہیں رہتا۔ دلائل ہمارے ذہن میں ایسے باافراط ہوتے ہیں کہ لب تک آنے کے لیے ایک دوسرے پر پلے پڑتے ہیں۔ بغض تو موقع محل بھی نہیں دیکھتے اور بلا سیاق و سباق وارد ہو جاتے ہیں۔ کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ کئی ایک نے بیک وقت ہماری زبان پر آنے کی کوشش کی تو ایک کچھاسا بن کر ہمارے حلق میں اٹک گئے۔

ایسے میں سطحی نظر والوں کو ہماری تقریر اگر ابھی ہوئی معلوم ہو تو وہ قابل معافی ہیں۔ حلق تر رکھنے کے لیے ہمیں پانی بھی بار بار پینا پڑتا ہے۔ جیسے تو اور لوگ بھی ہیں، لیکن ہمیں اپنی ضرورت کے پیش نظر منتظمین جلسہ سے گزارش کرنی پڑتی ہے کہ اسٹیج پر ٹکالگا دیا جائے۔ اب کتنے لوگ ہیں جو ایسا اہتمام کر سکیں۔ ابھی پچھلے دنوں ایسا اتفاق ہوا کہ بزم تاریخ والوں نے ایک مباحثہ کرایا۔ موضوع ایسا تھا کہ ہمیں بے اختیار تقریر کرنے کی خواہش ہوئی۔ ہم نے اس خواہش کا اظہار کیا تو سیکریٹری صاحب بولے۔

”آپ کا تقریر کرنا ہمارے لیے فخر کا باعث ہوتا لیکن کیا کریں، گے ڈی اے والے نہیں مانتے۔ کہتے ہیں۔“ ”شہر میں ویسے ہی پانی کی قلت ہے۔“

خدا جانے ہمارے تقریر نہ کرنے کی شہرت ایک مقامی

لکھواتے ہیں۔ یہاں ایک بی بی نے اپنی تقریر کا آغاز اس شعر سے کیا۔

دل میں ایک چھیتی ہوئی تقریر ہونی چاہیے
نالہ کیسا بات میں تاثیر ہونی چاہیے
تو ہم نے پوچھ لیا کہ آپ کس کالج سے تشریف لائی
ہیں؟ فوراً کہنے لگیں۔ ”آپ انجان بنتے ہیں۔ جس فٹ
پاتھ پر آپ اپنے دفتر کی کھڑکی میں سے گنڈریوں کے پھلکے
پھینکتے ہیں وہیں تو ہماری کلاس لگتی ہے آپ نے مجھے ضرور
دیکھا ہوگا۔“

اس بحث کا موضوع تھا کہ نئی پود کی بے راہ روی کی ذمہ
داری والدین پر عائد ہوتی ہے۔ بعض طالبات نے اپنی
بات میں زور پیدا کرنے کے لیے الٹیوں سے ادھر اشارے
بھی کیے، جدھر ان کے والدین بیٹھے تقریر سن رہے تھے۔
لیکن سب ہی ایسی نہیں تھیں۔ بعضوں نے ان کو برسی
کرانے کے لیے زورِ خطابت صرف کیا۔ ایک صاحبہ نے
کہا کہ۔

”حضرت آدم علیہ السلام کے تو والدین ہی نہیں تھے۔
اس کے باوجود آپ لوگ جانتے ہیں کہ ان سے جنت سے
نکالے جانے کے قابل بعض باتیں سرزد ہوئیں۔“
لیکن سب سے موثر استدلال ان صاحبہ کا تھا جنہوں
نے کہا۔

”یہ نئی نسل نہایت ناخلف اور نالائق ہے۔ ہدایتی کی
حرکتیں خود کرتی ہے اور ذمہ دار والدین کو گھبراتی ہے۔ کار
بد تو خود کریں لعنت کریں شیطان پر۔“

اس پر ہمیں بہت دن پہلے کی ایک بات یاد آئی۔ اخبار
(ڈان) کی ملکیت کا جھگڑا تھا۔ آرام باغ میں ایک جلسہ
ہوا۔ ایک بہت محترم اور معزز نے صدارت کی۔ ایک
مقرر نے نہایت غیظ و غضب میں تقریر کی اور آخر میں
فیصلہ صادر کیا کہ۔

”ڈان میرے باپ کی ملکیت نہیں، ڈان ایڈیٹر صاحب
کے باپ کی ملکیت نہیں۔ ڈان (انٹلی) سے اشارہ کرتے
(ہوئے) صاحب صدر کے باپ کی ملکیت نہیں، بلکہ قوم کی
ملکیت ہے۔“



یہ کہلوایا تھا کہ۔
”سنائی امیر پیار پھاڑ کی طرح اٹل ہے اور سمندر کی
طرح پیاب۔“

ایک اور مصنف پر وہ عمر بھر اس لیے خفا رہے کہ اس
نے کہیں روانی میں لکھ دیا تھا کہ۔

”اس آگ نے مجھے جلا کر خس و خاشاک بنا دیا ہے۔“
ہمارے زمانے میں یا تو زیرِ نگرانی کہتے تھے یا نگرانی میں
خور کرنے پر زیرِ نگرانی میں، کہنے کی حکمت کھلی، یہ تقریر
کوئی فارسی خواں سن رہا ہو تب بھی سمجھ جائے گا اور فارسی
سے نا بلند ٹھیٹھ اردو بولنے والے کے لیے بھی محلِ اعتراض

نہ ہوگا۔ ایک اور صاحبہ غالباً ”فارسی طالب علم تھیں۔ وہ
صدر گرامی، قدر گرامی کے نیچے بھی زیرِ ذلتی تھی تھیں۔
ان کا صدر گرامی کہنا، ہمیں تو بہت بھلا معلوم ہوا، متعارف
کے معنی میں ہم ایک لفظ روشناس بولا کرتے تھے۔ ہمیں
اندازہ نہ تھا کہ اس کا تعلق روشنی سے ہے۔ دو تین
طالبات کو روشناس کہتے سنا تو صحیح مطلب سمجھ میں آیا۔
رجعت پسندی ہم ہمیشہ زیرِ زور سنی پڑھتے رہے۔ اپنی اس

رجعت پسندی کا احساس اس وقت ہوا جب اک مقررہ
سے رجعت پسند سنا۔ اگر اتنے دنوں میں زیرِ ترقی کر کے
پیش تک نہ پہنچے تو زبان کی ترقی ہی کیا ہوگی۔ اسی مہاٹھے
میں ہمیں پہلی بار معلوم ہوا کہ صحیح لفظ مدح سرائی نہیں،
مداح سرائی ہے۔

اسکولوں کی عمارتیں کم ہونے کی وجہ سے ہمارے بہت
سے اسکول فٹ پاتھوں پر قائم ہیں۔ ہم نے اکثر دیکھا کہ
ذرا استاد کلاس سے غائب ہوا اور کوئی بندر نجانے والا یا بلا
درد و انت نکالنے والا یا چورن بیچنے والا ان کی جگہ آ بیٹھا۔ یہ
بات فائدہ سے خالی نہیں، اس سے طلبہ کا ذہن و اشعار بڑھتا
ہے۔

سچائی چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے۔

اور۔

بشر ازل کہہ کر ذلیل و خوار ہوتا ہے

اور

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے

وغیرہ ایسے ایبات ہیں کہ عمر بھر کام آتے ہیں۔ ان

اسکولوں کے طالب علم جب فارغ التحصیل ہو کر رکشہ یا

بس چلاتے ہیں تو ان اشعار کو رکشہ اور بس کی پشت پر

”سب کو معلوم ہے کہ میں اس فیلڈ میں کب آئی اور کیسے آئی اور میری ابتدائی زندگی کے بارے میں بھی سب کو معلوم ہے۔“

”لیکن ہماری نئی نسل کو آپ کے بارے میں جاننے کا شوق ہے۔ تو پھر میں چاہوں گی کہ آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیں؟“

”ہوں۔ اچھا۔ میرا جنم لاہور میں ہوا۔ میرے تین بھائی اور دو بہنیں ہیں، جبکہ میں گھر میں بڑی ہوں۔ اور ہم بھائیوں، بہنوں میں ایک ایک سال کا ہی فرق ہے۔ اس لیے جب تھوڑے بڑے ہوئے تو سب ایک ہی عمر کے لگا کرتے تھے۔ ویسے بھی مجھے لگتا ہے کہ عمروں کا فرق تھوڑے ہی عرصے لگتا ہے، پھر سب ایک برابر ہی لگنے لگتے ہیں۔ یہ میں اپنی بہنوں کی بات کر رہی ہوں۔ جبکہ بھائیوں میں فرق بہا۔ سب سے



باصلاحیت فنکارہ

شمینہ احمد سے ملاقات

شایین رشید

چھوٹا بھائی دس سال کے کیپ سے اور ایک بھائی چار سال کے کیپ سے پیدا ہوا۔ میرے والد چونکہ فارسٹ ڈیپارٹمنٹ میں تھے تو چونکہ وہ سفر میں رہتے تھے، کبھی اس شہر، تو کبھی اس شہر تو ہمیں بھی اپنی کم عمری میں بہت کچھ دیکھنے کا موقع ملا۔ کئی شہروں میں رہنے کا موقع ملا۔ میری ابتدائی تعلیم اور بچپن جہلم میں گزرا۔ البتہ کالج کی ابتدا اپتلور شہر سے کی۔

”گویا مزے کی زندگی گزری؟“

”کہاں مزے میں گزری۔ جب میں سیکنڈ ایری کی طالبہ تھی تو میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ اور ہم سب تالی کے گھر آ گئے۔“

”گھر کی کفالت؟“

”میری والدہ ماشاء اللہ بڑھی لکھی خاتون تھیں۔ انگریزی بہت اچھی تھی ان کی۔ خود دار تھیں اس لیے

شمینہ احمد کے لیے اگر میں یہ کہوں کہ ہم انہیں اپنی کم عمری سے دیکھ رہے ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ اور ہم نے انہیں ہمیشہ بہترین کردار میں دیکھا۔ خواہ وہ مزاجیہ کردار ہوں یا سنجیدہ۔ ان کی مقبولیت میں کبھی فرق نہیں آیا۔ ہم نے کبھی ان کے بارے میں یہ نہیں سنا کہ ان کی پر فارمنس اچھی نہیں ہے۔ لباس کے معاملے میں ہمیشہ بلو قار پایا۔ میں نے اکثر اپنی سینئر فنکاراؤں کو مارڈرن لباس میں دیکھا ہے۔ اسکرین پر بھی اور آف وی اسکرین بھی مگر شمینہ احمد کو کبھی نہیں دیکھا، ان کی شخصیت میں ہمیشہ ایک وقار ہی دیکھا ہے۔ ہم شمینہ احمد کو ہمارے آپا کہہ کر بلاتے ہیں۔

”ابتدا کہاں سے کریں۔ وہاں سے کہ آپ اس فیلڈ میں کب آئیں یا یہ کہ آپ پہلے اپنے بارے میں بتائیں؟“



اپنے بچوں کی کفالت خود کرنا چاہتی تھیں۔ ورنہ جو لائی میں جو خاتون بیوہ ہو جائے وہ تو ہمت ہی ہار دیتی ہے۔ مگر میری والدہ نے ہمت نہیں ہاری اور انہوں نے تنہا اپنے بچوں کی کفالت کی۔ انہوں نے انگلینڈ جا کر نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کی۔ بطور پوٹیشن بھی کام کیا اور بطور ٹرانسلیٹر بھی کام کیا۔ وہ لندن کورٹ میں بطور ٹرانسلیٹر کام کرتی تھیں جو لوگ اپنا مقدمہ اردو میں لے کر آیا کرتے تھے۔

”آپ کے دیگر بہن بھائی۔ اسی فیلڈ سے وابستہ ہیں؟“

”نہیں۔ وہ اس فیلڈ میں نہیں ہیں۔ بہن لندن میں اور دو بھائی امریکہ میں اور ایک بھائی لاہور میں ہوتے ہیں۔“

”والدین کی کیا خواہش تھی کہ آپ کیا نہیں بڑے ہو کر۔ خصوصاً والد کی؟“

”دونوں نے ہم بچوں پر کبھی فورس نہیں کیا کہ ہمیں یہ بننا چاہیے یا وہ بننا چاہیے۔ بس دونوں کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ ہمیں پڑھنا ہے اور بہت پڑھنا ہے اور ہمیشہ دن تھرڈ میں آنا ہے۔ اور ہم آ کر دکھاتے تھے۔“

”تعلیم کے علاوہ کیا سرگرمیاں تھیں آپ کی؟“

”جی پڑھائی تو ہمیں کرنی ہی ہوتی تھی۔ اور اللہ کا شکر کہ اللہ تعالیٰ نے ذہن بھی اچھا دیا تھا اور شوق بھی ڈال دیا۔ تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ میں غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی کافی حیز تھی اور مجھے گیمز سے اگرچہ لگاؤ زیادہ نہیں تھا مگر پھر بھی میں نے فٹ بال اور بیڈمنٹن کھیلی کہ یہ لڑکیوں کے لیے لازمی تھی۔ البتہ دوسری سرگرمیوں جیسے ڈرلما، تھیٹر کا شوق تھا مجھے۔ پتلیاں بنانے کا بہت شوق تھا اور نہ صرف خود بنائی تھی بلکہ اپنے بہن بھائیوں اور اپنی دوستوں کو بھی سکھاتی تھی اور مزے کی بات کہ ”پتلی شو“ بھی کیا کرتے تھے باقاعدہ ٹکٹ لگا کر۔“

”والدین نے تو پڑھائی پہ زور دیا۔ اپنے طور پر

آپ نے سوچا تھا کہ آپ کو کیا بنانا ہے؟“

”بالکل سوچا تھا۔ مجھے ڈاکٹر بننا تھا یا پیننٹر اور اینٹنگ کا بھی شوق تھا۔ مگر اداکار بننے کا کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ ہمیں تو بس پڑھائی کرنی تھی۔ ڈاکٹر بن نہ سکی کہ مار کس کم آئے تھے البتہ ہینٹنگ کا بہت شوق تھا تو ہوم آنا کس کلچ میں داخلہ لے لیا اور شام کے وقت ہینٹنگ کی کلاسز بھی جوائن کر لیں اور اس کلچ سے میں نے ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی کیری ایڈ آرٹ میں۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ اداکاری کا شوق بھی جالتا گیا اور پھر آہستہ آہستہ اس فیلڈ میں عمل طور پر آگئی۔ اور بہت کام کیا اس فیلڈ میں اور اب تک کر رہی ہوں۔“

”تمک نہیں جاتیں کیا؟“

”تمک جاتی تو کام نہ کر رہی ہوتی۔ مجھے ہر وقت کام کرنا اور اہم کاموں کا اہم لگنا ہے۔ کیونکہ اس میں انسان کی کامیابی ہے۔ میں نے اپنی زندگی جبر مسلسل میں گزار دی ہے تب کہیں جا کر مقام ملا ہے۔ کوئی بڑا مقام ایسے ہی نہیں مل جاتا۔ بہت محنت کرنا پڑتی ہے۔ آج کل کے بچے شارٹ کٹ کے ذریعے آگے بڑھنا چاہتے ہیں اور میں نے دیکھا ہے کہ شارٹ کٹ

جلدی گزر گیا۔ اور اب میں نے سیونگ کو اپنی عادت بنالی ہے۔ ہمارے ملک میں یہ بڑی بد قسمتی ہے کہ ہمارے فن کاروں کے لیے کوئی سیکورٹی نہیں ہے۔ ہمیں اپنے لیے خود ہی سوچنا پڑتا ہے اور اپنا فوج پر بچانا ہوتا ہے۔ برے وقت سے۔“

”گویا زندگی پلاننگ کے ساتھ گزارتی ہیں؟“
 ”بالکل۔ زندگی پلاننگ کے ساتھ ہی گزارنی چاہیے۔ اور میں سب کو کہتی ہوں کہ پلاننگ ضرور کریں اور اپنی پلاننگ کے مطابق چلنے کی کوشش بھی کیا کریں، مگر زلت اللہ پر چھوڑ دیا کریں۔ کیونکہ اللہ ہمارے لیے بہت بڑا پلانر ہے۔ وہ جو بہتر سمجھے گا وہی ہمارے لیے کرے گا۔“

”کیا اولاد کے لیے ان کے ماں باپ ہی خیر خواہ ہوتے ہیں یا کچھ اور بھی لوگ ہوتے ہیں؟“
 ”والدین سے بڑھ کر تو کوئی خیر خواہ ہو ہی نہیں سکتا، مگر زندگی میں اچھے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جو آپ سے دل سے محبت کر کے آپ کے لیے اچھا سوچتے ہیں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے زندگی میں بہت سے اچھے لوگ ملے۔ جو میرے لیے استاد کا درجہ بھی رکھتے ہیں۔ جنہوں نے مجھے اس فیلڈ کے بارے میں بہت سی گائیڈ لائنز دیں، اور نہ صرف اس فیلڈ کے بارے میں ڈرامے کے بارے میں، بلکہ کیا اچھا ہے، کیا برا ہے، کس بات کی اہمیت ہے، کس کی نہیں ہے۔ اور میں ان سب کی شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے سمجھا اور سمجھایا۔“

”حساس ہیں؟“
 ”بہت زیادہ حساس ہوں۔ اپنے ارد گرد بہت سی ایسی باتیں ہیں جنہیں دیکھ کر مجھے دکھ ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ انسان کا اپنے سے کم حیثیت والوں کے ساتھ سلوک بہت برا ہوتا ہے اور مجھے اس بات پر بہت افسوس ہوتا ہے۔ میں تو پہلے پہلے سے ایسے لوگوں سے کام کروا رہی ہوں جنہیں پیسوں کی

کبھی آپ کو دریا کامیابی نہیں دے سکتا۔“
 ”آپ نے بیگ ایج میں ماں کے کردار کرنا شروع کر دیے تھے۔ کیوں؟ کسی نے کہا بھی نہیں؟“
 ”شاید اس لیے کہ میں اپنے گھر کی بڑی گھبراہٹ اور مجھ میں بیٹوں والا انداز گفتگو اور شفقت آئی تھی۔ اور۔ شاید ”ماں“ کا پہلا کردار میں نے بہت اچھے انداز میں کر لیا تھا۔ اس لیے مجھے یہ کردار ملنے لگے اور کوئی کیوں کچھ کہتا۔ ایک اچھی نئی بنائی اسٹارٹ ماں جو سب کو مل گئی تھی۔“ ٹینہ احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کسی کردار کو کرنے سے انکار کیا آپ نے؟“
 ”یہی تو عادت بری ہے۔ کہ انکار نہیں کر سکتی۔ میں ہر کردار کو ایک چیلنج سمجھ کر کرتی ہوں اور اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ناظرین نے مجھے ہر کردار میں قبول کیا ہے۔“
 ”آپ نے کامیڈی کردار بھی کافی کیے۔ پروڈکشن بھی کی ڈائریکشن بھی کی؟“

”جی۔ بالکل یہ تینوں کام میں نے کیے ہیں اور بڑے دل سے کیے ہیں اور جیسا کہ آپ کو بتایا کہ مجھے ہر کام کرنے کا شوق بھی ہے اور ہر کام کو میں چیلنج سمجھ کر کرتی ہوں۔“

”حقیقت میں کیا ہیں مسجیدہ طبیعت یا نارمل۔“
 ”دونوں۔ میں نے خوش رہنا اور۔ خوش رکھنا سیکھا ہے۔ مگر کبھی کبھی زندگی کے جھیلوں میں او اس بھی ہو جاتی ہوں، پریشان بھی ہو جاتی ہوں۔ میری زندگی کے بارے میں سوچ یہ ہے کہ اگر اسے ہم نہی خوشی گزار دیں تو آرام سے گزر جائے گی ورنہ رونے دھونے گزر ہی جاتی ہے۔ اور میں نے دیکھا کہ رونے والوں کا کوئی ساتھ نہیں دیتا۔“

”سیونگ کرتی ہیں؟“
 ”بالکل کرتی ہوں۔ زندگی میں دو تین بار ایسا ہوا۔ میرے پاس بالکل بھی سیونگ نہیں گئی۔ بڑی مشکل میں وقت گزرا، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ وقت

ضرورت ہوتی ہے، تاکہ ان کی "۴" بھی متاثر نہ ہو اور ان کی مدد بھی ہو جائے۔ اس معاملے میں بہت حساس ہوں۔ میں نے تو بہت سے لوگوں کو پڑھایا بھی ہے، تاکہ وہ بڑھ لکھ کر اپنے پیروں پہ کھڑے ہو جائیں۔

"آپ کے بچے بھی اس فیلڈ میں ہیں؟"

"لوڈ کاری کی فیلڈ میں تو نہیں ہے۔ البتہ میرا بیٹا "ہیٹاچا" میں جا رہا ہے۔ جبکہ میری بیٹی نے ایل ایل ایم کیا ہے اور کینیڈا میں رہتی ہے، شادی شدہ ہے اور بیٹے کی بھی شادی ہو گئی ہے۔ خیر سے اللہ نے مجھے داوی اور ثانی دونوں کے رتبے سے نوازا ہے۔"

"مزاجاً کیسی ہیں آپ؟"

"بھئی یہ سوال تو آپ کو دسروں سے پوچھنا چاہیے۔ لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ میں خوش مزاج ہوں، لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ مجھے غصہ نہیں آتا تو یہ غلط ہوگا۔ مجھے بے مقصد باتوں پر بہت غصہ آتا ہے۔ ٹریفک کے نظام پر بہت غصہ آتا ہے۔ لوگ بہت غلط طریقے سے ڈرائیونگ کرتے ہیں۔"

"جنہیں ڈرائیونگ آتی ہے وہ اس بات کو خاص طور پر نوٹ کرتے ہیں کہ لوگ غلط چلا رہے ہیں یا صحیح۔ آپ خود ڈرائیونگ کرتی ہیں؟"

"جی۔ میں ڈرائیونگ کرتی ہوں اور بڑے صبر و تحمل سے ڈرائیونگ کرتی ہوں اور دسروں کو غلط ڈرائیونگ کرتے ہوئے دیکھ کر "بھئی" ہوں۔"

"کھانے کا شوق ہے؟ کھلانے کا شوق ہے یا پکانے کا شوق ہے؟"

"کھانا کھانے اور کھلانے کا شوق ہے۔ پکانے کا زیادہ شوق نہیں ہے۔ بے شک گزارے کے لیے پکا لیتی ہوں مگر یہ نہیں کہہ سکتی کہ میں پکانے کے معاملے میں ماہر ہوں۔ لاہور کے ڈانقہ دار پکوان بہت پسند ہیں۔"

"۴" کوئی اچھی بات۔ اور کوئی بری بات بتائیے؟"

"۴" اچھی بات تو یہ ہے کہ خوش مزاج ہوں۔ صبر و

شکر والی ہوں۔ کام کرنے میں محنت کر کے کمانے میں مزا آتا ہے۔ اور بری بات یہ ہے کہ کبھی کبھار غصہ بہت آ جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے اور جو کام کرنے کا سوچ لوں تو بس پھر سوچ جاتی ہوں۔"

"شہرت نے کبھی مسائل پیدا کیے؟"

"شہرت آج کی نہیں ہے، اب کافی ٹائم ہو گیا ہے اور کبھی شہرت کو سہرا سوار نہیں کیا، تو مسائل بھی کیوں جنم لیں گے۔"

"آپ ملک سے باہر جاتی رہتی ہیں۔ کہاں انجوائے کرتی ہیں؟"

"انجوائے تو میں ہر جگہ کرتی ہوں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بہت خوب صورت دنیا بنائی ہے۔ ویسے مجھے کینیڈا بہت پسند ہے۔ شاید اس لیے کہ وہاں میری بیٹی رہتی ہے۔"

"۴" اور پاکستان کے کس شہر کو بہت پسند کرتی ہیں؟"

"پاکستان تو میری جان ہے۔ میری محبت ہے۔ اس کے بغیر کہیں مستقل رہنے کا سوچ بھی نہیں سکتی اور یوں تو پورا پاکستان میرا اپنا ہے، لیکن لاہور مجھے بہت پسند ہے۔ اس کی ہر گلی محلے سے مجھے محبت ہے۔ بہت خوب صورت ہے لاہور۔"

"مفضول خرچ ہیں؟ یا پیسہ سوچ سمجھ کر خرچ کرتی ہیں؟"

"آپ مجھے مفضول خرچ نہیں کہہ سکتیں، کیونکہ میں ضرورت کی چیزوں پر خرچ کرتے وقت کبھی نہیں سوچتی۔ پیسہ کمانا بہت مشکل ہے۔ اس لیے سوچ سمجھ کر ہی خرچ کرتی ہوں۔"

"موجودہ حکومت سے کوئی شکایت؟"

"۴" ایک نہیں۔ کافی شکایتیں ہیں۔ لیکن سب سے بڑی شکایت تو یہ ہے کہ ٹیکسوں کی بھرمار کروی ہے۔ نہ صرف ہر چیز پر ٹیکس لیا جاتا ہے بلکہ بہت زیادہ لیا جاتا ہے۔ اور ان ٹیکسوں کے بدلے میں ہمیں کیا ملتا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے اسٹریٹوں کا اختتام کیا۔

گردش ماہ و سال کی نیرنگیوں میں کئی راستوں سے گزرے، کئی اتار چڑھاؤ دیکھے، لیکن قافلہ شوق رکنے نہیں پایا۔

اس طویل سفر میں ہماری مصطفین نے ہمارا بھرپور ساتھ دیا، ان کی سوچ اور فکر کے رنگ لفظوں میں ڈھلے تو ان میں زندگی کے سارے منظر سمٹ آئے، ان کی تحریروں میں حمد حاضر کی کرب ناک حقیقتوں کی آگہی کے ساتھ ساتھ مختلف دل آویزی اور خوابوں کے دلکش رنگ بھی شامل تھے۔ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے لاکھوں قارئین کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی، ان کے دلوں میں امید کے چراغ روشن کیے، یہی وجہ ہے کہ خواتین ڈائجسٹ کے ذریعے مصطفین کو اپنی پہچان کے ساتھ ساتھ قارئین کی بے پایاں محبت و تحسین بھی ملی۔

فطری بات ہے، ہم جن کو پسند کرتے ہیں، جن سے لگاؤ رکھتے ہیں ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں، ہماری قارئین بھی مصطفین کے بارے میں ان کی ذات کے حوالے سے جاننا چاہتی ہیں۔ اس لیے ہم نے مصطفین کے لیے ایک سروے ترتیب دیا ہے، جس کے سوالات یہ ہیں۔

س 1۔ لکھنے کی صلاحیت اور شوق وراثت سے منتقل ہوا؟ یا صرف آپ کو قدرت نے تخلیقی صلاحیت عطا کی۔ گھر میں آپ کے علاوہ کسی اور بہن بھائی کو بھی لکھنے کا شوق تھا؟

س 2۔ آپ کے گھر والے خاندان والے آپ کی کہانیاں پڑھتے ہیں؟ ان کی آپ کی تحریروں کے بارے میں کیا رائے ہے؟

س 3۔ آپ کی کوئی ایسی کہانی جسے لکھ کر آپ کو اطمینان محسوس ہوا ہو؟ اب تک جو لکھا ہے اپنی کون سی تحریر زیادہ پسند ہے؟

س 4۔ اپنے علاوہ کن مصطفین کی تحریروں شوق سے پڑھتی ہیں؟

س 5۔ اپنی پسند کا کوئی شعریا اقتباس ہماری قارئین کے لیے لکھیں۔

آیے دیکھتے ہیں، مصطفین نے ان کے سوالات کیا جوابات دیے ہیں۔

حرفِ سادہ کو دیباچہ عجایب کا رنگ

امت الصبور

مصباحِ نو شین

محسوس نہیں ہوئی۔ اگر میں کہوں کہ میں پیدا کنسی طور پر پیدا ہی مصنفہ ہوئی تھی تو یہ بالکل بھی غلط نہیں ہوگا مجھے صرف رائٹری بنانا تھا۔ میں اس کے علاوہ کسی بھی اور پروفیشن میں ہوتی میں ہمیشہ اپنے ساتھ اور اس پروفیشن کے ساتھ زیادتی ہی کرتی۔ اور اللہ کالاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے اس پروفیشن میں بے پناہ عزت دی۔ آج میں ایک پروفیشنل رائٹر ہوں۔

1 لکھنے کا شوق مجھے صرف قدرت نے عطا کیا۔ میرے خاندان میں دور دور تک کسی کو لکھنے کا کوئی شوق نہیں ہے نہ ہی میرے کسی بہن بھائی کو کبھی شوق ہوا۔ البتہ میری امی کو پڑھنے کا شوق ہے اور انہوں نے ہمیشہ ان ڈائجسٹ کو پڑھا اور ہر اچھی کتاب کو بھی۔ شاید یہی وجہ ہو کہ مجھے کبھی بھی ادب سے اجنبیت

صلاحیت نہیں رکھتی بلکہ دیگر رائٹرز سے متاثر ہو کر عام سا ہی لکھتی ہوں۔ کچھ نے تو یہ بھی کہا کہ لکھنا کہاں کا مکمل ہے آرام سے کھنڈ لکھ لے کر ایر کنڈیشن روم میں سارا دن بیٹھ کر لکھتے رہو۔ لیکن میں ان صفحات کے حوالے سے کہنا چاہوں گی کہ میری پیاری بہنو۔۔۔ اگر یہ کوئی کمال نہیں تو آپ لوگ مجھے ایک افسانہ ہی لکھ دو۔ ویسا ہی عام سا جیسا میں لکھتی ہوں حالانکہ میں جانتی ہوں کہ آپ سب لوگ مجھ سے زیادہ اچھا اور بہتر لکھ سکتے ہو۔ لیکن مجھے منہ توڑ جواب دینے کے لیے عام سا بے حد عام سا مگر پلیز ایک تو ضرور ہی لکھ دو۔

اور اب میں ٹی وی سیریل لکھ رہی ہوں۔ اس پر بھی یقیناً اسی طرح کے سحرے ہوں گے۔ میں کبھی بھی سمجھ نہیں سکی کہ میرا خاندان ایسی باتیں کیوں کرتا ہے۔ یا تو میں واقعی میں ان کی امیدوں پر پورا نہیں اتری۔ یا وہ میری کامیابی اور میری صلاحیتوں سے خائف ہیں۔ یا یہ کوئی اور جذبہ ہے۔ شاید یہ سطریں پڑھ کر کوئی سمجھ سکے تو پلیز مجھے ضرور بتائیں۔

یہ تو سروے میں سوال تھا تو میں نے اس کا یہی جواب دینا تھا کیونکہ یہی وہ منحنی رویہ تھا جو میں نے ہمیشہ دکھایا اور محسوس کیا۔ لیکن اب میں ان سب چیزوں سے بہت آگے نکل آئی ہوں مجھے کسی کی بھی کسی بات سے کبھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ میری کامیابیاں، میرے خواب، میری خواہشات، میری زندگی سب کچھ میرا ہے۔ میں اسے ان لوگوں سے شیئر ہی نہیں کرتی جن کو سمجھ ہی نہیں ہے اور پھر اس بات پر یہ کہہ دینا کہ یہ جھوٹ کہتی ہے بھلا بتاؤ پورے خاندان میں کون میرا راز دار ہے؟ میری ماں میری ہر کامیابی پر خوش ہوتی ہیں اور میرے لیے دعا گو ہیں۔ میری پیاری بہن ہمیشہ مجھے سراہتی ہے اور وہ دونوں میری ہر بات سے واقف ہوتی ہیں۔ خاندان کے چند بڑے لکھے لوگ مجھے بے حد سراہتے ہیں وہ مجھے بھی

عدد کتابوں کی مصنفہ اور ڈرامہ رائٹر بھی۔ میں آج کل جیو انٹرنیشنل کے لیے ایک سیریل لکھ رہی ہوں اور تین ڈراموں کا کانٹریکٹ ان کے ساتھ کر چکی ہوں۔ اور ایک بات یہ بھی کہ میں بہت زیادہ مختصر ہوں۔ میں اللہ کی مدد کے ساتھ ساتھ خود پر بہت بھروسہ کرتی ہوں۔ میں کبھی بھی ہمت نہیں ہارتی بلکہ مشکلات سے ٹکرا جاتی ہوں اور پھر اس کا پھل بہت ہی میٹھا اور عمدہ ملتا ہے۔

2 اس سروے کا بہترین سوال۔ جس کا جواب میں سو فی صد صحیح بر مبنی ہی لکھوں گی۔ تو میری پیاری بہنو سنو۔ میرے گھر میں سے ہمیشہ میری امی اور بہن نے میری ہر تحریر کو پڑھا، سراہا اور تنقید کر کے اصلاح بھی کی۔ مگر میرے خاندان والے اول تو میری کوئی تحریر پڑھتے نہیں اگر پڑھ لیں تو جتاتے نہیں۔ کبھی بھولے بھولے کسی رشتے دار خاتون یا کسی کزن سے پوچھا تو کہا اچھی ہے مگر بیٹھ پیچھے جو ان کی رائے میں نے ہمیشہ سنی وہ یہ کہ مجھے لکھنا ہی نہیں آتا ہاں یہ وہ واقعی میں صحیح کہتے ہیں کہ یہ بھی کوئی کہانی ہے۔ پہلی رائے تو یہ تھی کہ کلنی عرصہ لوگوں کو یقین ہی

نہیں آیا کہ میں رائٹر ہوں۔ قارئین میں ایک پسماندہ گاؤں کی رہنے والی ہوں جہاں پر مجھے ہمیشہ سہولیات کی کمی رہی ہے۔ مجھے اچھی اور بہترین کتاب کے حصول کے لیے ہمیشہ بہت تک و دو کرنی پڑی ہے۔ میں نے اچھا برا جو بھی سیکھا۔ وہ ان پرچوں سے ہی سیکھا بلاشبہ ان پرچوں کی تمام مصنفین بہت قابل ہیں جن سے ہمیشہ مجھے بہت کچھ سیکھنے کو ملا اور ابھی تک میں سیکھ رہی ہوں۔ لہذا میرے خاندان والوں کو لگتا تھا کہ میں جھوٹ بولتی ہوں۔ وہ کوئی اور مصباح نوشین اور میں جھوٹ موٹ اپنا نام لیتی ہوں اور ایسا سب نہیں کچھ لوگ کہا کرتے تھے۔

مگر جب میری پہلی کتاب مارکیٹ میں آئی تو لوگوں کو یقین آیا۔ جو قریبی عزیز ہیں وہ البتہ جانتے تھے مگر سب کا ذاتی اور پختہ خیال تھا کہ میں اپنی کوئی سوچ اور

ہیں اور نثر بھی کرتے ہیں اور میری سسرال میں بھی سب سے تعریف کرتے ہیں اور ہمیشہ کرتے ہیں۔

3 پہلی بات میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ کبھی کبھی کوئی بھی تخلیق کار اپنی تخلیق سے سوئی صد طور پر بھی مطمئن نہیں ہوا۔ ہاں لیکن کچھ تمہارے ایسی ضرور ہوتی ہیں جو ہر لکھاری کے دل کے قریب ہوتی ہیں۔

میں نے ایسی دو تحریریں لکھی ہیں جن کو لکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے کچھ بہتر کام کیا ہے جنہیں لکھنے میں مجھے مشکل میں بھی مزہ آیا اور میں نے کافی ریسرچ

ورک بھی کیا شعاع کے لیے میں نے ایک ناول لکھا تھا جو جنوری 2015ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔

اس ناول کے لیے میں نے ایک رسک لیا تھا۔ حشمت زیدی کے کردار کو تخلیق کرنا اور پھر بالکل اسی طرح اسے اپنی سوچ کے مطابق صفحہ قرطاس پر لانا

ایک مشکل امر تھا میرے جیسی نو آموز لکھاری کے لیے اس کی ذات کا منفی پہلو جو اچھائی کی پرتوں میں چھپا

تھا اور کہانی کی اصل روح اور اس کا مقصد قارئین کو ویسے ہی دکھانا سب سے مشکل تھا۔ اور اس ناول کو

لکھنے کے بعد مجھے بہت اطمینان محسوس ہوا۔ جب یہ شائع ہوا تو بہت بڑے بڑے رائٹرز کی جانب سے مجھے

جتنی تعریف و توصیف ملی اس کے لیے میں ان کی محبت کی اور خلوص کی احسان مند ہوں۔

اس ناول کے بعد مجھے ایک چینل سے سیریل کی آفر ملی۔ بہت بڑے ڈرامہ رائٹرز نے ایک جملہ کہا جس

نے مجھے مبہوت کر دیا۔ انہوں نے کہا ”تمہارا ناول ایک کلاسیک ناول ہے جو ہر قاری کی سمجھ میں نہیں آ

سکتا تم ایک بہترین مصنفہ ہو اور تمہارا مستقبل بہت روشن اور تہناک ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور ناول بھی ہے مگر ابھی شائع نہیں ہوا اس لیے اس پر ابھی

بات نہیں کروں گی۔ مگر میری پسندیدہ ترین نثر ہے۔ اب دیکھتے ہیں کب شائع ہوتا ہے۔

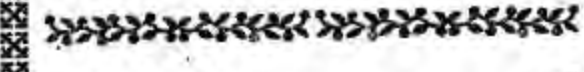
4 اپنے علاوہ یہ پوچھیں کہ میں کس کس کو نہیں پڑھتی۔ میں سمیرا حمید کی دیوانی ہوں۔ عمیرہ احمد

مشہور مزاح نگار اور شاعر انشاء جی کی خوبصورت تحریریں، کارٹونوں سے مزین

آفٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گردپوش



450/-	سفرنامہ	آوارہ گرد کی ڈائری
450/-	سفرنامہ	دنیا گول ہے
450/-	سفرنامہ	ابن بطوطہ کے تعاقب میں
275/-	سفرنامہ	چلتے ہو تو چین کو چلیے
225/-	سفرنامہ	مگرمی پھر مسافر
225/-	طنز و مزاح	خمار گندم
225/-	طنز و مزاح	اردو کی آخری کتاب
300/-	مجموعہ کلام	اس ہستی کے کوچے میں
225/-	مجموعہ کلام	چاند نگر
225/-	مجموعہ کلام	دل وحشی
200/-	ایڈگرائٹن پر انبن انشاء	اندھا کنواں
120/-	ادوہتری انبن انشاء	لاکھوں کا شہر
400/-	طنز و مزاح	ہاتھیں انشاء جی کی
400/-	طنز و مزاح	آپ سے کیا پردہ



مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

تمو احمد کی ہر تحریر میں سانس روک کے پڑھتی ہوں۔
 تیلیا جیلانی، رخسانہ نگار عدین، عنیدہ سید، صائمہ
 اکرم چوہدری اور اس ادارے کی ہر نئی پرانی رائٹرز
 اس کے علاوہ گزشتہ برس میرے ہاتھ بے حد تلیا
 اور قیمتی کتابوں کا خزانہ لگا اور ایک کتاب تو ایسی ملی کہ
 جس میں مجھے پورا بین الاقوامی ادب پڑھنے کو مل گیا۔
 پوری دنیا کے چنیوہ رائٹرز کا انتخاب جسے اکادمی ادبیات
 نے ایک کتاب میں یکجا کر دیا تھا۔ اس کتاب میں
 تقریباً 400 اہل کلم کی بہترین اور عالی سطح پر منتخب
 کہہ تحریریں ہیں۔

جس میں آسٹریلیا، ازبکستان، افغانستان، البانیہ،
 امریکہ، ترکی، ایران، برازیل، انڈیا، بنگلہ دیش، تھائی
 لینڈ، جاپان، جرمنی، افریقہ اور لاتعداد ممالک کے خوب
 صورت رائٹرز کے انتخاب بے حد خوب صورت۔
 اس کے علاوہ میں نے گزشتہ سال بہت خوب صورت
 کتابیں پڑھیں۔ میں مغربی ادب سے واقف ہوئی۔
 مغربی ادب مجھے ہمارے ادب سے بالکل منفرد لگا اس
 لیے مجھے اسے سمجھنے میں کافی وقت ہوئی لیکن کتاب
 کے اینڈ پر میں نے ہمیشہ کی طرح کافی کچھ سیکھنے کو پایا۔
 ڈائجسٹ رائٹرز کے علاوہ میرے فیورٹ کیرل
 گارشیامار کیر۔ ”نجیب محفوظ“ آغا گل اور محمد عاصم
 بٹ ہیں۔ ان کے ناول دائرہ کو میں تمہوڑا سانی پڑھ پائی

مکراش اش کراٹھی۔ اس قدر گہرا مشاہدہ ہونا اور پھر
 اس کو لکھ دینا کمال سے کم نہیں۔ ان کی منظر نگاری
 اس ناول کی کامیابی کی ضمانت بنی تب ہی تو ایک سال
 میں اس کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا تھا۔

اس کے علاوہ بہت ساری کتابیں ہیں جو میرے
 ریک میں تھی ہیں مگر میں انہیں ابھی پڑھ نہیں سکی۔
 ”محبیبوں کے آسپ“ یہ ”کیرل گارشیامار کیز کا
 نامور ناول ہے یہ ناول بہت خوب صورت ہے۔ مگر میں
 نے اسے بہت مشکل سے سمجھ سمجھ کر پڑھا تھا۔ یوں

کہہ لیں کہ یہ ناول میری ضد سی بن گیا تھا۔
 پھر میں نے پیلا کو پڑھا۔ اس کے لکھاری وائس
 چانسریونیورٹی آف بلوچستان کے آغا گل ہیں۔ اس
 ناول کے رحمان اور پیلا کو میں تا عمر نہیں بھلا سکتی۔ نہ
 رحمان کی قربانیوں کو نہ پیلا سے اس کے عشق کو اور یہ
 وہ ناول تھا جس کو پڑھتے ہوئے میرے سارے
 اندازے اور نکلے غلط نکلے اور مجھے اپنے غلط ہونے پر
 بے حد خوشی محسوس ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ بھی
 بہت سی کتابیں میرے پاس رکھی ہیں۔ اللہ کرے میں
 انہیں جلد ہی پڑھ سکوں۔ اور اگلے سروے میں ان پر
 سیر حاصل تبصرہ کرنے کا مجھے موقع مل سکے۔

5 اپنی پسند کا کوئی شعر۔ پسندیدہ اشعار کی تعداد
 ایک نہیں ہزاروں کی تعداد میں ہوں گے لیکن
 مجھے اشعار یاد نہیں رہتے اور حیرت اور افسوس کی بات
 یہ ہے کہ مجھے شاعری زیادہ اپیل نہیں کرتی۔ مجھے بے
 شمار شاعری کی کتابیں محضے میں ملتی ہیں مگر میں کبھی بھی
 انہیں پورا پڑھ نہیں پائی مگر آج کل ایک شعر اچھا لگتا
 ہے وہ ہی لکھ رہی ہوں۔

اس نے کہا۔ کیسے میں تمہارے عشق کو سمجھوں
 میں نے کہا عشق کو بہت کر اور اتنا کر کے چھوڑ دے
 آخر میں میں ادارے اور امتل کی بے حد ممنون
 ہوں ان کا محبت بھرالہجہ اور آواز پہچان کر فوراً ”میرا نام
 لے لینا مجھے بے حد خوشی کے ساتھ حیرت میں مبتلا کر
 دیتا ہے۔ ان کے موبائل نمبر پر فون نہ بھی کروں لینڈ
 لائن پر بھی ان سے بات ہو تو وہ فوراً پہچان جاتی ہیں
 ۔ یہی بات واضح کرتی ہے کہ انہیں اپنی مصنفین
 بہنیں کس قدر عزیز ہیں۔

بائیں عمران اشرف سے

شایین کر سید

- 1 "اصلی نام؟"
- "عمران اشرف۔"
- 2 "پیار کا نام؟"
- "اتنا پیار کسی نے کیا ہی نہیں کہ نام بدل دے۔"
- 3 "تاریخ پیدائش / شہر؟"
- "11 ستمبر 1989ء / اسلام آباد۔"
- 4 "ستارہ / قد؟"
- "درگو / 6 فٹ۔"
- 5 "بہن بھائی / آپ کا نمبر؟"
- "تین بہنیں ایک بھائی اور میں / آخری نمبر ہے میرا۔"
- 6 "تعلیم؟"
- "گرجویٹ ہوں۔"
- 7 "پہلی کمائی؟"
- "500 روپے۔ ایک ٹیلی فلم میں کام کیا تھا۔"
- 9 "رات میں کب سوتے ہیں؟"
- "رات کو نیند کم آتی ہے۔"
- 10 "صبح اٹھ کر کون چاہتا ہے؟"
- "کہ خدا کرے کوئی آرٹسٹ سیٹ پہ نہ پہنچا ہو۔"
- 11 "شادی؟"
- "ابھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ابھی میرا سارا ٹوکس اپنے کام پر ہے۔"
- 12 "پسند کو ترجیح دیں گے؟"
- "ابھی سوچا نہیں۔ ویسے کچھ کہہ نہیں سکتا۔"
- 13 "گنے ملک کے لوگوں سے کوئی شکایت؟"
- "کہ جو قوانین بنائے گئے ہیں اسے مت توڑیں اسے فالو کریں۔"
- 14 "قومی تہوار مناتے ہیں؟"
- "بہت جوش و خروش کے ساتھ مناتا ہوں۔ میرا بلکہ آزاد ہے اور ہمیشہ آزاد رہے گا۔"
- 15 "فلٹائن ڈے مناتے ہیں؟"
- "کالج کے زمانے میں بہت مناتے تھے۔ بڑے پھول دینے کی کوشش کی واپس ہی مل گئے۔ تقسیم مذاق کر رہا ہوں۔ جب احساس ہوا کہ محبت کے لیے کوئی خاص دن نہیں ہوتا تو پھر چھوڑ دیا۔"
- 16 "شدید بھوک میں کیفیت؟"
- "سموت نظر آرہی ہوتی ہے۔"
- 17 "دوستوں میں وقت گزارتے ہیں یا رشتے داروں میں؟"
- "نہ دوستوں میں نہ رشتے داروں میں۔ بلکہ تھائی میں وقت گزارتا ہوں۔"
- 18 "کس دن کا انتظار رہتا ہے؟"
- "کوئی ایسا خاص دن ہے جس کا مجھے خود بھی پتا نہیں ہے۔ مگر مجھے اس کا انتظار رہتا ہے۔"
- 19 "محکم میں بھی کہاں جانے کے لیے تیار رہتے ہیں؟"
- "کوئی خاص جگہ نہیں ہے۔ میرے لیے بہتر ہی ہوتا ہے کہ آرام کروں۔ مجھے لیٹنا اچھا لگتا ہے۔ لیٹ کر بات کرنا لیٹ کے ہی وی دیکھنا۔"
- 20 "خوشی کے اظہار کا طریقہ؟"
- "جھپکا کر گلے لگا کر اور کسی کو کوئی اعتراض نہ ہوتو۔"
- 21 "ضد ہی ہیں؟"
- "جس ضد میں کسی کا نقصان نہ ہو اور جس ضد میں میرا فائدہ ہو نہ دونوں نہیں چھوڑتا۔"
- 22 "میں غمگن ہوں جاتا ہے؟"
- "جب کوئی کسی کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتا ہے۔"
- 23 "غصے میں کیفیت؟"
- "نارمل رہتا ہوں اور غلط کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"



24 "خواتین میں کیا بات متاثر کرتی ہے؟"
 "دنیا میں کسی بھی قسم کی خواتین ہوں، لڑکیاں ہوں، مجھے
 اچھی لگتی ہیں۔"
 25 "لڑکیوں کا گھورنا کیسا لگتا ہے؟"
 "بڑا اچھا لگتا ہے۔"
 26 "آپ ڈرتے ہیں گھر میں؟"
 "اپنے آپ سے۔ میرا غصہ تیز ہے۔"
 27 "لائٹری یا پرائز بانڈ میں دلچسپی؟"
 "نہیں۔ میرا ایمان ہے کہ میری قسمت میں جو لکھا ہوگا
 وہ مجھے خود ہی مل جائے گا۔"

28 "وقت سے زیادہ نہیں وقت سے پہلے نہیں۔
 مانتے ہیں؟"
 "ہاں۔ لیکن مجھے سمجھ بوجھ وقت سے پہلے مل گئی
 ہے۔"

29 "اپنی کمانی دو سروں کو تانی چاہیے؟"
 "نہیں۔ اپنی پرائیویسی ہونی چاہیے۔ اپنا اکاؤنٹ ہونا
 چاہیے۔"

30 "محبت کا اظہار کھل کر کرتے ہیں؟"
 "اتنا کھل کر کرتا ہوں کہ جس سے گرتا ہوں اسے اپنے
 ہونے کا یقین نہیں ہوتا۔"

31 "دنیا میں آنے کا مقصد؟"
 "میرے رب کو بتاؤ گا اور اس نے مجھ سے جو کوانا ہے
 وہ کروانا جا رہا ہے۔"

32 "خریداری میں آپ کی ترجیح؟"
 "ضرورت کی چیزیں۔ فضول خریدی نہیں کرتا۔"

33 "بچپن کی کوئی برائی جو ابھی تک آپ میں موجود
 ہے؟"
 "بچپن دیکھائی نہیں۔ کرائسٹس میں وقت گزارا۔"

34 "پیسہ ہاتھ کا میل ہے؟"
 "نہیں۔ بہت محنت سے پیسہ آتا ہے۔"
 35 "پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟"
 "میں فوڈ لور ہوں۔ میں کھانے کا عاشق ہوں اور عشق سچا
 تب ہی ہوتا ہے جب وہ لے نہ اور میں بھی جب سے فیڈ

میں آیا ہوں مجھے کھانا صحیح طرح نہیں ملتا ہے۔"
 36 "بہترین تحفہ؟"

"کسی کو کوئی اچھا انسان مل جائے، کوئی اچھی گائیڈ لائن
 دینے والا مل جائے اس سے اچھا تحفہ کیا ہوگا۔"

37 "کس بات سے موڈ اچھا ہو جاتا ہے؟"
 "کوئی بھی خوب صورت بات، کوئی بھی خوب صورت
 انسان۔ موڈ اچھا اثر ڈال سکتا ہے۔"

38 "غصے اپنے ہوتے ہیں یا برائے؟"
 "وہ جنہیں آپ سے بہت ہی گرا مطلب ہوتا ہے وہ
 غصے ہوتے ہیں۔"

39 "آنکھ کھلتے ہی بستر چھوڑ دیتے ہیں؟"
 "میرے کئی موڈ ہیں۔ کوئی ہتا نہیں ہوتا، آنکھ کھلتے ہی
 بستر چھوڑ دوں۔ کوئی ہتا نہیں کہ آرام سے چھوڑوں۔"

40 "چھٹی کا دن کہاں گزارتے ہیں؟"
 "چھٹی؟ یہ کیا بات ہوئی۔"

41 "کسی کی سچی محبت دیکھنی ہو تو؟"
 "انتظار۔"

42 "اپنی شخصیت کے لیے ایک لفظ یا جملہ؟"
 "کو۔"

”صحیح بری نہیں لگتی اور اچھی نصیحت تو بہت اچھی لگتی ہے، جس جب نصیحت کا لباس اوڑھ لیتا ہے تو بہت برا لگتا ہے۔“

55 ”وقت کی پابندی کرتے ہیں؟“
”ہاں۔ مگر مجبوراً۔“

56 ”پیسہ خرچ کرتے ہیں؟“
”بالکل خرچ کرتا ہوں اور جس کو ضرورت ہو اس پر کرتا ہوں۔“

57 ”اپنے اوپر کتنا خرچ کرتے ہیں؟“

”زیادہ نہیں۔ گھر والوں پر زیادہ خرچ کرتا ہوں۔“
58 ”کھانے کے لیے پسندیدہ جگہ۔ ڈائننگ ٹیبل، چٹائی یا اپنا پیڑ؟“

”بھری ہوئی پلیٹ۔ جگہ کوئی بھی ہو۔“

59 ”دنیا سے کیا رپوارڈ لینا چاہتے ہیں؟“

”دنیا کیا دے گی مجھے؟۔ میرا رب مجھے دے گا۔“

60 ”انٹرنیٹ اور فیس بک سے لگاؤ؟“

”بہت زیادہ۔ ہر وقت ساتھ رہتا ہوں۔“

61 ”اپنے آپ کو ساتویں آسمان پر کب محسوس کرتے ہیں؟“

”نہیں۔ میں بہت ڈرتا ہوں اپنے رب سے۔“

62 ”مفوج پلاننگ؟“

”اے کام کو بہتر کرتے چلے جانا۔“

63 ”کھانے کس قسم کے پسند ہیں؟“

”ہلکی اور صرف دسی۔“

64 ”عشق کے بخار چمکے؟“

”ہائے۔ ہائے۔ ابھی اترے ہی کہاں ہیں۔“

65 ”عورت نرم دل ہوتی ہے یا مرد؟“

”عورت بہت پیاری ہوتی ہے۔ بس مجھے یہ پتا ہے۔“

66 ”کوئی سوال جو بار بار کیا جاتا ہو؟“

”تمہارے کیوں نہیں ہوتے۔“

67 ”کوئی ایسی پسندیدہ شخصیت جس کو اغوا کرنا چاہتے ہیں اور تاوان میں کیا وصول کرنا چاہتے ہیں؟“

”جس پیاری شخصیت کو اغوا کروں گا اس کے تاوان کے

43 ”گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟“

”جہاں بے سکونی نہ ہو۔“

44 ”اگر ڈھیر ساری چٹھیاں ایک ساتھ مل جائیں تو

”

”اللہ نہ کرے کہ ایسا ہو۔“

45 ”ایک آرٹسٹ جس کے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں

”

”ایک نہیں۔ ہر اس آرٹسٹ کے ساتھ جو سین کو

سمجھتا ہو، کام کو سمجھتا ہو۔ اپنے کردار کو سمجھتا ہو۔

انفرادی ہو کہ نہ سوچتے۔“

46 ”کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً دیتے

”

”جس کے ایس ایم ایس پڑھ لوں۔“

47 ”مہجوریت کس طرح دور کرتے ہیں؟“

”سوچنا ہی رہ جاتا ہوں کہ کیا کروں۔“

48 ”کوئی کردار جو ہٹ گیا ہو؟“

”ہٹ تو ماشاء اللہ کافی گئے ہیں۔ ”گل رعنا“ میں اشعر

کا کردار کافی مقبول گیا تھا۔ کالا جادو کا ”کرم“ کافی ہٹ گیا

”

49 ”آپ کے والٹ کی تلاشی لیں تو کیا کیا نکلے گا؟“

”جو میرے کام کی چیزیں ہوں گی وہ میرے جیب میں ہوں

گی۔ والٹ میں کچھ نہیں ہوگا۔“

50 ”کسی کو فون نمبر دے کر پھتائے؟“

”اب زیادہ بدل گیا ہے۔ جو پسند آجائے اسے فیس بک

پر ریکورڈ بھیج دیتا ہوں۔“

51 ”سرعام کسی نے لوٹا؟“

”ہاں ایک بار مگر میرے پاس زیادہ کچھ نہیں تھا۔“

52 ”اگر پاور میں آگے تو کیا کریں گے؟“

”رب کے زیادہ قریب ہو جاؤں گا اور زیادہ ڈرنے لگوں

گا۔“

53 ”کیا چیریں جمع کرنے کا شوق ہے؟“

”ہائے کا شوق ہے جمع کرنے کا نہیں۔“

54 ”نصیحت جو بری لگتی ہے؟“

- لے کہوں گا یہ مجھے ہی دے دیں۔“
- 68 ”کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟“
- ”سوچ کے کیڑوں سے۔“
- 69 ”کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟“
- ”محبت تو آنکھوں والی ہوتی ہے۔ ایک نہیں ہزاروں آنکھیں ہوتی ہیں اس کے پاس۔“
- 70 ”شادی میں پسندیدہ رسم؟“
- ”تعبیر۔“
- 71 ”تحفہ بہتر ہے یا کیش؟“
- ”کیش۔“
- 72 ”ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟“
- ”میں نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ گھر سے باہر گزارا ہے تو بڑے ہاتھوں کا مزا چکھا ہے۔ اس لیے میری خواہشیں کوئی اتنی زیادہ نہیں ہیں۔“
- 73 ”کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش ہے؟“
- ”علامہ اقبال سے۔“
- 74 ”کیا بار بار فون نمبر تبدیل کرتے ہیں؟“
- ”نہیں۔ پانچ سال ہو گئے ہیں نمبر تبدیل نہیں کیا۔“
- 75 ”آپ کو فویا ہے؟“
- ”کوئی بھی سوچ۔ نگینو سوچ سے بچتا ہوں۔“
- 76 ”کن چیزوں کو لیے لیشیر گھر سے نہیں نکلتے؟“
- ”میرے پاس اتنی چیزیں ہوتی ہی نہیں۔ فون ہوتا ہے اور میں ہوتا ہوں۔“
- 77 ”دوسروں سے مختلف ہیں؟“
- ”ہاں ہوں۔ اس لحاظ سے کہ حقیقت پسند زیادہ ہوں۔“
- 78 ”میں ناراض ہو جائے تو؟“
- ”تو فوراً منالیتا ہوں۔“
- 79 ”ذہنی کا اعتراف کرتے ہیں؟“
- ”بالکل اور بہت جی و پکار کے ساتھ۔“
- 80 ”دل کی سنتے ہیں یا دماغ کی۔“
- ”دونوں کی ددستی اچھی ہے۔“
- 81 ”بچپن کا کوئی کھلونا جو آج بھی سنبھال کر رکھا ہوا ہے؟“
- ”مجھے یاد ہی نہیں ہے کہ میں نے بچپن میں کوئی کھلونا رکھا ہو۔“
- 82 ”کبھی غصے میں کھانے سے لڑائی کی؟“
- ”بہت بار۔ مگر مہرنا کر کھانا کھلاتا ہوں۔“
- 83 ”شہرت مسئلہ بنتی ہے؟“
- ”بڑی خوب صورت چیز ہے شہرت۔ مسئلہ نہیں بنتی۔“
- 84 ”بستر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا۔۔۔؟“
- ”نہیں جلدی نیند نہیں آتی۔ کروٹیں بدلتا رہتا ہوں۔“
- 85 ”بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا چیزیں رکھتے ہیں؟“
- ”سائیڈ ٹیبل ہے ہی نہیں۔“
- 86 ”خدا کی حسین تخلیق؟“
- ”ہر چیز۔“
- 87 ”زندگی کب بری لگتی ہے؟“
- ”جب پتا چلتا ہے کہ ختم ہو جائے گی۔“
- 88 ”کھانے کی ٹیبل پہ کیا نہ ہو تو کھانے کا مزا نہیں آتا؟“
- ”نہیں مجھے ہمیشہ مزہ آتا ہے اور ہر چیز ہو تو پھر اسے بولس سمجھتا ہوں۔“
- 89 ”پیسہ محنت سے ملتا ہے یا قسمت سے؟“
- ”پیسہ قسمت سے بھی ملتا ہے مگر جو مزا محنت کی کمائی کا ہے کسی اور میں نہیں۔“
- 90 ”زندگی کب بدلی؟“
- ”زندگی نہیں بدلی۔ میں بدل گیا ہوں۔“
- 91 ”کوئی گہری نیند سے اٹھاوے تو؟“
- ”اگر وہ مجھ سے بڑا ہو گا تو خیر ہے اور چھوٹا ہو گا تو چھوٹوں کا نہیں۔“
- ”سنیما میں سب سے پہلی فلم کون سی دیکھی تھی؟“
- ”تیرے پیار میں۔“
- ”اگر آپ کی شہرت کو ذوال آجائے تو؟“
- ”میں اس کے لیے تیار ہوں۔“

✱

خاتمی کو بیارے

ادان

تک کھوئی ہوئی ہوں اس کے بعد سے میں ان رسالوں کو پلاؤ کی طرح عزیز رکھنے لگی (مجھے پلاؤ بہت پسند ہے) اور رسالے بھی اسی طرح لیتی ہوں اور میرے میاں صاحب نے بھی مجھے ان کا نشہ لگا دیا ہر مہینے رسالہ (دونوں) بغل میں دبائے چلے آتے ہیں اور انگڑائی لے کے پھینک دیتے ہیں ان کا یہ انداز مجھے بے حد پسند ہے۔

4 - ڈائجسٹ سے رشتہ۔

ان کی سنگت میں وہ رسالے پڑھ ڈالے ہیں جو میری پیدائش سے بھی پہلے کے ہوں گے۔ اور میرے والد صاحب نے بھی بہت رسالے پڑھوائے البتہ امی مجھے رسالوں میں غرق دیکھ کے کمرہ جھاڑو سید کر دیتی تھیں۔ ”من و سلویٰ“ ”ایک نئی منزل“ ”میڈیم یا قوت“ ”نزہت شبانہ حیدر کی پہلی کہانی پڑھی تھی۔ (مطلب سب سے پہلے ان ہی کی ایک کہانی پڑھی تھی) عائشے گل اور ہمارے گل نہیں بھولتیں۔

5 - پسندیدہ اشعار آفتاب۔

پسندیدہ غزل ”بھولتا کون ہے“ پروین شاکر کی میں اپنے ہاتھوں سے اس کی دلہن سجاؤں گی ”احمد فراز کی غزلیں، مرزا غالب کے اشعار اور غزلیں لکنا ہے ابھی ابھی لکھی گئی ہیں ان کے شعروں کی تازگی آج تک برقرار ہے۔ پسندیدہ کتاب قرآن مجید ہے جب کھولیں نئی بات سامنے آتی ہے، سوچ کے نئے دروا کرتی ہے اور لفظوں کی خوب صورتی اور ان کا ربط بہت حیران کن ہوتا ہے اور سیرۃ النبیؐ کی ہر کتاب ہر آفتاب پسند ہے اگر میسر ہو جائے تو۔

پسندیدہ شعر۔

اس کے سب جھوٹ بھی سچ ہیں محسن
شرط اتنی ہے وہ بولے تو سہی

شازیہ الطاف ہاشمی۔ شجاع آباد

میرا نام شازیہ الطاف ہاشمی ہے اور میرا تعلق شجاع آباد کے چھوٹے سے گاؤں سے ہے۔ ساتویں سلونی لے سے قد کی خوب صورت نین نقوش والی میٹرک پاس لڑکی ہوں شادی کو آٹھ سال ہونے والے ہیں وہ پیاری سی بیٹیوں کی امی جان ہوں۔ قاطمہ زہرہ اور آمنہ الطاف۔ فارغ وقت میں شعاع خواتین اور اخبار کا مطالعہ جو تقریباً ”سارا دن جاری رہتا ہے اور ہاں دن کے تین بجے اپنی بیٹی قاطمہ زہرہ کا ہوم ورک کروانا اور موبائل میرے پاس نہیں ہے شام کو میاں صاحب کے آنے پر امی کو کل کر کے خیر خیریت پوچھنا۔ میرے مشاغل ہیں۔

2 - خوبیاں اور خامیاں۔ خامی میری سب سے بڑی یہ ہے کہ بے حد سادہ بلکہ بے وقوف لڑکی ہوں۔ کرنا کچھ ہوتا ہے کہ کچھ بیٹھتی ہوں کہنا کچھ اور ہوتا ہے اور کہہ کچھ اور بیٹھتی ہوں۔ زندگی میں جھوٹ بھی بولنے پڑتے ہیں کبھی ضرورت کے تحت مگر مجھ پر جھوٹ بولتے ہوئے جو گزرتی ہے جھوٹ بہت مشکل سے بولتی ہوں۔ دل میں کسی کے لیے عناد پالنا چاہتی ہوں تو بھی میرا دل صاف رہتا ہے۔ منہ پھٹ ہوں بات منہ پہ کہہ دیتی ہوں۔ حساس بے حد ہوں ذرا سی بات پہ رو پڑتی ہوں اور کبھی بڑے بڑے دکھ آرام سے سہ جاتی ہوں صفائی پسند ہوں۔

3 - خواتین سے وابستگی؟

خواتین سے وابستگی بہت ہی پرانی ہے۔ (اللہ جنت نصیب فرمائے) میرے والد صاحب کو ایک دفعہ مجھے ایک پھیری والے سے امروڈ لے کر دیے اس نے جس ورق میں امروڈ کاٹ کے دیے وہ اسی خواتین یا شعاع کا تھا۔ امروڈ کھا کر میں اس گھٹے میں کم ہو گئی اور آج

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ✦ ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

قلعہ فلک بوس

قلعہ فلک بوس کا آسیب آیوشمتی۔ ایک بھگتی روح جس کے اسرار سے کوئی واقف نہیں ہے۔
معاویہ فلک بوس آتا ہے تو اسے وسامہ کی ڈائری ہتی ہے۔

فلک بوس میں وسامہ اپنی بیوی آئے کت کے ساتھ رہتا ہے۔ وسامہ بہت اچھا اور ذہین مصنف ہے۔ وہ باوقار اور
وجہہ شخصیت کا مالک ہے لیکن ایک ٹانگ سے معذور ہے۔ وہ غیر معمولی حساس ہے۔ اسے قلعہ فلک بوس میں کوئی روح
محسوس ہوتی ہے۔ آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن کوئی نظر نہیں آتا۔ معاویہ وسامہ کا پھوپھی زاد بھائی ہے، آئے کت اور
وسامہ معاویہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ قلعہ فلک میں آیوشمتی کی روح ہے لیکن معاویہ مضبوط اعصاب کا
مالک ہے، اسے اس بات پر یقین نہیں آتا۔

کمانی کا دو سرائیک جہاں تین بھائی جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت رہتے ہیں۔

صابر احمد سب سے بڑے بھائی ہیں۔ صابر احمد کی بیوی صباحت تالی جان ہیں اور تین بچے، رامین، کیف اور فہمیدہ
ہیں۔ رامین کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملایشیا میں ہے۔

شفیق احمد کی بیوی فضیلہ چچی ہیں۔ مالی لحاظ سے وہ سب سے مستحکم ہیں۔ شفیق احمد نے ان سے پسند کی شادی کی تھی۔
دو بیٹیاں صیام اور منہا ہیں اور دو بیٹے شاہجہاں اور شاہ میر ہیں۔ بڑے بیٹے شاہ جہاں عرف مشہو بھائی کا داغ چھوٹا رہ گیا
ہے۔

Downloaded From
Paksociety.com

READING
Section

باسط احمد تیسرے بھائی کا انتقال کا ہوجکا ہے۔ ان کی بیوی روشن امی اور دو بیٹیاں خوش نصیب اور ماہ نور ہیں۔ خوش نصیب کو سب منحوس سمجھتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ تنگ مزاج ہو گئی ہے۔ خوش نصیب کی ثانی بھی ان کے ساتھ رہتی ہیں۔ خوش نصیب کو دونوں بچاؤں سے شکایت ہے کہ انہوں نے ان کا حق نہیں دیا ہے۔ گھر کا سب سے خراب حصہ ان کے پاس ہے۔ صاحبہ ثانی جان اور روشن امی خالہ زاد بہنیں ہیں۔ صاحبہ ثانی جان کے چھوٹے بھائی عرفات ماموں جو بہت نرم گفتار اور دل موہ لینے والی شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے شادی نہیں کی۔ وہ کیف کے ماموں ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا آئیڈل بھی ہیں۔

کہانی کا تیسرا ٹریک منقر اور فیسی ہیں۔ منقر امریکہ میں بڑھنے آئی ہے۔ ہاسٹل میں رہتی ہے۔ زیر زمین ٹرین میں ان کی ملاقات معاویہ سے ہوتی ہے۔ منقر کی نظریں معاویہ سے لگتی ہیں تو اسے وہ بہت عجیب سا لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی سفاکی اور بے حسی ہے۔ منقر چونک سی جاتی ہے۔

تیسری قسط

اس روز جب سورج طلوع ہوا اور سورج کی کرنیں بشارم کے پھاٹوں کی اوٹ سے فلک بوس کی اونچی چینیوں سے ٹکراتی ہوئی نیچے اتریں اور تالاب کے پانی پر نازک قدموں سے رقص کرنے لگیں تو چند کرنیں کھڑکی کے شیشے سے چھلانگ لگا کر اندر داخل ہوئیں اور صوفہ کم بیڈ پر بے سدھ سوئے ہوئے وسامہ کے چہرے پر پھیلنے لگیں۔

وسامہ پچھلی رات بہت پرسکون ہو کر سویا تھا۔ کڑوں کی شرارت سے وہ کسمسایا پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے پردے کی درز سے ایک روشن چمک دار دن اسے خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ وہ صبح کی تازگی لیے مسکراتے ہوئے اٹھ کر بیٹھا۔ پچھلے دو روز کے پریشان کن واقعات کی یاد ابھی اس کے ذہن میں تازہ نہیں ہوئی تھی۔ اس نے خوب بانو پھیلا کر رات کی ٹھکن اتاری۔ انگڑائی لیتے ہوئے اس کی نظر آئے کت پر پڑی۔ وہ ایک صوفے پر کھٹی سمٹائی سو رہی تھی۔ سر ایک طرف کو لڑھکا ہوا تھا۔ گرم لحاف کا کچھ حصہ آئے کت کے گرد لپٹا تھا

Downloaded From
Paksociety.com

READING
Section

اور کچھ سرگتا ہوا نیچے غالیے پر پھیل گیا تھا۔

وسامہ کو ایک دم سے وہ تمام واقعات یاد آئے جو پچھلی دو راتوں میں اس پر ہوتے تھے اس یاد کی نقوش کے ساتھ اس کا دل سم گیا اور اس نے جلدی سے ادھر ادھر دیکھا۔ کھڑکیوں کے پردے اگرچہ برابر تھے، لیکن کمرے میں دن کا اجالا پھیل چکا تھا اور وہاں صرف وہ نفوس تھے وہ اور آئے کت۔ آتش دان میں رات بھر لکڑیاں سلگ سلگ کر راکھ بن چکی تھیں اور اب ان میں زندگی کی رمت باقی نہیں رہی تھی۔

آہستہ آہستہ اس کا ڈر ختم ہونے لگا۔ دن کی روشنی میں یوں بھی یہ احساس کم رہتا تھا۔ اس نے گہری سانس لی۔ پیر نیچے رکھے سرہانے کی طرف رکھی میسا کی اٹھا کر ٹانگ سے جوڑی اور بنا آواز چلا ہوا کھڑکی تک آیا۔

باہر دن پوری طرح طلوع ہو چکا تھا۔ وسیع و عریض باغیچے اور اس کے بیڑ پودے مسور سے دکھائی دیتے تھے تالاب کے وسط میں اپنے پنک پھیلائے سفید پری سنہری دھوپ کا لطف لے رہی تھی۔ یہاں سے دور فلک بوس کے مرکزی پور ٹیکو میں معاویہ ملازمین کو اکٹھا کیے بات چیت کر رہا تھا۔ وہ ہینٹ سوٹ میں ملبوس تھا۔ موسم کے پیش نظر اس نے وسامہ کی لیڈر جیکٹ پہن رکھی تھی ہاتھ میں موٹی چھتری تھی یہ ایسی ہی ایک چھتری تھی جو جنگل کی طرف جاتے ہوئے وہ سب جنگلی جانوروں کے حملے کے پیش نظر احتیاطاً پکڑ لیتے تھے معاویہ صبح خیز لوگوں میں سے نہیں تھا۔ یہ حیرانی کی بات تھی کہ وہ اتنی صبح کیسے بیدار ہوا اور جنگل کا چکر بھی لگا آیا تھا۔

وسامہ نے وہاں سے دھیان ہٹایا اور پردے کی درز کو برابر کر کے واپس صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ میسا کی کاہل اس نے ڈھیلا کر دیا تھا اور اب ٹانگ پھیلا کر نیم دراز ہو گیا تھا۔ وہ کمرے کی محرابی پھت کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ساتھ رو نما ہونے والے تمام تر واقعات پر غور کرنے لگا۔



بہری پیر کے مزار کی کرامات یوں تو دور دور تک مشہور تھیں، لیکن سب سے بڑی کشش وہ کھٹے بیٹھے پیر تھے جن کے درخت مزار کے بڑے محرابی دروازے کے دائیں بائیں لگے ہوئے تھے۔

زارین جوق در جوق آتے دربار میں داخل ہونے سے قبل بائیں ہاتھ والے بہری کے درخت کے نیچے بیٹھے پھولوں والے سے پھولوں کی پتیاں، حسب حیثیت قبر پر چڑھانے کی چادر تیار کی بوندی اور کھانے خریدتے۔ پھر بائیں ہاتھ والے بہری کے نیچے اپنی اپنی چھتوں اتار کر ٹوکن لیتے اور یہ آواز بلند قبر میں سوتے ہوئے باباجی کو سلام کرتے اندر داخل ہوتے۔ اندر دربار کا کھلا اور وسیع احاطہ تھا۔ جہاں فقیروں اور زارین کا ملا جا سار ش لگا ہوتا۔ اب آنے والے لائن سے چلتے ہوئے آتے جاتے قبر کے پاس کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھتے، زور کر گڑ گڑا کر اور کچھ

تو باقاعدہ قبر کو سجدہ کرتے ہوئے قبر میں استراحت فرماتے باباجی سے اپنی خواہش پوری کرنے کی استدعا کرتے۔ پھر چادر چڑھاتے، قبر کے متولی کو چمکے سے نذر کے میسے پکڑاتے اور اگلے قدموں چلتے ہوئے نہایت ادب اور احترام کے ساتھ باہر نکل جاتے۔ احاطے میں فقیروں کے درمیان بوندی اور نمک پاروں کی نیاز تقسیم کی جاتی اور باہر جاتے جاتے مٹھیاں بھر بھر کر بیروں سے جیبیں اور ساتھ لائے لفافے بھر لیے جاتے تھے۔

کہنے والے کہتے تھے کہ یہ باباجی کی بابرکت کرامات کا نتیجہ ہے کہ سارا سال ان درختوں سے پھل ختم نہیں ہوتا۔ صرف یہی نہیں، تو یہاں تک بھی کہتے تھے کہ یہ جو پیر اتنے بیٹھے ہیں یہ بھی باباجی کی کرامات کا ہی نتیجہ ہے۔ خوش نصیب کو بہری والے مرحوم باباجی سے تو کوئی دلچسپی نہیں تھی نہ ہی ان کی کسی کرامت پر وہ یقین رکھتی تھی اس کی ساری دلچسپی ان بیروں میں تھی جو ہر بار مزار کے سامنے سے گزرنے پر اسے لچانا شروع کر دیتے تھے۔

سوہیری پیر کے مزار سے اس کا پرانا دوستانہ تھا جو بچپن سے جلا آ رہا تھا اور جو اس وقت تک قائم رہنا تھا جب تک پیر کے درخت یہاں موجود تھے۔ وہ سب ان ہی گلیوں میں کھیلتے کودتے شرارتیں کرتے بڑے ہوئے تھے۔ سب بچے یہاں مزار تک ریس لگاتے تھے جس میں زیادہ تر وہ اور کیف ہی جیت جاتے کیونکہ ان دونوں کو ان پرانی اور تنگ چھوٹی گلیوں کے سارے راستے معلوم تھے۔ باقی بچوں کے یہاں کھینچنے تک وہ دونوں کچے پیروں سے چھینیں بھریتے اور پھر باقیوں کو ناک ناک کر مارتے۔

بچپن گزر گیا۔ تپتی یادیں چھوڑ گیا۔
واپسی پر خوش نصیب کے ذہن میں بہت سی باتیں گھوم رہی تھیں۔ گھر جانے سے پہلے اسے پھر چاہیے تھے۔ گلی نمبر سات کے چور اے پر فریج سے ملاقات ہو گئی۔ وہ سر پر روٹا اوڑھے اپنی امی اور بڑی بہن ثمرین کے ساتھ آ رہی تھی۔ خوش نصیب کی بچپن کی سہیلی اور پڑوسن بھی تھی۔
”ارے خوش نصیب!“

”فریج تم! دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ایسے خوش ہوئیں جیسے برسوں بعد ملاقات ہو رہی ہو۔
”کہاں جا رہے ہو تم لوگ؟“ خوش نصیب نے مسکرا کر تینوں کو دیکھا۔

”ہم مزار والے بڑے پاباجی سے ثمرین پاباجی کے لیے تعویذ لکھوانے جا رہے ہیں۔“ فریج جوش میں بولتی چلی گئی پھر فوراً ”نہی ثمرین پر نظر پڑی۔ وہ دانت کچکچا کر اسے دیکھ رہی تھی۔ فریج نے سیٹھا کر پہلے تھوک نکلا اور جلدی سے بولی۔

”نہیں۔ نہیں۔ ہم تو مزار پر دعا مانگنے جا رہے ہیں۔“ بہن کی ناراضی دیکھ کر جلدی سے بات مٹائی تھی۔
”اب کیا فائدہ ایسے بولنے کا۔“ ثمرین نے تنگ کر کہا اور ماں سے آواز دیا کر بولی۔ ”میں نے آپ سے کہا بھی تھا اس کو ساتھ لے کر نہ آئیں۔ خوش نصیب کے سامنے بول دیا ہے۔ سارے محلے کو خبر مل جائے گی اب۔“
خوش نصیب کو یوں بھی کان لگا کر بات سننے کا شوق تھا۔ ثمرین نے آواز دہمی کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ فریج اگر خوش نصیب کی سہیلی تھی تو ثمرین کا پارا نہ میام سے تھا۔ جتنا میام اسے ناپسند کرتی تھی۔ اتنا ہی ثمرین بھی اس کے بارے میں ناپسندیدگی کے خیالات رکھتی تھی۔

”فکر نہ کریں ثمرین پاباجی! سارے محلے کو میں نہیں بتائی صرف میام کو بتاؤں گی۔ وہ تو آپ کی دوست ہے۔ اسے تو پتا ہونا چاہیے آپ تعویذ بنا رہی ہیں۔“ خوش نصیب نے ساوگی سے کہا تھا۔
”ہائے اللہ۔ یہ غضب مت کرنا۔“ ثمرین نے سیٹھا کر کہا پھر جھنجھلا کر بولی۔ ”تم تو سارے محلے میں اعلان کرو گی۔ وہ تو پورے شہر کو ہی بتا دیے گی۔“ دوستی ضرور تھی، لیکن دوستی سے جڑا ہوا مخصوص قسم کا اعتماد اور مقابلے بازی کی فضا بھی خوب گرم رہتی تھی دونوں کے درمیان۔

شائع ہوئے ہیں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

خوشگوار سردق
خوشگوار چیمپائی
مضبوط جلد
آفٹ پیپی

☆ تملیاں، پھول اور خوشبو راحت جنیں قیمت: 250 روپے
☆ بھول بھولیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 600 روپے
☆ محبت میاں نہیں لہنی جدون قیمت: 250 روپے

شکوٹہ ہاؤس، مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

39 مارچ 2016

READING
Section

”ارے جانے بھی دیں ثمرین باجی۔“ خوش نصیب نے نرمی سے کہا۔ ”کیا ہوا جو شکل سے ہی خزانہ لگتی ہے، لیکن دل کی اچھی ہے صیام۔“

”بڑی اچھی طرح جانتی ہوں میں اس دل کی اچھی صیام کو۔ مجال ہے جو کسی کی خوشی برواشت ہو جائے۔“ خوش نصیب کی باتوں میں آگے بولتی چلی گئی۔ ”مجھے تو پہلے ہی شک ہے صیام کی ہی نظر لگی ہے میری شادی شدہ زندگی کو۔“ خود کلامی۔

”اب بس بھی کر دے ثمرین! تو تو پورا دفتر ہی کھول کر بیٹھ گئی ہے۔“ اماں جسنبھلا کر بولیں پھر خوش نصیب سے کہنے لگیں۔ ”اے بیٹی! تم اس بارے میں کسی سے ذکر مت کرنا۔ اپنی چچی اور صیام کو جانتی ہو نا۔ واقعی پورے محلے میں مشہور کر دیں گی۔“

”فکر مت کریں خالہ! کسی سے نہیں کہوں گی۔“ وہ ہنسی اور شرارت سے ثمرین کو دیکھ کر بولی۔ ”وہ تو میں ثمرین باجی کو تنگ کر رہی تھی۔“

ثمرین نے ”ہونہہ“ کر کے منہ موڑ لیا۔
خوش نصیب اور فریحہ کھی کھی کر کے ہنسنے لگیں۔ پھر خوش نصیب نے کہا۔
”میں بھی ساتھ ہی چلتی ہوں۔ مجھے مزارہہ جانا ہے۔“

”ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔“ اماں نے کہا، لیکن ثمرین اس بات سے خوش نظر نہیں آرہی تھی۔ اس نے ناک چڑھالی اور خوش نصیب کو گھور کر اماں کے ساتھ آگے آگے چل دی۔

”تمہاری بہن کی ناک میں کوئی مسئلہ ہے کیا؟“ پیچھے آئی خوش نصیب نے بڑی ہمدردی سے فریحہ سے پوچھا تھا۔

”نہیں۔ مسئلہ نہیں ہے۔ اس کی سہینگ ہی ایسے ہو گئی ہے کہ ناک ہر وقت چڑھی ہوئی لگتی ہے۔“ فریحہ نے بھی اس کے انداز میں کہا اور دونوں ہاتھ پہ ہاتھ مار کے زور سے ہنس دیں۔



یہ چند مہینے پہلے کی بات ہے جب وسامہ نے فلک بوس میں عجیب و غریب اثرات کو محسوس کرنا شروع کیا تھا۔ ایک شام فلک بوس کے اندرونی حصوں میں دیکھ ریکھ کے خیال سے گشت کرتے ہوئے اسے بہت تیز بدبو کے بھسکے نے رکنے پر مجبور کر دیا۔ اسے سخت ناگواری محسوس ہوئی، لیکن بدبو کی سمت کا تعین کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس نے ملازم لڑکے پاشا کو بلا کر تحقیق کروائی تو پتا چلا یہ بدبو تو تہ خانے کی طرف جانے والے راستے سے آرہی ہے۔ کچھ اور تحقیق کی گئی تو انہیں مری ہوئی گلابوں کا ایک ڈھیر ملا جن کے جسم اس وقت تک گل سڑ چکے تھے اور بدبو پیدا کر رہے تھے۔ یہ ایسا کراہت انگیز منظر تھا کہ وسامہ کا دل برا ہو گیا اس نے بمشکل خود کو ابائی لینے سے روکا اور ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔

”یہ کیا ہے؟ یہاں کتنے عرصے سے صفائی نہیں ہوئی پاشا؟“ وسامہ نے ناگواری سے کہا۔
”مجھے اس بارے میں پتا نہیں صاحب۔! آپ جانتے ہیں میں کل ہی شہر سے آیا ہوں۔“ اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

”کبیر بابا کو بلاؤ۔“ وسامہ نے ملازموں کے سربراہ کا نام لیا جو پاشا کے والد بھی تھے۔
”وہ شہر گئے ہوئے ہیں۔ دو دن بعد ان کی واپسی ہے۔“ پاشا نے وسامہ کے ناپسندیدگی والے تاثرات دیکھ کر ذرا محتاط لہجے میں کہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ صاحب کا موڈ خراب ہو چکا ہے اور حقیقت بھی یہی تھی۔ فلک بوس میں

رہائش اختیار کرنے کے بعد سے یہ جگہ وسامہ کی ذمہ داری تھی۔ اور اپنے تئیں وہ یہ ذمہ داری بہ احسن نبھا بھی رہا تھا، لیکن صفائی کا ناقص انتظام دیکھ کر اسے سخت کوفت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وسامہ نے پاشا سے وہ جگہ صاف کروانے کے لیے کہا، ساتھ ہی اسے تاکید کی کہ جب تک وہ یہاں ہے صفائی ستھرائی کے کاموں کی نگرانی کرے۔ پاشا نے اسے یقین دلایا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ مری ہوئی گھریوں کو اٹھا کر باہر پھینک دیا تھا۔ فائل چمڑک کر تہ خانے کا راستہ صاف کیا گیا اور تیز خوشبو وہاں چمڑکی گئی تاکہ وہاں وہاں سے گزرتے ہوئے ناگواری محسوس نہ ہو، لیکن اتنی اچھی خوشبو کے باوجود وسامہ کا موڈ ٹھیک نہ ہو سکا۔ آئے کت نے اس بارے میں دریافت کیا تو وسامہ نے سارا قصہ من و عن اس کے گوش گزار کر دیا۔ ساری بات سن کر آئے کت کو ناگواری محسوس ہوئی۔

”بخ“ اس نے برا سامنہ بنا کر کہا۔ ”میں بھی سوچ رہی تھی تمہ خانے کی طرف جاتے ہوئے اتنی گندی اسمبل کیوں آئی ہے۔“

”تم تمہ خانے میں گئی تھیں۔؟“

”ہرگز نہیں۔“ آئے کت نے فوراً کہا۔ ”تم جانتے ہو میں کبھی وہاں اکیلی جانے کی غلطی نہیں کرتی، فلک بوس کے اس حصے میں عجیب سی وحشت ہوتی ہے مجھے۔“ اس نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا تھا۔

وسامہ اس کے انداز پر ہنسا۔ ”ڈر پوک۔“

”ڈر پوک ہوں تو ڈر پوک ہی سی۔“ وہ کندھے اچکا کر لاپرواہی سے بولی۔ ”لیکن اکیلی تمہ خانہ تو کیا فلک بوس کے کسی حصے میں گھومنے کی ہمت نہیں کر سکتی میں۔“

”ارے ایسی کیا بات ہے یہاں؟“

”تہی پرانی عمارت ہے یہ اور بہت عرصہ غیر آباد بھی رہی ہے۔ سنا ہے ایسی جگہوں پر بھوت پریت تو ہیں، سیرا کرتی ہیں۔ اگر کسی روز کوئی جن میرے سامنے ہی آکر کھڑا ہو گیا تو میں تو ایک منٹ میں بے ہوش ہو جاؤں گی۔“

آئے کت نے مزاحیہ سے انداز میں کہا تھا، لیکن وسامہ چونک سا گیا۔

اسے بے ساختہ بچپن میں سنی ہوئی اس ہندو عورت کی کہانیاں یاد آئی تھیں جسے ڈیڑھ سو سال پہلے فلک بوس کے تہ خانے میں قتل کر دیا گیا تھا۔ قتل کا سبب اس عورت کے کردار کا داروغہ ہونا تھا اور افواہ مشہور تھی کہ اس عورت کی روح قلعہ فلک بوس میں بھٹکتی پھرتی ہے۔ گو کہ اس بات کا کوئی واضح ثبوت نہیں تھا، نہ ہی کسی نے اب تک اس عورت کو فلک بوس میں پھرتے دیکھا تھا۔ کچھ من گھڑت سی افواہیں تھیں، جو مقامی آبادی کے لوگ ہمیشہ سے فلک بوس کے بارے میں سناتے رہے تھے۔

وسامہ کو ان افواہوں پر کبھی یقین نہیں آیا، دراصل اس نے اس بارے میں سوچنے کی زحمت ہی نہیں کی۔ زندگی میں ہم بہت ساری چیزوں اور باتوں پر اس وقت تک غور نہیں کرتے جب تک ان سے واسطہ نہیں پڑتا تو یہ بھی اس کے لیے ایک ایسی ہی بات تھی، لیکن وہ ان لوگوں میں سے تھا جو مرنے کے بعد مدحوں کے دنیا میں کسی نہ کسی وجہ سے رہ جانے کے فلسفے پر یقین رکھتا تھا۔

اس وقت اس نے سر جھٹک کر اس خیال کو دفع دفع کر دیا۔ کبیر بابا کی واپسی دو دن بعد ہوئی اور وسامہ کے باز پرس کرنے پر کبیر بابا نے کہا۔

”اس گندگی کی یہاں موجودگی حیران کن بات ہے کیونکہ کوئٹہ جانے سے پہلے میں نے اپنی نگرانی میں صفائی کروائی تھی۔“ بابا کبیر نے الجھ کر اس جگہ کو دیکھا جہاں مری ہوئی گھریوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔

”ممکن ہے آپ اس حصے کو صاف کروانا بھول گئے ہوں۔“ وسامہ نے خیال ظاہر کیا۔

”مجھ سے ایسی کوتاہی سرزد نہیں ہو سکتی۔“ بابا کبیر نے کہا۔ ”میں ہر ہفتے نیچے وادی سے لوگوں کو اجرت پر بلاوا کر

قلعے کی صفائی کروا تا ہوں۔ وہ سب میری پہچان کے لوگ ہیں، چونکہ انہیں دنوں کے حساب سے اجرت دی جاتی ہے تو ان کے کام کی نگرانی بھی میں کڑی کرتا ہوں۔ کوئی حصہ مجھ سے نظر انداز ہو جائے۔ ایسا ہو نہیں سکتا۔“ انہوں نے پورے وثوق سے کہا تھا۔

”قلعہ اتنا بڑا ہے بابا۔ انہی پوشیدہ راستے اور راہ داریاں ہیں یہاں۔ ہو سکتا ہے آپ کی نظر جوک گئی ہو۔“ پاشا نے کہا۔

”پاشا ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ وسامہ نے پرسوج انداز میں کہا تھا۔ ”فلک بوس اتنا بڑا ہے کہ میں نے بھی کئی کمرے نہیں دیکھے بلکہ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا تیسری منزل کی طرف جانے کے چار راستے ہیں۔“ اب وہ تینوں ہی اچھے ہوئے نظر آنے لگے۔ پھر پاشا نے کہا۔

”بابا! جب تک میں یہاں ہوں صفائی کی نگرانی میں کروں گا۔“ اسے اپنے والد کی پریشانی کی فکر تھی سو اس نے اپنی خدمات پیش کر دیں پھر وسامہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”آپ بے فکر ہو جائیں سر! دوبارہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔“

”شکایت کی بات نہیں ہے۔ بس میں اپنے ارد گرد گندگی برداشت نہیں کر سکتا۔“ وسامہ نے نرمی سے کہا، لیکن اس کے کنبے میں شرمندگی تھی۔ بابا کبیر معاویہ کے خاندان کے پرانے ملازمین میں سے تھے اور معاویہ بچپن سے ان سے بہت مانوس رہا تھا۔ آئے کت اور وسامہ کے فلک بوس شفٹ ہو جانے کے بعد معاویہ کی ایما پر بابا کبیر خدمت گزاروں کے لیے اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ یہاں آگئے تھے۔ پچھلے دو سال سے یہ چھوٹا سا خاندان ان کے ساتھ فلک بوس میں موجود تھا۔

وسامہ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس لیے میں اس روز غصے میں کچھ زیادہ بول گیا تھا جب کہ یہ مقام بچوں کی شرارت بھی ہو سکتی ہے۔ چونکہ ادا رہتا رہتا بہت شرارتیں ہی اس علاقے کے“ اب وہ تینوں باتیں کرتے ہوئے واپس مڑ گئے۔ ان کے پیچھے تہ خانے کی طرف جانے والے راستے کی راہداری کچھ دیر ان کے جوتوں اور باتوں کی آواز سے گونجتی رہی پھر وہاں سناٹا چھا گیا۔ اگلے دن سے فلک بوس کی صفائی ستھرائی کا کام مزید جانفشانی سے ہونے لگا اور وسامہ کے نزدیک بات ختم ہو گئی، لیکن یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ پریشان کن واقعات کا ایک سلسلہ تھا جو مری ہوئی گھریوں کے اس ڈھیر سے شروع ہو چکا تھا۔

لیکن مری ہوئی گھریوں کا ملنا ایسی کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ فلک بوس سے چند کوس دور شام کا جنگل تھا۔ جنگل گھنٹا تھا اور وہاں پہاڑی جنگلی جانور بھی پائے جاتے تھے، لیکن وہ کوئی ایسے خونخوار جانور نہیں تھے کہ ان کے خوف سے انسان ڈر کر گھر میں دیک کر بیٹھا رہے یا جنگل کی طرف جانا ہی چھوڑ دے۔ ڈیڑھ سو سال پہلے جب فلک بوس کے اصل مالک نواب صاحب یہاں رہائش پذیر رہے ہوں گے ممکن ہے اس دور میں خونخوار جنگلی جانوروں کی وہشت پھیلی رہی ہو غالباً ”اسی لیے فلک بوس کے چاروں طرف لوہے کا مضبوط اور تقریباً ”دس فٹ اونچا“ جنگل لگا کر جنگلی جانوروں سے بچاؤ کے لیے پیش بندی کر دی گئی تھی۔ اس کے باوجود بدلتے موسموں خصوصاً برسات کے دنوں میں جنگلی چوہے اور گھریاں اندر گھس آتے تھے اور وافر مقدار میں خوراک نہ ملنے کے باعث یا کبھی باہر نہ نکل پانے کی وجہ سے اندر ہی دم توڑ دیتے تھے۔ اس لیے مری ہوئی گھریوں کا ملنا کوئی ایسی انہونی بات نہیں تھی۔

انہونی ان گھریوں کے کٹے سر اور منہ تھے جو کم و بیش ایک ہی انداز میں کٹے ہوتے تھے۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ مرے ہوئے یہ چھوٹے جانور وسامہ کو ہی ملتے تھے۔ آئے کت اور فلک بوس کے چند ملازمین میں سے کبھی

کسی نے آکر مری ہوئی گلہری یا چوہے کے ملنے کی نشان دہی نہیں کی تھی۔ پہلے پہل وسامہ نظر انداز کرتا رہا، لیکن جب یہ واقعات بڑھے تو وسامہ چونک گیا۔ اب گلہریوں کے جسم گلے سڑنے نہیں ہوتے تھے بلکہ اکثر ان کے جسم پر خون بہہ بہہ کر خشک ہو چکا ہوتا تھا۔ وسامہ کا قیاس تھا ضرور فلک بوس میں کوئی جنگلی کتابا ملی گھس آئی ہے اور درختوں پر پھدکتی گلہریوں پر ہاتھ صاف کرتی ہے۔ ایک روز وہ اور آئے کتلان میں چل قدمی کر رہے تھے۔ موسم خوشگوار تھا اور گھاس خوب چمک رہی تھی۔ جب آئے کتلان جی مار کر پیچھے ہٹی۔ وسامہ بری طرح چونکا۔ درخت کی کھوہ میں سرکٹی گلہری پڑی تھی اور کٹی ہوئی گردن سے بہتا ہوا خون کچی مٹی میں جذب ہو چکا تھا۔

”ڈرو مت آئے کتلان! یہ ضرور کسی ملی گھس کا کام ہے۔“ وسامہ نے ادھر ادھر اپنے اندازے کی درستی کے لیے نظریں دوڑائیں۔ اس وقت تک آئے کتلان کا ڈر کم ہو چکا تھا۔ اس نے فاصلے سے، لیکن بغور گلہری کو دیکھا۔

”میرا نہیں خیال۔ ملی گھس کا کام ہوتا تو وہ یوں گلہری کو چھوڑ کر کبھی نہ بھاگتی۔ آخری ہڈی بھی بھینھوڑ کر رکھ دیتی۔ یہ تو ایسا لگ رہا ہے جیسے کسی درندے نے اپنی نفسیاتی تسکین کے لیے اس بے چاری گلہری کا سر کاٹا ہو۔“ وہ پر سوچ انداز میں بول رہی تھی۔

وسامہ کا دل ایک منٹ کے لیے بری طرح سکوڑ کر پھیلا۔ اس نے اس بات کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ اب غور کرنے لگا تو آئے کتلان کی بات درست لگی۔

”اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گلہریوں کا قتل آئوشستی کر رہی ہو۔“ پاشا آئیوری کی ہاتھ کے پیچھے سے نکلا۔ وہ دونوں ابھی تک اس کی دہاں موجودگی سے ناواقف تھے۔

”تم یہاں کب آئے پاشا! ہم نے تمہیں نہیں دیکھا۔“ آئے کتلان نے کہا۔

”میں پچھلی کناری کی گڑھی کر رہا تھا۔ نیچے بیٹھا ہوا تھا اس لیے آپ کو نظر نہیں آیا۔“ پاشا نے مسکرا کر کہا ساتھ ہی ہاتھ میں پکڑی کھرنی ان کے سامنے کی۔ اس کے ہاتھ اور کھرنی مٹی میں لت پت تھے۔

”اور یہ تم کیا کہہ رہے تھے۔ گلہریوں کے بارے میں؟“

پاشا کے چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ آگئی۔ ”مذرت چاہتا ہوں کہ میں نے آپ لوگوں کی بات سن لی۔“

”کوئی بات نہیں۔“ وسامہ نے کہا۔ ”لیکن تم کیا کہہ رہے تھے؟“ اسے تجسس ہو رہا تھا۔

”میں کہہ رہا تھا ہو سکتا ہے ان گلہریوں کو آئوشستی مار رہی ہو۔ سنا ہے اس کی روح فلک بوس میں کئی سالوں سے بھٹک رہی ہے۔“

”کیا کہہ رہے ہو تم؟“ آئے کتلان کو اس کی بات کا اعتبار نہیں آیا تھا اسی لیے اس نے پاشا کی بات کو مذاق میں لیا۔ دونوں میں سے کسی نے وسامہ کی طرف نہیں دیکھا تھا جس کا چہرہ پیکا پڑنے لگا تھا۔

”اس کی باتوں پر دھیان نہ دیں۔ الٹا سیدھا بولنے کی عادت ہے اسے۔“ بابا کبیر کہیں سے برآمد ہوئے اور کہا۔ لیکن ساتھ پاشا کو غضب ناک نظروں سے گھورا۔ پاشا سٹپٹا گیا۔

”کہانی دلچسپ لگ رہی ہے۔ مجھے سننے تو دو۔“ آئے کتلان نے بابا کبیر سے کہا۔

”تمہیں ہر انٹی بات میں دلچسپی ہوتی ہے۔“ اچانک وسامہ نے کہا۔ اس کے انداز میں سنجیدگی تھی۔ ”چلو اندر چلتے ہیں۔ کبیر! مجھے دوبارہ کوئی مرا ہوا جانور یہاں نظر نہیں آتا چاہیے۔“ وہ اندر کی طرف مڑ گیا کسی نے بھی محسوس نہیں کیا کہ وسامہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ ہو چکا ہے۔

جس وقت وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے برآمدے تک پہنچے گلان میں کھڑے پاشا کو بابا کبیر سے ڈانٹ پڑ رہی تھی۔

آئے کت نے دور سے ان دونوں کو دیکھا پھر سامہ سے کہا۔

”اس میں اتنا ناراض ہونے کی کیا بات ہے مجھے اس عورت کے بارے میں اور جانتا تھا۔“ اس نے زور سے
پن سے کہا تھا۔

”ہر چیز کے بارے میں جانتا ضروری نہیں ہوتا۔“ وسامہ نے ناراضی سے کہا۔ ”تم اپنے کام سے کام رکھنا
سیکو۔“

وہ اسے وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا، لیکن وہ نہیں جانتا تھا آئے کت کے دل میں تجسس بیدار ہو چکا ہے۔ وہ دن
بعد وہ نیچے واوی میں گھومنے پھرنے گئی اور واپس آئی تو سنی سنائی کہانیوں کا ایک ادب تھا اس کے پاس۔
”یہاں تو ایو شمتی بہت مشہور ہے۔ تم نے بتایا ہی نہیں مجھے۔“ وہ اپنی برساتی اتارتے ہوئے پر جوش لہجے
میں بولی۔

آج بارش کا دن تھا۔ وقفے وقفے سے کئی بار بارش برستی اور رکتی رہی۔ ابھی بھی کن من جاری تھی اور ٹھنڈی
ہوا میں کھڑکیوں سے ٹکرائی تھیں۔
”یہ کس نے کہا تمہیں؟“ وسامہ نے پوچھا۔

”نیچے واوی میں اکثر لوگ کہہ رہے تھے کہ انہوں نے اکثر رات کے اندھیرے میں ایو شمتی کی روح کو فلک
بوس میں گھومتے پھرتے دیکھا ہے۔ تمہیں دلچسپ بات بتاؤں۔ واوی میں تو ایسی ایسی باتیں مشہور ہیں کہ لوگ
ڈر کے مارے شام کے بعد فلک بوس کے سامنے والی سڑک سے بھی نہیں گزرتے۔ اور ایک لڑکا ہے سرخرو نام
ہے اس کا۔ ایک رات اسے فلک بوس کے سامنے سے گزرتا ہوا تو ایو شمتی کی روح نے اس پر حملہ کر دیا تھا۔
اس بے چارے کا ذہنی توازن بگڑ چکا ہے۔“ آئے کت اسے بتاتی چلی گئی۔

”سنی سنائی باتیں ہیں ساری۔ ورنہ ان میں کوئی حقیقت نہیں۔“ وسامہ نے اپنے دل کے ڈر پر قابو پاتے
ہوئے کہا۔ اس کے سامنے ایک عورت تھی اور عورتیں فطری طور پر زیادہ ڈر پوک ہوتی ہیں۔ وسامہ نہیں چاہتا
تھا کہ آئے کت ڈر جائے کیوں کہ اس صورت میں ان دونوں کو فلک بوس سے جانا پڑتا اور وسامہ اسے کہیں اور
لے کر نہیں جاسکتا تھا۔

”میں نہیں مانتی۔“ آئے کت نے کہا۔
”تمہارے ماننے نہ ماننے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم اتنے مہینوں سے یہاں رہ رہے ہیں۔ ہمیں تو کبھی
ایو شمتی نظر نہیں آئی۔“

”ہو سکتا ہے وہ ہمیں متوجہ کرنے کے لیے گھریوں اور چہلوں کے سرکٹ کر پھینکتی ہو۔“
”کیسی بےوقوفی کی باتیں کر رہی ہو؟“

”اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آج کل وہ سامنے نہ آتی ہو۔“ آئے کت پر سوچ انداز میں کہہ رہی تھی۔ ”ایک
عورت بتا رہی تھی ایو شمتی صرف غیر آبادوں میں نظر آتی ہے۔ یعنی جب کوئی یہاں رہائش پذیر نہ ہو تب ہی
آزادی سے گھومتی پھرتی ہے۔“

”کچھ عجیب سی روح نہیں ہے جسے اپنا دیدار کروانے کے لیے تمہاری کی ضرورت ہوتی ہے۔“
”وسامہ! مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ تم بڑرہے ہو؟“ آئے کت نے شرارت سے اسے دیکھا۔
”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ وسامہ نے نظریں جراتے ہوئے کہا۔
”آر لو شیور؟“ وہ شرارت سے باز نہیں آرہی تھی۔
”مجھے تنگ مت کرو آئے کت! مجھے آج یہ ڈرافٹ پورا کرنا ہے۔“ اس نے زور سے کہا۔

لیکن جواب میں آئے کت زور سے ہنس پڑی۔ اسے پہلی بار ہتلا چلا دسامہ ایسی باتوں سے خوف کھاتا ہے اور یہ بڑی دلچسپ بات تھی۔ اسے دسامہ کو چڑانے کا ایک بہانہ مل گیا تھا۔



دربار پر معمول کا رش تھا۔

فریحہ کی امی اور بہن نے پھولوں کی دکان سے پھول اور چادر خریدی۔ نیاز کا سامان خریدتا تب تک فریحہ اور خوش نصیب نے بیروں سے دوپٹوں کے پلو بھر لیے۔ فاتحہ اور چادر چڑھانے کے بعد وہ سب واپس مزار کے احاطے میں آگئیں جہاں کئی فقیر سا دھوڑوں کا ساحلیہ بنائے بیٹھے تھے۔ ایک باباجی کے آگے کئی کئی زائرین جمع تھے۔ اماں اور ثمرین بھی قطار میں لگ گئیں۔ پیچھے فریحہ اور خوش نصیب تھیں۔ پھر کھانے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی ہو رہی تھیں۔ سب ملے کر نامشکل تھا وہ بول زیادہ رفتار سے رہی ہیں یا کھا زیادہ تیز رہی ہیں۔

”خوش نصیب! تم تعویذ لکھوانے آئی ہو؟“ اماں نے مڑ کر پوچھا۔

”توبہ کریں خالہ جان! میری امی بہت برامانتی ہیں ان باتوں کا۔“

”ہاں تمہاری ماں اور مزاج کی ہے۔ ورنہ تمہاری مائی چچی تو بہت ماننتی ہیں ان باباجی کو۔“

”ہاں جی۔ پتا ہے مجھے۔“ اس کا دھیان بیروں کی طرف تھا۔

”اے میں تو کہتی ہوں تعویذ نہ سہی۔ دعا ہی کروالو۔ بڑی تاثیر والی دعا ہے باباجی کی۔“ فریحہ کی امی ایسی اعلا پلشی کر رہی تھیں مذکورہ باباجی کی کہ کوئی بھی ہو تا دعا کروانے پر مجبور ہو جاتا۔

خوش نصیب نے ہاں میں جواب دیا نہ ناں ہی کی۔ صرف باباجی کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ اسی اثنا میں ان کی باری آگئی۔ فریحہ کی امی اور ثمرین باباجی کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر مٹھیاں ان کے سامنے بیٹھ گئیں۔ فریحہ نے بھی گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر سلام کیا۔ پھر خوش نصیب کے ساتھ پیچھے ہو کر کھڑی ہو گئی۔

”تم سلام نہیں کرو گی؟“

”کیا تو ہے۔“

”جی۔ گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر وناں۔ ورنہ باباجی برامان جاتے ہیں۔“ فریحہ نے آواز دیا کر کہا۔

”مانتے ہیں تو مانیں۔“ خوش نصیب نے باباجی کو دیکھتے ہوئے ناک چڑھا کر اور آواز دیا کر کہا۔ ”میری روشن امی کو ہتلا چلا کہ میں نے کسی کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر سلام کیا ہے تو وہ میرے ہی گھٹنے کاٹ دیں گی۔“ پھر اور فریحہ کے کان میں کھس کر بولی۔

”مشکل سے لگتی نہیں ہیں۔ لیکن بڑی جلا و صفت ہیں۔ مجھے اور ماہ نور کو انہوں نے ایسے پالا ہے کہ کیا ہلا کو خان نے اپنے بچپالے ہوں گے۔“

”چھاسر تو ڈھک لو۔“ فریحہ نے پھر کہا اس کا خون نہ جانے کیوں خشک ہوا جا رہا تھا۔

”یہ پلو میں بیڑا لے ہوئے ہیں ناں۔ ان کے وزن سے دوپٹہ ننگ نہیں رہا۔“ اس نے عذر دیا۔

”ایسے نہ کرو خوش نصیب! باباجی برامان جاتے ہیں۔“ اس نے بے چارگی سے کہا۔

”ارے کمال ہے۔ بڑے نازک مزاج باباجی ہیں۔ ہر بات پر برامان جاتے ہیں۔“ اس نے کس کے دوپٹہ اوڑھ لیا۔

ثمرین رو رو کر باباجی کو اپنی غم کی داستان سنارہی تھی۔ ”میری ساس اور مندریں بڑی سخت مزاج کی ہیں۔ ابھی تو رخصتی بھی نہیں ہوئی اور انہوں نے میرے شوہر کو

میرے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا ہے۔ ہائے باباجی! (یہ لمبی دہائی تھی دردناک) ایسے ہی حالات رہے تو ”وہ“ مجھے اپنے ساتھ دہئی لے کر نہیں جائیں گے۔“ اسے بڑا رونا آ رہا تھا۔

فریحہ نے افسردگی سے خوش نصیب کو دیکھا۔

”ثمرین کا مسئلہ بہت بڑا ہے۔ آج کل سارا وقت روتی رہتی ہے۔ اگر باباجی کو کوئی بات بری لگ گئی تو ہرگز تعویذ لکھ کر نہیں دیں گے اور تعویذ نہ ملا تو ثمرین کے مسئلے کبھی حل نہیں ہوں گے۔“ وہ خود بھی اتنی افسردہ لگ رہی تھی کہ خوش نصیب نے مزید کس کر دھونڈنے لے لیا۔

”اللہ یہ بھروسہ رکھو فریحہ! میری روشن امی کہتی ہیں یہ سب کمزور ایمان کی باتیں ہوتی ہیں۔“

”چھاپلیز۔ تم اپنا درس یہاں مت شروع کرو۔“ فریحہ نے اسے — ٹوک دیا۔ خوش نصیب کے لیے خاموش رہنا دنیا کا سب سے مشکل کام تھا لیکن اس وقت خاموش رہنا مجبوری بھی تھی سولہ پر پتھر رکھ کر چپ ہو رہی۔ لیکن اب اس نے باباجی کو غور سے دیکھا۔ انہوں نے ہرے رنگ کا ایک لمبا اور بے انتہا میلا سا چغہ پہن رکھا تھا، سر پر جینے کا ہم رنگ اور اتنا ہی میلا ایک رومال باندھا ہوا تھا جس کے اطراف سے گندے مٹھے بالوں کی ٹپیں نکل رہی تھیں۔ موٹی موٹی ٹپیں اس قدر آپس میں چپکی ہوئی تھیں کہ لگتا تھا ہاتھوں سے ان بالوں کو پانی نصیب نہیں ہوا۔ صرف بال ہی نہیں چہرہ بھی گندہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں من من سرے کی لگیں مٹی چھینچ رکھی تھیں۔

خوش نصیب سمجھنے سے قاصر تھی اتنے مٹھے آدمی سے ثمرین اور اس کی اماں کو اتنی عقیدت کیوں محسوس ہو رہی ہے۔ جبکہ باباجی کے چہرے پر کوئی ایسا نور بھی نہیں ٹپک رہا تھا جو ان کی روحانیت کا ثبوت ہی دے دیتا۔ اسی وقت باباجی نے دائیں ہاتھ سے مٹھے ترین صندوق سے ایک پڑیا نکالی۔ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا اور پڑیا پر پھونک کر ثمرین کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ نمک ہر کسی چیز میں ملا کر اپنی ساس کو کھلا دیتا۔“ آواز گھسی ہوئی جسے اپنی طرف سے اور گھبرہانے کے چکروں میں اور عجیب سا کر دیا تھا۔

پھر وہ سری پڑیا اٹھائی یہ پچھلی والی سے وزن اور سائز میں بڑی تھی اسے کھولا اندر چینی تھی۔ باباجی نے اس پر بھی کچھ پڑھ کر پھونکا تو ڈی سی چینی اٹھا کر منہ میں ڈالی۔ اگلے ہی لمحے باباجی پڑیا پر جھکے اور منہ سے ساری چینی پڑیا میں ہائی ماندہ چینی پر اگل دی۔

”یہ شکر اپنی نندوں کو کھلاتا۔ ساری زندگی بری نظریں سے تمہیں نہیں دیکھیں گی۔“ خوش نصیب کا دل بری طرح متلایا۔ خود کو اب نکالی لینے سے روکنے کے لیے اس نے دونوں ہاتھ ہونٹوں پر سختی سے رکھ لیے۔ دوپٹے کے پلو میں جمع کیے ہوئے سارے ہیراں کے پیروں میں بکھر گئے۔ ارد گرد کھڑے سب ہی لوگ حتیٰ کہ باباجی بھی اس کی طرف دیکھنے لگے۔ خوش نصیب سٹپٹا کر باہر بھاگی۔ فریحہ حواس باختہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے تو خود بھی اس کے پیچھے دوڑ گئی۔ مجمع میں چہ گوئیاں شروع ہو گئیں۔

باباجی نے بغور صورتحال کا جائزہ لیا تھا۔ ایک گھمبیری ”ہوں“ کی آواز نکالی اور فریحہ کی اماں کی طرف جھک کر قدرے رازداری سے بولے۔

”لڑکی کے دل پر گہری چوٹ آئی ہے۔ اس سے پہلے کہ غم سے نڈھال ہو کر یہ خودکشی کر لے۔ کسی وقت اس کو لے کر آنا میرے پاس۔“

مزار کے باہر پھری کے درخت تلے خوش نصیب بے زاری بیٹھی تھی۔ اتنی بری طرح دل متلایا تھا کہ طبیعت کا ستیا ناس ہی ہو گیا۔

فریحہ بول کھلائی بول کھلائی سی دوڑی چلی آئی۔

”آف خوش نصیب! یہ تمہارے کیا کیا؟ اب اگر باباجی ناراض ہو گئے تو؟“ وہ سخت پریشان تھی۔

”ارے ہوتے ہیں تو ہو جائیں ناراض۔“ وہ پھاڑ کھانے کو دوڑی۔ ”گند کے مارے غلط باباجی۔“

”آواز آہستہ رکھو۔ کسی نے سن لیا تو اور مصیبت ہو جائے گی۔“ اس بے چاری کی مدح فنا ہو رہی تھی۔

”تمہیں بتایا تو ہے ثمرین کے مسائل بہت ہیں۔ اس کی ساس ننڈیں گھور گھور کر دیکھتی ہیں ثمرین کو۔“

”بس۔ خاموش۔“ اس نے ڈبٹ کر فریحہ کو بولنے سے روک دیا۔ ”تمہارے ان باباجی کے نمک چینیوں سے

کچھ نہیں ہونا۔ ثمرین سے کو مٹھی بھر سرخ مرچیں جا کر ان کی آنکھوں میں ڈال دے۔ آنکھیں پھیں گی تو اسے

گھو گھور کر دیکھیں گی۔ ہونہ۔ آئیں بڑی۔ باباجی سے تعویذ لینے والی۔ اس سے تو اچھا تھا ثمرین میرے پاس آگئی

ہوتی۔ ساس ننڈوں سے نمٹنے کے ایک سو ایک طریقے بتا دیتی تھی کہ یہ گندی چینی تو نہ دیکھنے کو ملتی۔ اونہ۔“

جھنجھلاہٹ اور ناراضی سے اس کا برا حال ہو گیا تھا۔



آئے کت اب اکثر آہوشمتی کا ذکر کر کے وسامہ کو چلانے لگی۔ وہ ہر دوسرے دن آہوشمتی کا کوئی قصہ وادی سے سن کر آتی اور مزے لے لے کر وسامہ کو سناتی۔ ایسا کرتے ہوئے اسے ہرگز احساس نہیں تھا مذاق میں کی جانے والی یہ باتیں آئے وا۔ لے دلوں میں اس کے اور وسامہ کے لیے کتنا بڑا خطرہ بننے والی ہیں۔ اگر اس کی چھٹی جس کوئی اشارہ دے دیتی تو یقیناً ”وہ یہ ذکر کرنا چھوڑ دیتی۔“

چند روز یہ مذاق چلتا رہا پھر اس کا لطف دم توڑ گیا۔ ان ہی دنوں معاویہ نے آئے کت کے لیے سوئیٹر بننے کی مشین بھجوا دی۔ آئے کت تنگ کا بہت بہترین کام جانتی تھی۔ یہ کام اس نے اپنی مرحوم ترکہاں سے سیکھا تھا۔ جب سے وسامہ کا ایک سیڈنٹ ہوا تھا اور وہ دونوں معاشی اعتبار سے زبوں حالی کا شکار ہوئے تھے آئے کت اپنے اس ہنر کے ذریعے پیسہ کمانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ سب قسمت سے ان دنوں کے پاس اتنے روپے بھی نہیں تھے کہ وہ کوئی چھوٹی موٹی استعمال شدہ تنگ مشین خرید لیں۔ ہریار کی طرح اس بار بھی معاویہ ان کے کام آیا تھا اور اس نے مشین آون اور ضرورت کا دیگر سامان بھجوا دیا تھا۔

آئے کت اور وسامہ دونوں ہی معاویہ کے بے حد مشکور ممنون ہوئے۔ جس نے پررے وقت میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ وسامہ کے لیے وہ سگے بھائی سے بڑھ کر دوا گار ثابت ہو رہا تھا۔ آئے کت مشین کے آتے ہی پہلے دن سے کام میں جت گئی۔ وہ کم وقت میں زیادہ ڈیزائن تیار کرنا چاہتی تھی تاکہ جلد از جلد کوئی ڈیلر تلاش کیا جاسکے اور اس کے بنائے ہوئے ڈیزائنیز کو فروخت کے لیے مارکیٹ میں بھیجا جاسکے۔ اپنی مہارت کی بنا پر وہ پر یقین تھی کہ یہ کام وہ جلد ہی کر لے گی۔ معاویہ سے اس بارے میں اس کی بہت تفصیل سے بات چیت ہوئی تھی اور معاویہ نے اسے یقین دلایا تھا کہ اس کا فیجربہت جلد آئے کت کے اس چھوٹے سے کاروبار کے لیے ڈیلرز ڈھونڈ دے گا۔ معاویہ کی یقین دہانی کے بعد سے وسامہ اور آئے کت بہت پر یقین ہو گئے تھے۔

آئے کت کے مصروف ہونے سے قبل ہی مری ہوئی گلہریوں کے ملنے میں کمی آگئی تھی لیکن وسامہ کے دل میں خدشہ سا بیٹھ گیا تھا وہ ہر دوسرے دن پورے فلک بوس کا ایک چکر ضرور لگاتا تھا۔ اس کی راہداریوں میں گھومتا پھرنا کمروں میں جھانکتا تھا۔ لیکن لاشعوری طور پر اس نے گھومنا پھرنا کم کر دیا۔ اس نے کبھی کسی سے کہا نہیں لیکن بچپن میں سنے اور پڑھے ہوئے جن بھوتوں کے قصے کہانیاں اس کے ذہن و دل پر ایسا گہرا تاثر چھوڑ چکی تھیں کہ ان کا اثر ستائیس سال کی عمر میں بھی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ مرے پر سوورے یہاں ایک اصلی روح کا

ذکر ہو رہا تھا جس کے بارے میں وادی کے چند لوگوں کا دعویٰ تھا وہ اسے دیکھ چکے ہیں۔ وہ اپنے ڈر کا ذکر بھی کسی سے نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس صورت میں اسے بزدل سمجھا جانے لگتا اور یہ بات اس کی مواعظی کو ہرگز گوارا نہ تھی۔ اس نے اپنے دل میں بیٹھے اس ڈر کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن ہر دوسرے تیسرے روز کچھ نہ کچھ ایسا ہونے لگا کہ ڈر کم ہونے کے بجائے بڑھتا چلا گیا۔



کیف نے دور سے دیکھا۔ خوش نصیب میری پیر کے مزار کے باہر درخت کے نیچے جھنجھلائی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کے لبوں سے سکون کی ایک سانس برآمد ہوئی۔ اسے دیکھ کر سر سے مانو ایک بوجھ سا ہٹ گیا تھا۔ اب وہ سکون سے اس کی طرف بڑھا۔

اسی اثنا میں فریحہ کی نظر اس پر پڑی اس نے کیف سے بھی زیادہ سکون کی سانس لی۔
 ”شکر ہے کیف! تم آگے سنبھالو اس مصیبت کو۔ ہر ایک کے بننے کام ہنگامہ ڈرتی ہے۔“ وہ بھی جھنجھلا گئی تھی کہہ کر اندر چلی گئی۔ خوش نصیب نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔
 ”تم کب آئے؟“ حیران ہوئی۔

کیف نے جواب دینے کے بجائے ناراضی سے اسے دیکھا۔
 ”کہاں تھیں تم؟“

”یہیں تھی۔ میں نے کہاں جانا ہے؟“ وہ منہ بنا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔
 ”تمہیں ذرا بھی اندازہ ہے کتنے گھنٹوں سے گھر سے نکلی ہوئی ہو تم۔ روشن چچی اور ماہ نور کتنا پریشان ہیں تمہارے لیے۔ ان دونوں کا کیا تصور ہے کہ کبھی ثانی کے لیے پریشان ہوں تو کبھی تمہارے لیے۔“ وہ بہت سنجیدہ اور ناراض لگ رہا تھا۔

خوش نصیب نے نظریں بھی نہیں ملائیں ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ اپنی حرکت پر شرمندہ تھی۔
 ”اب کیا ساری رات یہیں گزارنی ہے؟“ کیف نے اس بار غصے سے کہا تھا۔ ”اٹھو۔ گھر چلو۔“ ڈپٹ کر بولا۔
 ”مجھ سے چلا نہیں جائے گا۔“ خوش نصیب نے نروٹھے پن سے کہا۔
 ”گود میں اٹھا کر نہیں لے جاؤں گا میں۔“ کیف نے صفا چٹ جواب دے دیا۔ ”اپنا وزن دیکھو اور میری صحت دیکھو۔ محبت اپنی جگہ لیکن خود پر ظلم نہیں کر سکتا میں۔“ یہ آخری جملہ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا تھا۔
 خوش نصیب نے بد مزہ ہو کر اسے دیکھا۔

”اوہو۔ یہ مطلب نہیں تھا میرا۔“ وہ خود شرمندہ ہو گئی۔ ”پہلے بوتل پلاؤ۔ دل گھبرا رہا ہے میرا۔ ایک قدم بھی نہیں اٹھایا جائے گا۔“

کیف نے دیکھا اس کی رنگت واقعی زرد ہو رہی تھی۔ وہ جا کر قریبی بیکری سے کولڈ ڈرنک لے آیا۔ ڈسکن کھول کر اسے دیا۔ وہ غناغٹ آدمی بوتل چڑھا گئی۔

”ہائے۔ شکر یہ کیف! ایمان سے اس وقت اتنے اچھے لگ رہے ہو کہ کیا بتاؤں۔ کولڈ ڈرنک کی بہت ضرورت تھی مجھے۔“

وہ کسی بھی وقت کچھ بھی بول دیتی تھی اس کی ذہنی حالت پر شک کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن کیف حیران ہو رہا تھا۔
 ”ہوا کیا ہے تمہیں؟“

”بس کچھ نہ پوچھو میری طبیعت پہلے ہی بہت خراب ہو رہی ہے۔“ اس نے ناک چڑھائی، دل دو بارہ متلانے لگا تھا سو جلدی سے دو گھونٹ مزید بھر لیے۔

کیف اسے دیکھتا رہا پھر گہری سانس بھر کر اس کے ساتھ ہی درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ مزار پر لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا سو اس طرح کسی کا بیٹھ رہنا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔

”تم واپس کیوں آگئے؟“ اس نے دوبارہ سوال کیا اور گولڈ ڈرنک کی بوتل اس کی طرف بڑھادی۔

”کیونکہ میں جانتا تھا۔ تمہیں میری ضرورت ہے۔“ اس نے بوتل منہ سے لگالی۔

خوش نصیب خاموش ہی رہی۔

کیف نے دو تین بڑے بڑے گھونٹ بھر کر ڈھکن بند کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”اتنی چھوٹی سی بات کا اتنا غصہ؟“ سوال تھا یا غیر معمولی رویے کی نشاندہی۔ جو بھی تھا بس یہ تھا کہ اس کے لہجے میں اپنائیت تھی۔

خوش نصیب کی ناراضی بھی ماند پڑنے لگی۔

”یہ چھوٹی بات نہیں ہے۔“ اس نے زور دے کر لیکن دھیمے لہجے میں کہا۔ ”پورے پورشن کے نام پر وہ ایک بڑا کمروہی تھا ہمارے پاس۔ وہ بھی لفضیلہ چچی کے مہمان کے لیے خالی کروا لیا گیا۔ سب مل کر زیادتی پر زیادتی کر رہے ہیں ہمارے ساتھ۔“

کیف کچھ دیر خاموش ہی رہا خوش نصیب کی بات غلط نہیں تھی۔

”تم اوپر کے کمرے میں نہیں رہنا چاہتیں؟“ اس نے پوچھا۔

”میرے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟“ اس نے طنز سے ہنس کر کہا۔ ”ہو گا تو وہی جو باقی سب نے سہلہ کر چکے ہیں۔ مجھے یقین ہے اب تک تو روشن امی اور ماہ نور نے وہ کمرہ صاف کر کے ہمارا سامان وہاں پہنچا بھی دیا ہو گا۔“

کیف کو اس بار بھی خاموش رہنا پڑا کیونکہ خوش نصیب کا اندازہ غلط نہیں تھا۔

وہ کہناں گھنٹوں پر نکائے آگے گوجھک کر بیٹھا ہوا تھا اور گولڈ ڈرنک کی بوتل کو دونوں ہاتھوں میں گھما رہا تھا۔

”تم ایسا کرو میرے کمرے میں شفٹ ہو جاؤ۔“ کچھ دیر سوچنے کے بعد کیف نے کہا۔ ”چار لوگوں کے حساب سے تھوڑا چھوٹا کمرہ ہے لیکن کسی طرح ایڈجسٹ کر لیتا۔ کم سے کم اوپر والے کمرے سے تو کہیں بہتر ہو گا۔“

خوش نصیب نے جھٹکے سے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ”اور تم؟“

”میں تو پہلے ہی یہاں کم رہتا ہوں۔ فائنل پراجیکٹ کے سلسلے میں اگلے دو مہینے آنا اور بھی مشکل ہو گا۔ اور دو مہینے بعد تو لفضیلہ چچی کا مہمان چلانا ہی جائے گا۔“

خوش نصیب کو یہ آئیڈیا مناسب لگا وہ غور کرنے لگی۔

”لیکن۔“ کن آنکھوں سے کیف کو دیکھا۔ ”لیکن یہ تو نہیں ہو سکتا کہ تم دو مہینے گھر ہی نہ آؤ۔ اور جب آؤ گے تو کہیں نہ کہیں تو رہنا ہو گا۔“

”یار، خوش نصیب! پورا گھر میرا ہے۔ کسی بھی کمرے میں رہ لوں گا۔“ اس نے قدرے صبر سے کہا تھا۔

خوش نصیب کو بے ساختہ اس پر رشک آیا۔ کتنا برا اعتماد تھا وہ۔ کیسے حق سے کہہ رہا تھا کہ کسی بھی کمرے میں رہ لے گا۔ جب کہ وہ کبھی ایسا نہیں کہہ سکتی تھی۔ فضل منزل میں رہتے ہوئے کبھی اسے اور ماہ نور کو اتنا اختیار دیا ہی نہیں گیا تھا کہ وہ حق چلتا تھی۔

کیف اپنی دھن میں بولتا چلا جا رہا تھا۔

”اور یہ کوئی اتنی بڑی بات بھی نہیں ہے۔ کہیں اور جگہ نہ ملی تو لفضیلہ چچی کے کمرے میں میٹرز ڈال لوں گا۔“

”ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔“ خوش نصیب نے پر سوچ انداز میں کہا اب وہ پر سکون نظر آ رہی تھی۔

”اب مسئلہ حل ہو گیا تو گھر چلیں؟“ کیف نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

”لیکن۔۔۔ روشن امی نہیں مانیں گی کیف!۔۔۔“ اسے پھر پوسنی نے گھیر لیا۔

کیف نے بے ساختہ اپنی ہتھیلی پیشانی پر ماری۔ ”میں میں منالوں گا۔ فی الحال تم تو گھر چلو۔ کسی کو نہیں پتا تم

گھر سے غائب ہو۔ روشن چچی نے رازداری سے مجھے بھیجا ہے۔“

”اوہاں۔ چلو چلو۔“ اس نے کھڑے ہو کر جلدی جلدی پاؤں میں سلپرز ڈالے اور اس کے ساتھ چل دی۔

”ویسے ایک بات ہے کیف!۔۔۔“ چانک پھر سے کچھ یاد آیا تو گھم سی گئی۔

کیف جھنجھلا کر مڑا۔ ”اب کیا ہے؟“

”تم اتنے ”برے“ نہیں ہو جتنے شکل سے لگتے ہو۔“ ایسے کہا جیسے بڑی پتے کی بات بتائی ہو اور وہ بھی بتا کسی شرمندگی کے

کیف نے اسے گھو کر دکھا پھر زیر لب مسکرایا اور بولا۔ ”اور تم بھی اتنی ”چھی“ نہیں ہو جتنی شکل سے لگتی ہو۔“

خوش نصیب کو زور سے ہنسی آئی سو وہ دل کھول کر اور اپنی ہتھیلی پر ہاتھ مار کر ہنسی۔ کیف کی مسکراہٹ گہری ہنسی میں ڈھل گئی۔

یوں حساب برابر ہوا اور دونوں اچھے بچوں کی طرح گھر کی طرف چل دیے۔



بشام کا موسم زیادہ تر سرد رہتا تھا لیکن راتیں بہت بخ بستہ ہوتی تھیں۔ ہر دوسرے تیسرے روز بارش ہو جاتی۔ تیز ہواؤں کا طوفان پہاڑوں سے سر ٹکراتا پھرتا۔ صبح سویرے لٹکا پانی سے خالی باقی ماندہ بادل سورج کی تپش سے پگھل جاتے اور چمکتی دھوپ چنار کے درختوں کے پتوں کو اور بھی سرسبز شاداب کر دیتی۔

اس رات بھی طوفان آیا۔ آسمان پر بجلی کے کوڑے برس رہے تھے اور تیز ہوا میں دو دو یوار سے سر ٹکراتی پھرتی تھیں۔ وسامہ نے پردہ ہٹا کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ طوفان کے شور سے لبریز پر اسرار رات فلک بوس کے دالان میں اتر آئی تھی۔ اس نے پردہ برابر کھینچا اور بیوی دیکھنے کے ارادے سے دوسری سمت نہ بڑھا۔ لیکن ابھی اس نے دو ہی قدم بڑھائے تھے کہ کھڑکی پر دستک ہوئی۔ وسامہ چونک کر پلٹا اور کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا۔ اگلے ہی لمحے وہ بری طرح حیران ہوا۔ باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے ذرا آگے ہو کر بند شیشے سے ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کی۔ اسے اب بھی کوئی دکھائی نہیں دیا۔

اس نے پردہ برابر کیا اور واپس ہوا اس بار پھر اس کے پلٹتے ہی شیشے پر دستک ہونے لگی۔

وسامہ کے روکنے کھڑے ہو گئے۔ اس میں ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ اس بار وہ پردہ ہٹائے۔ لیکن دستک بڑھتی جا رہی تھی۔ وسامہ نے ہمت جمع کی اور کانپتے ہاتھوں کے ساتھ پردہ سر کا دیا۔ پردہ ہٹتے ہی دستک بند ہو گئی۔ صرف یہی نہیں باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ وسامہ کا دل بری طرح دہشت زدہ ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ باہر بارش شروع ہو چکی تھی اور تیز ہوا پڑ پڑوں سے سرخ رہی تھی۔ وسامہ کا ایک ہاتھ ابھی تک پردے کو پکڑے ہوئے تھا اور جوں ہی پیچھے ہٹنے لگا بند شیشے کے دوسری طرف ایک دم سے پاشا سامنے آ گیا۔ یہ سب اتنا غیر متوقع اور اچانک ہوا تھا کہ وسامہ بری طرح دہشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹا۔ اس کا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ لگتا تھا ابھی سینے سے باہر آ جائے گا۔

دل کی دھڑکن کو نارمل ہونے میں چند لمحے لگے پاشا ہا ہر زور زور سے کچھ بول رہا تھا شیشہ بند ہونے کی وجہ سے آواز نہیں آرہی تھی۔ وسامہ کو اس پر غصہ آیا اس نے جا کر دروازہ کھول دیا۔ پاشا کھڑکی کے پاس سے گھوم کر دروازے کی طرف آیا تو وسامہ نے ناراضی سے کہا۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے؟ تم کچھوں بار بار کھڑکی بجار ہے تھے؟“ اس نے غصے سے کہا۔
پاشا برآمدے سے آیا تھا لیکن تیز ہوانے بارش کی بو چھاڑے اس کو بھی بھگو دیا تھا۔ وہ اندر آ کر جلدی جلدی اپنے کپڑے چھاڑ رہا تھا۔ اس سوال پر ہونق سا بن کر وسامہ کو دیکھنے لگا۔
”میں نے کھڑکی نہیں بجائی۔“ اس نے کہا۔

”جھوٹ مت بولو۔ تم مجھے ڈرانا چاہتے تھے۔“ وسامہ نے جارحانہ انداز میں کہا۔
دوسری جانب پاشا بری طرح سٹپٹا گیا۔

”نہن۔ نہیں صاحب! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بابا نے مجھے آپ کے بیڈ روم کی کھڑکی کی جو کھٹ کی لکڑی درست کرنے بھیجا تھا۔ میں آیا تو آپ کھڑکی کے پاس کھڑے تھے۔ اس لیے میں سیدھا کھڑکی کی طرف آیا۔ میں قسم کھاتا ہوں میں نے دستک نہیں دی۔ میں تو ابھی آیا ہوں۔“ وہ وضاحتیں دینے لگا۔
”جاؤ جاؤ لکڑی ٹھیک کرو۔“ وسامہ کو پاشا کی باتوں پر اعتبار نہیں تھا سو اس نے ناراضی سے کہا۔
”اور سنو۔“ پاشا نے جوں ہی قدم بدھائے تو وسامہ نے کہا۔ پاشا رک کر اسے دیکھنے لگا۔
”لکڑی ٹھیک کر کے اسی راستے سے واپس جانا۔ میں یہیں بیٹھا ہوا ہوں۔“
”جی ہاں۔“ وہ جلدی سے آگے چلا گیا۔

وہ گیا تو آئے کت آگئی وسامہ نے ساری بات اسے بتائی اور کہا۔
”میں تو اسے اچھا لگا سمجھی تھی لیکن یہ تو بہت شرارتی نکلا۔ تم کل اس کی شکایت بابا کبیر کو لگانا۔“ آئے کت نے بھی ناراضی سے کہا۔

”ہاں۔ میں ایسا ہی کروں گا۔“ وسامہ نے کہا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ بے ارادہ نظر اٹھا کر دیکھا تو آئے کت صوفے کے پتے پر گھسیٹا ہوا ٹکڑے ہتھیلی پر جو سجائے شرارت سے مسکراتی ہوئی اسے دیکھ رہی تھی۔
”کیا ہوا؟“ ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟“
”دیکھ رہی ہوں اور سوچ رہی ہوں۔“ اس کی شرارتی مسکراہٹ گہری ہوئی۔
”کیا؟“ وہ جو لگا۔

”یہی کہ تم کتنے ڈر پوک ہو۔“ اس نے کہا۔ لمحہ بھر کا توقف کیا اور اگلے ہی لمحے زور سے ہنس پڑی۔
وسامہ جھینپ کر ہنس دیا۔ وہ ڈر پوک تھا اس میں تو کوئی شک نہیں تھا۔
لیکن اگلے روز بابا کبیر سے کچھ کہنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ جو بھی اس رات ہو پاشا باپ کو اس کے بارے میں آگاہ کر چکا تھا۔ وسامہ سے سامنا ہونے ہی وہ وضاحتیں دینے لگے۔ ان کا کہنا تھا وہ رات کو پاشا کے ساتھ آئے تھے لیکن چونکہ اندر ان کا کوئی کام نہیں تھا اس لیے وہ کچھ فاصلے پر ہی رک گئے تھے اور جس وقت وسامہ نے اندر سے پاشا کے لیے دروازہ کھولا بابا کبیر کچھ فاصلے پر کھڑے اسے دیکھ رہے تھے اگر پاشا نے مسلسل کھڑکی پر دستک دی ہوتی تو ضرور یہ بات ان کے نوٹس میں آجاتی۔

وسامہ کو ان کی باتوں کا یقین کرنا ہی پڑا۔ صرف اس لیے نہیں کہ وہ بے چارہ بہت گھٹکھا کر بول رہا تھا اس لیے بھی کیونکہ وہ معاویہ کے پرانے اور قریبی ملازمین میں سے تھے اور معاویہ ان کا بہت احترام کرتا تھا۔
”میں تمہاری بات کا یقین کر لیتا ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ اگر پاشا نے کھڑکی پر دستک نہیں دی تو وہ کون تھا جو

اشارے کرتا بولتا گیا۔

روشن امی نے پریشان ہو کر خوش نصیب کو دیکھا جس کے چہرے پر طبیعت خرابی کے کوئی آثار دکھائی نہ دیتے تھے۔

”ہیں۔ کیا کہہ رہے ہو؟ وہ ہاں ہاں۔ میری طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی روشن امی! ابھی تک سر چکر رہا ہے۔ اپنی زور کی چوٹ لگی مجھے ہائے۔“ ایک دم سے کیف کی بات سمجھ کر اس نے جو سر پکڑ کر کرنا شروع کیا تو روشن امی کو تو یقین آیا سو آیا۔ کیف کے لیے اپنی بے ساختہ ہنسی چھپانا مشکل ہو گیا۔ اس بے چارے نے سرخ بدل کر اپنی امنڈتی ہنسی چھپائی تھی۔

”چوٹ؟“ روشن امی نے تعجب سے کہا سمجھی اور فکر مندی سے دوہرایا اور سوالیہ نظروں سے کیف کو دیکھا۔ اس سے پہلے کہ کیف سے کوئی جواب بن پاتا خوش نصیب جلدی سے بولی۔

”مموٹر سائیکل نے لکڑی تھی۔ فٹ پاتھ پہ سر لگا میرا۔“ جموٹ میں سچائی کے رنگ بھرنے کے لیے اس نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

”کیا ہو گیا ہے خوش نصیب!“ روشن امی فکر مندی سے جلدی سے آگے بڑھیں اور سہارا دے کر اسے چارپائی پر بٹھایا۔ تشویش سے سر اور ہاتھ کا جائزہ لیا اور الجھ کر بولیں۔

”چوٹ کا کوئی نشان تو نظر نہیں آ رہا؟“

کیف بھی ہلچلتا لیکن اس بار بھی فرالٹے سے جواب خوش نصیب نے ہی دیا تھا۔



”آ۔ آ۔ اندرونی چوٹ ہے نا۔ باہر سے کیسے نظر آئے گی۔ بس مجھے بہت زور زور سے چکر آرہے ہیں۔“

”ہائے میری بچی۔!“

”فکر مند نہ ہوں روشن امی! میں ٹھیک ہوں اب۔“ اس نے آواز میں نفاہت بھر کر کہا۔ ”لیکن یہ سامنے والا دردانہ کیوں گھوم رہا ہے؟“

”دردانہ نہیں گھوم رہا تمہیں چکر آرہے ہیں اس لیے گھومتا ہوا لگ رہا ہو گا۔ تم لیٹ جاؤ۔“

انہوں نے زبردستی اسے لٹانے کی کوشش کی۔

”دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا تم نے۔ اب بھی کیا وقت ہو گیا ہے۔ کمزوری سے چکر آرہے ہوں گے۔“ وہ فکر مندی بول رہی تھیں۔

”کمزوری تو بہت ہو رہی ہے۔ ہائے ڈاکٹر نے کہا ہے جب تک میں پوری طرح ٹھیک نہیں ہو جاتی مجھے بخنی اور ویسی اینڈ کھلانا ہے۔ ہائے۔“ وہ ہائے کرتی پٹنگ پر ڈھے ہی گئی۔ کوئی دیکھتا تو پہچانتا مشکل ہو جاتا کہ اسے واقعی چوٹ لگی ہے یا ڈراما کر رہی ہے۔

”فکر نہ کرو میری بچی! میں ویسی مرغی کی بخنی بھی بنا کر دوں گی تمہیں۔“ وہ اپنی ناراضی بھول بھال کر فکر مند ہو گئی تھیں۔

کیف کے لیے اب مزید اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو گیا تھا۔ ”چچی! میں صبح آؤں گا۔“ کہہ کر جلدی سے باہر نکل گیا اور باہر جا کر خوب ہنسا۔ اس روز کیف نے اعتراف کیا وہ خواہ مخواہ خوش نصیب کو لطیفہ کہتا تھا وہ تو لطیفوں کی پوری کتاب تھی۔

تھوڑی دیر بعد روشن امی کی ہدایت پر ماہ نور اسے خود چھ بھر بھر کے بخنی پلا رہی تھی۔ خوش نصیب بیمارنی تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھی۔ چہرے پر اس نے خوب کمزوری والے تاثرات سجا رکھے تھے۔ روشن امی دور تانی کے پلنگ پر بیٹھی ان سے باتیں کر رہی تھیں۔

دوسرے تیسرے چھ پر خوش نصیب جھنملا کر لیکن آواز دیا کر بولی۔ ”کیا چھ بھر بھر کے صرف بخنی پلاتی جا رہی ہو۔ تھوڑی بوٹی بھی ڈال دے۔ ہا بھی ہے خالی پانی جیسی بخنی میرے حلق میں پھنس جاتی ہے۔“
 ”دنیا کی تمہو واحد انسان ہو جس کے حلق میں بخنی پھنس جاتی ہے۔“ ماہ نور نے سنجیدگی سے کہا۔
 ”ہاں تو میں منفقو جو ہوں۔“ بڑے انداز سے گردن ہلا کر بولی۔ ”واؤن ایڈ اوٹلی۔ دنیا میں ہے کوئی ایسا جو خوش نصیب کا مقابلہ کر سکے؟“

ماہ نور نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ ”مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ تمہیں کوئی چوٹ سوٹ نہیں لگی۔ ذرا سی خراش لگ جائے تو آسمان سر پر اٹھالیتی ہو۔ سچ سچ ایکسیڈنٹ ہو اور تو چار دن تمہارے آنسو نہیں رکنے تھے۔“

”کس قدر ذہین ہو تمہا نور! مسموعی رکھ آمیز انداز میں مسکرا کر اس نے ماہ نور کو دیکھا۔

ماہ نور نے چھ پہالے میں پٹھا اور اسے ایک چپت لگا کر بولی۔

”اور کس قدر کمپنی ہو تم۔ گھنٹہ بھر سے مجھے اپنی خدمتوں میں لگا رکھا ہے۔ کبھی یہ چیز لاق۔ کبھی وہ چیز کھلاق۔ تا نہیں سکتی تھی کوئی ایکسیڈنٹ نہیں ہوا۔“

”بیٹا! ابھی تو تمہیں میں اور تنگ کر دی گئی۔ کیسے مجھے دیکھ کر منہ بنایا تھا۔ آئی بڑی خوش نصیب کو نخرے دکھانے والی۔“ اس نے دانت پیس کر اپنے عرازم کا اظہار کیا۔

ماہ نور نے اس کی دھشائی پر اپنا ہی سر پیٹ لیا۔ ”بجائے اس کے کہ تھوڑا سا شرمندہ ہو لیا جائے۔ تم مجھے ہی قصور وار ٹھہرا رہی ہو؟“

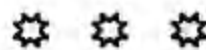
”ماہ نور! تم بہت بولتی ہو۔“ اس نے اپنا سر پکڑا۔ ”ہاں بھی ہے میں بیمار ہوں۔ پھر بھی پڑ پڑ بولے جا رہی ہوں۔“

”بہانے بنا بنا بند کرو اور اٹھ کر برتن دھوؤ۔ کرو صاف کرتے کرتے میں تھک گئی ہوں۔“ ماہ نور نے کہا۔

”میری بلا سے۔“ وہ ناک چڑھا کر بولی۔ ”ویسے بھی ڈاکٹر نے مجھے برتن اور کپڑے دھونے سے منع کیا ہے۔“
 ”کیوں؟“ اس بات پر ماہ نور کو شاک سا لگا تھا۔

”میرے سر پر چوٹ لگی ہے اور دماغ کا ڈائریکٹ تعلق ہاتھوں سے ہوتا ہے۔ اس لیے ڈاکٹر نے کہا ہے جب تک میں بالکل صحت یاب نہیں ہو جاتی نہ کپڑے دھوؤں نہ برتن۔“ اپنی طرف سے بڑی سائنس جھاڑی تھی اور کسی کا منفق ہونا ضروری بھی نہیں تھا۔

”اچھا اب باتیں کم کرو اور بخنی میں اور بوٹی ڈال کر لے کر آؤ۔ ہاں بھی ہے مجھے کتنی ویک نیس ہو رہی ہے۔“ اس نے دوبارہ آواز میں نقاہت پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ماہ نور ایسے سر ہلا کر گئی جیسے کہہ رہی ہو خوش نصیب تیرا کوئی علاج نہیں۔



دسامہ کی وہ رات بہت بے چینی میں گزری۔ وہ جلد از جلد سرخرو تانی اس لڑکے سے ملنا چاہتا تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ صبح شام کے بعد فلک بوس کے سامنے والی سڑک سے گزرنے کے جرم کی پاداش میں اس

پر حملہ کر چکی ہے۔ لیکن وہ لڑکا اپنے خاندان کے باقی افراد کے ساتھ بشام سے نقل مکانی کر چکا تھا۔ وسامہ سے ملاقات اس کی قسمت میں نہیں تھی۔

جس وقت کبیر نے وسامہ کو یہ ساری بات بتائی تو وسامہ لان میں کین کی کرسی پر فکر مند سا بیٹھا تھا۔

”اس کا کوئی نہ کوئی رشتہ دار تو ضرور ہو گا بشام میں۔“ وسامہ نے کہا۔

”میں نے پتا کیا ہے۔ لیکن سب لوگ جا چکے ہیں۔“

”سرخرو کے بارے میں پتا کرنا تھا۔ کیا واقعی اس پر۔ فلک بوس کے آسیب نے حملہ کیا تھا۔“ وسامہ معصومانہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

کبیر بابا ملازم تھے ایک بار اس سے جھاڑ کھا چکے تھے لیکن اس بار پھر ہمت کر کے بولے۔

”میں نے یہ بھی پتا کروایا ہے۔ داوی میں اس کے متعلق بھی کئی کہانیاں ہیں۔ کوئی کہتا ہے سرخرو اپنی محبوبہ سے ملنے رات گئے یہاں آیا کرتا تھا۔ جنگل کے کسی بھیڑیے نے اس پر حملہ کر دیا۔ سرخرو بچ تو نکلا لیکن اتنا خوف زدہ ہوا کہ ذہنی توازن کھو بیٹھا۔ پاگل پن کی حالت میں وہ بھی بھیڑیے کا نام لیتا تھا کبھی آہو شمتی کا۔ لیکن کوئی بھی بات واضح نہیں تھی۔“

”اگر ایسی ہی بات ہے تو سرخرو کے گھر والے بشام سے کیوں چلے گئے؟“

”کم پڑھے لکھے کمزور اعتقاد کے مالک ہیں صاحب! جو انہیں ٹھیک لگا وہ انہوں نے کیا۔ آدھی سے زیادہ آبادی ہندو مذہب سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کے یہاں تو ویسے بھی مانا جاتا ہے کہ جن روجوں کو مکتی (نجات) نہیں ملتی وہ ساری زندگی پھر دنیا میں بھٹکتی رہتی ہیں۔ جب کہ ہم مسلمان ہیں ہماری روجوں کو مکتی ملے یا نہ ملے قیامت تک قبر میں ہی رہنا پڑے گا۔“ آخر میں انہوں نے ذرا ہلکے پھلکے انداز میں کہا تھا۔ وسامہ بھی مسکرا دیا لیکن بات اس کے ذہن سے نکلی نہیں تھی۔

اسے ہر وقت ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے اسے کوئی دیکھ رہا ہے اور یہ احساس شام کے بعد سے بڑھنا شروع ہو جاتا تھا۔ وہ جس راہ داری سے گزرتا، جس جگہ جا کر بیٹھتا اسے ایسا لگتا تھا جیسے دو آنکھیں مستقل اس کے پسرے پر لگی ہوئی ہیں اور اس کی ایک ایک حرکت ایک ایک جنبش کو لوٹ کر رہی ہیں۔ ایک بار پھر وسامہ نے اسے اپنے دماغ کا خلل سمجھا اور خود ہی اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ سب اس کا وہم ہے لیکن یہ خیال اس کے ذہن میں زور پکڑ گیا جب آئے کت نے بھی اس کے وہم کی تائید کر دی۔ وہ اپنے تنگ کے کام میں بے حد مصروف رہتی تھی لیکن اس دوران اسے بھی یہی محسوس ہوتا تھا کہ کوئی مسلسل اسے دیکھ رہا ہے۔

”ایسا لگتا ہے جیسے کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ عجیب سی وحشت ہونے لگی ہے۔ ایسا پہلے نہیں ہوتا تھا وسامہ!“ وہ بڑی نڈھال اور اداس سی لگ رہی تھی۔ ”کاش! اللہ ہمیں اولاد سے نواز دے تو یہ وحشت خود بخود ختم ہو جائے گی۔“ وہ اپنے مسئلے اور اس کے حل سے بھی واقف تھی لیکن وسامہ کا مسئلہ اولاد نہیں تھا۔ اس کی الجھنیں کچھ اور تھیں جو دن بدن بڑھ رہی تھیں۔

فلک بوس قلعہ نما بہت وسیع و عریض عمارت تھی جہاں بیک وقت کئی خاندان ساکتے تھے معاویہ کے مشورے پر جب آئے کت اور وسامہ نے یہاں آکر رہنا شروع کیا تو انہوں نے پورے فلک بوس میں رہائش اختیار کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ پورے فلک بوس پر تسلط رکھتے اس لیے انہوں نے ایک الگ تھلگ حصے کو اپنی قیام گاہ بنا لیا تھا۔ صرف دو سری منزل کی اسٹڈی میں وسامہ چلا جاتا تھا اور اکثر صبح سے شام وہاں بیٹھ کر لکھتا رہتا تھا۔

لیکن کسی کا خود پر نظر رکھنے کا احساس جوں جوں زور پکڑتا گیا وسامہ نے اسٹڈی میں جانے کے اوقات بھی

گھٹا دیے۔ شام ہوتے ہوتے اسے وہاں عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگتی تھی اور یہ چیز اس کی کارکردگی پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ وہ پبلشر کو اپنی زیر طبع کتاب کے ہفتے میں دو ڈرافٹ بھجواتا تھا اب وہ ہفتوں میں ایک ڈرافٹ بھجوانے لگا۔ اور یہ بات خاصی پریشان کن صورت حال اختیار کرتی جا رہی تھی کیونکہ وسامہ کے معاشی معاملات کا دارو مدار انہی پیسوں پر تھا جو اسے مختلف جرائد اور پبلشرز کے لیے لکھنے پڑھنے تھے۔ انہی معاملات سے پریشان ہو کر اس نے اپنا دھیان بنایا اور زیادہ سے زیادہ وقت کتب بینی کو دینے لگا۔ مختلف کتابوں کے مطالعے سے اس کا ذہن کھلتا چلا گیا اور اسے زیادہ سے زیادہ لکھنے کے لیے تحریک ملنے لگی۔ وسامہ اس چیز سے خوش ہو گیا۔

لیکن یہ خوشی چند روزہ تھی۔ ایک سہ پہر اسٹڈی میں بیٹھے ہوئے اس نے کسی چیز کے سرکنے کی دھیمی سی آواز سنی۔ اسٹڈی کی خاموشی میں یہ آواز نمایاں ہو کر اعصاب پر لگ رہی تھی۔ کتاب پر دھتا ہوا وسامہ پہلے متوجہ ہوا پھر چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ غور کرنے سے اسے اندازہ ہوا یہ آواز لکڑی کی سطح پر کسی چیز کے گھسیٹے جانے سے پیدا ہو رہی ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس کی نظر سیدھی اپنی میز پر گئی اور وہ یہ دیکھ کر تنگ سی رہ گیا کہ میز پر بڑا ہوا تانے کا آرائشی پیالہ اونڈھا ہوا ہولے ہولے حرکت کر رہا تھا۔ یہ حرکت اتنی معمولی اور غیر واضح تھی کہ اگر ارد گرد اتنی خاموشی نہ ہوتی اور آواز بلند نہ ہو رہی ہوتی تو وسامہ کا دھیان بھی اس طرف نہ جاتا۔ اب ایک طرح سے اس حرکت کو لرزش کہنا زیادہ مناسب رہے گا۔ اس کے دل میں ڈر کا ہلکا سا شعلہ دکھنے لگا۔ وسامہ اس پیالے کو ابھی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہوا سوچتا رہا کہ آیا وہ واقعی بل رہا ہے یا اس کی نظریں دھوکا کھا رہی ہیں۔ کوئی بھی جواب واضح نہیں ہو پا رہا تھا۔ تب ہی اچانک وسامہ نے جیسے غیر ارادی طور پر ہاتھ بڑھایا اور اس پیالے کے اٹھے پینڈے پر زور سے رکھ دیا۔ پیالہ اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ چند سیکنڈوں اسی طرح پیالے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا رہا پھر اس نے آہستگی سے ہاتھ ہٹالیا۔ نظریں جو کئے انداز میں پیالے پر مرکوز کیے ہوئے تھیں۔ ایسے جیسے ہاتھ ہتے ہی اس کی حرکت کا مشاہدہ کرنا چاہتی ہوں لیکن ہاتھ ہٹنے کے بعد بھی پیالہ ساکت ہی رہا۔

وسامہ کا خوف قدرے کم ہو گیا اثریشانی بڑھ گئی۔ اسی وقت آئے کت اس کے لیے چائے لے کر آئی۔ اس وقت تک وسامہ پیالے سے اپنی نظریں نہیں ہٹایا تھا۔

”وسامہ! میں کہہ رہی تھی۔ آج ہمیں نیچے واوی کا چکر لگانا چاہیے۔“ وہ بولتی ہوئی اندر آئی تو وسامہ کو پیالے کی طرف دیکھتا پایا۔

”کیا بات ہے؟ آپ پریشان کیوں ہیں؟“ اس نے قریب آ کر چائے کا کپ سامنے میز پر رکھ دیا۔

”آں۔؟ ہاں یہ پیالہ۔“ وسامہ جیسے اس پیالے کی حرکت کے زیر اثر آچکا تھا اس کیفیت سے نکلنے میں اسے چند لمحے لگے تھے۔

”یہ پیالہ ابھی بل رہا تھا۔۔۔“

”ہائیں۔ بل رہا تھا۔“ آئے کت نے حیران ہو کر اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔ پیالہ ساکت تھا۔

”خود بخود بل رہا تھا؟“ آئے کت نے پیالے کو حرکت کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا مگر وسامہ کی آنکھوں اور لہجے میں خوف کی جو رمت تھی وہ اسے چونکنے پر مجبور کر گئی تھی۔

”ہاں۔“

”آپ کا وہم ہو گا وسامہ! بھلا پیالہ خود بخود کیسے بل سکتا ہے؟“

”اسی لیے تو میں زیادہ حیران ہو رہا ہوں۔“

کچھ دیر وہ دونوں خاموشی اور باریک بینی سے پیالے کی طرف دیکھتے رہے لیکن اس بار پیالے میں کوئی حرکت

نہیں ہوتی۔

”اچھا چھوڑیں ناں۔ آپ کا وہم تھا اور کچھ نہیں۔ آپ جلدی جلدی یہ چہنچہ پورا کر لیں پھر ہم وادی کی سیر کے لیے جائیں گے“ آئے کت نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر کہا۔

”ہاں ٹھیک ہے جیسے تم خوش رہو۔“ وسامہ نے دھیان پیالے سے ہٹا کر کہا۔ آئے کت اپنی چوڑھویں کے چاند کی کرنوں جیسی مسکراہٹ اچھال کر ہر نکل گئی۔ اس کے ہا ہر جاتے ہی وسامہ کا دھیان دوبارہ پیالے کی طرف چلا گیا۔ وہ اسی طرح ساکت و صامت رہا تھا لیکن وسامہ کو لگ رہا تھا ابھی اس میں حرکت شروع ہو جائے گی۔ چند لمحے اور گزرے اور پیالے میں کوئی حرکت نہیں ہوئی تو وسامہ نے ارنکا کا دوبارہ کتاب کے صفحوں کی طرف لگانے کی کوشش کی۔ اسی وقت۔ ٹھیک اسی وقت پیالہ پھر لرزا۔ اس بار اس کی حرکت میں شدت تھی۔ وسامہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کا دل پیالے کی حرکت کے ساتھ ساتھ لرز رہا تھا۔

اچانک وسامہ کو بتا نہیں کیا ہوا اس نے ہاتھ پھرایا اور پیالہ اٹھا لیا۔ نیچے سے ایک موٹا چھاپقید سے آزاں ہوا اور چھلانگ لگا کر وسامہ کے سینے پر سوار ہو گیا۔ وسامہ بوکھلا کر اپنی جگہ سے اٹھنے لگا لیکن اس کوشش میں اس کی کرسی پیچھے الٹ گئی۔ وہ سر کے بل کرسی سمیت پیچھے گرا۔ چھاپقیدی سے پھدکتا کہیں غائب ہو گیا۔ یہ سب چند لمحوں میں ہوا تھا۔ وہ بخود سا وسامہ زمین پر گرا ہوا تھا۔

کبیر بابا وہیں کہیں کسی کام میں مصروف تھے شور کی آواز سن کر دوڑے چلے آئے لیکن جوں ہی وہ کمرے میں پہنچے دنگ رہ گئے۔

زمین پر کرسی سمیت گرا ہوا وسامہ نور نور سے ہنس رہا تھا۔ ہنس ہنس کر اس کی آنکھوں میں پانی بھر چکا تھا اور ایسا لگتا تھا اس کی ہنسی قابو میں ہی نہ آ رہی ہو اور یوں اٹھنے دنوں سے فلک بوس پر چھائی ہوئی خوف کی لٹھا چھٹ گئی تھی۔



بہو کلن کلابارک اسی طرح ہر رونق اور آباد تھا جس طرح ہمیشہ ہوا کرتا تھا۔

جانگ ٹریک پر دوڑتی ہوئی منفرانظر آ رہی تھی آج اس نے سبز رنگ کا ٹریک سوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کی اونچی پونی ٹیل دور سے ہی آگے پیچھے ہلتی نظر آ رہی تھی۔ اس نے آج ٹریک کے دو چکر لگائے تھے۔ تیسرا چکر پورا کر کے وہ گھاس کے قطعے پر اتر آئی اور چلتی ہوئی آکر بیچ پر بیٹھ گئی۔ جانگ کرنے کی وجہ سے اس کی سانس پھول رہی تھی اور خوشگوار موسم کے باوجود اس کا جسم سینے میں بھیجا ہوا تھا۔

بیچ پر بیٹھ کر اس نے اپنے کانوں سے ہیڈ فون اتارے۔ موبائل فون پر لگا ہوا ٹریک بند کیا اور اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر بیچ کی پشت پر سر رکھ کر سستانے لگی۔ سفیدے کے درختوں کے سائے میں خاموشی سے اس طرح بیٹھنا اسے اچھا لگ رہا تھا۔

کچھ دیر اسی طرح گزری پھر اس نے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ جہاں وہ بیٹھی تھی وہاں سے پورے پارک دکھائی دیتا تھا۔ منفرانے تمام ٹریکس پر محتلاشی نظر دوڑائی۔ پارک کا داخلی دروازہ اور پچھلی طرف کا چھوٹا دروازہ بھی دیکھا لیکن معاویہ اسے کہیں دکھائی نہیں دیا اور آج دسواں دن تھا معاویہ اسے نظر نہیں آیا تھا اور یہ حیران کن بات تھی۔ مارکیٹ اور سب وے پر نظر آجانا ایک اتفاق ہو سکتا تھا لیکن پارک ایک ایسی جگہ تھی جہاں منفرانے کی طرح وہ بھی روزانہ آنے والوں میں شمار ہوتا تھا۔ اکثر ہی آمناسامنا ہو جاتا ایسے میں اس کا نظرنہ آنا یقیناً حیرانی کی بات تھی یا کم سے کم منفرانے کو ایسا ہی لگ رہا تھا۔

بہر حال معاویہ کا پارک نہ آنا منفر کو عجیب سی فکر مندی میں مبتلا کر رہا تھا۔ ان گزرے ہوئے دس دنوں میں بھی اس نے معاویہ کی گئی کو محسوس کیا تھا اور پارک اس کے بارے میں سوچا تھا۔ مگر اس بار وہی تمام باتیں سوچتے ہوئے وہ جھنجھلا گئی اور اس نے دل ہی دل میں خود کو ٹوکا۔

میں بی بی سے کہتی ہوں مبین سے معاویہ کے بارے میں پوچھے۔ لیکن نہیں۔ بی بی میرا مذاق اڑائے گی۔ اس نے خود ہی اپنا خیال رد کر دیا۔

لیکن وہ اتنے دن سے پارک نہیں آیا۔ مجھے اس کی فکر ہو رہی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ بیمار ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے وہ کسی مشکل کا شکار ہو۔ what the hell (کیا مصیبت ہے) اسے تو میرا نام بھی معلوم نہیں ہو گا اور میں اس کے بارے میں فکر مند ہو رہی ہوں۔ یہ بے وقوفی کی انتہا ہے۔

سوچتے ہوئے اس نے اپنے سر پر چپکے سے ایک چپت بھی لگا لی۔ پھر سر جھٹکتے ہوئے اٹھی اور جاگنگ کرتی پارک کے بیرونی راستے کی طرف چلی گئی۔ چند دن مزید سرک گئے معاویہ نے پارک کا رخ نہیں کیا۔

منفر نے حتی المقدور کوشش کی کہ وہ معاویہ کے بارے میں نہ سوچے اور اپنی کوشش میں کامیاب بھی رہی اور جب اسے یقین ہو گیا معاویہ اس کے ذہن سے نکل چکا ہے تو اسے وہ نظر آ گیا۔ وہ پارک کے جاگنگ ٹریک پر۔ منفر کے دل نے بے ساختہ ایک پیٹ مس کی۔ پتا نہیں کیوں لیکن معاویہ کو دیکھتے ہی وہ مسرور ہو گئی تھی۔ اسے یہ دیکھ کر بھی تسلی ہوئی تھی کہ وہ ٹھیک ہے اور اتنے دن کی غیر حاضری کسی حادثے کا نتیجہ نہیں ہے۔ وہ دنوں ایک ہی جاگنگ ٹریک پر جاگنگ کرتے ہوئے مختلف سمتوں سے ایک دوسرے کی طرف آرہے تھے۔ عنقریب ان دنوں کا آنا سامنا ہوتا تھا۔ اس خیال نے منفر کے جسم میں سستی سی دوڑا دی۔ خیر سگالی جذبات کے تحت وہ کچھ اور خوب صورتی سے مسکرانے لگی۔ اس کی پونی ٹیل زور زور سے مل رہی تھی اور پونی کا سر اس کی گردن سے ہار ہار گرا رہا تھا۔

اس نے دل ہی دل میں وہ جملہ بھی تیار کر لیا جو آمنے سامنے پہنچنے پر اسے معاویہ کے سامنے ادا کرنا تھا اور جس کے ذریعے اس کی خیریت معلوم کرنی تھی۔ لیکن جوں ہی وہ اس کے قریب پہنچی معاویہ لا تعلق سے ایک بھی نظر اس پر ڈالنے بغیر آگے بڑھ گیا۔

منفر کی مسکراہٹ پہلے حیرانی میں ڈھلی اور پھر جینپ کرنا نکل ہی غائب ہو گئی۔ کافی عرصے سے وہ دنوں اس پارک میں آرہے تھے اکثر ہی ایک ٹریک پر جاگنگ کرتے ہوئے آنا سامنا: و جاتا تھا ایسے میں جان پہچان نہ تھی۔ آنکھوں میں شناسائی تو نظر آئی جاتی ہے لیکن معاویہ نے تو اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

یہ سوچ سوچ کر منفر کو اتنی شرمندگی محسوس ہو رہی تھی جتنی شرمندگی اسے آج سے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔



صبح فضل منزل کے مرکزی کچن میں رونق لگی ہوئی تھی۔ سب کے پورشن میں الگ الگ کچن تھے لیکن وہ کچن صرف چائے پانی جیسے کاموں کے لیے استعمال ہوتے تھے باقی سارے ناشتے کھانے جیسے بڑے کام اسی کچن میں انجام دیے جاتے تھے۔

جس وقت خوش نصیب نیند کے بوجھل پن سے آنکھیں ملتی اندر داخل ہوئی گھر کی آدھی عوام ناشتے سے

فارغ ہو چکی تھی جبکہ اس وقت کوئی ”تازہ خبر“ زیر بحث تھی اور جب عورتیں بحث کرنا شروع کرتی ہیں تو کان پڑی آواز سنائی دینا مشکل ہوتا ہے۔
خوش نصیب نے کسی کو بھی ڈسٹرب کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ کیف اور عرفات ساموں میز پر بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے وہ سیدھی ان کے پاس ہی آگئی۔

”السلام علیکم ہاموں!“

”وعلیکم السلام۔ جیتی رہو۔“

”مجھے بھی سلام کرو۔ برا ہوں تم سے۔“ کیف کوئی موقع ہاتھ سے جانے دے سکتا تھا ابے چڑانے کا۔
”السلام علیکم۔“ ہاتھ ماتھے تک لے جا کر سلام جھاڑا۔

اس تابعداری پر جہاں عرفات حیران ہوئے وہیں کیف ہنس دیا۔

”خیریت تو ہے؟ تم اور کیف کی بات اتنے آرام سے مان لو۔ کہیں سورج مغرب سے تو نہیں نکل آیا آج۔“
انہوں نے باری باری دونوں کو دیکھا۔

”ہا ہا ہا۔ مغرب سے کیوں نکلے گا سورج مشرق سے ہی نکلا ہے اور یہ آپ نے کیسی بات کہہ دی؟ میں تو ہمیشہ کیف کی ہر بات مان لیتی ہوں۔ یہ ہے ہی اتنا اچھا ہمیشہ صحیح بات کرتا ہے۔“ وہ واری صدقے جانے والی نظروں سے کیف کو دیکھتے ہوئے بول رہی تھی۔ اب کیف سے اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو گیا۔ اس نے ایک زوردار تہقہ لگایا۔ عرفات بھی اس کے ساتھ ہنسنے لگے۔

”خوش نصیب اب اکثر میری تعریف کیا کرے گی۔“ کیف نے خوش نصیب کو شرارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔
”آپ کو نہیں پتا۔ ہماری دوستی ہو گئی ہے۔“

”واقعی؟“ وہ ہنسنے لگا۔ ”یہ حادثہ کب ہوا؟“

”ہائے ہائے۔ حادثہ تو نہ کہیں۔ آپ کو تو پتا ہے میں کتنی سیدھی سادی اور معصوم سی ہوں۔ جھگڑا تو ہمیشہ یہ کیف۔ تم میرا مطلب ہے کیف تو جھگڑا کرتا ہی نہیں ہے۔ میں ہی کرتی ہوں۔ اب سے وہ بھی نہیں کرے گی۔“ دانت نکال کر بولی۔

”بالکل بالکل۔ تم دونوں سے زیادہ صلح جو تو کوئی اور ہے ہی نہیں۔“ وہ اپنی چائے کا کپ لے کر کھڑے ہو گئے اور کیف سے بولے۔ ”جب فرصت ملے تو حقیقت حال سے آگاہ کر جانا۔ اتنا آسن مجھے ہضم نہیں ہو رہا۔“
وہ مسکرا کر بولے تھے۔ دھیما سا تبسم لبوں پر سجائے باہر نکل گئے۔ کیف البتہ ان کی بات سمجھ کر زور سے ہنس دیا اور اثبات میں سر بھی ہلا دیا۔ اور جب وہ چلے گئے تو خوش نصیب کو دیکھنے لگا۔ مسکراتے ہوئے چمکتی ہوئی معنی خیز آنکھوں کے ساتھ۔

”تمہارے جھوٹ بولنے پر سارا دن طبیعت خراب رہ سکتی ہے۔ اس لیے سوچ سمجھ کے بولا کرو۔“

”میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ بولوں گی بھی کیوں؟“

”اچھا۔“ اس نے ابو اچکا کر اسے دیکھا۔ کہنی میز پر اور بند مٹھی ٹھوڑی کے نیچے جمائی اور اسے گہری نظروں سے دیکھ کر بولا۔

”اچھا۔ تو کھاؤ اپنے سر کی قسم کہ دوبارہ مجھ سے جھگڑا نہیں کرو گی۔“

خوش نصیب کی جان مشکل میں آگئی۔ سٹپٹا سی گئی۔

”اس سے تو اچھا تھا یہ ساری زندگی ساتھ جینے مرنے کی قسم لے لیتا۔ اب جھگڑا نہ کرنے کی قسم کون کھائے؟“

وہ بڑبڑاتی پھر جلدی سے بولی۔ ”تمہارے سر کی قسم کھا لیتی ہوں۔“

”اتفاقاً تو نہیں ہے میرا سرکہ تمہاری جھوٹی قسموں کی نذر ہو۔“ کیف نے فوراً ”آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔“
 ”ا فوہ۔“ وہ جھنجھلا گئی۔ ”کہہ جو دیا ہے کہ نہیں کروں گی، جھگڑا تو بس نہیں۔ لیکن تم کیوں مجھے ایسے دیکھ
 رہے ہو؟ تو یہ ہے ایک تو کسی کو میری بات پر یقین نہیں آتا۔“
 ”یقین وہ کرے جو تمہیں جانتا نہ ہو۔“ وہ مسکراتا ہوا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ”لیکن خیر مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے،
 مجھ سے جتنے مرضی جھگڑے کرو گرتی رہو۔ میں تو مستقبل قریب کا نقشہ دیکھ رہا ہوں بلکہ سمجھو فلم چل رہی ہے
 میری آنکھوں کے سامنے۔“ خلا میں دیکھا وہ جیسے واقعی مستقبل کا کوئی منظر دیکھنے لگا تھا۔
 خوش نصیب پہلے حیران ہوئی پھر اس کے اندر کا تجسس جاگا۔

”کیسی فلم؟ کیا بات کر رہے ہو کیف؟“

”وہ دیکھو۔“ اسی طرح خلا میں دیکھتے ہوئے خواب ناک آواز میں اس نے دور کہیں خلا میں ہی اشارہ کیا تھا۔
 خوش نصیب اس طرف دیکھنے کی کوشش کرنے لگی جہاں اس نے اشارہ کیا تھا۔

”وہ دیکھو آج سے چند سال بعد لیکن اسی گھر کا منظر ہے۔ میں ایسا ہی گھرو جوان ہینڈ سم سا لیکن سر جھکائے
 کھڑا ہوں تھوڑی دور ایک پانچ چھ سال کی بچی بیٹھی ہوئی ٹی وی دیکھ رہی ہے۔ اب دوسری طرف آ جاؤ۔ نہیں
 رائیٹ سائیڈ پر نہیں لیفٹ سائیڈ پر۔ تم وہاں کھڑی ہو۔ ہاں وہیں دروازے کے پاس موٹی تازی جیسے گول مشل
 سی فٹ بال۔ باس کاٹ میں مناسور رہا ہے اور تم تم مجھ سے جھگڑا کر رہی ہو۔ پورا محلہ تمہاری آواز سن رہا ہے
 ۔ میں ہینڈ سم لیکن مسکین معصوم شوہر کی طرح سر جھکائے کھڑا ہوں۔ اور تم جھگڑا لگو۔ تک چڑھی بد زبان بیوی
 کی طرح۔ واؤ۔ ایک پرفیکٹ ٹیلی کاسین ہے۔“ وہ اس منظر میں اس قدر ڈوب چکا تھا کہ ایسا لگتا تھا وہیں پہنچ
 گیا ہے۔

خوش نصیب پہلے تو سمجھی نہیں اور جب سمجھ گئی تو اس کا چہرہ ایسے لال ہونے لگا جیسے کارٹون موویز میں تھرمائٹر
 کا درجہ حرارت بڑھنے سے پارہ لال ہونا شروع ہو جاتا ہے اور ایک وقت آتا ہے تھرمائٹر پھٹ جاتا ہے تو خوش
 نصیب بھی پھٹنے کے قریب تھی۔

کیف نے اس کی طرف دیکھا اور ڈر گیا۔

”کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا؟“

”تم۔ تم انتہائی فضول انسان ہو۔“ اس نے دانت اس حد تک کچکپائے کہ ایسا گادانت ٹوٹ ہی جائیں گے
 اور وہ اس قدر زور سے بولی تھی کہ سب ہی ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔
 ”کیا ہوا۔؟“ سب کی زبان پر ایک ہی سوال ابھر آیا۔ کیف ہنس ہنس کر دہرا ہو گیا۔

”خوش نصیب کو چند سال بعد کا منظر بتا رہا تھا۔ اس نے ابھی سے سین کری ایٹ کرنا شروع کر دیا۔“ اس کی
 ہنسی رکنے کا نام نہ لے رہی تھی اور خوش نصیب کا بس نہ چلتا تھا اس کی گردن ہی چبا ڈالے۔ وہ اٹھی اور پاؤں پختی
 پکن سے باہر نکل گئی۔

”کیسا سین؟“ جملہ خواتین حیران۔ ان دونوں کو کیا ہوا؟

منٹے منٹے کیف کی آنکھوں میں پانی جمع ہو گیا تھا اس نے ہاتھ کی پشت سے آنکھیں رگڑیں۔
 ”کچھ نہیں۔ آپ لوگ نہیں سمجھیں گے۔“ وہ ابھی بھی ہنس رہا تھا اور واقعی مستقبل کا وہ منظر دیکھ رہا تھا
 جہاں ان دونوں کے درمیان بڑے بڑے معرکے ہونے والے تھے۔



کچھ دیر گزرنے کے بعد منفر خود ہی اپنا مذاق اڑا رہی تھی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ✦ ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

”تم میری عقل چیک کرو۔ اتنا مسکرا مسکرا کر اس کے پاس جا رہی تھی جیسے پتا نہیں ہماری کتنی پرانی شناسائی ہو۔“ اس نے اپنی عقل کے اس عظیم مظاہرے پر ہنستے ہوئے اور ظاہر ہے دل ہی دل میں شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

نبی بی اس کی بات پر ہنسنے میں اس کا ساتھ دے رہی تھی۔
 ”اب میں نے اسے نوٹس کیا ہوا ہے تو ضروری تھوڑی سی ہے کہ اس نے بھی مجھے نوٹس کیا ہو۔ پارک میں لوگ واک کرنے آتے ہیں اس بات کا خیال رکھنے نہیں کہ وہاں کون آ رہا ہے کون نہیں۔“ نبی بی کو بتاتے ہوئے وہ خود اپنے آپ پر ہنس رہی تھی۔

نبی بی ابھی اپنے لیے نوڈل بنا کر لائی تھی اور اب کاؤچ پر نیم دراز مزے سے کھا رہی تھی۔ منفر کے خاموش ہونے پر اس نے بڑا سا نوالہ کھاتے ہوئے ابھرا چکا کر منفر کو دکھا۔ وہ دو مزے کاؤچ پر بیٹھی نیچے کو جھکی اپنے جوگرز کے کسے کھول رہی تھی اور مسلسل خود پر ہنس رہی تھی اور بول رہی تھی۔

”ان لوگوں کو بندہ اتنا لعلقل اور سرد مہر لگتا ہے کہ اس نے میری نوکیلا پارک میں آنے والے کسی دوسرے فرد کی موجودگی کو بھی محسوس نہیں کیا ہوگا۔ ایسا سوچنا بھی حماقت تھی۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں بولتے ہوئے ابھی اور الماری سے اپنے کپڑے نکالنے لگی۔

نبی بی اس کی پشت پر نظریں جمائے جیسے کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کی سوچ کا محور منفر اور معاویہ ہی تھے۔
 ”یہی صحیح کتنی ہے۔۔۔ esthetic sense (حس لطیف) سے عاری انسان ہے۔“
 ”لیکن وہ ہینڈ سم ہے۔ کسی بھی لڑکی کا دل اسے دیکھ کر دھڑکنے بھول سکتا ہے۔“ نبی بی نے مسکرا کر کہا۔
 ”یہ بات سچی کو بتاؤ۔۔۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جن کا دل اسے دیکھ کر دھڑکنے بھولا ہو۔“ اس نے الماری بند کر دی۔ نبی بی اسے پر سوچ نظروں سے دیکھتی رہ گئی۔



Downloaded From
 Paksociety.com

کیف چائے کا کپ ہاتھ میں لیے خوش نصیب کے پیچھے آیا۔

”نصیبین! اری او میری نصیبین!“

دورک بھی گئی اور پلٹ کر اسے گھورا بھی۔

”کتنی بار کہا ہے مجھے اس طرح مت بلایا کرو۔ خوش نصیب نام ہے میرا۔“

”اتنا لبا نام لیتے میرا منہ تھک جاتا ہے۔ اس لیے پیار سے نصیبین کہہ دیتا ہوں۔ کیوں تمہیں اچھا نہیں لگتا۔“ معصومیت سے آنکھیں پھپھٹا کر پوچھا۔

”جیسے تم تو جانتے ہی نہیں۔“ اس نے گھور کر دیکھا۔

”اچھا۔۔۔ جا کہاں رہی ہو۔ بات تو سنو۔“ اس نے ہنسی دہائی۔

”کیا تکلیف ہے؟“ کاٹ کھانے کو دوڑی۔

”تکلیف تو دل میں ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں اسے؟ ہاں دردِ محبت۔“ وہ چائے کرنے سے بچانے کی کوشش کرتا تیز قدموں سے چلتا اس کے پاس آ گیا۔

”کیف! میں تمہیں قتل کروں گی۔“ اس نے انگلی اٹھا کر روانت کچکا کر کہا۔ ”تم دیکھ لیتا میں کسی دن واقعی تمہیں قتل کروں گی۔“

”پہلے ابو سے بات کر لینے دو اس کے بعد بے شک قتل کر دینا۔“ اب وہ ذرا سنجیدہ ہوا۔ ”اچھا سنو۔ ابو اور امی

READING
 Section

کو میں راضی کر لوں گا کہ جتنے دن فضلہ چچی کا مہمان یہاں رہے گا تم لوگ ہمارے پورشن میں رہو گے۔ روشن چچی کو منانا تمہاری ذمہ داری۔“

”ان کی فکر تم نہ کرو۔ میں منالوں گی۔“ وہ بھی جھگڑا بھول گئی۔ ”اور روشن ای کیوں نہیں مانیں گی؟ تمہارے کمرے میں میلی جرابوں کی بدبو آتی ہے لیکن کیوتوں کی اسمبل والے کمرے میں رہنے سے تو یہ سو درجہ بہتر ہو گا۔“

”ایسی بات ہے تو ابو اور امی کو بھی تم ہی منالو۔“
 ”ہائے ہائے۔ تم تو برا ہی مان گئے۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔ تمہارے کمرے سے تو خوشبو آتی ہے۔ وہ بھی جو بیس گھنٹے“ دانت نکالے

کیف اسے گھور کر بولا۔ ”تمہا ہر ہی رہتا۔ میں ابو کے پاس جا رہا ہوں۔“
 صابر احمد برآمدے میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ کیف چائے لے کر ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ خوش نصیب کی طبیعت میں سکون نہیں تھا۔ ٹوہنتی اندر ملی وی بلاؤن میں آگئی۔ یہاں سے ایک کھڑکی برآمدے میں کھلتی تھی اس نے کھڑکی کا پٹ سر کا یا اور پردے کی اوٹ میں ہو کر باہر کی آوازوں پر کان لگا کر کھڑکی ہو گئی۔ کیف نے اسے اندر ہی رہنے کی تاکید کی تھی لیکن وہ خوش نصیب ہی کیا جو ایک بار میں کئی ہوئی بات مان لے۔ نرم گرم سی دھوپ برآمدے کی چھت کے ڈیزائن سے چھن چھن کر آرہی تھی اور فرش پر پھیل رہی تھی۔ منی پلانٹ کی بیلیں ستونوں سے لٹٹی ہوئی تھیں اور دھوپ سے خوب چمک کر تروتا نا محسوس ہوتی تھیں۔ صابر احمد نے اخبار کا صفحہ پلٹتے ہوئے ایک نظر کیف کو دیکھا۔

”تم کوئی بات کرنا چاہ رہے ہو؟“
 کیف نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا لفظ بھر کو سوچا پھر بولا۔ ”جی ابو!“
 ”ہاں بولو۔“ وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ ”خیریت تو ہے نا۔ پیسے چاہئیں؟“
 ”نہیں۔ پیسے بہت ہیں میرے پاس۔“

”ہاں بھئی۔ اب تو خود کمانے لگ گئے ہو۔ اب تمہیں باپ کی دی ہوئی پاگٹ منی کی کیا ضرورت ہے۔“ انہوں نے شرارت سے کہا کیف ہنس دیا۔

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ جتنے میں کمانا ہوں وہ آپ کی دی ہوئی پاگٹ منی کا چوتھائی حصہ بھی نہیں ہوتا۔ ہاں بس دل کو تسلی ضرور رہتی ہے کہ کچھ نہ کچھ کر رہا ہوں۔“

”اچھی بات ہے۔ بہت اچھی بات ہے۔“ انہوں نے اخبار کا صفحہ پلٹتے ہوئے اسے سراہا۔ ”میں اپنے دوستوں کے بیٹوں کو دکھاتا ہوں۔ کچھ تو تم سے بڑی عمر کے ہیں لیکن احساس ذمہ داری نام کو بھی نہیں ہے۔ لیکن تمہا شاء اللہ میرے بہت لائق اور سمجھ دار بیٹے ہو۔“

صابر احمد کے منہ سے نکلنے والے تعریفی جملوں کے ساتھ ساتھ کیف کی مسکراہٹ گہری ہو رہی تھی۔ ”کھڑکی کی اوٹ میں کھڑکی خوش نصیب دانت مینے لگی۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔ میری مدد کر رہا ہے مگر اب کوئی ایسا بھی لائق سمجھ دار نہیں ہو گیا۔ یہ کیف کا بچہ۔ کہ تاپا ابو تعریفیں کرتے نہیں تھک رہے۔ اونہ۔“ جوش جذبات سے وہ ذرا آگے ہوئی۔

”ابو۔ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہ رہا تھا۔ اگر آپ کو برانہ لگے تو۔“
 ”ہاں۔ ہاں بولو۔“

اسی وقت کیف جو صابر احمد کے سامنے تمہید باندھ رہا تھا اس کی نظر خوش نصیب پر پڑ گئی۔ وہ گڑبڑا کر اپنی جگہ

سے دفٹ اوپر اچھلا۔ اسے خوش نصیب سے ایسی دلیری کی توقع نہیں تھی۔

”وہ اب۔۔۔ میں۔۔۔ میں بے چارہ بھول ہی گیا کیا کہنے آیا تھا۔ صابر احمد اس معاملے میں سخت مزاج تھے اگر انہیں بھٹک بھی پڑ جاتی کہ خوش نصیب ان کی اور کیف کی باتیں سننے کی غرض سے کھڑی ہوئی ہے تو خوش نصیب کی بنا ٹکٹ باری آجاتی تھی۔ ایسی اس کی طبیعت صاف کرتے کہ لگتا جاتا۔

”کیا ہوا تم کھڑے کیوں ہو گئے؟“ ”جب سے پوچھا۔ بیٹھ کر آرام سے بات کرو۔“

”پھر کبھی اب لوگ۔۔۔“ وہ بری طرح سٹپٹایا ہوا تھا خوش نصیب اسے اشارے کر رہی تھی کہ وہ بیٹھ جائے اور بات جاری رکھے۔ کیف کو فکر تھی اگر خوش نصیب کی یہاں موجودگی سے کوئی واقف ہو گیا تو ایک منٹ میں بات بتائی جائے گی کہ وہ کیف کو سمجھا بھگا کر اپنے حق میں کرتی ہے۔ لفظ چچی تو ایسے موقعوں پر ”قابو میں کیا ہوا ہے۔“ ٹائپ جملے بولنے سے بھی نہیں چوتی تھیں۔ جب کہ کیف خوش نصیب کے لیے مزید کسی ذہنی آزار کا باعث بننا نہیں چاہتا تھا اسے زندگی میں آسانیاں دینا چاہتا تھا۔

خوش نصیب یہ بات نہیں سمجھتی تھی وہ من مانی کر کے بننے کام بگاڑ دینے کی ماہر تھی۔ کیف گھبراہٹ میں مسلسل کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا صابر احمد کھٹک گئے انہوں نے کیف کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا خوش نصیب ایک دم سے اوٹ میں ہو گئی۔

”بات کیا ہے کیف! صابر احمد اب اخبار سمیٹ کر پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”گگ۔۔۔ کوئی بات نہیں ہے ابو!“

”میں تمہارا باپ ہوں میرے باپ بن کر مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔ یہاں بیٹھ جاؤ اور مجھے تفصیل سے بتاؤ۔“ انہوں نے ایک منٹ میں اس کے سارے دلائل رد کر دیے تھے۔ کیف ناچار بیٹھ گیا۔ سول میں دعا کرتے ہوئے کہ خوش نصیب کوئی بے وقوفی نہ کرے۔

”میں آپ سے روشن چچی کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔“ اس نے جھجکتے ہوئے لیکن مضبوط لہجے میں کہا۔

”ہاں ہاں بولو۔ کیا ہوا ہے روشن کو؟“

”نہیں۔۔۔ روشن چچی کو کچھ نہیں ہوا۔“ اس نے کہا۔ ”ابو! آپ کو نہیں لگتا ان کا پورشن خالی کروا کے ہم سب ان کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔“

صابر احمد نے وہاں ٹانگے بائیں پر رکھ لی اور سنجیدگی سے بولے۔

”نہیں۔۔۔ مجھے ایسا نہیں لگتا۔“

کیف یابوس ہوا لیکن وہ ایسے ہی جواب کی توقع کر رہا تھا۔

”لفظیہ چچی کو اپنے مہمان کو اپنے پورشن میں ٹھہرانا چاہیے۔ اور پھر ایک مہمان کے لیے پورا پورشن خالی کروانے کی کیا ضرورت تھی۔“

”مہمانوں کے لیے ہمیں ایک گیسٹ روم بنوانا ہی تھا۔ اب باسٹ کے پورشن کو ری نو کروالیں گے۔ شفقت نے کہا ہے وہ اپنی ذمہ داری پر پورا پورشن ری نو کروائے گا۔“

”لیکن ابو! اوپر والے کمرے کی حالت تو ایسی نہیں ہے۔ کہ وہاں روشن چچی ماہ نور خوش نصیب اور ثانی رہ سکیں۔“ اس نے احترام کے ساتھ کہا۔ ”میں سوچ رہا تھا کیوں نہ وہ چاروں میرے کمرے میں شفٹ ہو جائیں۔“

”ہوں۔“ صابر احمد نے کچھ دیر سوچا۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن میرا خیال ہے تمہاری ماں راضی نہیں ہوگی۔“

”آپ مان گئے تو امی کو میں منالوں گا۔“
 ”کیوں اپنے لیے اتنے درد سر مول لیتے ہو کیف۔!“
 ”درد سر نہیں ہے ابو! احساس ذمہ داری ہے۔“

وہ اثبات میں سر ہلانے لگے جیسے دل ہی دل میں کچھ سوچ رہے ہوں پھر مسکرانے لگے اور بولے
 ”میں تمہارے احساس ذمہ داری کی قدر کرتا ہوں کیف! لیکن میرا خیال ہے ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ روشن اور
 اس کی بیٹیوں کے لیے اوپر کا وہ ایک کمرہ ہی کافی ہے۔“ انہوں نے بے حد آرام سے کہہ دیا۔
 کھڑکی کی اوٹ میں کھڑی خوش نصیب ایک دم سے مایوس ہوئی۔ یہی صورت حال کیف کی تھی۔ وہ بہت اعتماد
 کے ساتھ آیا تھا کہ اس کی بات مان لی جائے گی۔
 ”لیکن ابو۔۔۔؟ اس نے کہنے کی کوشش کی۔

”لیکن وہ کچھ نہیں۔۔۔ ان لوگوں کی ضروریات ہی کتنی ہیں کہ انہیں پورا پورا روشن دیا جائے۔۔۔ جہاں تک
 ہمارے پورشن میں رہنے کی بات ہے تو ہر ایک کی اپنی پرائیوٹسی ہوتی ہے میرا نہیں خیال روشن بھابھی بھی یہاں آ
 کر رہنا چاہیں گی۔“

”میں ان سے بات کر لوں گا۔“
 ”ذرا الفہمینہ سے کہنا مجھے ایک کپ چائے دے جائے۔“ انہوں نے دوبارہ اخبار کھول لیا یہ اس بات کا واضح
 اظہار تھا کہ اب دفع ہو جاؤ۔
 خوش نصیب کا دل ٹوٹ گیا اگلے ہی بل اس نے ناراضی اور غصے سے پرورد چھوڑ دیا اور وہاں سے ہٹ گئی۔
 کیف مایوس سا سر جھکا کر اندر سے نکلا۔



ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

ایک میں
اور ایک تم



تنزیلہ ریاض
قیمت - 350/- روپے

اُجالوں کی بستی



فاخرہ جنین
قیمت - 400/- روپے

کسی راستے کی
تلاش میں



میمونہ خورشید علی
قیمت - 350/- روپے

میرے خواب
لوٹاؤ



نگہت عبداللہ
قیمت - 400/- روپے

فون نمبر
32735621

منگوانے
کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی

READING
Section

65 مارچ 2016

اس روز منفر ابیدار ہوئی تو بروکلن ہائٹس پر ایک اور چمکتا ہوا دن طلوع ہو چکا تھا۔ اس نے ذرا سا بروہٹا کرنا ہی دیکھا تو طبیعت پر چھائی ہوئی سستی دور ہو گئی۔ وہ مارٹ ٹائم میں ایک گروسری اسٹور پر کام کرتی تھی پچھلی رات اس کی ٹائٹ ڈیوٹی تھی اس لیے صبح معمول کے برعکس وہ دیر سے بیدار ہوئی تھی۔ اب دیر سے اٹھی تھی جاگنگ پر تو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس روز اس کا ارادہ میوزیم جانے کا بھی تھا اور ایک چمکتے ہوئے دن کے لیے یہ ایک اچھا پروگرام ثابت ہو سکتا تھا۔

پچھلی رات اسے ڈاکٹر رحمن کا پیغام ملا تھا۔ وہ شہر کے بہترین سائیکاٹرسٹ اور ان کے ڈپارٹمنٹ کے ڈین تھے۔ انہوں نے کہا تھا چونکہ آج وہ اپنی سائیکاٹری سے وابستہ مصروفیات کی وجہ سے کلج نہیں آسکیں گے اس لیے اگر منفر کو وقت نہ ہو تو وہ ان کے پاس ان کے سائیکاٹریک کلینک آجائے تاکہ مزید وقت ضائع کیے بنا اس کے فائنل ایئر کے ریسرچ ورک کو ڈسکس کر لیا جائے۔ منفر کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس نے راستے گننا شروع کیے تو اندازہ ہوا ڈاکٹر رحمن کی سائیکاٹری میوزیم کے راستے میں ہی ہے۔ منفر نے سوچا وہ ایک ساتھ وہ کام نمٹائے گی۔

اس مقصد کے لیے اس نے فی بی کی سائیکل بھی ادھار لے لی۔ جس وقت وہ تیار ہو کر ہاسٹل سے نکلی۔ اپنا بیگ کمر لٹکائے اور فی بی ٹیل جھلاتی ایک چھوٹی سی بیجی لگ رہی تھی۔ ذرا سی دیر میں سائیکل ہوا سے باتیں کرنے لگی تب ہی اس کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے مشاقی سے سائیکل چلاتے ہوئے جیب سے موبائل نکالا۔ مام کی کال تھی۔ منفر نے پہلے ہیڈ فون کانوں میں ٹھونسا پھر کال اینڈ کر کے موبائل دوبارہ جیب میں ڈال لیا۔ اور سارا راستہ مام سے باتیں کرتے ہوئے عبور کیا۔ ان کا اصرار تھا منفر کچھ دن کے لیے مونٹوک آئے اور ان کے پاس قیام کرے وہ اس ہو رہی تھیں اور ارادہ رکھتی تھیں کہ منفر کی آمد پر اس کی پسند کی ہر چیز بنائیں گی۔

منفر نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ اگلے ویک اینڈ پر ضرور مونٹوک آئے گی۔ مام سے بات کرنے کے دوران اسے وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوا جب اس نے فون بند کیا تو وہ اپنے طے شدہ وقت سے بیس منٹ لیٹ ہو چکی تھی اور یہ اس کی سنگین کوتاہی تھی جسے پروفیسر رحمن جیسا وقت کا پابند انسان یقیناً "معاف کرنے پر راضی نہ ہوتا۔ منفر آگیا ہوا سے باتیں کرتے ہوئے سائیکل چلانے لگی۔

ڈاکٹر رحمن کا کلینک "ایڈمز ٹاور کی دوسری منزل پر تھا۔ منفر نے سائیکل پارکنگ میں لگائی اور بذریعہ لفٹ دوسری منزل پر پہنچی۔ سائیکاٹری میں اس روز زیادہ رش نہیں تھا۔ "آپ لیٹ پہنچی ہیں میم!" ریپشنسٹ نے اسے دیکھ کر کہا۔ "جانتی ہوں۔" منفر نے ناک چڑھا کر کہا۔ "کیا اگلا ہیشنڈ اندر جا چکا ہے؟" اس نے بڑی امید سے پوچھا کہ شاید جواب نہ ملے۔ "نہیں۔"

"لیس۔ یہ ہوئی نابات۔" وہ خوش ہو گئی۔ "کیا میں اندر جا سکتی ہوں؟" "مسٹر رحمن ابھی مصروف ہیں۔ آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا ہو گا۔" ریپشنسٹ نے مسکرا کر اس سے کہا۔ منفر پہلے بھی دو چار بار یہاں آچکی تھی اس لیے ریپشنسٹ جانتی تھی کہ ڈاکٹر رحمن کے پسندیدہ طالب علموں میں سے ہے۔ منفر ابوس سی ہو گئی۔

”کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اگلے پشٹ سے پہلے مجھے پروفیسر سے بات کرنے کا موقع مل جائے؟“ منفر نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی وقت دیکھتے ہوئے لجاجت سے پوچھا تھا۔

”یہ ممکن نہیں ہے میم! آپ جانتی ہیں مسٹر رحمن اپنے پشٹس کے معاملے میں کتنے پٹی ہیں۔“
اب انتظار کے سوا اور کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ناچار وہ وینٹنگ روم میں آکر بیٹھ گئی۔ تقریباً ”آدھا گھنٹہ اسے انتظار کرنا پڑا یہ وقت اس نے جمائی لیتے ہوئے گزارا پھر پشٹ نے اسے اندر جانے کا عندیہ دیا تو وہ اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑی ہوئی اور ایسے اندر داخل ہوئی جیسے گیٹ بند ہو جانے کا خطرہ ہو۔

”گڈ مارننگ پروفیسر! امید کرتی ہوں میرے دیر سے پہنچنے کا آپ نے برا نہیں منایا ہو گا۔“ وہ اندر داخل ہوئی اور جلدی سے بولتی چلی گئی۔
”ہرگز نہیں۔ کیونکہ مجھے اب عادت ہو چکی ہے۔“ پروفیسر رحمن نے خیر سگالی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
منفر اٹھ کھلا کر بئی۔ ”آفٹر آل میں آپ کی سب سے لائق اور ذہین اسٹوڈنٹ ہوں۔“
”آف کورس۔“ پروفیسر صاحب متانت سے مسکرائے پھر بولے۔ ”اؤ میں آپ لوگوں کا انٹروڈکشن کروا دوں۔“

اس بات پر پہلی بار منفر کو اندازہ ہوا کمرے میں پروفیسر اور اس کے علاوہ کوئی اور بھی موجود ہے۔ اس نے اس تیسرے شخص کی طرف دیکھا اور اس کا دل ایک لمحے کے لیے تھم کر بحال ہوا۔
”ان سے ملو مس منفر! یہ معاویہ شیرازی ہیں۔ اینڈ سٹریٹل مشینری کے کاروبار سے وابستہ ہیں۔ اتنی سی عمر میں بزنس میں بہت نام کما لیا ہے۔ اور تمہیں بتا ہے پچھلے سال ان کی کمپنی کو بہترین کارکردگی پر stevie ایوارڈ ملا تھا۔“

پروفیسر رحمن بڑے متاثر کن انداز میں اسے بتا رہے تھے۔
معاویہ ان کی بات سن کر مسکرا رہا تھا۔ اس کی سرو مہر آنکھیں جیسے کہیں عائب ہو چکی تھی اور وہ بڑی خوش دلی سے مسکرا رہا تھا۔ اس کے نقوش پارک والے معاویہ سے ملتے تھے آنکھوں کے تاثرات نہیں۔ منفر نے دل میں سوچا۔

”وہم آن ڈاکٹر! آپ میری بہت تعریف کر رہے ہیں۔“ وہ مسکرا رہا تھا لیکن انداز میں جینیب بھی تھی۔
”وہ اس لیے کیوں کہ میں تم سے بہت متاثر ہوں۔ اتنی سی عمر میں اتنی کامیابیاں حاصل کر لی ہیں کہ میری عمر کے لوگ تم سے متاثر ہوئے ہنا نہیں رہ سکتے ہیں۔“ اس بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر منفر کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

”ہیلو۔ آئی ایم معاویہ!“ اس نے مصالحوں کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ منفر نے اپنا ہاتھ اس کی چوڑی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ معاویہ نے خیر سگالی کے تحت اس کے ہاتھ کو ہولے سے دیا اور منفر کو ایسا لگا اس کی ساری جان سمٹ کر ہتھیلی میں قید ہو گئی ہو۔ صرف یہی نہیں معاویہ کی مسکراہٹ منفر کے دل پر اس بن کر رہنے لگی تھی۔
ٹھنڈی ہٹھی اور پرسکون کر دینے والی۔
”ہیلو۔ میں منفر ہوں۔ منفر اسکندر۔“ اس نے خود کو کہتے سنا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

For Next Episode Stay Tuned To
Paksociety.com

پاک خواتین ڈائجسٹ 67 مارچ 2016

READING
Section

ہو گئی تھیں اور ان میں ہی ان کی ننھی سہیلی بھی شامل تھی۔ انہیں ہمیشہ اس کا قلق رہا۔ جانے کس کے ہتھے چڑھ گئی تھی وہ۔

میں جانتی تھی ان کا دل غموں سے کبا ہے۔ میں ڈاکٹر بن رہی تھی۔ جسم پر لگے زخموں اور ناموروں کا علاج کرنا سیکھ رہی تھی۔ مگر ان کا علاج نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ میڈیکل سائنس ابھی روح چہ لگے زخموں کا کوئی علاج دریافت نہیں کر سکی تھی۔



فیس بک پر میں اور ہشہا گھنٹوں باتیں کرتے۔ جتنا میں ہندوستان کو دیکھنے کے لیے تڑپتی تھی اس سے کہیں زیادہ وہ پاکستان کو دیکھنے کی تمنائی تھی۔ ہشہا کی

میری ہشہا سے شناسائی فیس بک پر ہوئی تھی اور اس کو دوستی میں ڈھالنے میں سب سے زیادہ میرا ہی ہاتھ تھا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ ہشہا ہندوستان میں رہتی تھی اور ہندوستان میرے خوابوں کی سرزمین تھی کیوں کہ وہ میرے والد کی جائے پیدائش تھی۔ قیام پاکستان کے وقت جب میرے دادا لٹے پٹے ہندوستان سے پاکستان آئے تھے تو وہ وہاں صرف اپنی جائیداد، حویلی اور کاروبار ہی نہیں چھوڑ کر آئے تھے بلکہ وہاں کی کسی جھیل کی تہہ میں اپنی بیوی اور دو بیٹیوں کو بھی چھوڑ آئے تھے۔

میری پیدائش سے بہت پہلے دادا اس دنیا سے جا چکے تھے۔ ہوش کی منزل تک پہنچتے پہنچتے میں اپنے والد کے چھپ چھپ کے رونے کا سبب جان چکی

تسیم شریف

سن کا گھاؤ

کوئی بھی بات ماما جی کے ذکر کے بغیر پوری نہ ہوتی۔ وہ باتوں باتوں میں اکثر اپنی ماما جی کے خیالات میرے گوش گزار کرتی رہتی جس میں اس کی من پسند بات یہ تھی کہ مسلمان اور ہندو جنم جنم سے اکٹھے رہتے تھے۔ ان کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا تھا۔ ہندو ہی تھواریوں پر مٹھائیوں کا تہاولہ ہوتا، ایک دوسرے کو کھانے پر بلایا جاتا۔ امن، محبت، شائقی سب ہی کچھ تو تھا یہ دنیاؤں کا کینسہ پن تھا کہ جس نے محبت کی سرزمین کو سرحدوں میں بانٹ دیا تھا۔ اور ان سرحدوں نے سوائے نفرتوں کو جنم دینے کے کچھ نہیں کیا تھا۔ وہشت گردی کی جس آگ میں ہم جل رہے تھے اس کے شعلے انہیں بھی جھلسا رہے تھے۔

انگریز سرکار برصغیر سے تو چلی گئی تھی مگر اس کی

تھی۔ میں جانتی تھی کہ انہیں اپنی ماں ہمیں یاد آتی ہیں۔ اپنا وہ بڑا سا گھریا یاد آتا ہے جس میں اہلی اور یتیم کے درخت تھے۔ انہیں وہ گلیاں یاد آتی ہیں جہاں وہ کسی داس کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ انہیں ماسٹر شکر کا وہ ڈنڈا بھی یاد آتا ہے جو ان کے ننھے ننھے ہاتھوں کو سرخ کر دیا کرتا تھا۔ وہ مجھ سے ہندوستان کی باتیں کرتے کرتے اکثر اپنے مضبوط توانا ہاتھوں کو دیکھ کر ہنس پڑتے۔ ان کے ہاتھوں سے ماسٹر شکر کی دی ہوئی سرخی کب کی رخصت ہو چکی تھی مگر من کا گھاؤ اسی طرح بلیا تھا۔ وہ اکثر سیاستدانوں کو برا بھلا کہتے جن کی وجہ سے ان کا گھر بار چھوٹا تھا۔ ان کی تعلیم ادھوری رہ گئی تھی۔ بلوائیوں کے حملے کی وجہ سے ان کے گاؤں کی بے شمار خواتین نے خود کشی کر لی تھی۔ بیشتر لاپتا



Saba...

READING
Section



دوران ملاقات ہنس مکھ سی نندتا شلہا، راجیش اور راکھی نے از خود ہمارے گائیڈ کی ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ وہ ہمارے ساتھ کئی تفریحی جگہوں پر بھی گئے۔ مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے جو کوئی تاریخی عمارت سامنے آجاتی تو وہ نہ صرف اس کے محل وقوع سے آگاہ کرتے بلکہ اس کا پس منظر اور تاریخی حیثیت بھی بتاتے۔

وہاں تو مسلمانوں کی مختلف یادگاریں جگہ جگہ بکھری تھیں۔ نندتا اور شلہا کو فر فر انگریزی بولتے دیکھ کر مجھے احساس کمتری نے گھیر لیا تھا۔ میں ڈاکٹر بن رہی تھی تب بھی ایسی انگریزی بولنے سے قاصر تھی۔

راستے میں نظر آتے کھیت کھلیاں، گلیاں چوہارے، گھر اور ان کے مکین واقعی ہمارے جیسے ہی تھے محسوس ہوتا تھا کہ پاکستان کے ہی کسی علاقے میں ہیں۔ ویسے ہی ناک نقشے کے لوگ، ویسا ہی پہناوا، رہن سہن، غروت، کسمپرسی، سب تقریباً ایک جیسا ہی تھا۔

ہشہا کی ماما جی ٹھیک کہتی تھیں۔ ”ہم تو ایک جیسے ہی تھے“

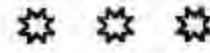


ہشہا کی ماما جی ایک خوب صورت خاتون تھیں۔ ذہانت ان کے بشرے سے ظاہر تھی۔ انہوں نے مسکرا کر میرا سواگت کیا۔ مجھے گھر کی ویلینز پر روک کر پہلے میری آرتی اتاری۔ میں شرمیلی شرمیلی کھڑی رہی۔ ہشہا کی پر شوق نگاہیں مجھ پر جمی تھیں۔ میں محسوس کر سکتی تھی کہ میں اسے چہلی نظر میں بھاگتی ہوں۔ مجھے بھی وہ بہت اچھی لگی تھی اور اس سے بڑھ کر میرا استقبال کرنے کا انداز۔

میں نے اپنی پروفیسرز سے خصوصی اجازت لی تھی پورے تین دن ہشہا کے ساتھ گزارنے کے لیے۔ میڈم رخسانہ نے پہلے پاکستان فون کر کے میری والدہ سے تصدیق کی کہ مجھے ہشہا کے گھر جانے کے لیے ان کی اجازت حاصل ہے۔ پھر دس ہدایتوں اور نصیحتوں

سیاست ابھی بھی نہیں بھٹک رہی تھی۔ ہشہا کی ماما جی کہتی تھیں کہ انگریز تو چاہتے ہی ہیں کہ ہم آپس میں لڑیں مریں اور ان کا اسلحے کا کاروبار چلتا رہے۔ جگہ میں شانتی ہوگی تو ان کا اسلحہ کون خریدے گا۔ تب ہی تو دھرتی پہ دنکا فساد مچائے رکھتے ہیں اور نینتاؤں کا راج پاٹ بھی نفرت پھیلانے میں ہے۔ ورنہ پر جاتو دونوں طرف کی ملنا چاہتی ہے۔ ایک دوسرے سے سمبندھ رکھنا چاہتی ہے۔ آپس میں محبت دوستی رکھنا چاہتی ہے۔ یہاں فساد کوئی اور کرتا ہے اور ہم الزام ایک دوسرے کو دیتے ہیں۔ ہمارا بیوی (دشمن) سا بچھا ہے۔ ہمیں اسے کھوجنا چاہیے۔

ہشہا سے باتیں کر کے اکثر میرا دل اداس ہو جاتا۔ مجھے اپنے مرحوم والد یاد آجاتے جنہوں نے قیام پاکستان کی بڑی بھاری قیمت ادا کی تھی۔



جوں ہی ہمارے طیارے کے پہیوں نے دہلی

ایئر پورٹ کے رن وے کو چھوا، میرا بے تحاشا دھڑکتا دل بے قابو ہونے لگا۔ کاش آج والد زندہ ہوتے اور میرے ساتھ ہوتے۔ اور ایک بار پھر اپنے ہندوستان کو دیکھتے۔ اسی ہندوستان کو جو مسلمانوں کی سطوت کا شاہد تھا۔ جہاں مسلمانوں نے ہزار برس حکومت کی تھی۔ جنہوں نے تاج محل بنا کر محبت کو خراج تحسین پیش کیا تھا۔ جنہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی قائم کر کے کھولی ہوئی میراث کو پانے کی بنا ڈالی تھی۔ وہی ہندوستان میرے قدموں تلے تھا۔

میں اپنے کالج کے چند اساتذہ اور اسٹوڈنٹ کے ساتھ پندرہ دن کے تعلیمی دورے پر یہاں آئی تھی۔ دو دن تو مختلف کالجز اور یونیورسٹیز کا دورہ کرنے میں لگ گئے جہاں مختلف لوگوں سے ملاقات کا موقع ملا۔ سب ہی خوش اخلاقی اور محبت سے ملے۔ ہندوستان میں تعلیم کا معیار نہایت عمدہ تھا۔ میڈیکل، کمپیوٹر اور انجینئرنگ کے اعلیٰ تعلیمی ادارے تھے جن کا معیار دیکھ کر میں از حد متاثر ہوئی۔

”شما کرنا ہم پالیوں میں چائے پیتے ہیں۔ تمہارے لیے یہ کپ ہے۔“ میں نے مسکرا کر کپ اٹھالیا۔
 ”تمہارے آنے کا سن کر میں نے بابو جی سے خاص فرمائش کر کے یہ شیشے کے برتن منگوائے ہیں۔ ہم تو پیتل تانبے کے برتنوں میں کھاتے پیتے ہیں۔ جانے تمہیں کیسا لگتا اسی کارن تمہارے کیسے نئے برتن منگوائے ہیں۔“

میں شرمندہ ہو گئی۔ ”ارے نہیں۔ تم نے خواہ مخواہ تکلف کیا۔ میں کسی چھوٹ چھات کی قائل نہیں۔ میں بھی ان ہی برتنوں میں کھاتی۔“
 اس نے مسکرا کر میری بات سنی اور موضوع منتقلو بدل دیا۔



دوپہر کو بھی اس نے کھانا میرے ساتھ انیکسی میں کھایا۔ ہشہا کی ماما جی نے بڑا شاندار اور پر تکلف کھانا بنایا تھا۔ کھانے کے دوران باتوں باتوں میں ہمارا پروگرام بن گیا کہ شام کو ہشہا کی دوستوں کے ساتھ بازار خریداری کے لیے چلیں گے۔ مجھے قبولے کی عادت تھی۔ اس لیے ہشہا میرا خیال کر کے جلد ہی رخصت ہو گئی۔ مگر آج کچھ عجیب سی بات تھی کہ مجھے در تک نیند نہ آئی۔ تنگ آ کر میں انیکسی سے باہر نکل آئی۔

غضب کی دھوپ پڑ رہی تھی۔ لان خالی بڑا تھا۔ میں ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ ہشہا کو بلاؤں تو کیسے کہ انیکسی کے عقب سے مجھے کچھ آوازیں سنائی دیں اور میں اسی جانب ہوئی۔ ایک انتہائی دلچسپ منظر میرے سامنے تھا۔ ایک چھوٹا سا پارا سا لڑکارا ج کمار بنا ہوا تھا۔ اور تقریباً اسی کی عمر کی ایک لڑکی کھڑی اس کے احکامات سن رہی تھی۔ میرے چہرے پر مسکراہٹ رنگ گئی۔

”راج کمار صاحب! آپ کے کپڑے تو اتنے گندے میلے ہو رہے ہیں، راج کمار کیا ایسے ہوتے ہیں؟“ میری آواز سن کر وہ چونکا۔ پہلے مجھے دیکھا پھر

کے بعد رومی کے ساتھ مجھے ہشہا کے گھر بھیجا۔ رومی کو ہم نے ڈرائیور کے طور پر ہار کیا تھا اور وہ بڑی ذمہ داری کے ساتھ پورے ٹرپ پر ہمیں ہر اس جگہ بحفاظت لے گیا تھا جہاں ہم لے جانے کی خواہش کی تھی یا جہاں جانا تعلیمی نقطہ نگاہ سے ہمارے لیے مفید تھا۔

ہشہا کی کوٹھی وسیع و عریض رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ خوب صورت لان رنگ برنگے پھولوں سے مزین تھا۔ مجھے اس نے انیکسی میں ٹھہرایا تھا اور اس بات پر خاصی شرمندہ ہو رہی تھی کیوں کہ گھر میں پہلے ہی اس کے بابو جی کے کچھ مہمان ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ خواہ مخواہ شرمندہ ہو رہی تھی حالانکہ مجھے یہ بات اچھی لگی تھی۔ کیوں کہ میں پردے کی پابند تھی۔



صبح میری آنکھ کسی شور سے کھلی۔ دو کہیں گھنٹیوں سی بج رہی تھیں۔ جن کا ترنم فضا میں ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ یہ میری بھی نماز کا ٹائم تھا۔ میں اٹھ گئی۔ فضا میں خشکی تھی اور مجھے شدت سے چائے کی طلب

محسوس ہو رہی تھی۔ نجانے ہشہا اور اس کے گھر والے کتنے بجے جاتے تھے اور پھر از خود چائے مانگنا بھی تو معیوب تھا۔ میں نے وضو کر کے نماز کی نیت باندھ لی۔ ابھی فرض کی آخری رکعت باقی تھی کہ مجھے دروازے پر کچھ کھٹکا سنائی دیا۔ اطمینان سے نماز مکمل کر کے میں نے دیکھا۔ ہشہا دروازے پر ناشتے کے لوازمات سمیت کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر کچھ عجیب سا تاثر تھا۔

”او آؤ ہشہا! میں نماز پڑھ رہی تھی۔“
 وہ چونکی۔ ”آں! ماما جی بھی سویرے سویرے راتھنا کرتی ہیں۔ پر تو۔ مجھ سے اتنے سویرے نہیں اٹھا جاتا۔“ وہ میرے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔
 تھالی میں ایک پیل کی پیالی اور ایک شیشے کے کپ میں چائے تھی۔ میں سوچ میں پڑ گئی کہ کسے اٹھاؤں کہ اس نے خود میری مشکل آسان کر دی۔

اپنے کپڑوں کو اور جھینپ گیا۔

”ہم تو کھیل رہے ہیں۔“

”راج کمار والا کھیل رہے ہو تو پہلے راج کمار جیسے بنو بھی تو اور یہ کون ہے؟“ میں نے بچی کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ سلمیٰ ہے، میری داسی۔“ مجھے ایک دم ہنسی آئی۔ بچی پہلے ہی سہمی ہوئی تھی مجھے ہنستا دیکھ کر کھسیا گئی۔

”اور تم کون ہو؟“ میں نے راج کمار سے پوچھا۔

”میں راجیش ہوں۔“ ہشیا دیدی کا متر (دوست)۔

”اوہ! میرے منہ سے بے ساختہ آواز نکلی۔“

”آپ بھی ہشیا دیدی کی متر ہونا؟“

”ہاں! اور ہشیا کے گھر جو مہمان آئے ہیں وہ کس کے دوست ہیں؟“

”مہمان؟ میری بات سن کر اس نے حیرت سے دہرایا۔“

”ہاں! ہشیا کے بابو جی کے مہمان آئے ہوئے ہیں نا۔“ میں نے ہشیا کی کوٹھی کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں! میں تو روز ہشیا دیدی کے گھر آتا ہوں۔“

وہاں تو کوئی مہمان نہیں آیا ہوا۔ مہمان تو بس آپ ہو۔“ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

مجھے اس کی بات سن کر اچنبھا ہوا۔ کیا ہشیا نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے؟ مگر کیوں؟ میری سمجھ میں نہ آیا تو میں پھر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”اچھا۔ اچھا جاؤ۔ ہشیا دیدی کو دیکھو۔ اگر وہ کوئی کام نہ کر رہی ہو اور جاگ رہی ہو تو اس سے کہو آپ کی دوست بلارہی ہے۔“

”میں جاؤں؟“ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، سلمیٰ بول پڑی۔ مگر راج کمار نے سختی سے اسے روک دیا۔

”نہیں۔ تم اندر نہیں جاؤ۔ دیدی کہتی ہیں تم پلچھ ہو۔ دیدی کا گھر پلید ہو جائے گا اور پھر انہیں صفائی کرنی پڑے گی۔ ٹھہرو۔ میں جاتا ہوں۔“

”نہیں! تم بھی ٹھہرو۔“ میرے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔ اور میں انیکسی کی طرف لوٹ آئی۔ میرے دل غم میں جھکڑ چل رہے تھے۔

”کیا میں بھی پلچھ تھی؟ ہشیا نے مہمانوں کا جھوٹ اسی لیے بولا تھا کیوں کہ وہ مجھے اپنے گھر لے جانا ہی نہیں چاہتی تھی۔“

میرے لیے کلچ کے برتن میرا خیال کر کے نہیں، اس لیے منگوائے تھے کہ کہیں اس کے برتن پلید نہ ہو جائیں۔“

ایک دم مجھے خیال آیا کہ اب تک میں جن اعلا تعلیمی اداروں میں گئی تھی وہاں میری ملاقات ’مندیتا‘ شوہا، راہا سے تو ہوئی تھی مگر وہاں کوئی غزالہ، کوئی رضیہ نہیں تھی۔ ہاں ایک سلمیٰ سے ملاقات ہوئی تھی جو داسی تھی۔

راجیش کی داسی۔

کمرے میں جس بڑھ گیا تھا۔ سڑی دھوپ سر چکرائے دے رہی تھی۔ میں نے روی کو فون کیا کہ وہ آکر مجھے لے جائے اور خاموشی سے اپنا سوٹ کیس اٹھا کر انیکسی سے باہر آئی۔ سڑک پر کھڑے ہو کر میں نے روی کا انتظار کرتے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ بھانت بھانت کے لوگ تھے۔ ماتھے پر تلک لگائی ہوئی ہنستی کھیلتی ناریاں، بچن گاتے پنڈت پجاری، سر اٹھائے مندر اور سر پر ٹوپیاں جمانے، خاموشی سے سر جھکائے چائے پیچھے لڑکے۔

یہ میرے والد کا ہندوستان تو نہیں تھا۔ وہ تو شاید میری دادی کے ساتھ ہی کسی جھیل کی تہ میں بیٹھ گیا تھا۔

یہ تو ہشیا کا ہندوستان تھا۔ جہاں برتن الگ تھے لوگ الگ تھے۔ عبادت الگ تھی۔ سب سے بڑا فرق یہ تھا کہ میرا وحدہ لا شریک رب ان کا بھی پالن ہار تھا مگر ان کے بے شمار مٹی کے بت میرے خدا نہیں تھے۔

ہشیا کی ماما جی نے غلط کہا تھا ”ہم ایک جیسے ہیں۔“ ہم ایک جیسے نہیں تھے۔



جنگلات

تحت احمر نے اودھ کھلے دروازے کو پورا کھول کر چوکھٹ سے پرے ہٹ کر گویا انہیں اندر آنے کی عورت دی۔

”تشریف رکھیے سزا حراہی جاہ سے بس آتی ہی ہوں گی۔“ بولتے والے کے لہجے میں کھڑکی کے پار اترتی ٹھنڈک رچی تھی۔ خاتون اور ان کا ساٹھی خندہ پیشانی سے بچھلے اودھ کھٹے سے انتظار میں تھے۔ اور احمر نے کچن میں اپنے مہمانوں سے زیادہ اہم کاموں پر توجہ مرکوز رکھی تھی۔

”ویل آج مجھے باننا پڑے گا کہ مصفرہ اور احمر میرے انتظار میں بیٹھے ہیں۔“ پختہ مگر نرم نقوش کی عورت چند شاہنگ بھنگتے تھامے بولتے ہوئے اندر داخل ہوئی تھی لیکن لاؤنج میں براجمان مہمانوں کو دیکھ کر ان کے ہنسنے میں بوس ہو گئے۔

”تم ٹھیک ہو زینا۔“ ڈھلتی عمر کی عورت لپک کر قریب آئی۔

”تمہیں خود کو نارمل رکھنا ہوگا، اگر تمہارے شوہر کو علم ہو گیا تو۔“ مہمن نے بات اوھوری چھوڑ دی۔

”اتنی دیر لگا دی تم نے؟“ اندر داخل ہوتے احمر کے لہجے کی نئی زینا کی رگوں کو زخمی کرنے لگی۔ اس کی ہڈیاں گھٹھرنے لگیں۔

”ہاں بس کچھ گروسری لینے گئی تھی۔“ گلے میں پھندے کی طرح پھنسے بے حد وزنی گولے کو دھکیلتے ہوئے وہ بہ مشکل بول پائی۔

”ذرا جلدی فارغ ہو جانا اب۔“ مزید احکام صادر کرتے ہوئے وہ ذرا بھی موت دکھائے بغیر کتا چلا

سو بج کی زرد زردی روشنی کو شام کے دھند لکوں نے دھیرے دھیرے اپنے پروں میں سمیٹنا شروع کیا تھا۔ فضا میں خشکی بڑھنے لگی تھی۔ ڈھیلے قدموں سے چلتی وہ اپنے کسی خیال میں محو نظر آتی تھی۔

”کتنی دلچسپ کما ہے کھٹنی کم بجایا کرو ایک دفعہ اس پر ہاتھ رکھ لو تو اٹھانا بھول جاتی ہو۔ میں بہرہ نہیں ہوا ابھی۔“ روزمرہ کی طرح وہ اس کے یوں کھٹنی بجانے پر غصہ ہوا تھا۔

”اتنی دیر کیوں ہو گئی آج تمہیں؟۔ مصفرہ! میں خوب جانتا ہوں کہ تمہارا آف سات بجے ہوتا ہے۔“ مصفرہ بنا جواب دیے بیڑھیاں چڑھنے لگی۔

”مجھے بے خوف سمجھتی ہے کیا؟“ لوڈ لڑ بناتے ہوئے وہ مسلسل اشتغال سے بیڑھائے جا رہا تھا۔

مصفرہ دھیان دیے بغیر اپنے کمرے میں آگئی۔ اسی وقت دروازے پر دھارہ دستک ہوئی۔

”جی! میں کیا مدد کر سکتا ہوں آپ کی؟“ جیسے چوڑوں، آنکھوں میں اجنبیت لیے احمر نے سوال داغ۔

”ہمیں سزا حمر سے ملنا ہے۔“ ڈھلتی عمر کی ایک عورت نے آگے بڑھتے ہوئے جواب دیا۔

”کس سلسلے میں۔“ احمر نے اودھ کھلے دروازے کی چوکھٹ میں مزید تن کر کھڑے ہوتے ہوئے شکل نظروں کے ساتھ استفسار کیا۔

”کچھ ذاتی نوعیت کا کام ہے ان سے۔“ جواب انتہائی نرمی سے آیا۔ خاتون اور ان کا ساٹھی بظاہر مضبوط حیثیت کے معلوم ہوتے تھے اسی خیال کے



READING
Section

ہاتھ چلا رہا تھا۔ سارا رگڑا ہوا کر ڈالا تھا۔ تب ہی ایک دلہو زینچ نے سکوت زور ماحول میں ارتعاش پیدا کیا تو زینچا دیوانوں کی طرح بھاگی۔

”چھوڑو میری زینچی کو۔ ورنہ۔۔۔ رکو تم میں نے کال کی ہے پولیس کو کوئی تمہیں سنبھالے گی اب۔“ وہ ہانپتے ہوئے مصفرہ کو پچھلے میں ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔

پولیس کا سنتے ہی احمر کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور وہ لودو گیا رہا ہو گیا۔

مصفرہ کی حالت قاتل رحم تھی، وہ سسکتی جاتی تھی اور اپنی ماں کے سینے سے لگی گرم سیال اٹھاتی جاتی۔ نہ زینچ سے کوئی شکوہ، نہ شکایت۔ خاموش اور سسل چپ ہونٹوں سے لگائے وہ بلیکتی رہتی۔ یہی معمول تھا تب بھی وہ خاموش پڑی رہتی، خاموش ندی جو بہتی چلی جاتی۔ کبھی کبھی خاموشی بھی ”زینچا“ کو یوں چونکاتی جیسے جلتے ہوئے موم سے کٹیف دھواں

اٹھے اور نصارتوں کو جلانے لگے۔



”سنو مصفرہ۔۔۔ میں پوری یونی میں چار دن سے تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔“ تیز مگر اجنبی آواز اس کے پہلو پہلو قدم رکھنے لگی۔

”جی۔“ وہ چونک کر رکی رخ روشن پہلو میں چلی آواز کی طرف مبذول کیا تھا۔

”تم تو کبھی چھٹی نہیں کرتیں لیکن۔“

”ہاں کسکو زنی۔ میں مصروف ہوں۔“ آنکھوں میں اجنبیت لیے وہ آگے بڑھی۔

”میں عذیر ہوں۔ سنو مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں، تمہارے والد نے جو کچھ اس دن کہا۔“ وہ بولتا رہا اور وہ ناک کی سپدھ میں کتابیں سینے سے لگائے چلتی رہی۔

”میں تم سے معذرت کرتا ہوں، مجھے ایسے اپنے والدین کو تمہاری طرف تمہاری اجازت کے بغیر نہیں لے جانا چاہیے تھا۔ شاید وہ پہلے سے اس بات کے لیے تیار نہیں تھے۔ سو سوری۔“ آخری بات سنتے ہی

”جی میں نے پہچانا نہیں آپ کو؟“ زینچا نے کھاری سانسوں کو محسوس کرتے ہوئے آنے والوں کا مدعا جانتا چلا۔ کسرا جی بنے ہوئے۔

”میں وہ۔۔۔ آپ کی بیٹی مصفرہ کے سلسلے میں آئی تھی۔“ من دجھے لہجے میں کہنے لگی۔ ”اگر آپ اجازت دیں تو۔۔۔ میرا بیٹا عذیر میں اسی سلسلے میں آئی تھی۔“ من نے بے ربط الفاظ میں مدعا بیان کیا۔

”بہت خوب۔ یہ تھا آپ کا زانی نوعیت کا کام۔“ دروازے کی اوٹ میں کھڑے احمر نے سامنے آتے ہوئے انتہائی بھونڈے انداز میں سوال کیا۔ آنے والوں کے وہ لٹے لیے گئے کہ اگر وہ سمجھ دار ہوئے تو دوبارہ یہاں آنے کا قصد بھی نہ کر سکیں۔

کھڑکی کے پار چاند ناراضی سے اوٹ میں جا چھپا، باہر چھپا چھم سفید برف روئی کی مانند تو اتر سے زمین پر اترنے لگی اور اپنی ٹھنڈا اندر موجود نفوس میں اٹھ پینے لگی۔

”آپ چلے جائیں یہاں سے، بہت بڑی فلفلی کی آپ نے۔“ سرزنشک ہم چھپاں وجود کے پار ہو میں۔

”آپ سنیں تو، میرا بیٹا بزنس کا اسٹوڈنٹ ہے۔ مصفرہ اور عذیر ساتھ پڑھتے ہیں، دیکھیں۔“ من منمنائی آواز میں دفاع کرنا چاہتی تھی احمر کا ضبط یہیں تک تھا، آخری الفاظ نے گویا سرد وجود کو آگ میں دھکیل دیا تھا۔

مہاتوں کو جس عزت سے نکالا گیا تھا وہ قاتل مذمت تھا مگر اس سے آگے جو ہوا۔ وہ بھی قاتل مذمت تھا۔

”مصفرہ۔ نہیں چھوڑوں گا تمہیں۔ سارا ڈالوں گا میں تمہیں بے شرم۔ بے حیا یہی گل کھلائے تھے پڑھنے کے نام پر۔ میں تمہیں مار دوں گا۔“ کھڑکی کے پار کر میں لپٹی کھاری سانسوں کی آہیں گھلنے لگیں۔ زینچا تحیف و وجود کے ساتھ وہیں ڈھے گئیں۔ اور کسی دق کی مریضہ کی طرز جو کہنے لگیں۔

”کیوں گھربلایا تم نے انہیں۔“ وہ بولنے سے زیادہ

مصفرہ کی کلن کی لوہی سرخ پڑ گئیں، چہرہ سخت سے گلابی پڑ گیا اور وہ بھاگنے کے سے انداز میں چلنے لگی۔ جیسے وہ ایسا کر کے اس آواز سے چھٹکارا لیا لے گی۔

”کیا تم نے مجھے معاف کر دیا۔“ کلنی دور تک چلنے رہنے تک جب اسے یقین ہو گیا کہ یہ کچھ نہیں بولے گی تو سوال دانتا۔

”جی۔“ وہ مختصر جواب دے کر دوڑتے قدموں کے ساتھ دوڑ چلی گئی۔ کھولتے ہوئے پانی — نے اس کے گالوں پر ہنسا شروع کیا اور وہ پھر سے بہتی ہوئی ندی بن گئی۔

افق کے کنارے پر نکلی گول نکلیا پارے کی طرح چمکتی تھی، مگر اس چمک میں رونق کی کمی تھی۔ سیلا ہوائیں دائیں سے بائیں تیر رہی تھیں جن میں کسی کے آنسوؤں کی نمی شامل تھی۔

”تم آج پھر کئی تمہیں پڑھنے؟“ احمر اشتعال سے

گر جا تھا۔

”اور ملی بھی ہوگی اس سے؟“ فحسے سے ابھبھک کر آگے آیا۔

”ہاتھ مت لگانا اسے ورنہ میں پولیس کو بلا لوں گی۔“ زینیا نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکا۔

”ہونہہ پولیس۔“ وہ ہنکارتا آگے بڑھا۔ ”آئندہ اس کے ساتھ دیکھا تمہیں تو تمہاری ماں کے درمیان میں آنے سے پہلے ہی کاٹ ڈالوں گا تمہیں۔ سنا تم نے“ زہریلی برہمچیاں اس کی سماعت میں اتارنا وہ چلا گیا۔ مصفرہ کو آج سے پہلے اتنی ہنگام محسوس نہیں ہوئی تھی جتنی گزشتہ روز کے واقعہ کے بعد ہوئی تھی۔

”کیا تم پلیس اس لڑکے سے؟“ زینیا کی آواز جذبات سے عاری تھی۔

”مہی میں جانتی تک نہیں اسے۔“

”ٹھیک ہے آئندہ خیال رکھنا۔“ پھر بلا لہجہ ’موم کی صورت پر پتھر برسا کر آگے بڑھتا چلا گیا۔



”مصفرہ تم کہاں غائب ہو جاتی ہو؟ رحم کرو مجھ پر“ مدھر مگر انسیت اور نا آشنائی کے درمیان پندولم کی طرح جھومتی آواز سحر باندھنے لگی، وہ مسکور نہیں ہونا چاہتی تھی، سوا تھل پھل سانسوں کو سنبھالتی چلتی گئی۔

”تم ٹھیک ہو مصفرہ؟“ وہ پریشان سا ہو کر سامنے آیا۔

سرخ روشن ساکت مگر بے رنگ پتلیوں میں رنگ بھرنے لگا۔

”اگر آئندہ آپ نے میرا پیچھا کرنے کی یا مجھ سے مخاطب ہونے کی غلطی کی تو نقصان کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے“ شیلے انداز میں کہتی وہ رنگوں بھری دنیا سے کترا کر آگے بڑھتا چاہتی تھی، لیکن وہ اس کے قدموں سے لپٹ لپٹ جاتیں یوں کہ وہ بے بس ہونے لگی۔

”زندگی پہلے کم مشکل تھی جو اب یہ شو شا چھوڑ کر

مجھے اذیت میں مبتلا کر دیا آپ نے“ آپ ہوتے کون ہیں میرے گھر رشتہ بھجوانے والے، جانتی تک نہیں میں آپ کو تمہارا لگا کہ رکھ دیا ہے آپ نے میری ذات کا وہ میرا سوتیلا وحشی باپ اسے کوئی پنچ چاہے ہوئی ہے مجھے اذیت دینے کے لیے مگر آپ کو کیا۔“ وہ غیر متوازن لہجے میں بے بسی سے رندھی آواز سے شکوہ کرتے لگی۔

”کیا تم پانچ منٹ کے لیے یہاں بیٹھ کر قتل سے میری بات سن سکتی ہوں؟“ مان بھرے لہجے میں کہتا وہ سامنے پڑے شیخ کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ وہ انکار یا اقرار سے پہلے شیخ کی طرف بڑھ گیا اور وہ تھلید میں پیچھے آئی۔

”ہم اجنبی نہیں ہیں۔ میں تمہاری ٹمن پھپھو کا بیٹا ہوں مصفرہ۔“

”تو کیا وہ ٹمن پھپھو۔۔۔؟“ وہ آدھی بات کاٹ کر تیزی سے بولی۔

”پانچ منٹ مجھے بولنے دو، کیا بولنے دو گی؟ پھر ساری زندگی مجھے تمہیں ہی سنتا ہے، کیوں ٹھیک کہانا میں نے؟“ سنجیدگی سے کہتے کہتے وہ ایک انتہائی غیر سنجیدہ

کی بات کر گیا تھا اور یہ منظر یوں ہی تھا جیسے چیز کڑکتی ہوئی دوپہر میں شدید جس کے عالم میں ہائل چم سے آئیں اور برستے چلے جائیں، وہی مسکن نے گلابی پتیوں کے کناروں کو چھوا اور وہ پھیلنے لگے۔

”ہاں می اس دن آئی تھیں ابو کے ساتھ، لیکن اس بات کا تمہارے والد کو نہیں پتا چلنا چاہیے وگرنہ وہ بھی ایسا نہیں ہونے دیں گے اور دادی نہیں دیکھنے کو ترس رہی ہیں مصفورہ، وہ کہتی ہیں ایک دفعہ بس ایک دفعہ مجھے ابراہیم کی اولاد سے ملو اور بہت یاد کرنی ہیں تمہیں انہوں نے امی کو بہت منت سے بھیجا ہے ورنہ تو امی کبھی اپنی مرضی سے نہ آئیں، تم کافی چھوٹی تھیں جب تمہارے ابو کی ڈھتہ ہوئی، تمہاری امی کی دو سری شادی کے بعد سے اب تک دادی تم سے ملنے کو بہت بے تاب ہیں مصفورہ! میں کسی کے عیب بتانے یا کسی کو نچا دکھانے نہیں آیا، مجھے دادی نے بھیجا ہے وگرنہ تمہاری امی کے تعلقات اپنے پچھلے سسرال سے اتنے برے تھے کہ ہر آن لگتا کہ وہ ٹوٹ جائیں گے اور پھر ایک دن ٹوٹ ہی گئے۔ مگر خیر تمہاری امی، مطلب ممالی، امی کو پہچان گئی تھیں، لیکن انہوں نے اپنے شوہر کے سامنے اظہار نہیں کیا، اب تمہاری مرضی ہے تم جو چاہے مرضی فیصلہ کرو۔ چاہے دادی کا کہا رکھ لو، یا آگے۔ جیسے تمہاری مرضی ہے، چلنا ہوں، کچھ کام ہے، کل بات ہوگی۔“ کھپ اندھیوں سے نکل کر وہ تیز روشنیوں میں آن گھری تھی، اس کی آنکھوں میں اتنی سخت نہیں تھی کہ وہ اتنی تیز روشنیوں کا سامنا کر سکتی، لاشعوری طور پر اس نے اپنی ہتھیلیوں سے آنکھوں کو ڈھانپ لیا تھا۔

لیکن روشنیاں تیز بڑھوں کی مانند اس کی پتلیوں کو کلٹنے پر تلی تھیں۔ ایک سیل رواں تھا جو وہاں تھا بیٹھی مصفورہ کی ذات میں بہتا جا رہا تھا۔

”اتنی جلدی کیسے آگئیں تم آج، جا ب پر نہیں آگئیں؟“ احمر کی کرخت آواز اس کے پیچھے آئی تھی۔ وہ معمول کی طرح چلتی راہ داری سے گزر کر اب اوپر اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔

”میں کچھ پوچھ رہا ہوں تم سے؟“ وہ چینل سرچنگ

کرنا ہوا پھر سے بولا تھا۔ وہ تہنی اور چلتی آئی۔ احمر نے چہرہ اٹھا کر بے جان ہونے قدموں کو کھینچی مصفورہ کو دیکھا اور پھر ”اونہہ“ کر کے منہ پھیر لیا۔ اسے اس کا مطلوبہ چینل مل چکا تھا۔ زینیا سے کبھی بحث و محیص کے بعد وہ عذیر سے شادی پر رضامند ہوئی۔

”تمہیں اس سے اجمار شتہ مل سکتا ہے مصفورہ! اتنی دور مت جاؤ۔“ اگلے دن نکاح سے پہلے وہ پھر اسے سمجھانے لگی۔

”لیکن مجھے میری دادی پھر نہیں مل سکیں گی وہ سب رشتے جن کے لیے میں ساری عمر ترستی رہی ہوں۔ میں خوش ہوں بہت خوش۔“

”اگر آپ کہتی ہیں تو نہیں جاتی، شہد میں سرکہ ڈال کر اسے خراب کرنا ہے تو آپ کی مرضی۔“ وہ ماں کی نظروں سے خائف ہو کر اپنے کپڑے سینتی ہاتھ جھاڑ کر کھڑی ہوئی۔

”میں خوش ہوں مصفورہ، بس وہی ہو رہی ہوں، تم تیاری کرو۔“

دادی، پھوپھو، چچا سب رشتے کتنے مضبوط اور حسین ہوتے ہیں، وہ جان گئی تھی، سب جان گئی تھی، جب دادی کی نرم گرم آنکھوں سے سیراب ہوئی، جب چچا کے مضبوط ہاتھوں کا سر پر رکھنے والے جانثار تحفظ کا احساس، کتنے انوکھے رنگ تھے ان رشتوں کے، کتنے انوکھے رنگ کہ ساری عمر وہ ان سے نا آشنا رہی تھی۔ جب خون کے رشتے رو بہ ہوئے تو جتنے ہوئے لوہوں میں شرارے پھوٹ پڑے۔ کیش ثقل کیا ہوتی ہوگی جو اپنے خون میں ہوتی ہے، سب سے بڑھ کر اس کا ہم سفر وہ خداوند کریم کی جتنی شکر گزار ہوتی کم تھا، اسے اس کے پھڑے رشتے دان کر دیے گئے تھے جو کسی نعمت مترقبہ سے ہرگز ہرگز بھی کم نہ تھے، بے حس ہو کر، غیر معمولی زندگی گزارنے گزارتے وہ پھولوں کے کنج میں آن گھری تھی، جہاں خوشبو تھی، تپتلی تھیں، خواہوں کی تعبیر تھی اور سب سے بڑھ کر ان پر جگمگاتا متاب مصفورہ بن کر اس کے قدم بہ قدم تھا۔

سازگار

ایک ڈھلتی عمر کی عورت سڑک پار کرتے ہوئے ایک لڑکی کو دیکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ایک ماڈرن عورت ہے۔ وہ اسے چلا کر گرنے کے لیے کہتی ہے لیکن وہ دونوں سڑک پار کر کے گاڑی میں بیٹھ کر چلی جاتی ہیں۔
 وقار صاحب کے دو بچے ہیں۔ اجیہ اور سائر۔ وہ سائر کی شادی کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ان کی بیوی اس دنیا میں نہیں ہے۔ ان کی سالی مہ پارہ خاص طور پر لندن سے اس شادی میں شرکت کرنے آئی ہیں۔ اجیہ وقار صاحب کو بتاتی ہے کہ سائر اس شادی سے ناخوش نظر آتا ہے۔ وقار صاحب یہ سن کر پریشان ہو جاتے ہیں۔
 اجیہ بہت خوب صورت ہے۔ وہ دو ماہ کی تھی جب اس کی ماں چلی گئی۔ وہ اپنی خالہ مہ پارہ سے پوچھتی ہے اس کی ماں کیسی تھیں۔ مہ پارہ بتاتی ہیں کہ اس کی ماں بہت خوب صورت تھی بالکل کالج سے بنی عورت۔ وقار صاحب کی بہنیں بھی انہیں احساس دلاتی ہیں کہ سائر اس شادی سے خوش نہیں ہے۔ تب وقار صاحب سائر سے براہ راست بات کرتے ہیں کہ سائر کہیں اور انٹرنشڈ تو نہیں ہے۔ تب سائر کہتا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے اور وہ اپنے باپ کی کوئی بھی خواہش رد نہیں کر سکتا۔

سائر کی شادی میرب سے ہو رہی ہے۔ میرب دو سال کی تھی جب ان کی ماں بھی دنیا سے چلی گئی تھیں۔ ابراہیم صاحب نے اس کے بعد شادی نہیں کی۔ ان کے پڑوسی اور دوست احمد سعید اور ان کی بیگم نے میرب کا خیال اپنے بچوں کی طرح رکھا سعید صاحب کی بیٹی ماریہ کی میرب سے گہری دوستی ہے ان کا ایک بیٹا عاشر ہے جو اجیہ کو پسند کرنا ہے شادی کی

مہنگا ناول

Downloaded From
 Paksocietyfc.com

Downloaded From
paksociety.com



READING
Section



تقریبات میں سائر کارویہ بہت اکٹھا ہوا رہتا ہے۔ شادی کی رات بھی وہ میرب سے بہت رکھائی سے پیش آتا ہے وہ میرب سے کہتا ہے کہ وہ اس سے صرف وفاداری کی توقع رکھتا ہے اور اسے اپنی بہن اور والد کا خیال رکھنے کو کہتا ہے۔ اجیہ کی دوست شینا بہت آزاد خیال لڑکی ہے۔ اس کا بھائی آغا شایان اجیہ میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ اجیہ بھی اس کی طرف مائل ہے۔ جبکہ میرب کا بھائی سعد اجیہ کو پسند کرتا ہے۔ سائر کارویہ میرب کے ساتھ بہت عجیب ہے۔ وہ معمولی باتوں پر شدید رد عمل ظاہر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ کسی بھی لڑکے سے بات نہ کرے۔

وہ عورت جس نے سڑک پر مہ پارہ کو دیکھا تھا۔ ایک خستہ فلیٹ میں رہتی ہے۔ وہاں سے کوئی پرانا تیار نکال کر مہ پارہ کے گھر جاتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ مہ پارہ وہ گھر چھوڑ چکی ہے۔ لیکن وہاں کے مکین اسے وقار صاحب کے گھر کا پتہ دے دیتے ہیں۔

تب وہ کہتی ہے وقار آج سے سالوں پہلے تم نے جو اجازت مجھے پہنچائی تھی اس کے بدلے کا وقت آپنچا ہے۔“
 شیخ عبدالحمید کریانہ فروش ہیں۔ دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں، نازد چند اور مانوس چندا کا مزاج اور صورت سب سے الگ ہے۔ وہ بے حد حسین ہے اور بڑھائی کے بجائے دو سری رنگا رنگ سرگرمیوں میں دلچسپی رکھتی ہے۔ شیخ صاحب کی لاڈلی ہے۔ کالج میں ایک ڈرامے میں قلوبطرحہ کا کردار کرتی ہے تو آصف شیرازی اسے نیوی برادار کاری کی آفر کرتا ہے۔ وہ ایک ڈائریکٹر شکیل ملک کا ملازم ہے اس آفر پر چندا بہت خوش ہوتی ہے لیکن وہ جانتی ہے کہ اس کے گھر والے کبھی اسے نیوی پر کام کرنے کی اجازت نہیں دیں گے اور شادی کر کے رخصت کریں گے۔ وہ آصف شیرازی سے کہتی ہے کہ تم مجھ سے شادی کر لو یہ اصلی شادی نہیں صرف ایک معاہدہ ہوگا۔ میں گھر والوں کے چنگل سے نکل آؤں گی۔ آصف مان جاتا ہے۔

ساتویں اور آخری قسط

جھلا کر بولی۔

”اچھا۔۔۔ وہ نہیں ہے گھر پر۔۔۔ تب پھر میں آؤں گھنٹے تک پہنچ رہا ہوں تمہارے گھر پر پھر دیکھتے ہیں۔“
 اس نے کہہ کر ہنسا کچھ سننے لائن منقطع کر دی۔ چندا نے ریسیور کرپٹل پر ڈال دیا۔ وہ سر پکڑے بیٹھی تھی۔ پھر واقعی آؤں گھنٹے بعد وہ اس کے سامنے موجود تھا۔

”کہاں رکھے تھے کانفڈنٹ؟“ اس نے ایک الماری کی طرف اشارہ کر دیا۔

”یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے شوہر نے احتیاط کے پیش نظر کانفڈنٹ بینک میں رکھوا دیے ہوں۔“ اس نے کہا۔

”اگر ایسا ہوا ہے تب تو مسئلہ ہو جائے گا۔ میں کیا کہہ کر اس سے کانفڈنٹ مانگوں گی۔“ وہ فکر مند سی بولی۔

”بہت خوب۔“ آصف طنز آمیز غصے سے بولا۔
 ”جب میں اتنے دن سے تم سے یہی خدشہ ظاہر کر رہا تھا تب تمہارے کان پر جوں تک نہ رہن گئی۔ اب اگر گھر

”آصف۔۔۔ گھر کے کانفڈنٹ نہیں مل رہے مجھے۔ میں نے پوری اسٹڈی چھان لی ہے۔“ چندا کا پریشانی سے براہ حال ہو گیا۔ جیل کے نکلنے کے بعد اس نے اسٹڈی میں جا کر وہ مخصوص لا کر کھولا۔ جس میں اہم کانفڈنٹ وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ وہاں چند روٹی کانفڈنٹ اور چند ایک غیر ضروری دستاویزات کے علاوہ کچھ بھی موجود نہیں تھا۔ وہ بری طرح چکرا کر رہ گئی اور اس نے مارے گھبراہٹ کے اپنے ہمدرد کو فون ملایا۔
 ”کیا۔۔۔ دھیان سے دیکھو اگر تم نے وہاں رکھے تھے تو وہیں پر ہوں گے۔“

”میں کیا بکواس کر رہی ہوں۔ کہ نہیں ہیں وہاں۔ وہاں کیا پوری اسٹڈی میں کہیں نہیں ہیں۔“ وہ دانت کچکا کر بولی۔

”شوہر کہاں ہے تمہارا۔ اس سے پوچھو شاید اس نے کہیں رکھ دیے ہوں۔“
 ”وہ اس وقت فلائٹ میں ہوگا کیسے پوچھوں؟“ وہ

ہاتھ سے نکل گیا تا۔ تو پھر بیٹھی اپنی قسمت کو روٹی
رہنا۔

”اگر اس نے ڈاکو منٹس کی جگہ تھیل کی ہے تو
اس سے کیا فرق پڑتا ہے گھر رہے گا تو میرے نام ہی پر
تا۔“ وہ اس کی بےوقوفی پر سرپیٹ کر بولی۔

”نہ جانے تمہیں اپنے شوہر پر اتنا اندھا اعتماد کیوں
ہے؟ بی بی تم ہو کس جہان میں۔ ہمارے ملک میں ہر
جگہی کام بڑے اصلی طریقے سے ہوتا ہے۔ خیر تمہیں
سمجھانا تو بے کار ہی ہے۔ تمہیں کون سا عقل آجانی
ہے۔“ اس نے بے چارگی سے سر جھٹکا اور کرسی پر
ڈھے گیا۔ چندا اس کی بات سن کر حقیقی معنوں میں
تشویش کا شکار ہوئی تھی۔

”تو اب کیا کہوں میں؟“ اس نے پھر سر پکڑ لیا اپنا۔
”تمہاری لالچ کی حد بھی ہے؟ اس نے تمہارے
نام پر کا دیار کیا شروع کر لیا، تمہاری ساری ہمدردی
اس کے ساتھ ہو گئی۔ کاروبار کا توہنا نہیں، اگر اس چکر
میں گھر ہاتھ سے نکل گیا تو بہت برا ہوگا۔“ وہ سخت
برافروختہ تھا۔

”اب تم خاموش ہو کر مسئلے کا حل بھی بتاؤ گے یا
یوں ہی بھونکتے رہو گے۔“ وہ چڑ کر اسے جھڑکتے
ہوئے بولی۔

”حل کوئی نہیں سوائے اس کے کہ تم اس سے
پوچھو کہ اس نے ڈاکو منٹس کہاں رکھے ہیں؟“ اس
نے سر جھٹکا۔

تب ہی بڑے زور کی بجلی چمکی اور یکفخت موسلا
دھار بارش برسا شروع ہو گئی۔ ان دونوں نے چونک کر
ہوا کی شوریدہ سری کے آگے مجبور کھڑکی کی جانب
دیکھا۔

”یا۔۔۔ یہ تو بہت تیز بارش شروع ہو گئی۔ اب میں
گھر واپس کیسے جاؤں گا؟“ آصف گھبرا کر کھڑا ہوا۔
”کچھ دیر میں بارش رک جائے تو چلے جانا۔“ چندا
نے بمشکل تمام کھڑکی کے پٹ بند کرتے ہوئے کہا۔
”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ اب وہ اطمینان سے اٹھرائی
لے کر بولا۔ ”چلو جب تک میں تمہارے بیڈ روم میں

آرام کر لوں۔“ آصف نے آنکھ دبا کر کہا۔ بیٹھا بیٹھا
موسم اور اس پر چندا کی بے پناہ کشش کی حامل خوب
صورتی وہ ہنسنا نہیں تو اور کیا ہوتا۔

”اپنی حد میں رہو۔“ چندا نے اسے برے دھکیلا۔
”میری حد کیا ہے۔ آج تم بتا ہی دو مجھے۔“ وہ اس
کے مزید نزدیک آکر بولا تھا۔ چندا نے مزاحمت کی
کوشش کی، ایسی مزاحمت جو بے دم بے جان ہوتی
ہے۔

دوسری طرف کمرے میں سونو پری طرح سما
نہنت لی کے متا بھرے جسم سے لگا تھر تھر کانپ رہا تھا
صد شکر کہ بچی سوچکی تھی۔

”نہنت لی۔ اکیلے میں ماما کو بھی ڈر لگ رہا ہوگا
تا۔ آج تو بلا بھی نہیں ہیں۔“

”بیٹا۔ آپ کی ممانیت بہادر ہیں، وہ خوف نہ
نہیں ہوتیں۔“ وہ اسے تھکتے ہوئے بولیں۔ ان کے
علم میں نہیں تھا کہ چندا کی تنہائی پانٹنے والا آچکا ہے۔

”مجھے بارش سے بہت ڈر لگ رہا ہے نہنت لی،
مجھے بابا کی یاد آ رہی ہے بہت۔ آسمان پر تو بارش ہے
تا۔ بابا کا جواز گیلا ہو گیا ہوگا۔“ وہ نیم غنودگی میں بولا۔
نہنت لی شفقت سے مسکرائیں۔

”ہاں۔ یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔ اچھا بس اب دعا
پڑھو اور سو جاؤ۔ اچھے بچے یوں خوف نہ تھوڑی
ہوتے ہیں۔“

”سو نے کی دعا کیا تھی۔ سوری نہنت لی میں بھول
گیا۔“ اس نے نفقت سے کہا۔

”کوئی بات نہیں، روز پڑھ کر سوؤ گے تو یاد رہے گی،
پڑھو اللہم۔“

”اللہم۔“ اس نے دہرایا۔

”بس۔ ابھی نہنت لی نے کہا ہی تھا کہ باہر سے
کسی کے زور سے چلانے کی آواز آئی تھی۔
”یا اللہ خیر۔“ وہ دل کرا تھی تھیں۔



”جو تم کرنے جا رہے ہو، وہ انتہائی خطرناک ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے فون پر کھلا۔ پھر کہیں اور نمبر ملایا۔ دوسری طرف کھنٹی بج رہی تھی۔
 ”ہیلو۔ میں جمیل بات کر رہا ہوں، قاسم سے بات ہو سکتی ہے۔“ اس نے رابطہ طے پر کہا تھا۔



”تمہیں کیا لگتا ہے؟ اجیہ نے کیا اس فیصلے کو دل سے قبول کر لیا ہے؟“ وقار نے میرب سے پوچھا۔ آج میرب چارپانچ دن بعد اپنے کمرے سے نکلی تھی۔ وہ تو دوسرے ہی دن اسی کمرے سے گھبرا کر باہر نکلنے کے لیے پر لول رہی تھی مگر سائے کی طرح اس کے ساتھ موجود لالی نے اسے ہرگز باہر نہ نکلنے دیا۔ وہ بھی احتیاط کے پیش نظر اس کی بات مان گئی تھی۔ اس دوران سائز کو بھی بخار نے آلیا تو وہ بھی گھر ہی پر موجود رہا، ہر چند کہ وہ زیادہ وقت وقار صاحب کے کمرے ہی میں گزار رہا تھا۔ بخار کو گھر ہی پر موجود تھا۔ وہ نہیں ہوتا تو میرب وہ ڈائریاں ضرور ہی پڑھنے کی کوشش کرتی، ظاہر ہے اس کے دل میں کھدبہ ہو رہی تھی۔ وہ ایک بار اس نے سائز کا سر دبانے یا اسے دوادینے کی کوشش بھی کی مگر سائز نے نرمی سے ٹوک کر اسے صرف اپنا خیال رکھنے کی تاکید کی، وہ تو اس کے بدلے بدلے اور سرہانہ انداز دیکھ کر مطمئن اور شلواں و فرحان ہی تھی۔ ٹھیک کہہ رہی تھیں سجدیہ آئی۔ اولاد واقعی اکھڑے سے اکھڑ اور سخت سے سخت آدمی کو اپنا رویہ بدلنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

ان چارپانچ دنوں میں سکون رہا اس لیے سب ہی کچھ مطمئن سے ہو گئے میرب اپنے کمرے سے نکل کر اسٹڈی میں کوئی کتاب لینے کی غرض سے آئی تو وہاں وقار موجود تھے پہلے تو اسے دیکھ کر ناراض ہونے لگے بعد ازاں میرب کے نسلی دلانے پر اسے وہیں بٹھا کر ادھر ادھر کی باتیں کرتے کرتے اجیہ کا موضوع چھیڑ بیٹھے۔

”بظاہر تو وہ خاموش ہو گئی ہے مگر کچھ الجھی الجھی اور پریشان سی لگتی ہے۔ ابھی کچھ دن لگیں گے بابا انشاء

لہذا تم ایک مرتبہ پھر سوچ لو۔“ ہمدانی نے کہا۔
 ”بہت دن سوچ پچار کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے ہمدانی۔ میں تو اسے جان سے مارنا چاہتا ہوں مگر پھر سوچتا ہوں کہ اسے جان سے مار دینے سے مجھے کیا ملے گا۔ میرے بچے میں کی محبت سے تو پیدا انٹی محروم ہیں، باپ کی شفقت بھی ان سے چھین جائے گی۔“ وہ کمری اواسی سے کہہ رہا تھا۔

”یہ انتہائی قدم اٹھانے سے قبل ایک مرتبہ تمہیں ان سے کھل کر بات کر لینی چاہیے تھی۔“

”کیا بات کرتا؟ یہ کہ تم آج تک مجھ سے بے وفائی کیوں کرتی رہیں یا پھر یہ کہ کیا سوچ کر تم میری عزت کو روندتی رہیں یا یہ پوچھتا کہ تمہیں مجھے دھوکا دیتے ہوئے بھی شرم آتی؟ نہیں ہمدانی! اس کی ناربا حرکتوں کا جواز کچھ بھی ہو مگر مجھ میں اتنا طرف نہیں کہ میں اسے معاف کر سکوں، جبکہ معافی تلافی کا سوال ہی کیا۔ وہ معافی کیا مانگے گی جسے اپنی غلطی کا احساس تک نہیں۔“ وہ زخمی لہجے میں کہہ رہا تھا۔

بات اس کی ٹھیک تھی ہمدانی کچھ نہیں بولا۔
 ”مگر اب تم ایک بیٹی کے باپ بن چکے ہو۔ بیٹی کے لیے ماں کا ہونا بے حد ضروری ہوا کرتا ہے۔“

”ماں کا ہونا نا۔ وہ نہ بیٹی ہے نہ بہن ہے نہ بیوی ہے تو وہ ماں کیسے بن سکتی ہے؟ وہ صرف چندا ہے اور کچھ نہیں، وہ اپنے لیے جیسی اپنے لیے مرتی ہے، اسے کسی کی زندگی اور موت سے کوئی سروکار نہیں۔“

ہمدانی بغور اس کی بات سنتے ہوئے خاموش رہا۔
 ”اور پھر بہت مشہور کہاوٹ ہے کہ بیٹی ماں کا عکس ہوتی ہے اور میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ میری بیٹی اس کا عکس بنے۔“ وہ قطعیت سے بولا۔

”ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔“ ہمدانی نے تائید کی جیل خاموش نگاہوں سے اسے دیکھا رہا۔ پھر فون اپنی طرف کھینچ کر کسی کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

”ہاں سنی۔ کیا رپورٹ ہے؟“ دوسری طرف نجانے کیا کہا گیا تھا کہ اس کی آنکھوں سے خون چھلکنے لگا۔

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بے بال لاکھا ہے
- بالوں کو مضبوط اور لمبا کرتا ہے
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- یکساں مفید
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے



قیمت - 150/- روپے

سوہنی ہیرائل 12 بڑی بوتلوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ قصوری مقدار میں تیار ہوتا ہے۔ یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدیا جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف 150/- روپے ہے، دوسرے شہروں کے لئے آڈر بھیج کر ہنڈل پارسل سے منگوائیں، رجسٹری سے منگوانے والے شی آرڈر اس حساب سے بھجائیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے 350/- روپے
- 3 بوتلوں کے لئے 500/- روپے
- 6 بوتلوں کے لئے 1000/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور ٹیکس پارٹ شامل ہیں۔

منی آرڈر بھجئے گئے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگز ب مارکیٹ، سیکٹر فور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دعوتی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیرائل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53- اورنگز ب مارکیٹ، سیکٹر فور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

اللہ آہستہ آہستہ سنبھل جائے گی۔"

"اللہ جانتا ہے کہ میں نے باوجود اپنی ناپسندیدگی کے ان لوگوں سے اس لڑکے سے صرف اس کی خاطر ملاقات کی۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ ساڑھن کتنا ناراض ہو رہا تھا اسے سمجھایا، راضی کیا صرف اس کی خاطر اب وہ لڑکا ہی بد کردار نکلا تو اس سے اجیہ کو بچانا بھی تو ہمارا ہی فرض تھا نا بیٹی۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ اس نے ہمارے خلوص اور محبت پر اس لڑکے کی بددلی محبت کو ترجیح دی۔" وہ رنجیدہ ہو گئے۔

"بابا۔ یہ عمر ہوتی ہی ایسی ہے، ہر چمکتی چیز سونا معلوم ہوتی ہے۔"

"تم بھی تو اس سے محض چند برس ہی بڑی ہو مگر تم تو اتنی تلوکن اور جذباتی سی نہیں ہو۔" وہ میرب کا اجیہ کا دفاع کرنے پر کچھ ناراضی سے اسے دیکھنے لگے۔

"مزلج، مزلج میں فرق ہوتا ہے بابا جان یہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں پھر میری تربیت میں بہت حد تک سہارہ آئی کا ہاتھ رہا شاید اس لیے میری طبیعت میں سنجیدگی بڑھاری اور پھر آؤ آگیا ہو گا ورنہ اگر میں بھی اجیہ کی طرح پبی بڑھی ہوتی تو شاید میری شخصیت میں بھی خللا رہ جاتا۔" وہ بولی۔

"ہاں۔ کہتی تو تم ٹھیک ہی ہو۔ میں نے ان دونوں کی پرورش تو کی مگر تربیت شاید اس طرح نہیں کیایا جیسا کہ ایک ماں کیا کرتی ہے۔" انہوں نے چشمہ امار کر ٹیبل پر رکھ دیا اور ٹھکے ٹھکے سے انداز میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگلی۔

"بابا۔ میرب کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔" آپ دوسری شادی کر لیتے آپ بیک تھے، میسے والے تھے، نہیں تو کم از کم ان کی خالہ، پچھی کسی کے نزدیک رہتے تو شاید۔" وہ اتنا کہہ کر چپ ہو گئی۔ خود اس نے بھی تو یہی حالات دیکھے تھے، خالہ، پچھی یا چچی نائی نے کتنا کہ لیا تھا اسے اور عاشق کو؟

"میں اپنے بچوں کے معاملے میں کسی پر بھی اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔" میرب بے ساختہ مسکرائی۔

"اپنے بچوں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں آپ۔"

”یہی دونوں تو میری کل کائنات میری زندگی ہیں۔“ وہ دل کی گہرائیوں سے بولے پھر پوچھنے لگے۔
”سائز کہاں ہے؟“
”آفس سے آکر کھانا کھا کر پھر دوبارہ کہیں کام سے چلے گئے۔“

”بیخارا تر گیا ہے نا اس کا بے چارہ بچہ بہت محنت کر رہا ہے میں نے تو پچھلے دو سال سے آفس جانا سمجھو ترک ہی کر دیا ہے وہ بھری محبت فکر مندی سے بولے۔

”حالانکہ آپ کو جانا چاہیے۔ ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے۔“ وہ شرارت سے مسکرائی۔

”یہ تو بیٹا جی کہ پہلے منٹ ہو گیا آپ کا۔“ وہ زور سے ہنس پڑے تب ہی لالی نے کمرے میں آکر جھانکا اور اطلاع پہنچائی کہ سائز اسے کمرے میں بلا رہا ہے یعنی وہ گھر واپس آچکا تھا۔

”ہاں۔ ہاں جاؤ آرام کرو وقت بھی زیادہ ہو گیا ہے‘ میں بھی اب آرام کروں گا۔“ وہ اٹھنے لگے۔



وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ سامنے ہی سائز بیڈ پر بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا اس نے بے ساختہ ناک پر دوپٹہ رکھ لیا کہ سگریٹ کا دھواں میرب کے لیے اس حالت میں سخت نقصان دہ تھا اسے دیکھ کر سائز نے سگریٹ الٹیش ٹرے میں مسل دی۔

”کہاں تھیں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”اسٹڈی میں بابا کے ساتھ باتیں کر رہی تھی آپ کہاں چلے گئے تھے۔“ وہ واٹس روم کی جانب بوختے ہوئے بولی۔

”تم فریش ہو کر ٹیرس پر آ جاؤ۔“ اس نے جواب دے دیا۔

یقیناً سائز کا باتیں کرنے کا موڈ ہو رہا تھا اتنا تو وہ سمجھ گئی تھی۔ وہ واٹس روم سے باہر نکلی ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے میں اپنا عکس دیکھا ہاتھوں سے بل ٹھیک کیے اور دروازہ کھول کر ٹیرس پر چلی آئی۔

”ابھی برتھ ڈے ٹویو۔“ وہ ٹیرس میں داخل ہوئی تو سفید اور سرخ گلابوں سے سجا گلدستہ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے سائز مسکرا کر بولا۔

وہ دنگ رہ گئی۔ کین کی خوب صورت سی میز پر چاکلیٹ پائن اپل کیک سجا تھا۔ ساتھ ہی سرخ رنگ کے تھینٹی کارڈز رکھے ہوئے تھے۔ اور دو چار ادھ کھلی گلاب کی کلیاں بھی۔

”آپ کو یاد تھا۔“ اس کے لب خوشی سے کپکپا اٹھے اس نے ہاتھ بڑھا کر بکے تمام لیا۔

”میں کچھ بھی بھولتا نہیں۔“ اس کی بے تاثر نگاہیں مسکراتے لیوں کا ساتھ نہیں دے پار ہی تھیں۔ وہ اسے کندھوں سے تمام کر میز کے نزدیک لایا۔ پھر اس کے ہاتھ میں سرخ رین گئی چھری تھمائی۔

”تو کیک کاٹو۔ رنگ برنگی چھوٹی چھوٹی دو چار موم بتیاں کیک پر بھی تو تھیں مگر روشن نہیں تھیں کیوں کہ ہوا بہت چل رہی تھی۔ ہاں البتہ ٹیرس کی فینسی لائٹ روشن تھی۔

گوکہ میرب کے چہرے کی چمک کے آگے اس وقت تو وہ ماند پڑتی محسوس ہو رہی تھی۔

”ابھی برتھ ڈے ٹویو۔“ سائز گنگنایا میرب نے کیک پر چھری پھیری اس وقت ٹھیک ہاں کا وقت تھا جب سائز نے یہ یادگار لمحہ پیشہ کے لیے اپنے مہیا نل کے کمرے کی آنکھ میں مقید کر لیا تھا۔ میرب نے کیک کاٹیں کاٹا اور سائز کو کھلانے لگی۔

”اب یہ منظر کون Capture کرے گا؟“ وہ پریشانی سے بولی۔

”تم کھلاؤ۔“ سائز نے کہا اور خود اپنے ہاتھ سے تصویر بھی اتاری۔ میرب اسے کھلاتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”ویسے یہ میری زندگی کا یادگار ترین برتھ ڈے ہے۔“ اس نے نشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

”گور میر آگفت۔“ وہ بچوں کے انداز میں بولی۔

”یہ رہا۔“ سائز نے ایک سنہرے کفڑ میں لپٹا تحفہ آگے کیا۔

”تھینک یو سوچ۔“ میرب کی آنکھیں جھللا گئیں۔

”آپ بہت اچھے ہیں۔“ میرب اس کا ہاتھ دبا کر جذب سے بولی۔ آخر کئی نا ایک عورت۔ شوہر کے ذرا سے التفات سے سب کچھ بھول کر اسے دیوتا ماننے والی۔ تب ہی سائز کافون بچنے لگا۔

”مہیلو۔ جی اسلام و علیئم جی میں خیریت سے ہوں۔ لیں بات کر لیں۔“

اس نے فون میرب کی جانب پر بھلایا ابراہیم صاحب کا تھا۔

”اچھی برتھ ڈے میری جان۔“ کیسی ہو تم؟“ وہ پر شفقت بچے میں بولے۔

”تھینک یو بلبل۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟“ عاشر کیسا ہے؟“ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”ہم بھی مالک کا کرم ہے ٹھیک ہیں خیریت سے ہیں، تمہیں یاد کرتے رہتے ہیں۔“ وہ بولے تو وہ افسردگی سے کہہ اٹھی۔

”مجھے یاد کرتے تو میرے پاس نہ آجاتے۔“

”ذہینج بہنا۔ صبح زیادہ ملکہ جذبات نہ ہو اور نہ ہی ہمیں جذباتی مار مارنے کی ضرورت ہے۔“ عاشر تھا۔

”تم تو مجھ سے بالکل بات مت کرو۔“ وہ یکلخت ناراضی سے چچی۔ اتنے مصروف ہو گئے کہ اکلوتی بہن سے بات تک کرنے کی فرصت نہیں۔

”گرتو رہا ہوں۔ جنم دن مبارک ہو بہنا۔“ اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔

”بس۔ بس زیادہ قلمی ایکٹرن بننے کی ضرورت نہیں یہ بتاؤ پاکستان کب آرہے ہو؟“ وہ ہنسی روک کر بولی۔

”بہت جلد۔ عنقریب، صرف اپنے ہلنے یا بھانجی کی خاطر۔“ اس نے کہا تو وہ بے ساختہ جھینپ گئی۔ مگر خوشی بے تحاشا ہوئی۔

”سچ کہہ رہے ہو۔“

”آج تک تمہارے بھائی نے جھوٹ بولا ہے؟“

”ہم بارہ بچے کے بعد بات کر رہے ہیں۔ آج کا دن

کل میں تبدیل ہو چکا ہے۔“

”بلبل۔“ وہاں سے وہ کلن پھاڑ دینے والا جتنا ہی تھوہہ لگا کر ہنس۔

”مذاق پر طرف۔ ہمارا واقعی ارادہ ہے بلباتو یہاں آکر سمجھو بالکل ہی شمس ہو کر رہ گئے ہیں پاکستان کو بہت مس کرتے ہیں اسی لیے ہم نے سوچا ہے وہاں آنے کا۔“

”بہت اچھی بات ہے۔“ وہ ان کے فیصلے کو سراہتے ہوئے بولی۔ ”مجھے بھی بڑی تقویت ملے گی اچھا سنو۔“

اس نے فون کلن سے ہٹا کر دیکھا۔

”ماریہ کافون آ رہا ہے تم رکھو۔“

”افسوس ہے لڑکی! سات سمندر پار بیٹھے بھائی کی قدر نہیں۔ لا فرلانگ کے قافلے پر موجود اپنی سہیلی کے فون کی زیادہ پروا ہے۔“ وہ مصنوعی ماتسف سے بولا۔

”ہاں ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”اس نے اور اس کی امی نے ہر قدم پر ہر مشکل میں میرا بالکل اپنوں کی طرح ساتھ بھلایا ہے، میری سہیلی بن بھی شاید میرا اتنا

اور اس طرح خیال نہیں رکھتی جتنا اس نے کیا ہے۔“

”بس بس۔ میرے سامنے اس با لڑکی کی زیادہ تو تعریفیں مت کرو اچھی طرح جانتا ہوں اس لڑا کن کو۔

دیکھنا اس انجینئر کو ساری انجینئری بھلا دے گی۔“

”ہاں۔ ہاں۔ دیکھ ہی لیں گے اچھا خدا حافظ۔“

اب اس نے ماریہ کافون اٹھالیا۔ ساتھ بے ظاہر ٹیس سے نیچے جھانک رہا تھا۔ درحقیقت وہ ٹیس کی کو نچھائی کا اندازہ لگا رہا تھا۔

”کام تو بن جائے گا۔ مگر ایسا کرنا زیادہ خطرناک ہے۔ کیا بتا اس کی جان چلی جائے اور اگر سچ گئی تو سب کو تلوے گی۔ سب کی تو خیر مجھے کوئی پروا نہیں مگر بابا۔

ان کا کیا حال ہو گا یہ خبر سن کر بڑھتا تو ابھی تک اچیہ کے دیے گئے جھٹکے ہی سے نہیں سنبھلے۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”اور امی اور سعد بھی تمہیں سالگرہ کی مبارکباد دے رہے ہیں۔“

”اور امی اور سعد بھی تمہیں سالگرہ کی مبارکباد دے رہے ہیں۔“

”آئی اور سعد کو میرا شکریہ پہنچا دو۔“ وہ کمرے سے بولی سائز کے کان سعد سن کر کھڑے ہو گئے۔
”تم آؤ تا یار کسی دن سائز بھائی کو لے کر امی کہہ رہی ہیں ہمیشہ ہی کہتی ہیں مگر تم سنتی نہیں۔“ وہ ناراضی سے بولی۔

”یار تمہیں بتا تو ہے۔“ وہ افسردہ ہونے لگی۔
”اچھا۔ اچھا۔“ ماریہ جلدی سے بولی ”اُداس مت ہو صرف خوش رہو خوش رہنا تمہاری حالت کے لیے اچھا ہے۔“

”واہ بھئی بڑی تجربہ کار بن رہی ہو۔“ اس نے چھیڑا۔

”ارے۔“ وہ چلائی ”یہ بھی امی کہہ رہی ہیں۔“
”اچھا۔ ہا ہا ہا“ وہ ہنس دی۔ پھر دو چار ماں وہاں کی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔

”بہت گہری دوستی ہے تم لوگوں کے بیچ۔“ سائز چبھتے لہجے میں بولا۔

”یہ سلمان لالی سے کہہ کر اٹھوا لیتی ہوں۔“ اس نے اس کی بات نظر انداز کر کے جلدی سے کہا مبادا اسے پھر کوئی دودھ پڑ جائے۔

”ارے نہیں۔“ وہ ہوشیار ہوا لالی کو بلوایا تو خواجہ خواجہ میرب کے سر پر منڈلائی رہے گی اور اس کا منصوبہ خراب ہو جائے گا۔ وہ سوچنے لگا۔

”وہ سوچکی ہوگی سائز سے بارہ سے اوپر کا وقت ہو رہا ہے، ایک ہی رکھنا ہے تا فرج میں۔ میں رکھ آتا ہوں۔“ اس نے ایک کی پلیٹ اٹھائی اور کچن میں آکر فرج میں رکھ دی۔ اس کے بعد دودھ گرم کیا اور احتیاط سے یہاں وہاں دیکھا اور اس کے بعد اپنے کرتے کی جیب سے کوئی شیشی نکالی۔ ایک نہ دوس۔ اس میں آٹھ گولیاں تھیں، اس نے ساری گولیاں تھیلی پر نکالیں۔

”اوپ۔ یہ تو دودھ میں کھلیں گی نہیں۔“ وہ فکر مند ہو گیا۔ اس نے یہاں وہاں دیکھا، اسے ہاون دستے کا دستہ دکھائی دیا۔ اس نے بنا شور کیے وہ اٹھایا اور دروازے سے تھیلی نکالی۔ تھیلی میں گولیاں رکھ کر اس پر

دستہ مارا۔ ”ٹھک“ ایک عجیب سی آواز گونجی۔ اسے پیٹہ آنے لگا۔ اس طرح تو بہت شور مچے گا۔ وہ پریشان ہو کر پھر یہاں وہاں دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہ میں مسالا پیٹے کی مشین آئی۔ اس نے تھیلی سے گولیاں نکالیں، انہیں مشین میں ڈالا اور سوچ آگن کر دیا۔ چند سیکنڈز میں سفوف تیار تھا۔ اس نے جلدی سے وہ دودھ میں ملایا، تب ہی اسے لالی کے کوارٹر کی طرف کھانے والے دروازے پر کچھ کھٹکا محسوس ہوا۔ اس نے نہایت تیزی سے دودھ کا گلاس اٹھایا۔ تب ہی دروازہ کھول کر لالی اندر آئی دکھائی دی۔ سائز پر گھبراہٹ سوار ہو گئی۔

وہ لالی کا سامنا کیے بنا اپنے کمرے میں جانے کے لیے باہر نکلا۔ ”ارے صاحب جی۔ آپ کو کچھ چاہیے تھا تو مجھے بلا لیا ہوتا۔ آپ نے کیوں تکلیف اٹھائی۔“ وہ رکا مگر مڑے بنا۔ ”کوئی بات نہیں۔“ کہہ کر تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گیا۔ لالی سونے چلی گئی تھی۔ تب ہی اسے یاد آیا کہ وہ کچن کی کھڑکی بند کرنا بھول گئی ہے۔ بس اسی لیے واپس آئی تھی۔ اس نے کھلی کھڑکی بند کی۔ سلیب پر علوتاً ”نظر ڈالی۔ سب صاف تھا“ بھی

اس کی نگاہ سفید رنگ کی پلاسٹک کی چھوٹی شیشی پر پڑی۔ شیشی اچھی اور مضبوط تھی اور خالی بھی۔

”شریف جو بد ہنسی کا چورن لایا ہے۔ وہ یوں ہی پریا میں پڑا ہے۔ اچھا ہے اس میں ڈال لوں گی۔“ اس نے ہمیشہ کی طرح خالی شیشی اپنے قبضے میں کر لی اور کچن کی لائٹ اور دروازہ بند کر کے واپس اپنے کوارٹر میں چلی گئی۔ دوسری طرف سائز میرب سے کہہ رہا تھا۔

”یہ لو۔ گرم دودھ پی لو۔“

”آپ رکھ دیں میں پی لوں گی۔“ وہ بولی۔

”نہیں ابھی میرے سامنے۔“ اس نے مسکرا کر گلاس تھاما اور پی لیا۔ وہ دودھ پیتے اسے بڑے دھیان سے دیکھ رہا تھا۔

”یہ لیں۔ اور اب آپ بھی سو جائیں سکون سے“ آپ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔“ اس نے بڑے پیار سے اسے دیکھ کر کہا۔

”ہاں۔ اب تو سکون سے ہی سونا ہے۔“ اس کا

اس نے خالی گلاس سامنے میز پر رکھا اور لائٹ بند کر کے واقعی بڑے آرام سے آنکھیں موند لیں۔ اسے ایک بار بھی اس خلی شیشی کا دھیان نہیں آیا تھا۔

”کس کا فون تھا؟“ ثینہ جو قاسم کے پیچھے ہی کھڑی تھی تجسس سے پوچھنے لگی۔
 ”جیل کا۔ مجھے گھربلا لیا ہے۔“ قاسم نے کمری سنجیدگی سے کہا تو ثینہ پریشانی سے بولی۔
 ”خدا خیر کرے۔ رات کے ساڑھے بار بج رہے ہیں ایسی کیا بات ہو گئی۔“

”مجھے کیا بتا“ وہ چڑ گیا بس اتنا کہا ”گھر فوراً“ پہنچوں آدھے گھنٹے تک کیا بات ہے کیا معاملہ ہے؟ پوچھنے پر بھی نہیں بتایا۔ ”وہ خود بہت تشویش زدہ ہو رہا تھا۔“

”ضرور چند اسے لڑائی ہوئی ہوگی بہت منہ زور اور بد تمیز عورت ہے نہ جانے جیل بھائی اسے کیسے برداشت کرتے ہیں۔“ قاسم خود گئی بار ثینہ کے سامنے چند اکو برا بھلا کہہ چکا تھا۔ اس لیے ثینہ نے بھی یہ ناگوار خیال اس کے متعلق خیالات کا اظہار کیا۔
 ”تم جاؤ اندر بچوں کے پاس۔ میں لکھا ہوں۔“ وہ شدید کوفت زدہ ہو کر بولا۔

”میں بھی چلوں۔“ وہ پر جوش ہو کر بولی تو قاسم نے اسے گھور کر دیکھا۔

”اس برستی بارش میں باہر نکلنا آسان ہے اور میں کوئی مزے کرنے نہیں جا رہا کیا پتا وہاں کیا معاملہ ہے تمہیں مزے سوجھ رہے ہیں۔“ اس نے ڈٹتا تو منہ بنا کر بولی۔

”کیسے جائیں گے۔ آپ کے پاس جیل بھائی کی طرح گاڑی ٹھوڑا ہی ہے۔ سارے بھیگ جائیں گے۔“

”جو بھی ہو جانا تو پڑے گا۔“ وہ پر سوچ لہجے میں بولا۔

کچھ دیر قبل ہی اس کی آنکھ مل گئی تھی کہ عجیب سی گھبراہٹ کے تحت کھل گئی۔ اس کی سانس بہت تیز چل رہی تھیں۔ ہاتھ پیر بلکہ پورا جسم آگ کی طرح تپ رہا تھا اس پر مستزاد چکرانا سر اور کھلی۔

”یا اللہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے مجھے۔“ وہ بمشکل تمام اٹھی اور روم فریج سے پانی کی ٹھنڈی بوتل نکل کر منہ سے لگالی۔ ٹھنڈا پانی پی کر اسے کچھ راحت کا احساس ہوا تھا۔ تب ہی اسے زور کی لپکتی آئی۔ وہ واش روم کی طرف بھاگی۔ اس کی تپتی ہوئی خون کیا تھا۔ وہ ہراساں ہو گئی۔ منہ پر پانی ڈال کر باہر نکلی اور بے چینی سے کمرے میں چکرانے لگی۔

”یا اللہ یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔“ اس کا دل ہی طرح گھبرا رہا تھا۔ وہ مختلف قرینہ کیات کا درد کرنے لگی۔ تب ہی درد کی ایک شدید لہر گئی جو اس کی کمر سے اٹھی اور وجود کو چیرتی چلی گئی۔

”سارے! وہ خوف و ہشت سے چلائی تھی۔“

قاسم جب جیل کے گھر پہنچا وہ گھر کے باہر غائب اسی کا شکر تھا۔ بارش اب رکی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ رفق لوں ہدائی بھی موجود تھے۔

”کیوں جیل۔ اس وقت اس طرح کیوں بلا لیا مجھے سب خیریت تو ہے۔“ اس نے جیل و دیگر سے مصافحہ کرتے ہوئے تشویش سے پوچھا۔

”اندر چلو۔“ وہ غیر معمولی سنجیدہ تھا۔ قاسم کو اس کے انداز پر اچنبھا ہوا۔ وہ تینوں مشینی انداز میں گھر کے اندرونی جانب بڑھنے لگے۔ ان کے انداز پر جیل کو وحشت ہونے لگی۔ بارش جو کچھ دیر سے رکی ہوئی تھی ایک مرتبہ پھر رستا شروع ہو چکی تھی۔ سارے گھر میں خاموشی کا راج تھا۔ جیل نے یہاں وہاں دیکھا اور پھر اسرار طریقے سے قاسم سے کہا۔
 ”اوتھ۔“

”کچھ پتا تو چلے یہ کیا تماشاً ہے۔ چند اکہاں ہیں؟“
اس صورت حال سے اس کے اعصاب کشیدہ ہونے لگے۔

”خود ہی دیکھ لو کہ تمہاری بہن کہاں اور کس کے ساتھ ہے۔“ اس کی آواز میں سانپ جیسی پھنکار تھی۔ قاسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

”دروازہ تو ڈورسٹی۔“ وہ بے چنگ انداز میں بولا۔
”جیل۔“ ہمدانی نے اس کا ہاتھ پکڑا ”تم دروازہ پر دستک دو۔“

”ہرگز نہیں۔“ اس نے کٹھور بن سے اس کا ہاتھ جھٹکا ”تم دروازہ تو ڈورسٹی۔“ اس کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں، نہ جلنے وہ ضبط کے کون سے مرحلے سے گزر رہا تھا۔

”آخر اجرا کیا ہے۔“ قاسم عاجز آ گیا۔

”تو ڈورسٹی۔“ رقیہ خیم خیم لور تو اتا تو جوان تھا۔ حکم ملتے ہی آگے بڑھا اور پوری قوت سے دروازے کو دھکا لگایا۔ دوسری تیسری ضرب کی شدت اندر لگی کنڈی پرواشت نہ کر سکی اور ٹوٹ کر گر پڑی۔ اب دروازہ کھل چکا تھا اور قاسم کی پوری آنکھیں بھی۔ آصف حواس باختہ بیڈ سے اٹھ کر باہر بھاگنے کی کوشش کرنے لگا۔ چندا حق رقیہ خیم خیم صورت حال کی سنگینی کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگی۔

”بے غیرت۔ ذلیل۔“ ان واحد میں قاسم اس پر پل پر پل پہلے پل پکڑ کر اسے کھینچا۔ پھر پوری قوت سے پے در پے پھینچوں سے اس کا منہ لال کر دیا۔ دوسری طرف رقیہ نے جھوٹے آصف کو دبوچ رکھا تھا۔ ہمدانی نہایت السوس سے یہ منظر دیکھ رہا تھا اور جیل۔

وہ یوں ساکت تھا گویا بے جان بت مگر نہیں۔ بت نہیں تھا۔

کیونکہ بت محسوس نہیں کر سکتے مگر وہ کر رہا تھا۔ غصہ، دکھ، تکلیف، نفرت، چندا اوندھے منہ بڑی سسک رہی تھی۔ اس نے تو خواب و خیال میں بھی اس صورت حال کا تصور نہیں کیا تھا۔

”اور تو۔“ اب قاسم رقیہ کی گرفت میں مچلتے آصف کی جانب لپکا۔

”تو ارہ بد معاش تیری یہ ہمت۔“ وہ اب لائوں اور گھونٹوں سے اس کی تواضع کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ مار مار کر خود بھی تھک کر بیڈ پر لاچارگی سے ڈھے گیا۔ آصف کو جو چار حوث پڑی تو اس کا سارا نشہ پل بھر میں ہرن ہو گیا۔

”اب تو تم جان ہی گئے ہو گے کہ تمہیں یہاں بلائے کا مقصد کیا تھا۔“ کمرے میں طاری موت کے شلے کو جیل کی آواز نے توڑا۔

”تمہاری یہ بد کردار۔ ذلیل اور بیخ بہن۔ میں نہیں جانتا کہ ان کا تعلق کب بڑا، شاید میری شادی سے پہلے۔ میں نے اس عورت کو بہار، محبت، مان سب دیا، آنکھ بند کر کے اس پر اعتبار کیا، اس نے جب جو فرمائش کی، میں نے اسے پورا کرنے کی کوشش کی۔ اسے زیادہ کی ہوس تھی، میں نے خود کو کاروبار میں کھپا دیا، تاکہ اس کی لامحدود خواہشات کی تکمیل کر سکوں۔ اسے مٹھیاں، بھر بھر کر شاپنگ کرنے کے لیے نوٹ حملائے اور ایک بار بھی پلٹ کر انتظار نہیں کیا کہ یہ میرے پیسے کہاں کس پر لٹا رہی ہے اور اس نے جو کہا، مجھے کیا دیا؟ اب یہ بھی سنو۔ بے زاری۔ غصہ، تنکناہٹ، ہر وقت کی ناشکری، ہر وقت کی جھج جھج مگر میں یہ سب بھی پرواشت کرنا رہا، سوچتا تھا کم عمر ہے، ڈے دار یوں سے گھبرا گئی ہے اس لیے ایسا کرتی ہے، میں نے اس کے لیے نوکر لائی رکھ دی، تاکہ اسے آرام ملے مگر اس نے مجھے مزید بے آرام کر دیا۔ مجھ سے جھوٹ بول کر اپنا وقت باہر گزارنے لگی، کس کے ساتھ کہاں اس نے جو کہا میں نے ہنسا شک کیے اعتبار کیا، اس کی ہر بات پر میں اسے جتنی سہولیات اور آزادی دیتا گیا یہ اس قدر ہی گھر سے بے پروا، مجھ سے بے گالی، حد تو یہ ہے کہ اپنی اکلوتی اولاد کی طرف سے بھی بے فکر ہوتی چلی گئی مگر میں اس سے محبت کرتا تھا، اس لیے اسے ہمیشہ نرمی سے سمجھانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ میرے تو گمان میں بھی

نہیں تھا کہ یہ مجھ سے بے وفائی کرے گی اور میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں مگر بے وفائی نہیں۔ ہرگز نہیں۔“

چند جو پوری آنکھیں کھولے حیرت سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ لکھت تھلا کر کھڑی ہوئی۔

”جو ابھی تم نے اپنی کرم نوازیوں کی فہرست گنوائی ہے تو تمہارے پاس آگ جو ان اپنی عمر سے آدھی اور خوب صورت بیوی کو اپنے لے سے ہاندھے رکھنے کا اس کے علاوہ جواز تھا بھی گیا۔ وہ بیوی بے فیرتی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”تمہیں صرف ایک اسی بات کی تکلیف نہیں تھی چند۔“ وہ زہر خند ہوا۔ ”تم چراغ محفل تھیں۔ اور میں نے تمہیں اپنے گھر میں سجانے کی کوشش کی تم یہاں مطمئن کیسے رہ سکتی تھیں تمہاری فطرت ہی میں کھوٹ تھا۔ تمہاری نیت ہی میں ملاوٹ تھی۔“

”ہاں تو پھر۔“ وہ بے وقوفانہ دلیری سے بولی۔

”تمہیں یہ تمنا لگا کر کیا مل گیا؟“ وہ اپنے بھٹے ہونٹ سے بہتے خون کو صاف کرتے ہوئے بولی۔ جمیل طنز سے ہنس پڑا۔

”مجھے کچھ ملا ہوا نہ ملا ہو، تمہیں البتہ جو ملے گا وہ ساری زندگی میرے سینے میں جلتی آگ پر ٹھنڈی پھوار بن کر رہے گا۔“

”پسیلیاں نہ بھجواؤ جمیل۔ صاف بات کرو۔“

مدھم آواز میں قاسم ہنسندیدگی سے بولا تھا۔

”میرا مشورہ یہ ہے کہ معاملات آرام سے بیٹھ کر طے کر لیے جائیں۔“ ہمدانی نے لقمہ دیا۔

”تم کون ہوتے ہو مشورہ دینے والے اپنے کام سے کام رکھو۔“ اس نے بری طرح سے ہمدانی کو جھڑک دیا۔

”ہاں تو ذرا میں بھی تو دیکھوں تم کیا کرنے لگے ہو۔“ وہ سینے پر ہاتھ باندھ کر مضحکہ خیز ہنسی لیوں پر سجا کر بولی۔

قاسم اٹھ کھڑا ہوا۔ جمیل کے چہرے پر درد آئے پھر لیے تاثرات دیکھ کر سہم گیا تھا۔

”میں وقار جمیل فاروقی۔ بھانگی ہوش و حواس تمہیں طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا

ہوں۔“ قاسم، جمیل، جمیل، جمیل پکارتا ہی رہ گیا۔

”ہا ہا ہا۔“ چند نے اک بڑبڑائی قہقہہ لگایا ”تو یہ دینے والے تھے تم۔ آصف ذرا دیکھو تو“ اس نے کونے میں کھڑے آصف کو فاتحانہ نگاہوں سے دیکھا ”جو چیز ہمیں چاہیے تھی وہ جمیل نے کتنی آسانی سے ہمیں دے دی ہے ہمیں زیادہ تر وہ تو نہیں کرنا پڑا۔“

”ہوش کر بے حیا۔“ قاسم نے روتے ہوئے اسے بری طرح پکڑ کر بھینچوڑ دیا۔

”میں نے تو سنا تھا کہ طلاق وہ چیز ہے جو عورت کو اگر مانگنے پر بھی ملے تو وہ روتی ہے۔ تو کس تلاش کی عورت ہے آخر۔ جو اپنی بربادی پر قہقہے لگا رہی ہے۔“ ہمدانی بھی متاسف نگاہوں سے کبھی جمیل تو کبھی چند کو دیکھ رہا تھا۔ رفت ہونق ہونا کھڑا تھا۔

”بربادی کیسی بربادی؟“ اس نے اپنا آپ چھڑایا ”برباد تو یہ ہوا ہے میں نہیں اس نے مجھے طلاق دے کر ترقی کی، کامیابی کی راہیں میرے لیے کھول دی ہیں۔ اس کے پاس رہ کر مجھے کیا ملتا تھا۔ اور اب بس بہت ہو گئی تمہاری ڈرامے بازی، لکھو یہاں سے۔“

اس نے حقیر سے قاسم کو پیچھے دھکیلا ”گور تم۔“ اس نے جمیل کی جانب اشارہ کیا اور چنگلی بھا کر اسے باہر کا راستہ دکھایا۔ اب قہقہہ لگانے کی باری جمیل کی تھی۔

چند اب بڑے خطرناک تیور لیے اپنی دانست میں جمیل کی بے وقوفانہ ہنسی کو دیکھ رہی تھی۔

”شاید بات تمہاری سمجھ میں نہیں آسکی چند اب تکم!“

جمیل نے ہنسی روک کر آنکھوں سے بہتا پانی صاف کرتے ہوئے کہا۔

”تو معاملہ یہ ہے کہ یہ گھر چھوڑ کر میں نہیں تم جاری ہوں۔ تم میں تمہیں دس مہینے ہوں اپنے باپ کے گھر سے لایا ہوا مسلمان اگر اٹھانا چاہو تو تم اٹھا سکتی ہوں اور ہاں۔ ایک چیز بھی۔“ جمیل جتا کر بولا۔

”ایک چیز بھی تم میری دلوانی ہوئی اس گھر سے لے کر نہیں جاسکوگی۔ چلو جلدی کرو۔ تمہارے پاس وقت کی بہت قلت ہے۔“ اس عرصے میں پہلی بار چند کے چہرے پر زلزلے کے آثار پیدا ہوئے تھے۔ آصف

خونخوار نگاہوں سے چندا کو دیکھ رہا تھا۔ بات چندا کے لیے بڑی ہو یا نہیں اس کے ضرور پڑنی تھی۔

”لگ۔ کیا کو اس کر رہے ہو۔ یہ گھر میرے نام پر ہے۔ اس نے ہٹلا کر یاد دلایا۔

”جیل کی تصحیح کر لو یہ گھر تمہارے نام پر تھا کبھی اب یہ میری ملکیت ہے اور میں تمہیں طلاق دے چکا ہوں۔“ وہ حفاٹھا رہا تھا۔

”کینے۔“ چندا بری طرح بھڑک کر اس پر چبھی۔ جیل نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر پیچھے دھکیلا تو وہ لڑکھڑا کر بری طرح گری۔

”میں نے کہا نا۔ نکلو یہاں سے بے غیرت عورت۔“

”یار۔ خاموش ہو جاؤ۔ اس پاس تو اواز جائے گی تو کیا عزت رہ جائے گی تمہاری۔“ ہدانی نے سمجھانا چاہا۔

”میری اب بھی کیا عزت رہ گئی ہے معاشرے میں۔“ وہ دکھ سے ٹوٹی آواز میں بولا۔

”میں نے انتہائی غیرت کے دلوں میں بھی اپنی عزت اور وقار پر سمجھوتا نہیں کیا اور اب۔ اب جبکہ معاشرے میں میری کچھ عزت کچھ مقام ہے تب اس عورت نے مجھے کہیں منہ دکھانے کے قاتل نہیں چھوڑا، مجھے نفرت ہے اس کے وجود سے، اسے کو فوراً نکل جائے یہاں سے، نہیں تو میں کچھ کریںٹھوں گا۔“ وہ چندا کی جانب پلکا۔

”اب کھڑی کیا ہو۔ اٹھاؤ اپنا سامان اور جاؤ اس کے گھر جس کی خاطر تم نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔“ قاسم نے خون آشام نگاہوں سے اسے گھورا۔ اتنی دیر سے بے وقوفوں کی طرح خاموش کھڑے آصف نے پہلی بار لب کشائی کی۔

”میری خاطر نہیں اپنے خوابوں کے خاطر میں تو صرف ذریعہ ہوں اس کے نزدیک اپنی منزل تک پہنچنے کا۔“ چندا نے بے یقینی سے اس کی جانب دیکھا۔ اس نے کندھے اچکا دیے۔ وہ بلا کا جاذب نظر اور پینڈ سم تھا اور سچ تو یہ ہے کہ جو بھی تھا چندا کو اس کا ساتھ پسند بھی

تھا۔ ”کس قدر ٹائٹلدار سہارا تلاش کیا ہے تم نے۔ لو دیکھ لو آناش کی لوگین گھڑی میں ہی تمہیں اس نے تمہاری اوقات حناوی۔“ جیل نے ایک اور وار کیا۔ ”چلو اب نکل بھی چکو۔“ وہ غرایا۔

”ہاں۔ میں تو چلوں۔“ آصف جلدی سے نکلنے لگا۔

”رکو۔“ قاسم نے ٹھنڈی برف جیسی آواز میں اسے پکارا ”چند ا تمہارے ساتھ جائے گی اور اگر تم نے انکار کیا تو میں تمہیں جان سے مارنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔“ یعنی قاسم اسے اپنے ساتھ لے جانے پر راضی نہیں تھا۔ چندا کا سارا غور، طنز، جھاگ کی طرح بیٹھ چکا تھا۔ پھر یک بیک ہی اس کے ذہن نے پینٹریڈ لانا اور وہ بری طرح چبھی۔

”خالم شخص تو نے مجھے میرے معصوم بچوں سے جدا کر دیا۔ اللہ مجھ سے ضرور حساب لے گا۔“ اب وہ بے بسی سے رو رہی تھی۔ بچوں کے تذکرے پر جیل لعل سا ہو گیا پھر بولا۔

”بچوں سے تمہیں کتنی محبت ہے میں اچھی طرح جانتا ہوں، مجھے ایبوشن بلیک میل کرنے کی بجائے تم اپنا سامان سمیٹو۔“

”نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی یہاں سے۔“ وہ روٹے ہوئے نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

”نکلو۔“ جیل کا ضبط جواب دے گیا اور وہ ہاتھ پکڑ کر اسے تھپتھپے ہوئے باہر نکالنے لگا۔ گھر کے باہر کھڑی نہنت لی رو پڑیں۔ بے لگام خواہشیں انسان کو اسی طرح برہلا کرتی ہیں۔ پتا نہیں سونو کو کیسے کیا ہوا، وہ نہنت لی کا آچل چھوڑ کر چندا کے پیچھے بھاگا۔

”ممان۔ ممان۔ مت جائیں۔ آپ مت روئیں۔ پلیز بلا۔ پلیز انہیں مت نکالیں۔“ اس کا پیر نہ جانے کس چیز سے رہتا تھا۔ وہ منہ کے بل گرا۔ نہنت لی دوڑ کر اس کے نزدیک آئیں۔ مگر جیل رکا نہیں۔ اس نے چندا کو باہر نکل کر دم لیا اور حق مہر کا چیک اور چند زیورات، جو شاید اس کی ملکیت تھے ایک

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

”آپ میرو ہیں؟“ ڈاکٹر نے پائیندہ نگاہوں سے اسے دیکھا وہ جینپ گئی پھر نفی میں سر ہلادیا۔
 ”بس تو پھر مطلب آپ کی سمجھ میں نہیں آسکتا“
 آپ کی سمجھ میں تو آگیا ہے نہ۔“ اس نے سحر یہ بیگم کی جانب دیکھا جو منہ کھولے بے یقینی سے ڈاکٹر کی بات سن رہی تھیں۔

”تک کہ ایسے کسے۔ میرا مطلب ہے کہ وہ ہرگز اتنی بڑی بے وقوفی نہیں کر سکتی۔“

”آپ یہ سب ہمیں نہیں پتا ہم انہیں ٹریٹ کر رہے ہیں آپ دعا کریں۔“ وہ کہہ کر چل دیں۔
 ساڑھے تین گھنٹے کو ریڈور میں تھا نہیں اس لیے ڈاکٹر کی بات سن نہیں سکا۔

”ہی ڈاکٹر کیا کہہ رہی تھیں؟“
 ”وہ اس نے غلطی سے شاید کوئی دوا وغیرہ کھالی ہے اس کا ری ایکشن ہو گیا ہے اس کنڈیشن میں کوئی دوا اپنی مرضی سے نہیں کھانی چاہیے۔“ وہ بیچ پر بیٹھ گئیں۔ ان کا ذہن عجیب عجیبے کا شکار ہو گیا۔
 ”وہ ایسا تو نہیں کر سکتی۔“ ماریہ انکاری ہوئی۔

”دعا کرو اس کی طبیعت بنا کوئی نقصان ہوئے سنبھل جائے پتا نہیں سچی کس نوحہ کا شکار ہو گئی ہے۔“ وہ بے بدبے غصے سے بولیں۔

”نوحہ یا سازش؟“ ماریہ کے ذہن میں جھماکے ہونے لگے۔



ثمنہ کے توسط سے چندا کی طلاق کی خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے خاندان میں پھیل چکی تھی۔ ساتھ ہی یہ بات بھی کہ اس کے شوہر نے اسے اس کے ”آشنا“ کے ساتھ رتنے ہاتھوں پکڑا تھا۔ بہنوں کے دلوں پر یہ خبر مانند برق گری تھی اور بی جان۔ ان کے دل نے تو یہ امدہ تاک خبر سن کر دھڑکنایا چھوڑ دیا تھا۔ سب ان کی موت کا ذمے دار چندا کو ٹھہرا رہے تھے۔ سب نے اس کا ہیکٹ کر دیا تھا۔ بہنوں کو بھی اس سے شدید نفرت ہو چکی تھی۔ کسی کے دل

تھیلی کی صورت اس کے منہ پر مارے۔ آصف کے چہرے پر ”برے پھنے“ والے تاثرات تھے۔
 ”یاد رکھنا۔ میں تجھے چھوٹوں گی نہیں۔ جیسے تو نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ میں بھی تجھے جیتے جی کہیں کا نہیں چھوٹوں گی۔ یہ میرا تجھ سے وعدہ ہے۔“ اسے جیسے دور سا بڑا گیا تھا۔

آصف نے زیورات کی تعمیل اٹھائی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ”اب چلو اس سے پہلے کہ تمہارا شوہر۔ میرا مطلب ہے کہ وہ کینہ انسان پولیس بلوالے“
 ”عرش سے فرش پر آجانے کے اور آگ کو کیا کہتے ہیں؟ چندا بس اسی اور آگ کے زیر اثر تھی۔ ذہن ٹھل سوچیں منتشر اور قدم۔ وہ اٹھ تو رہے تھے مگر منہ نامعلوم تھی ہمیشہ کی طرح۔ اندر کھڑے چاروں نفوس کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ ایک گھر ٹوٹا تھا۔ چار زندگیاں تباہ ہوئی تھیں۔ آگے زندگی کا نقشہ کیا ہونے والا تھا۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ آگ سے کھینے کا منطقی انجام ہو چکا تھا۔



”آخر اسے ہوا کیا ہے؟“ سحر یہ از حد پریشانی سے پاس سے گزرتی ڈاکٹر سے پوچھنے لگیں۔ رات ساڑھے تین بجے ساڑھے اسپتال لے کر آیا تھا۔ میرب کی حالت بے حد خراب تھی۔ اسی نے سحر یہ اور ماریہ کو بلوانے کا کہا۔ اس نے بلوایا۔ اب وہ لوگ پچھلے آدھ گھنٹے سے ڈاکٹروں کی بھاگ دوڑ دیکھ رہے تھے۔

”دیکھیں بی بی۔“ ڈاکٹر اپنے مخصوص لہجے میں بولی۔ ”نہ جانے آپ کے ہسپتال نے کون سی دوا استعمال کر لی ہے اس کا ری ایکشن ہو رہا ہے اور کچھ نہیں آ رہے اگر بے بی نہیں چاہیے تھا تو شروع میں ہی کچھ کر لیتیں اب ان کا چھٹا مینہ چل رہا ہے۔ ایسے میں دوا لئی نے کیا کرنا تھا سوائے ان کی طبیعت خراب کرنے کے۔“

”کیا مطلب؟“ ماریہ نے انہیں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔

میں۔ زندگی میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں بچی تھی،
تو گھر میں اسے جگہ کیسے دی جاسکتی تھی۔



میرب بری طرح رو رہی تھی۔ ساریہ اور سعدیہ بڑی
فکر مند سی بیٹھی تھیں۔
”بیٹا۔ مجھے تم سے ایسی بے وقوفی کی امید نہیں
تھی۔ تم ماشاء اللہ بڑھی لکھی لڑکی ہو۔ ایسے کیسے تم
نے استعطا حاصل دوا استعمال کرنا۔“ سعدیہ ذرا ڈپٹے
ہوئے بولیں۔

”کیا!؟ وہ رونا دھونا بھول کر ایک دم ان کی جانب
تخیر سے دیکھنے لگی۔

”اسی کاری لکھن ہو ہے، وہ تو شکر کرو کہ
تمہارے بے بی کی جان بچ گئی بڑی دقتوں سے ڈاکٹروں
نے معاملہ سنبھالا۔“

”تکڑوں نے ایسی کوئی دوائی استعمال نہیں کی کیوں
کہوں گی پانگل ہوں کیا؟“ وہ غصے سے بولی۔

”تو اس کا مطلب یہ ہوا۔“ ماریہ ٹھہرے لہجے میں
بولی۔ ”کہ کسی نے تمہیں چالاکی سے وہ دوائی کھلا دی
تھی۔ دیکھو نا تمہارے ساتھ ہونے والے پے در پے
حادثے اتفاق تو نہیں ہو سکتے۔ یہ پوری کڑی سے جو
سازش کرنے والے تک جاتی ہے۔“ وہ کہہ کر
خاموش ہو گئی۔ میرب گہری سوچ سے چونکی۔ سعدیہ
حیرانی سے اس کی بات سن رہی تھیں۔

”مگر کون کر سکتا ہے یہ گھٹاؤنی حرکتیں۔ ہمارے
گھر میں تو زیادہ لوگ بھی نہیں۔“ وہ خائف ہو کر
بولی۔

”شاید اجیب۔۔۔ کیونکہ تمہارے ساتھ یہ حادثات
اس کے نکاح کے بعد ہونا شروع ہوئے ہیں کیا بتاؤ
ساز بھائی اور انکل کا عقد تمہیں نقصان پہنچا کر
نکل رہی ہو۔“

”نہیں۔۔۔ وہ ایسی نہیں ہے۔“ میرب بے یقینی
سے بولی۔

”کیا فضول باتیں لے کر بیٹھ گئی ہو لڑکی۔“ سعدیہ

نے گھر کا۔
”میں فضول نہیں بول رہی ہوں امی۔ اب تو اس
کی جان پر بن چکی ہے، خدا را آپ لوگ اب تو اس
معاملے کو سنجیدگی سے لے لیں۔“ وہ ہنسی بولی۔
”آئی۔! ٹھیک کہہ رہی ہے ماریہ۔ اتنے
سارے حادثات محض اتفاق نہیں ہو سکتے۔“ وہ بولی۔
”تو پھر کون ہو سکتا ہے اس سب کے پیچھے۔“ وہ
تشویش ناک لہجے میں بولیں۔
”اجیبہ جذباتی احمق لڑکی ہے۔ وہی ہوگی۔“ ماریہ
و ثوق سے بولی۔

”لالی۔ ہاں لالی۔ وہ گھر کے فرد کی طرح ہے،
سب کے معمولات پر بھی عموماً نظر رکھتی ہے، پھر
آپ نے اسے میرا خیال کرنے کی تاکید کی تھی وہ میرا
خیال بھی رکھ رہی تھی۔ اس سے کچھ معلوم کرنے کی
کوشش کرو شاید اس نے گھر میں کوئی غیر معمولی بات
نوٹ کی ہو۔“ میرب بحیف آواز میں بولی۔

”ہاں۔ یہ ٹھیک رہے گا۔“ ماریہ متفق ہوئی۔
”ایسا کہ۔ میری چند ضروری چیزیں بھی گھر سے
لے آؤ، میں تو ظاہر ہے رات میں درد سے بے حال
افرا تفری میں یہاں آئی تھی اور جا کر لالی سے کچھ
معلوم بھی کرنے کی کوشش کہ۔ ذرا بہتا تو چلے کہ کون
ہے جو میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی چھین لینے
کے در پے ہے۔“ وہ برہم ہو کر بولی۔

”ہاں۔ سائز کے ساتھ چلی جاؤ۔“ سعدیہ بولیں۔
”وہ تو کبھی کے گھر جا چکے ہیں۔“ اس نے طنزیہ کہہ
”سائز گھر چلے گئے؟“ میرب حیرانی سے پوچھنے
لگی۔

”ہاں۔“ ماریہ سلگتے ہوئے بولی ”ان کی شاید نیند
ڈسٹرب ہو گئی ہوگی وہی پوری کرنے گئے ہوں گے۔“
سعدیہ کچھ نہیں بولیں، تاہم رنج و غصے کے طے
جلے تاثرات ان کے چہرے پر ابھرے تھے۔



جیل نے لاہور ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا اور اپنے

ملنے جلنے والوں کو بھی۔ وہ پچھلا ہر حوالہ اپنی زندگی سے کھینچ کر پھینک دینا چاہتا تھا۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ اس کی بہنیں اور بھائی دور دراز شہروں میں بے تھے۔ پھر اس کے کوئی خاص قریبی رشتے دار بھی لاہور میں نہیں تھے۔ سو انہیں چندا کے متعلق وہی پتا چلا جو جیل نے بتایا اور جیل نے بڑے آرام سے اس کے مرجانے کی خبر انہیں دی۔ سب نے جنازے پر نہ بلانے کا شکوہ کیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہونا تو دیتا۔ وہ اپنے بچوں کی اچھی تعلیم و تربیت کے لیے انہیں لے کر اچھی آس۔ یہیں کاروبار بھی منتقل کر لیا۔ زندگی کا پچھلا باب بند ہو چکا تھا۔ نیا شروع ہونے کو تھا۔

”سلام بی بی جی۔ آپ اتنی صبح صبح۔ سب خیر تو ہے جی۔“ لالی کرسیاں بھاڑ رہی تھی جب لاؤنچ میں داخل ہوئی ماریہ کو دیکھ کر حوٹھی۔

”بڑا سانا پھیلا ہوا ہے گھر میں، لگتا ہے سب بڑی میٹھی نیند سو رہے ہیں۔“ وہ طنز بولی۔

”سائز صاحب تو آفس گئے ہیں۔ اجیہ بی بی کلرک بڑے صاحب اٹھ گئے تھے۔ اب اپنے کتابوں والے کمرے میں ہیں۔“

”چہ خوب!“ وہ بھنا کر بولی۔ ”یعنی میرب مرے یا بچے ان لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اس کی آواز حیز ہو گئی۔

”کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ بی بی جی۔“ لالی بے چاری گھبرا کر بولی۔ ”وہ تو اپنے کمرے میں سو رہی ہیں، آپ چلی جائیں ان کے کمرے میں۔“

”وہ اپنے کمرے میں نہیں۔ اس وقت اسپتال میں دروسے بے حال پڑی ہے اور یہاں بے خبری کا یہ عالم ہے کہ کسی کو کچھ معلوم ہی نہیں۔“

”کیا بات کر رہی ہیں آپ۔“ وہ یک دم بولی ”کیا ہوا نہیں؟“

”کسی نے اسے بے بی ضائع کرنے کی دوائی کھلا دی

ہے۔“

”اللہ میرے اللہ۔“ لالی دھک سے رہ گئی۔

”کس نے کہا یہ ظلم۔“

”یہ تو تم لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے۔“ وہ درشتی سے بولی۔

”بہر حال۔ میں اس کے کمرے میں اس کا ضروری سامان لینے جا رہی ہوں۔“ وہ کہہ کر اس کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ اس کا ضروری سامان سمیٹا اور بیگ لیے واپس نیچے اتری۔ تو پریشان صورت لیے وقار کو اپنا منظر پایا۔

”کیا ہوا بیٹا۔ یہ لالی بتا رہی ہے کہ میرب اسپتال میں ہے۔“

”جی۔ رات میں اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ سائز بھائی اسے اسپتال چھوڑ کر واپس گھر آ گئے تھے۔ حیرت ہے۔ انہوں نے آپ کو نہیں بتایا۔“ وہ شرمندہ کرنے والے لہجے میں بولی۔ وہ از حد شرمندہ ہو بھی گئے۔

”بس بیٹا۔ شاید میری پریشانی کی وجہ سے نہیں بتایا ہو گا۔“

”مگر اسے ہوا کیا ہے؟“ اب انہیں کیا بتاتی۔ اس قدر بولی۔

”کوئی دوائی کھلا دی ہے کسی نے اس کو۔ اس لیے اس کی طبیعت بگڑ گئی۔“

”کسی نے دوائی کھلا دی۔ کس نے؟“ وہ استعجابیہ لہجے میں بولی۔

”وہ سب مجھے نہیں معلوم۔ امی آپ کو فون کریں گی۔ باقی باتیں ان سے معلوم کر لیجیے گا۔ مجھے ذرا جلدی ہے۔“ وہ اجنبیت سے کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

”یہ ہو کیا رہا ہے میرے گھر میں۔“ وہ بیڑاتے ہوئے صوفے پر بیٹھ کر اپنا ماتھا سہلانے لگے۔ ساری بات سنتی لالی کے ذہن میں کچھ کلبلا یا تھا۔

”آپ خود سوچیے بھائی صاحب۔ کیا آپ ان

READING
Section

پوچھنے لگی۔ میرب نے ذہن پر زور ڈالا۔
 ”ہاں۔“ اسے یاد آیا ”مگر یہاں تھارت کو سوتے
 وقت۔“ وہ کہہ کر مگر مگر سب کی صورت دیکھنے
 لگی۔ ”مگر وہ تو ساتر روز دیتے ہیں۔“
 ”ساتر بھائی! انا ماریہ بری طرح جوئی۔“

”یہ کیا ہے ہوئی ہے بیٹی۔“ وقار بے حد کرتی
 سے نکلنے لگے کو وہیما کر کے بولے۔
 ”خدا انخواستہ یہاں عدالت نہیں لگی ہوئی جو تم
 یوں جرح پر جرح کر کے بار بار میرے بچوں کو کٹھڑے
 میں کھڑا کر رہی ہو۔ آخر حد ہوتی ہے کسی بات کی۔“

”دیکھیں بھائی صاحب۔ خدا تو اب واقعی ہو ہی گئی
 ہے۔ آج میرب مرتے مرتے بچی ہے اللہ نہ کرے
 آج اگر یہ جان سے چلی جاتی تب پھر پائی کیا رہ جاتا۔ اگر
 یہ کسی مشکل میں گرفتار ہو گئی ہے تو اسے آزاد کروانا
 ہمارا ہی فرض بنتا ہے کہ نہیں۔ پہلی بار یہ
 ایکسپلنٹ سے بل پل بچی چلو اسے اتفاق سمجھ بھی
 لیا جائے تو پھر وہ ہاتھ روم میں پھسلنے والا واقعہ جس
 کی زد میں آپ کی کام والی بے چاری مفت میں آگئی۔
 اس کے بعد اس کا سیرٹھیوں سے پھسل جانا کیا آپ کو
 نہیں لگتا ہے کہ کوئی قریبی ہی یہ سب کام کر سکتا
 ہے۔“

”مگر وہ سیرٹھیوں سے اتفاق ہی تو پھسلتی تھی۔“
 وقار کمزور اور بڑے لمحے میں بولے۔
 ”اتفاق۔ نہیں بھائی صاحب۔“ اس کے سپررز
 کے ٹکڑوں کو باقاعدہ کسی کیا گیا تھا۔ یہ بات ہمیں لالی
 نے بتائی تھی کہ باجی کی چپل چکنی ہو رہی تھی۔ اس
 نے بعد میں دعویٰ بھی شاید۔ ”سعدیہ بولیں۔“

”دیکھیے ہم کسی پر شک نہیں کر رہے مگر ہمیں بچی
 کی سیٹھی بھی تو کرنی ہے نا ایسے کیسے چلے گا۔“ سعدیہ
 کالجہ ترش تھا۔
 میرب اب آنکھوں پر بانڈر کے سسک رہی تھی۔
 ماریہ غالباً ”اب بھی واقعات کے تلے ہانے جوڑنے
 میں مصروف تھی اور وقار وقار سر جھکائے مجرم سے
 بنے بیٹھے تھے۔ آخر کیا تھا یہ سب۔ ان کی تو سمجھ

مسلحہ حادثوں کو اتفاق سمجھ سکتے ہیں۔“ وقار ماریہ
 کے نکلنے کے کچھ دیر بعد خود بھی میرب کو دیکھنے چلے
 آئے تھے۔ اب حال احوال کے بعد سعدیہ بیگم نے
 صاف صاف بات کرنے کی ٹھان لی تھی۔ وقار سوچ
 میں پڑ گئے۔ میرب دھیرے دھیرے سسک رہی تھی۔
 ماریہ ہاتھ باندھے غصے میں کھڑی تھی۔

”مگر میں آپ کی بات تسلیم کر بھی لوں۔ تو ایسا
 کون ہے جو اس قسمی جان کو دنیا میں آنے سے قبل ہی
 ختم کرنا چاہے گا۔ میں کس پر شک کروں۔“ وہ الثالان
 ہی سے پوچھنے لگے تو ماریہ جھٹ سے بولی۔

”ظاہر ہے گھر والوں کے علاوہ آپ شک کر بھی
 کس سے سکتے ہیں۔“ اس کی بات پر وقار نے ناگواری
 محسوس کی۔

”بیٹی! گھر والوں کو اس سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے
 بات سوچ سمجھ کر منہ سے نکالنی چاہیے۔“

”بھائی صاحب۔ بات غور کرنے کی ہے کہ کوئی
 اس کے پیچھے اگر پڑا ہوا ہے تو دشمنی ہی میں پڑا ہوا ہے
 نا اور ایسی دشمنی کون کر سکتا ہے۔“

”ارے بیٹی۔ میں یہی تو کہہ رہا ہوں کہ گھر میں
 کون کر رہا ہے اس سے دشمنی کسی کو کیا غرض پڑی
 ہے۔“ وہ چڑ گئے۔

”غرض کا تو پتا نہیں ہو سکتا ہے کہ کوئی اپنی ناکام
 آرزوؤں کا بدلہ نکال رہا ہو۔“ ماریہ بولی۔ وقار چونک کر
 پوچھنے لگے۔

”کون۔ کون نکال رہا ہے بدلہ کسے کہہ رہی ہو؟“
 ”ہم کسی کو نہیں کہہ رہے۔“ سعدیہ جلدی سے
 بولیں اور ماریہ کو آنکھیں دکھائیں وہ ہونہ کہہ کر
 دوسری جانب دیکھنے لگی۔ ”یہ تو آپ معلوم کریں ہم
 تو بس یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان واقعات کے عقب میں
 کوئی نہ کوئی وجہ ضرور موجود ہے۔ اب دیکھیں نا کسی
 نے تو اسے دوا دی ہی ہے نا۔“ بات منقول تھی وقار
 سوچ میں ڈوب گئے۔

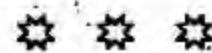
”تمہاری جب طبیعت خراب ہوئی۔ اس سے
 پہلے تم نے کچھ کھلایا تھا۔“ ماریہ تفتیشی انداز میں



آصف نے چندا سے نکاح نہیں کیا۔ اس نے چندا کو تب تک اپنے ساتھ رکھا جب تک اس کے پاس حق مہر کی رقم اور زیور موجود رہے۔ وہ دونوں ہی نکاح کالج سے فارغ تھے۔ لہذا قانون کا خرینہ جلد ہی ختم ہو گیا اور نوبت پہلے تو ایک دوسرے کو کوٹنے پھر رہا جھلاکنے اور آخر میں علیحدگی تک آئی۔ چندا حقیقی معنوں میں ریوڑ پر آئی تھی۔ خود غرض تھی اس لیے بے غیرت تھی۔

سو وہ بڑی بے غیرتی سے اپنی دانست میں اپنے ”باب“ کے گھر گئی۔ وہاں وہی ہوا جو اس کے ساتھ ہو سکتا تھا۔ یعنی قاسم نے اسے گھر میں گھسنے بھی نہ دیا۔ اس روز اتفاق سے مانو بھی وہاں آئی ہوئی تھی۔ اسے چندا کی دیگر گوں حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ اس نے ازراہ ہمدردی سے اپنے کراچی والے گھر کا ایڈریس تمھارا کیا کہ کسی ضرورت پڑے تو وہاں آسکتی ہے۔ چندا نے غصے سے ٹھیکیاں پیچھے ہوتے ان سب کو لعن طعن کا لیاں، گوٹنے دیے اور وہاں سے سیدھی ستارہ کے گھر چلی آئی۔

”مہوں۔ تو کرتے ہیں پھر کچھ۔ سب سے پہلے تو تمہارا کام کرنا ضروری ہے۔ یقیناً تم کروگی ہی۔ میں بات کرتی ہوں کسی سے۔ لیکن پہلے ہی بتادوں ضروری نہیں کہ تمہیں کوئی بہت اچھا رول یا کام ہی ملے۔ جو بھی ملے گا شکر کر کے کر لیتا۔“ اس نے صاف لفظوں میں جتایا اور چندا کے پاس پہلے کی طرح نہ آہنڈ تھے نہ نخرے دکھانے کی اجازت۔ سو وہ خاموش ہی رہی۔



گھر واپسی پر وقار کے دل و دماغ یہ جلد چپ اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ سوچنا چاہتے تھے مگر عجیب بات تھی کہ سوچ نہیں پارہے تھے۔ کئی دیر سے ایک ہی انداز میں اپنی مخصوص رائنگ چیئر پر اپنے کمرے میں بیٹھے

ہوئے تھے۔ ان کے سامنے رکھی چائے کبھی کی ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ تب ہی لالی دستک دے کر جھجکتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

”صاحب جی۔“ اس نے انہیں پکارا تو ان کی سوجوں کا ارتکاز ٹوٹا۔ انہوں نے بے تاثر سنجیدہ نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”وہ۔ جی میں نے سنا ہے کہ بی بی جی کی طبیعت کوئی دوائی کھالینے سے بڑھ گئی ہے۔“ وقار ہنوز اس کی جانب سابقہ انداز سے دیکھتے رہے۔

”وہ۔“ کچھ دیر سٹش وینچ میں جتلا رہی پھر اس نے جیسے کوئی فیصلہ کر کے اپنا سیدھا ہاتھ آگے کیا۔

”یہ مجھے کل رات سلیب پر خلی رکھی ہوئی ملی تھی جی۔ میں نے اپنی دوائی رکھنے کے واسطے اسے اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا تھا اس پر کیا لکھا ہے، مجھے پڑھنا نہیں آتا، آپ دیکھیں۔“ کہیں یہی دوائی تو بی بی کو نہیں دی کسی نے۔“

وہ ڈرتے جھجکتے کہہ ہی گئی۔ وقار نے جھٹ اس کے ہاتھ سے ٹھیکسی چھین کر دیکھی اور اس لیے انہوں نے سوچا کاش۔ انہیں بھی پڑھنا نہ آتا ہوگا۔ انہوں نے اپنے کرڑتے ہاتھوں پر قابو پا کر پوچھا۔

”کہاں سے اٹھائی یہ۔“
”کل رات سلیب پر رکھی ہوئی تھی وہیں سے۔“
وہ خائف ہو کر بولی۔

”کس نے رکھی تھی وہاں۔ تمہارا تو زیادہ تر وقت وہیں گزارتا ہے، کیا تم نے دیکھا تھا کسی کو؟“ وہ یوں بول رہے تھے جیسے بولنا نہ چاہتے ہوں۔

”وہ جی۔ بلور جی خانے سے نکلے تو میں نے سائز صاحب کو دیکھا تھا وہ بی بی کے لیے روٹھ لے جا رہے تھے۔“ اس کی آواز میں بارود تھا جو وقار کے وجود کے پرچھے اڑا گیا۔

”وہ صاحب آپ کو یہ شیشی اس لیے دی کہ آپ پتا لگا سکیں کہ کہیں یہ تو وہ زہر نہیں جو بی بی کو دیا گیا ہے۔ بی بی بہت اچھی ہیں، نہ جانے کون ان کے پیچھے پڑ گیا ہے۔“ وہ نرمی ہوئی آواز میں بولی۔

چاہیے اور پروا ہو بھی کیوں، ان لوگوں نے میری پروا
بھلا کب کی ہے جو مجھے ان کی ہو؟ اب وہ مجھے میں
آئی۔

”بس تو۔۔۔ تو تیار رہ بہت جلد تو میرے پاس آنے
والی ہے ہمیشہ کے لیے۔“ گل کی آنکھوں میں سرخ تھی۔
سرشاری تھی اور لہجے میں کھٹک۔

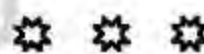


میرب ڈیڑھ دن اسپتال میں رہ کر ماریہ کے گھر آچکی
تھی۔ اس پورے عرصے میں سائر نے ایک بار بھی فون
کر کے اس کی خیر خیریت دریافت کرنے کی چنداں
ضرورت محسوس نہیں کی اور یہی چیز اسے بری طرح
چھ رہی تھی اور ماریہ کے شکوک کو یقین میں بدل رہی
تھی۔

”اگر اس سب کے پیچھے واقعی سائر بھائی ہوئے
تو۔۔۔“ ماریہ کہتے ہوئے فکر مندی اور اضطراب سے
بے عمل سی بیٹی میرب کو دیکھنے لگی۔

”سائر۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں، وہ ایسا کیسے کر سکتے ہیں
دنیا کا کون سا باپ اتنا سنگ دل اور ظالم ہو سکتا ہے جو
اپنی اولاد کی جان کے درپے ہو۔“ میرب کو یہ بات ہضم
نہیں ہو رہی تھی۔

آخر کیا بنے گا اس کی بے یقین زندگی کا۔ ماریہ کو
یہ تشویش کھائے جا رہی تھی۔ وہ میرب کے بستر کے
نزدیک خاموش بیٹھی سوچ رہی تھی اور میرب بیڈ پر
آنکھیں موندے۔



پھر چند اوقات جو بھی جیسا بھی کام ملا وہ کرنے
لگی۔ کیوں نہ کر، سائر نے بھی بے لاگ دلچسپی
کہہ دیا تھا کہ ”کام کرو گی تو میں شیرنگ کی بنیاد پر
سکو گی، وگرنہ تو اپنا راستہ بناؤ۔“ لہذا چند فلموں میں
بطور ایکسٹرا کام کرنے لگی۔ کبھی وہ برہنہ بازو لیے کسی
ڈانس کلب میں منگ منگ کر ہیرو کو رچھاتی دکھائی
دیتی، تو کبھی ہیروئن کی ڈھیروں سیلیوں کی جھرمٹ

تو قار نے سرو آواز میں کہا۔ ”اب جاؤ۔ اور ہاں
آج مجھے بالکل ڈسٹرب مت کرنا۔“ وہ سر ہلا کر باہر چل
دی۔

”یہ۔۔۔ یہ سائر کا کون سا روپ ہے۔ میرا بیٹا اتنا
حساس اتنا نرم دل اور یہ سب؟“ وہ گھرا گھری
”مگر نہیں۔۔۔ مجھے اس پر الزام لگانے سے قبل
ایک بار اس سے پوچھ ضرور لینا چاہیے ہو سکتا ہے کہ
کوئی بہت بڑی غلطی ہو رہی ہو۔ یاں ہو سکتا ہے
کیوں نہیں ہو سکتا۔“ وہ بیک وقت یقین اور بے یقینی
کے درمیان جھول رہے تھے۔



”میگزین مارکیٹ میں آیا ہے اجیب۔ خدا کی قسم
تیری کیا حسین تصویریں آئی ہیں۔ تو دیکھے گی تو مجھے
خود یقین نہیں آئے گا۔“ گل خوشی سے کپکپاتی آواز
میں بولی۔

”ای۔۔۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ ہونٹ
چباتے ہوئے بولی۔

”باگل۔۔۔“ وہ جیسے اس کی معصومیت پر ہنس دی۔
”اب کیوں ڈر رہی ہے تو؟ اب جا کر تو وہ وقت آیا ہے
جب تیرے سارے ڈر اور خوف سب ختم ہو جانے
ہیں۔ میں ہوں نا تیرے ساتھ، تو کیوں گھبرا رہی
ہے۔“ وہ اسے حوصلہ دیتے ہوئے بولی۔

”پھر بھی امی۔۔۔ جب سب کو ہٹا چلے گا تو نہ جانے یہ
لوگ کیاری ایکٹ کریں۔“

”تو ہم نے یہ سب ان سے بدلہ لینے ہی کی خاطر تو
کیا ہے یہ لوگ بڑے عزت دار بنتے ہیں اپنی نام نہاد
عزت کی خاطر انہوں نے تیرا دل، تیری زندگی برباد
کر دی۔ اب تو کیوں ان کی اتنی فکر کر رہی ہے۔ اب
تو تو نے میرے پاس ہی آ جانا ہے۔“

”کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں۔“ وہ یک دم ٹڈر ہو کر
بولی ”انہوں نے میری زندگی کی اولین خوشی کچل کر رکھ
دی، میرے دل کو بننے سے پہلے اجاڑ دیا۔ اب صبح کہہ
رہی ہیں، مجھے ان کے رد عمل کی اتنی پروا نہیں کرنی

میں ہیروئن کی سالگرہ پر تالیاں بجاتی۔ تو کبھی کسی باغ میں ایکسٹرا ڈانسز کے ساتھ ٹھہرتی ہوئی نہ جانے کیا بات تھی کہ اب اس کا ساحر حسن کام نہیں آ رہا تھا۔ ہر چند کہ وہ اب ہر ہا بندی سے آزاد تھی مگر نہ جانے کیا چیز تھی جو اب اس کے آڑے آ رہی تھی۔ وہ بظاہر خاموش ہو چکی تھی مگر اس کے سلگتے دل میں کتنے طوفان نہاں تھے یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ راتوں کو جب کھری چارباہی پر لیٹی تو بلا ارادہ ہی اسے اپنا شاہانہ کمرہ اس کا نرم گرم بڈ اور کمرے کا ٹھنڈا ٹھنڈا ماحول یاد آنے لگتا تو وہ جھلا کر اٹھ بیٹھتی۔ بعض اوقات تو سگریٹ پھونکتے پھونکتے پوری رات بتا دیتی۔ ستارہ کی جب کبھی آنکھ کھلتی وہ اسے ”سو جاؤ چندا“ کہہ کر کوٹ بدل لیتی۔ اس کی نیندیں حرام اور زندگی تلخ ہو چکی تھی اور یہ سب کیا دھرا کس کا تھا۔ بچھو کے ڈنک مارنے سے شاید اسے اتنی تکلیف نہ ہوتی، جتنی بلبلہٹ اس خیال سے چندا کو ہوتی تھی کہ کس صفائی سے کتنی مہارت سے وہ منہ۔ جو اس رجان چھڑکتا تھا جو اس کا دیوانہ تھا اسے بے وقوف بنا گیا تھا۔ کہانی الٹی ہو گئی تھی۔ اسے جنت سے بے غل کر دیا گیا تھا۔ ”تم نے مجھے برباد کر دیا جیل۔ کہیں کا نہیں چھوڑا۔ یہ میرا خود سے وعدہ ہے کہ میں عنقریب تمہیں ایسا مزا چکھاؤں گی۔ ایسا سبق دوں گی کہ تم زندگی بھر یاد رکھو گے۔“ وہ رات کے پچھلے پہر بری طرح سے سگریٹ پھونکتی ہوئی ہڈیانی انداز میں سوچ رہی تھی۔



”لالی! بابا کو بلاؤ کہاں ہیں وہ کیا کھانا نہیں کھائیں گے؟“ سائز آفس سے آکر ہاتھ منہ دھو کر اب کھانا کھانے آیا تھا مگر وہ کھانے کی میز پر اکیلا تھا۔ اجیہ تو خیر اپنے کمرے ہی میں کھاتی تھی مگر وقار تو بہر حال اس کے ساتھ ہی موجود ہوا کرتے تھے۔ اسی لیے اس نے ڈونگوں کے ڈسکن ہٹا کر سالن وغیرہ دیکھتے ہوئے لالی سے دریافت کیا۔

”صاحب صبح سے کتابوں والے کمرے میں بند ہیں انہوں نے منع کیا ہے جی کہ انہیں کوئی پریشان نہ کرے۔“ لالی دیکھی لہجے میں بولی۔

”غیر مت۔“ اس نے سالن پلیٹ میں ڈالتا ہاتھ روک کر پوچھا۔

”وہ جی۔ آپ کو تو بتا ہی ہے تاکہ میرا بی بی کتنی بیمار ہو گئی ہیں جی۔“ لالی بڑی حیران کن پریشانی سے سائز کا نارمل انداز دیکھ رہی تھی۔

”لو۔ اپنا چمچہ واپس ڈونے میں رکھ دیا، کسی کا فون آیا تھا؟“ وہ سخت لہجے میں بولا۔

”نہیں۔ ماریہ بی بی آئی تھیں، یہاں میرا بی بی کا سالن لینے تب صاحب کو بتا چلا۔“

”کیا بتایا اس نے؟“ وہ محتاط لہجے میں نگاہیں چرا کر پوچھنے لگا۔

”بی بی کو کسی نے غلط دوائی کھلا دی ہے جی۔ اس سے ان کی طبیعت بگڑ گئی۔ کہہ رہی تھیں ان کی جان کو خطرہ ہو گیا ہے۔“ سائز یک دم مضطربانہ اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے لائبریری کی جانب بڑھا۔

”صاحب جی کھانا تو کھائیں۔“ لالی نے پکارا۔

”رکھ دو۔ بھوک نہیں ہے۔“ وہ ہٹا دستک دیے اندر داخل ہوا۔ کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

اس نے ”بابا۔“ بلایا پکارتے گھبرا کر لائٹ جلائی۔ سامنے ہی وقار کرسی پر بے حس و حرکت سر تھامے بیٹھے تھے۔

”بابا۔ بابا۔ کیا ہوا آپ کو۔؟“ وہ دیوانہ وار ان کی جانب بڑھا۔ انہوں نے لال لال سرخ سوچی ہوئی آنکھیں اٹھا کر اجنبیت سے اسے دیکھا۔

”کون ہو تم؟“ ان کے منہ سے سرسراتی آواز نکلی تھی۔

”بابا۔ میں آپ کا بیٹا۔ آپ کا سائز۔“ وہ تڑپ کر ان کے گھنٹوں کے پاس آ بیٹھا۔ اور ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھنا چاہا۔

”ہٹو میرے پاس سے۔“ انہوں نے اس بری طرح اس کا ہاتھ جھٹکا کہ وہ ششدر رہ گیا۔ ”اور خبردار جو تم

دیکھ سکتا میں اس کے لیے لوگوں کی آنکھوں میں
خفارت نہیں دیکھ سکتا مجھے اس کی آنکھوں میں متاکی
پاس دکھائی دے رہی ہے ابھی سے۔ میں چاہتا ہوں
پاس بیٹھ، ششہ ہی رہتی ہے اور میں اسے ششہ دیکھنے
کی خود میں ہمت نہیں پاتا مجھے یہ سب اذیتیں چھیلنے
سے آسان اسے ختم کرونا لگتا ہے اس لیے میں اسے
ختم کرونا چاہتا ہوں۔ ختم کرونا چاہتا ہوں۔ ”خجراج کر
اس کا گلا چل گیا تھا۔ اور اس کی آنکھوں سے پیاس
بہ رہی تھی لفظی بہ رہی تھی۔

وقار حتی وقت سے بیٹھے اسے دیکھ رہے تھے۔ ان
کے پاس سارے الفاظ ختم ہو چکے تھے۔

”آپ کو اگر پھر بھی ایسا لگتا ہے کہ میں غلطی پر
ہوں تو بتائیے۔ بتائیے کہ میں کہاں غلطی پر ہوں۔“ وہ
بول رہا تھا گویا ان سے کہلوانا چاہتا ہوں کہ ”نہیں تم
غلطی پر نہیں ہو۔“

”جاؤ یہاں سے۔“ کچھ دیر بعد وقار بھینچی ہوئی آواز
میں دھاڑے۔ ”چلے جاؤ میری نظروں کے سامنے
سے۔“ سائز نے ان کا رد عمل دیکھا اور تپا کچھ کے پلٹ
کر باہر نکل گیا۔ اور انہیں حساب سود و زیاں کرنے
کے لیے چھوڑ گیا۔



میرب کے دلغ میں بچھلے تمام واقعات فلم کی مانند
چل رہے تھے۔ کڑی سے کڑی ملاری تھی۔ جب
بھی سائز غیر معمولی طور پر اس کی جانب ملتفت ہوا
اسے کوئی نہ کوئی حادثہ پیش کیا تھا اور پھر یہ بات تو
سامنے کی تھی کہ طبیعت خراب ہونے سے قبل
آخری بار اس نے دو دفعہ ہی ایسا تھا۔ کڑیاں جڑ چکی تھیں
مگر دل بدل جانے سے انکاری تھا، مگر کوئی حسرت تھی جو
سائز کے مجرم ہونے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ وہ
بری طرح رو رہی تھی جب اس کے لیے جوس لائی
مار یہ بول کھلائی۔

”دیکھا ہوا۔“ وہ جلدی سے اس کے قریب آئی۔

”مار یہ۔ ساریہ۔“ وہ بچکیوں کے درمیان بولی ”سائز

نے اب مجھے پایا کارا تو۔“

”پاپا۔ پلیز وہ بے چینی سے ان کا ہاتھ تمام کر بولا۔
”کیا ہوا ہے مجھے بتائیں تو سہی۔“ انہوں نے ایک مرتبہ
پھر اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”دیکھا جاؤں میں۔ بتاؤ گے تو تم سائز۔ تم بتاؤ گے اور
بالکل سچ اس کے علاوہ مجھے کچھ اور نہیں سننا۔“ وہ
متنبہ کرتے ہوئے بولے۔

”پاپا۔ میں آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ آپ
جاننے ہیں۔“ وہ بے قراری سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”تو پھر بتاؤ کہ میرب کو پاپا تم ہی نے دی تھیں یا
نہیں۔“ وہ اتنے سخت انداز میں بولے کہ ان کے
سوال پر سائز چھرا گیا۔ اور دونوں کی حالت اس وقت
ایسی ہی تھی جیسی کہ سلطان صلاح الدین کی جمعیتیں
کل کرینے کا حکم دیتے وقت ہوں گی۔

”جواب دو سائز۔“ وہ یوں بولے گویا بہت دور سے
آواز دے رہے ہوں۔

”ہاں۔“ بے ساختہ سائز کے منہ سے نکلا تھا۔
”تم نے تم نے ایسا کیوں کیا؟ تم نے اپنی اولاد کی جان
لینے کی کوشش کی۔ تم تم۔“ آگے الفاظ ختم ہو گئے تو
آنسوؤں نے ان کی جگہ لے لی۔

”کیا میں نے تمہاری ایسی تربیت کی تھی؟ بولو
جواب دو آخر تم نے کیوں کیا ایسا؟“ ان کی آنکھوں
سے درد بہ رہا تھا۔

”کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ ایک اور سائز اس دنیا
میں آئے۔“ وہ بیانی مانند انہیں حلق کے ٹپ چینا۔

”ہاں میں نہیں چاہتا کہ ایک اور زندگی برباد ہو۔
مجالیاں، جھڑکیاں دھکے گونے اس کا مقدر رہیں۔ میں
نہیں چاہتا کہ ایک اور عورت، اپنی خواہشوں تلے اس
معصوم کی معصومیت اور بچپن چل دے۔ اس لیے
میں اسے ختم کرونا چاہتا ہوں تاکہ جو لذت میری روح
پر آج تک رہے وہ اس کا حصہ وار نہ بنے۔ میں اس
کا بھلا چاہتا ہوں، میں اس کا خیر خواہ ہوں۔ ہاں میں
اسے مار دوں گا۔ میں کسی اور سائز کو دنیا سے چھپا نہیں
دیکھ سکتا۔ میں اسے اپنے ماضی کے ڈر سے بھاگتا نہیں

ایسا کیسے کر سکتے ہیں وہ اتنے ظالم کیسے ہو سکتے ہیں۔“
 ”میری جان۔ انسان بڑی عجیب شے ہے ایک
 ابھی ہوئی ایسی تھی جس کا سراپا معلوم ہے پھر سارے
 بھائی کا رویہ شروع ہی سے تمہارے سامنے ہے
 تمہیں یاد رہے کہ ان کا ماضی جاننے کی کوشش
 کرو۔ انہیں کسی سائیکلوسٹ کو دکھاؤ۔ مگر تم نے سنا ہی
 نہیں۔“ وہ اس کے قریب بیٹھ کر اس کا ہاتھ سہلانے
 لگی۔

”یہ سب اتنا آسان نہیں تھا باریہ۔“

”مسئلہ یہ ہے کہ تم ضرورت سے زیادہ ڈر پوک
 واقع ہوئی ہو۔ تم اگر ذرا سی بات سے کام لیتیں تمہارا کام
 یقیناً سنبھل جاتا۔“ اس نے کہا۔
 ”مجھے ان سے بہت ڈر لگتا ہے باریہ۔ تم نے انہیں
 غصے میں نہیں دیکھا وہ بالکل حیوان بن جاتے ہیں۔“ وہ
 بتانے لگی۔

”خیر۔“ باریہ منہ بنا کر بولی۔ ”وہ تو ہمیشہ رہتے ہی
 غصے میں ہیں اور حیوان بن جانے کی تم نے خوب کئی کیا
 تمہیں جان سے مار دیتے۔“

”جان سے مار دیتے تو شاید ایک باریہ ساری اذیت
 ختم ہو جاتی مگر تمہیں جانتیں باریہ، مو کا ہاتھ اٹھانا ایک
 عورت کو کیسے اپنی ہی نگاہوں میں ڈکھل کر دیتا ہے۔
 عورت آئینہ نہیں دیکھ پاتی۔ خود سے آئینہ نہیں
 ملایا پتی اپنے آپ کو اپنی نظروں میں گرا دیکھتا لائت
 ناک ہوتا ہے تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔“ وہ
 رنج سے بولی۔

”سارے بھائی تم پر ہاتھ اٹھاتے تھے؟“ باریہ ہکا بکا
 مٹی۔ میرب کے آنسو بہنے لگے۔

”نہایت ہی جاہل اور نفسیاتی انسان ہے وہ تم نے
 ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا۔ دل غم درست کر دیا ہوتا اب
 تک میں نے اس کا۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”پلیز باریہ ایسے مت رہی ایکٹ کرو۔“
 ”لی لی۔ تم انہیں سوساٹھ میں نہیں جی رہی ہو کچھ
 ہوش کے ناخن لو، یہ کیا بات ہوئی کہ تم اس کی خدمت
 بھی کرو اس سے محبت بھی کرو اس کی نسل کی آبیاری

بھی کرو اور وہ جو لیا تم سے اتنی جملات کا مظاہرہ کر کے
 تم اب بھی خاموشی سے چپ چاپ اس کا ظلم برداشت
 کرتی رہیں، یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔“ وہ سخت
 برانگیختہ ہوئی۔

”بس ایک باریہ انہوں نے ہاتھ اٹھایا تھا اس کے
 بعد نہیں۔“
 ”یہ خوب بہت ایک باریہ باریہ کی نہیں اس نے
 ہاتھ اٹھایا ہی کیوں؟ اور مجھے تو تم پر حیرت ہے اب بھی
 بیٹھی اس کی سائڈ لے رہی ہو بجائے اس کا دلغ
 درست کرنے کے اور اب۔ ان کی اس خطرناک اور
 پھر جانہ حرکت کو کیا کہہ کر ڈی لیٹنڈ کر دو؟ مجھے تو کیا
 یقین ہو گیا ہے کہ وہ بنا ہو تمہیں پلاؤ دینے میں ان ہی کا
 ہاتھ ہے۔“ وہ تیز تیز بولی۔ ”ویسے کیا تم اب بھی اپنے
 لیے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی؟“

”نہیں باریہ۔“ میرب اپنے آنسو پونچھ کر غصوں
 لہجے میں بولی۔ ”ایک عورت خود پر ہونے والا ہر چیز ظلم
 زیادتی سب کچھ برداشت کر سکتی ہے مگر ایک ماں۔“
 اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ کسی صورت اپنے بچے پر
 آج نہیں آنے کے سکتی۔ میں نے بحیثیت بھوی کے
 سارے کے ہر غلط لہجے کو مشکل سے ہی سہی مگر
 برداشت کیا مگر اب نہیں، میری برداشت کی حد میں
 آکر تمام ہو گئی ہے باریہ۔ میں اس گھٹاؤ نے جرم پر
 انہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔“ وہ پھر سے رو
 پڑی۔

”مگر تم تو یہ سوچ سوچ کر حیران ہوں کہ ایک باپ
 ایسا کس طرح کر سکتا ہے۔ آخر ان کے دلغ میں ہے
 کیا؟ مائی گاڈ۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ ایک باپ ظاہر
 پڑھا لکھا خیر مو جو ان اتنی بیمار ذہنیت کا حامل بھی
 ہو سکتا ہے کچھ تو کوئی توجہ ہوگی ان کے اس عمل
 کے پیچھے۔ میں نے تم سے کتنا کتنا تم انہیں کھوجنے
 کی کوشش کرو۔ مگر تم نے میری باتوں پر دھیان ہی
 نہیں دیا۔“ باریہ غصے سے کہہ رہی تھی۔

”میں نے کوشش کی تھی۔ مگر وہ بہت گہرے انسان
 ہیں ان کی ذہنیت میں اتنا بہت مشکل ہے۔“

”انسان اگر شان لے تو کچھ بھی مشکل نہیں پھرے
 تو تمہاری زندگی کا سوال تھا خیر۔ میں تو کسی ہوں انکل
 اور عاشر کو صاف صاف ساری بات بتا کر اپنے لیے کوئی
 فیصلہ کرو ویسے بھی اب باقی ہی کیا ہے؟“
 ”نہیں ماریہ۔ میں ایک آخری گوشش اپنا گھر
 بچانے کی ضرورت کروں گی۔ گھر بنانا آسان نہیں ہوتا اس
 گے لیے دنیا کے بل صراط سے گزرتا پڑتا ہے ورنہ گھر
 توڑنا تو بہت آسان ہوتا ہے۔“ میرب کمری سچیدگی
 سے بولی۔ تو باریہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔
 ”کیا چیز تو تم میرب! تمہاری جگہ اگر میں ہوتی۔“
 ”تم میری جگہ ہو ہی نہیں سکتی تھیں۔“ میرب
 نے اس کی بات قطع کی۔

”قدرت انسان کو ہمیشہ اس کے صحیح مقام پر ہی
 پہنچاتی ہے۔ اگر میرے لیے اس گھر کا اس شخص کا
 انتخاب کیا گیا ہے تو یقیناً اس میں اللہ کی کوئی نہ کوئی
 مصلحت ضرور پوشیدہ ہوگی۔ اور بات اگر ایک زندگی کو
 بچانے کی سہارا نہ کی ہو تو یہ تو دنیا کا افضل ترین کام
 ہے اور اس کام کے لیے اس نے مجھے چنا ہے میں
 نہیں جانتی میں اکل ہوں یا نہیں مگر میں گوشش ضرور
 کروں گی کہ اب تو یہ ایک نہیں دو زندگیوں کا سوال
 ہے۔“ وہ اتنے غبرے اور برتاؤ لے کر بولی کہ ماریہ
 اس کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر ششدر رہ گئی۔
 اور اس کے بعد کہنے کے لیے رہی کیا جاتا تھا۔



ساری رات آنکھوں میں کٹی تھی۔ بے چین
 مضطرب اس نے جو کیا تھا اس کے پاس اس کی توجہ
 تھی۔ مگر وہ بے قرار کیوں تھی وہ نہیں جانتا تھا۔ وہ یوں
 ہی ٹکے چلنے میں بنا ناشتہ کیے میرب سے ملنے کیوں
 چلا آیا تھا۔
 ”میرب کہاں ہیں بلاؤ اسے۔“ سامنے سے سعد
 آ رہا تھا اسے دیکھ کر وہ عونت سے بولا۔ سعد ہمیشہ اس
 کا لوجہ نظر انداز کرتا آیا تھا مگر آج بچانے کیوں بھڑک
 گیا۔

”تمیز سے بات کیجئے مسٹر سائز فاروقی۔ یہ آپ کا
 محل نہیں میرا غریب خانہ ہے اور یہاں گفتگو کرنے
 کے کچھ آداب بھی ہیں۔“
 ”تو تم مجھے تمیز سکھاؤ گے؟“ وہ پینٹ کی جیبوں میں
 ہاتھ ڈالے اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا اس کے
 نزدیک آ کر غزلیا۔
 ”نہیں۔“ سعد طنز بھرا بولا ”آپ کی عمر کچھ سیکنے
 سکھانے کی حدود سے تجاوز کر چکی ہے۔“
 ”دیکو اس بند کرو۔“ وہ چہچہا۔ ”بلاؤ میرب کو مجھے اس
 سے بات کرنی ہے۔“ اس کے چلانے پر گھبرا کر سعد یہ
 باہر نکلیں۔
 ”دیکو ہوا؟ اچھا تو تم ہو۔“ اسے دیکھ کر وہ بھی آگ
 بگولہ ہو گئیں۔

”اب کیا لینے آئے ہو لو حمر؟“
 ”مجھے میرب سے ملنا ہے۔“ وہ دھیمہ ہوا البتہ
 نقوش اب بھی تھے ہوئے تھے۔
 ”کیوں بیٹا اب مل کر کیا کرو گے اس سے۔ زعمہ ہے
 یا مگر کی کیا دیکھ کر یہ سلی کرنا چاہتے ہو؟“ ان کا طنز
 انداز اسے استبرائگ۔
 ”وہ میری بیوی ہے مجھے اس سے ملنے کا پورا حق
 ہے۔“

”ہمت خوب۔ یہ حقوق و فرائض آپ کو پچھلے دو
 دن سے یاد نہیں آئے تھے کیا سارے میں تو اسے آپ
 نے کوئی گھر نہیں اٹھا رکھی۔ اب اس سے مل کر کیا
 کریں گے۔“ یہ ماریہ تھی۔
 ”تم سب اچھا نہیں کر رہے۔ میں تم لوگوں کے
 خلاف اپنا قانونی حق استعمال کروں گا۔“ وہ بھنا کر انگلی
 اٹھا کر تنبیہ کرنے والے انداز میں بولا۔
 ”قانونی حق تو میں بھی استعمال کر سکتی ہوں سائز۔“
 نجف و نفہات آمیز آواز پر سب نے بے ساختہ پیچھے
 مڑ کر دیکھا تھا۔
 ”ارے تم کمرے سے کیوں نکلیں؟“ ماریہ بے
 ساختہ اسے تھا نے جو کمرے کو تھا لے ہوئے تھی آگے
 بڑھی۔ سائز یک ٹک اسے دیکھے گیا۔

ہیں ہمیں گھنٹوں دھوپ اور گرمی میں سڑنا پڑتا ہے جبکہ وہ مزے سے ٹھنڈی گاڑی میں بیٹھ کر آتی ہیں گانا ریکارڈ کرو لیا اور یہ جاہ جاب۔ میں تو سوچ رہی ہوں میں بھی ہیروئن ہی بن جاؤں۔" ایک گرمی سائلی اور بھدی سی لاداکار نے خیال آرائی کی۔

"کوئی بنائے تو بن جا۔" دوسری نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"ہاں تو کیوں نہیں بنائے گا مجھ میں کوئی کمی ہے کیا۔" وہ اترائی۔

"کی کمی تو نہیں ہے تجھ میں۔ ہر طرف زیادتی ہی زیادتی ہے۔" دوسری نے اس کا حدود اربعہ ناپنے ہوئے بے ہنگم قہقہہ لگایا۔ اور ان کی ٹوک جھونک سے قطع نظر چندا کی نگاہیں اتنی برنجائے کیا تلاش کر رہی تھیں پھر اس کی نگاہیں اتنی سے ہٹ کر اک منظر پر جم گئیں۔ سائیل ہیروئن سیٹ پر آچکی تھی اور اس کے ساتھ چھتری تانے پٹنا ہوا اس کا نیچر آصف بھی۔ وہ بڑے خوشامد انداز میں اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ چندا کو محسوس ہوا جیسے اس کے وجود میں چند نہیں سی رہ گئی تھی ہوں۔ اس نے سگریٹ چیسٹی اور اٹھ کھڑی ہوئی اور اوکے مکانہ ٹوکا کر اس پر تل پڑی۔ ہیروئن گھبرا کر جلدی سے اس سے دور ہوئی ان واحد میں وہاں ٹھیک ٹھاک تماشاکھڑا ہو گیا۔ آصف اٹھا اس نے بھی پے درپے کئی تھپڑ اس کے منہ پر دے مارے۔

"ذلیل عورت تیری یہ ہمت۔"

"لاچی کینے تجھے بھلا کر دیا تو نے اور تو مزے کر رہا ہے۔"

"بہلو میں نے تجھے نہیں۔ تیری بے لگام خواہشوں اور اونچے اونچے خوابوں نے تجھے کیا ہے۔ بنی آئی تھی ہیروئن، بھول کی۔ ٹکے کی صلاحیت نہیں اور جلی تھی دنیا فتح کرنے۔" اس نے اپنا ہیرا سہلاتے ہوئے کہا۔ جہاں چندا نے اپنی سینٹل سے ضرب لگائی تھی۔

"میں تیرا خون لی جاؤں گی۔" وہ مزید بھڑک اٹھی۔

"سیکیورٹی۔" سیکیورٹی یہ کیا تماشاکر رکھا ہے

"ہات تو مجھے بھی آپ سے کئی ہے سزا دو ٹوک اور آخری بار۔"

"تم بیٹھ جاؤ آرام سے۔" ماریہ نے اسے پکڑ کر کرسی پر بٹھایا۔

"ہاں تو کھیسے۔ جو آپ کو کہتا ہے، اس کے بعد میں وہ کھوں گی جو میں کہتا چاہتی ہوں۔" سعد مسخدیہ اور ماریہ ایک ملاحتی اور کٹ دار نگاہ سائیل پر ڈال کر وہاں سے چلے گئے۔

"گھر چلو۔" وہ نگاہیں چرا کر بولا۔

"گھریا مثل گھو۔ ایک نیا زخم کھلنے کے لیے؟"

میرب نے شکوہ کنل نگاہوں سے اسے دیکھا۔ سائیل خاموش رہا۔ وہ کچھ دیر اسے مستکر نگاہوں سے دیکھتی رہی پھر بولی۔

"آپ جانتے ہیں آپ نے میرے ساتھ کیا کیا ہے؟ آپ نے میری مدد کو نار نار کر دیا ہے۔ میرے کچھ بے ہتھ ڈالا ہے آپ نے، آپ نے قتل کرنے کی کوشش کی، مجھ سے اتنا بڑا اعزاز جھین لینا چاہا، میں آپ کو معاف نہیں کر سکتی، بالکل معاف نہیں کر سکتی۔" وہ دونوں باتوں میں چوہ چھپا کر رو پڑی۔

سائیل کچھ دیر اسے روئے تو بٹھکا رہا پھر اسے لگا جیسے وہ دو منٹ مزید یہاں کھڑا رہا تو پکھل جائے گا۔ اور وہ پھلنا نہیں چاہتا تھا اس لئے قدموں ہٹا کچھ کے جنزی سے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد میرب نے چہرے سے ہاتھ ہٹایا۔ کمرے میں اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا جیسے اس کے دل میں سائیل کے علاوہ۔

"کیا کھوں میرے اللہ مجھے کوئی راستہ دکھلاوے۔" اس نے دل سے فریاد کی تھی۔ تب ہی اس کے ذہن میں ایک خیال روشن ہوا تھا۔



چند اپنی دیگر ساتھیوں کے ساتھ باغ میں ہیروئن کی آمد کے انتظار میں گرمی دھوپ سنے سے بے جاں بیٹھی سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہی تھی۔

"یار ایک تو ان ہیروئنوں کے بڑے خرمے ہوتے

یہاں۔ نکالوں دونوں کو یہاں سے۔“ اسی وقت ڈائریکٹر کی انٹری ہوئی تھی دو منٹ کے اندر اندر سیکورٹی گارڈز نے دونوں کو اٹھا کر لوکیشن سے باہر پارکنگ میں پھینک دیا تھا۔ آصف پر جتن سوار ہو گیا۔

”کہہنی۔ بد کروا۔ خود توجہ ہو ہی گئی اب مجھے بھی کرنا چاہتی ہے اتنی دقتوں کے بعد ترم کو پٹایا تھا تو نے ساری محنت بہلا کر دی۔“ وہ اس کے بل پڑ کر جھٹک دینے لگا۔ وہ دود سے بہلا گیا تھی۔

”چھوڑ مجھے چھوڑ۔“ دونوں لڑتے ہوئے تیزی سے موٹر گاڑی پارکنگ میں داخل ہوئی گاڑی کی زد میں آئے تھے۔

ایک دل خراش حج چندا کے لیوں سے آزاد ہوئی اور اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبا چلا گیا۔



”یہ کیا کہہ گیا ہے سارے“ وقار پوری رات کرسی پر بیٹھے ہی سوچتے رہے تھے۔

”میری ریاضت۔ میری محنت سب رائیج گئی۔ میں اس کے ذہن کو بدل نہیں پایا۔ اس کے اندر کج بھی وہی پانچ چھ سال کا بچہ کنفی مارے بیٹھا ہے جو عورت کے وجود سے خائف ہے، متحضر ہے، بدل ہے، بے یقین ہے، کیا کوئی کسی پر اپنے اتنے کمرے اثرات چھوڑ سکتا ہے؟“

”کیوں نہیں؟“ کوئی ان کے اندر نہلا۔ اولاد سب سے زیادہ متاثر اپنے والدین ہی سے ہوتی ہے۔ اگر سارے دنیا کی ہر عورت کو اسی تاثر میں دیکھنا شروع کر دیا ہے تو اس میں عجیب کیا ہے۔

تو یہ ثابت ہوا کہ میں ہار گیا۔ میں اس بے وفا عورت کے اثرات سے اپنے بچوں کو بچا نہیں پایا۔ اور وہ جیت گئی۔ وہ ان کی زندگیوں سے دور ہوتے ہوئے بھی جیت گئی۔ روتے روتے ان کی آنکھیں پتھر کی تھیں۔ سرد سے پھٹا جا رہا تھا اور جو بیس گتھوں سے اثناج کا ایک دانہ بھی انہوں نے منہ میں نہیں ڈالا تھا۔ تب ہی دوا دوازے پر دستک دے کر لالی اندر آئی۔

”صاحب جی! آپ کے لیے کچھ کھانے کو لے آؤں۔“ وہ لوہی سے بولی۔

”نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔“ انہوں نے حسب سابق جواب دیا۔

”چھائی۔“ وہ جیسے تھک کر بولی۔ ”یہ ڈاکیا دے گیا ہے آپ کے نام کا لٹافہ۔“ اس نے ایک پھولا ہوا سفید بڑا سا لٹافہ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ وہ کئی کئی تھیوے کر لوٹ گئی۔ وقار نے دھندلی آنکھوں سے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ کالے مار کر سے واضح لکھا تھا ”ارجنٹ“ انہوں نے ناچار لٹافہ چاک کیا۔ دل و دماغ کی حالت جیسی بھی ہو دنیا کے دھندے نمٹانے ہی بڑتے ہیں۔ اندر سے نطفے انگش فیشن میگزین کے چھنے کو رہا تھا پھیرتے ہوئے انہیں حیرت ہی ہوئی کہ یہ بھلا انہیں کون بھیج سکتا ہے؟ میگزین کے بیچ سے ایک تمہہ کیا ہوا کٹڈ ان کی گوشیں آگرا۔ انہوں نے کٹڈ کو لالہ اور ان کی نگاہیں سطول پر پھلے لگیں۔

جوں جوں وہ خط کی عبارت پڑھتے گئے ان کے چہرے کی رنگت متحضر ہوئی تھی۔ خط ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا اور ٹپکے ہوئے میگزین کے موڑے ہوئے صفحے پر ان کی نظر پڑی۔ بس اس سے زیادہ سننے کی ان میں تاب نہیں تھی۔ وہ دل پڑ کر دہرے ہو گئے۔

”صاحب جی۔“ انہیں کھانا نہ سہی چاہئے کی غرض سے اندر آئی لالی کے ہاتھ سے کپ چھوٹ کر چکنا چور ہو گیا تھا۔ ان کے نزدیک آکر ان کی پیٹھ سہلائی مگر ان کے ہاتھ پر ڈھیلے پڑ چکے تھے۔



”کیا میں نے کچھ غلط کر دیا ہے؟“ سارے بہت ریش ڈرا سہ کر رہا تھا۔

”مگر نہیں۔ میں نے کہاں کچھ غلط کیا ہے“ ایک زندگی کو روتے سے بچایا ہے، چٹھی سے بہلا ہونے سے محفوظ بنایا ہے، تو پھر اتنے سارے لوگ مجھ سے تالاں کیوں ہیں۔ اگر میں غلطی پر نہیں تو ان سب کا خفا

ہم غریب ہیں تو کیا ہوا ہمارے اندر بھی سوہنے رب نے
بالکل آپ لوگوں جیسا دل لگا رکھا ہے۔ ہم اپنی محبت
بچوں کو آٹھے آٹھے اور مٹکے کھلونے دلا کر نہیں
جنا سکتے۔ ہم ایک وقت خود فائدہ کر کے بچوں کو دو وقت
روٹی کھلا کر ہی اپنی محبت دکھا سکتے ہیں۔ اس کا بھج اور
آنسو بڑے محتر تھے۔

”اگر میں کموں کہ اپنا یہ بچہ کسی کو دے دیا مار دو تو
تم کیا کرو گی؟“

”نئی تہ میں کیوں اپنے جگر گوشے کو خود سے
الگ کموں کیوں دیں کسی کو گھمیل ماروں اس کو میں
کہنے والے ہی کو نہ ختم کروں۔“ وہ خطرناک تیور سے
اسے دیکھنے لگی۔ سزا اس کا کرا سا نوا چہرہ دیکھنے لگا۔
اس کے گرد ایک نور کا ہالہ تھا۔ ایک چاندنی کا حصار
تھا۔ ایک مقنا قیسی کش تھی۔

جو اسے اس خوب صورت ترین عورت میں کبھی
محسوس نہ ہو سکی جو اس کی ”ماں“ تھی۔

یقیناً وہ اس عورت کے وجود پر چھایا ماتا کا نور تھا جو
اس بے حس اور خود غرض اور خود پرست عورت پر
کبھی چھایا نہ سکا تھا۔ اس مصروف سڑک کے
دوسرے کونے میں زمین پر کھٹنے کے کل بیٹھا بے یقین
ساز زندگی کا ایک نیا سبق ایک ان پڑھ اور غریب ترین
عورت سے پڑھ رہا تھا۔

”ماں۔ درد ہوتا ہے۔“ بچہ درد سے ہلایا تو ماں
اسے بے تماشاً چوم رہی تھی اور سزا کو اب کچھ عجیب
طرح سے دیکھ رہی تھی۔

”یہ لو۔“ سزائے اپنی جیب سے سارے نوٹ بنا
گئے اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”گپنے بچے کا علاج
کرو الیک۔“

”ییس۔ یہ تو بہت زیادہ ہیں صاحب۔“ وہ غریب
عورت اتنے بہت سے نوٹ ایک ساتھ دیکھ کر
گھبرا گئی۔

”نہیں بہت نہیں ہیں یہ بہت کم ہیں گھمٹی مال
میں یہی تمہیں دے سکتا ہوں۔ تمہارا کھر کہاں
ہے۔“ عورت نے سامنے خالی پلاٹ پر بنائی گھمٹی

ہونا کیا معنی رکھتا ہے اور میرے۔“ یہاں آکر وہ الجھ
گی۔

”وہ مجھے قائل کیوں کہہ رہی تھی۔ ابھی رو رہی ہے
بعد میں اس کی آنکھوں میں ہی وہ ننھا وجود سب سے
پہلے ٹھکنا شروع ہو جاتا۔ ہونہ ڈرامہ باز عورت۔
اپنی چال بازی اور کمر میں مجھے الجھانا چاہتی ہے، مگر میں
بے وقوف ہوں نہ اس کی باتوں میں آنے والا۔ سب
جاننا ہوں میں۔“ تب ہی اس کی ملاستی سوچوں کا سلسلہ
ایک جھٹکے سے ٹوٹا اور اس نے بے ساختہ ہی بریک
لگائے تھے کہ اس کی گاڑی کے سامنے چلی ٹیکر میں
لبیوس شرٹ سے بے نیاز بچہ یک دم ہی نہیں سے
نمودار ہوا تھا۔

بریک لگاتے لگاتے بھی ہلکی سی ٹکر بچے کو لگ ہی
گئی تو وہ بے چارہ سڑک پر بری طرح گرا تھا۔ سزا کے
حواس مٹل ہو گئے۔

”ہائے میرا بچہ۔ میرا لال۔“ ایک نہایت خستہ
حلیے والی عورت اسے اٹھا کر بری طرح جوئے لگی۔
سزا میکا ٹکی انداز میں گاڑی سے اترا اور گود میں بچہ
اٹھائی ہوئی عورت کے پاس گھنٹوں کے کل بیٹھا گیا۔
”یہ تمہارا بچہ ہے؟“

”میرا بچہ۔ میرے جگر کا کھڑا، صاحب جی آپ
نے تو اسے زخمی کر ڈالا۔“ وہ روتے ہوئے بے بسی سے
بولی۔

”تمہارے کہنے بچے ہیں؟“ سزا اسے محویت بھر
عاطفہ مافی سے دیکھ رہا تھا۔

”بچہ ہیں جی۔ یہ سب سے چھوٹا ہے باب ان کا
نشہ کرنا ہے اسے کوئی اور کام دینا نہیں۔ گھر کا خرچا
میں لوگوں کے برتن چھانڈ کر کے پورا کرتی ہوں اب تو
میرے پاس پیسے بھی نہیں بچے اس کی چوٹ کو کہاں
دکھاؤں۔“ وہ چٹکوں پہ کھول روٹی رہی۔ بچہ الگ درد
سے چلا رہا تھا۔

”تمہیں اس سے محبت ہے؟“ سزائے عجیب
طرح سے عجیب تر سوال کیا۔
”کس ماں کو اپنے بچے سے محبت نہیں ہوتی جی۔“

اور نکل کر چکا ہے۔ کہاں۔ یہ کسی کو نہیں پتا تھا۔
جن کو معلوم تھا چند ان کے لیے مرنے لگی۔
اس روز زندگی میں پہلی بار وہ اتنا مدنی لگا رہا کہ وہ
جان ہی دے دے گی، مگر نہیں۔ ابھی اسے بہت جینا
تھا۔

ساتر آندھی طوفان کی مانند گھر پہنچا تھا۔ وہ راستے ہی
میں تھا جب ملانی کی کل اسے موصول ہوئی۔ وہ جلدی
سے انہیں اسپتال لے آیا اور اب وہ آئی سی یو میں
زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہے تھے۔ ساتر کی خوف
زدہ بیچے کی مانند اس ٹھنڈے رخ نور اعصاب شکن
مخصوص ماحول والے کارڈیوڈیوڈیو پر لگے آف وائٹ
ٹائلرز سے سر نکلتے آنکھیں موندے ہوئے تھا۔ آنسو
ایک قطاری صورت آنکھوں سے بہ رہے تھے۔

”یا میرے اللہ! یہ کیا ہو گیا، میرے پیارے بابا
جان میری ذمیل حرکت کی وجہ سے ان حائل کو پہنچے
ہیں، اگر انہیں کچھ ہو گیا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں
کروں گا۔ آخر کیوں۔ کیوں میں نے انہیں دکھ پہنچایا،
انہوں نے، نہیں کیا نہیں دیا۔ باپ کی شفقت کے
ساتھ ساتھ ماں کی محبت، مگر جو آپ میں نے انہیں کیا
دیا۔“ وقت تھا کہ رات کی مانند انہوں سے پھسلا جا رہا
تھا اور ہرگز رہتا ہوا اللہ اس کے بچے ستارے میں اضافہ ہی
کر رہا تھا تب ہی اس کے فون کی بیل بجی۔ وہ بری طرح
چونکا پھر پراکت سے فون نکال کر آنسو پونچھے ہوئے
رہ گیا۔

”ہیلو،“ اس نے مضمحل سی آواز میں کہا۔
”بیٹا ساتر۔ یہ کیا قیامت ٹوٹ پڑی، ہم پر۔ ایسا کیا
ہو گیا آخر؟“ وہ پارہ روئے ہوئے پوچھیں۔ ساتر نے
بہ شکل تمام خود پر قابو پا کر کہا۔
”بس خالہ جان۔ آپ دعا کریں۔“
”میں نے تو کوئی اور ہی بات کرنے کے لیے وقار
بھائی کو فون ملایا تھا تو کھر سے یہ خبر ملی۔ اچھی۔ اچھی
کہاں ہے۔“ اس کے پونچھنے پر ساتر کو اس کا خیال آیا۔

جگیروں کی جانب اشارہ کر دیا۔
”ہاں ٹھیک ہے۔ میں پھر آؤں گا۔“ وہ اٹھا اور
گاڑی میں بیٹھ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا پھر گاڑی
اشارات کر کے تیزی سے بھاگنے لگا۔
”سوڈائی۔“ وہ عورت کا ہانکا ہی ساتر کو جاتے دیکھ
کر بیڑائی۔

”ہاں درد ہوتا ہے۔“ بیچے نے پھر صدائ لگائی۔
”چل کا کے تیری بیٹی کروا لوں۔ پھر تجھے تیری پسند
کے مرنے کے کہاں بھی پڑی دوکان سے دلو آؤں گی۔“
”بیچ ماں؟“ بیچے کی پہلی آنکھیں روشن ہو گئیں۔
”ہاں۔ ہاں چل۔ اب جلدی چل۔“ وہ اسے کود
میں اٹھا کر تیز چلنے لگی۔
”پتا نہیں کون دیوانہ تھا اور کیسے کیسے سوال کر رہا تھا
کہ عقلا۔“ اسے وہ دہر کر ساتر پر حیرت ہو رہی تھی۔

گاڑی کی کھرنے دوڑوں ہی کو بری طرح کھانٹ گیا
تھا۔ آسف کی کمری ہڈی جبکہ چندا کی سیدھی ٹانگ کا
ٹخنہ ستارہ ہوا تھا۔ کئی دن وہ اسپتال میں پڑی اپنی مختصر
بی جیج پونجی سے اپنا علاج کرواتی رہی پھر جوں ہی پیسے
ختم ہوئے علاج بھی تمام ہوا انتہہ جتا اس کے پور میں
لنگڑا ہٹ آئی جو کلم مل رہا تھا وہ ملتا بند ہوا۔ اسے
کھانے پینے کے لالے بڑھنے ایسے وقت میں ستارہ نے
اس پر نہ صرف رحم کھایا بلکہ اسے زندگی گزارنے کے
لیے صائب مشورہ بھی دیا۔

وہ ایک بار کر میں کام سیکھنے لگی۔ بعد میں اسی بار کر
میں تھوڑی مختصر روز کو کمری بھی کر لی۔ وہ مکمل طور پر تھوڑو
برباد ہو چکی تھی، مگر اس نے اب بھی شکست تسلیم
نہیں کی تھی۔ اب اس کی زندگی کا فکر کوئی مقصد تھا تو وہ
جیل کی بریادی تھی۔ ایسی بریادی جس سے اس کی
مدح کاتب اٹھے اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے
کے لیے اس نے دو تین بار جیل کے کھر جا کر آفس
جا کر دیکھا بھی، مگر تب یہ جان لیا خبر ملی کہ جیل نہ
صرف شہر چھوڑ چکا ہے بلکہ اپنا کھرا لٹا کا دیار بھی کہیں

”کلج میں ہے ابھی اسے یہ خبر نہیں ملی۔“
 میں نے دستیاب فلائٹ لے لی ہے میں دیکھنے
 تک پہنچ رہی ہوں کراچی۔ میرے خدایا۔ میری تو کچھ
 سمجھ میں نہیں آیا یہ سب ہو کیا ہوا ہے۔ میرے کہاں
 ہے اس کی طبیعت کیسی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ یوں مرے مرے انداز میں
 بولی گویا دل سے راضی نہ ہو۔
 ”ٹھیک کہتے ہیں سائے۔“ گل فون بند کرنے کے
 بعد سوچ رہی تھی۔ ”کبھی کے دن بڑے کبھی کی
 راتیں۔ کل تمہارا واؤ مجھ پر بھاری پڑا تھا جمیل۔
 آج میرے مرے نے تمہیں کہیں منہ دکھانے کے
 قائل نہیں چھوڑا۔ میری اذیت اور ناکامی کا ہب اب
 بند ہوا چاہتا ہے اور آج سے تمہارے سکون اور ٹیک
 نائی کے دن گنے جا چکے۔ برسوں پہلے جو دم تم نے
 مجھے دیا تھا۔ جمیل آج اس کا بدلہ میں نے لے لیا ہے
 کہ بہت سالوں سے یہی میری زندگی کا مقصد تھا۔
 اس روز تم فتح کا جشن منا رہے تھے آج میری باری
 ہے پاپا۔“ اس نے دیوانوں کی طرح پورا منہ گھول کر
 بڑبڑاتی فقہہ لگایا اور اپنے سامنے رکھی بوتل میں سے
 مشروب اٹھا اور وہ غنائت چڑھا گئی۔
 اس کے رگ و پے میں۔ ایک عجیب سی سرسستی
 اور سرور چھا رہا تھا۔ سراسر عارضی سرور۔

”کیا ہوا ڈاکٹر؟“ وہ ہراساں ہو کر بولا۔
 ”آپ دعا کریں ہم پوری کوشش کر رہے ہیں اور یہ
 انجکشن فوراً لے کر آئیں۔“
 ”اوکے ڈاکٹر۔“ اس نے ڈاکٹر سے پرچا لیتے
 ہوئے کہا پھر میاں سے مخاطب ہوا۔
 ”آجھا خالہ جان۔ میں رکھتا ہوں۔“
 ”اوکے بیٹا۔ کھرا نامت۔ میں بس ان شاء اللہ پہنچ
 ہی رہی ہوں۔“



”اب تک تو تیری تصویر میں تیرے باپ تک پہنچ
 چکی ہوں گی۔“ اجیہ کلج سے نقل رہی تھی جب اسے
 گل کی کھل موصول ہوئی۔
 ”چھال۔“ وہ بے ساختہ بولی۔ ”جب تو پھر میں گھر
 جانے کی بجائے آپ کی طرف آجاتی ہوں۔“ بجلانے
 وہاں کیا صورت حال ہوئی۔“

”ارے بے عقل۔“ اس نے جیسے سرخوٹا اپنا۔ ”تو
 وہاں جا کر تو دیکھ وہاں جانے کی نہیں تو دیکھی کیسے کہ
 وہاں کیا قیامت مچائی ہے تیری تصویروں نے۔“
 ”غرض مجھے ڈر لگ رہا ہے امی۔“ وہ خوف زدہ سی
 بولی۔ ”بچانے بابا اور سائز مچائی میرے ساتھ کیا سلوک
 کریں۔“

”تا ڈرنے اور گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔“ وہ
 برامان مئی۔ ”جا کر دیکھو تو کہ مجھے براد کرنے والوں کا کیا
 انجام ہوا۔ تمہارے دل کو کھلوانا مجھنے والوں پر کیا ہتی
 اور پھر تمہیں آنا تو ہر حال میں پڑے گا۔ تو آجانا۔“



مہیاہ اور پورٹ سے سیدھی اسپتال چلی آئیں۔
 بکھرے بکھرے حلقے میں سوچی آنکھوں والے
 متوحش سے سائز کو دیکھ کر ان کا دل کٹ کر رہ گیا۔
 ”آپ کیا کہتے ہیں ڈاکٹر۔“ مہیاہ نے پوچھا۔
 ”جو نہیں کہنے بہت اہم ہیں۔“ اس نے مختصراً

بتایا۔ اور سینے پر ہاتھ باندھے پوچھی کھڑا رہا۔
 ”ان شاء اللہ اللہ اپنا کرم کرے گا۔ تم کیل اتنے
 فکر مند ہو رہے ہو۔ اور تم اس کیلے کیل ہو سکتی۔ میرے
 کے گھر والوں کو اس وقت تمہارے ساتھ ہونا چاہیے
 تھا۔ ظاہر ہے اس شہر میں تمہارا ان کے علاوہ کوئی رہنے
 دار بھی تو نہیں۔“ اس نے اس کا سافصہ کیا۔
 ”میں نے انہیں فون نہیں کیا۔“ وہ لگاؤں چرا کر
 بولا۔

”بیٹا حد کرتے ہو۔ انہیں اطلاع تو دینی چاہیے
 تھی۔ رکوش کرتی ہوں میرے کو فون اور یہ اجیہ کہاں

نہیں کرتیں، سارا وقت روٹی ہوئی اجیرہ کو گود میں جو اٹھانا پڑتا ہے وہ بہت کمزور اور چڑھتی بے بی ہے۔ پاپا کراچی اگر بہت زیادہ بڑی رہنے لگے ہیں، عمر وہ جب بھی کام سے واپس آتے ہیں مجھے اور اجیرہ کو اپنے پاس اپنے ساتھ ہی بٹھا کر رکھتے ہیں۔ میں تو سوتا بھی ان کے ساتھ ہوں۔ اجیرہ رات میں ڈسٹرب مت کرتی ہے اس لیے میڈ کے پاس سوتی ہے۔ میں اب زیادہ باتیں نہیں کرتا۔ فریڈ بھی نہیں بنا تا۔ فریڈ زگنڈے ہوتے ہیں۔ میری ماما کے اتنے سارے فریڈ تھے انہوں نے ان کے لیے ہلپا سے لڑائی کی اور ہمیں چھوڑ دیا۔ پیاری ڈائری میں اپنی ساری باتیں اس لیے نہیں بتا رہا ہوں کیونکہ تم سب سے اچھی دوست ہو۔ تم میری ساری باتیں کسی کو نہیں بتا سکتیں۔ برا اس کو نہیں بتاؤ گی تا۔ کیونکہ بابا کہتے ہیں اپنی جملی کی بات دوسروں سے کرنا بری بات ہوتی ہے۔ دوسرے آپ کی لٹلٹ کرتے ہیں، آپ کو دکھ پہنچاتے ہیں، مگر کئی ہو پ کہ تم ایسا نہیں کرو گی۔ نہیں کرو گی نا؟

میرب نے بہتے آنسوؤں کے ساتھ وہ ڈائری بند کی۔
کیا بند تھا ان ڈائیریوں میں۔ یہ راز اب اس پر مکشف ہو چکا تھا۔ اس کا فون بچ رہا تھا اس نے ایک کمری سانس لے کر خود کو تار مل کرنے کی سعی کی۔
”میرب میرب بیٹا۔ میں میرب بات کر رہی ہوں۔“
”جی خالہ جانی! السلام علیکم میری ہیں آپ۔“
”بیٹا۔ اب کیا کہوں۔ تم ساری طبیعت تو خود ٹھیک نہیں۔“

”میں میں ٹھیک ہوں آپ بتائیے۔“ اس کی حیات الٹ ہو گئی۔
”کیا تم جانتی ہو کہ وقار بھائی اور سار کے بیچ کیا ٹینشن ہوئی ہے؟“
”ٹینشن۔ شاید ہاں جانتی ہوں۔“ وہ سوچ کر کہی۔
”مگر کیوں خالہ۔ آپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔“
”ہیں بیٹا۔ دیکھو وقار بھائی اسپتال میں ہیں۔ دعا کرو کہ وہ ساتھ خیریت کے گھر واپس آجائیں۔“ وہ

ہے کیا سے بھی تم نے ابھی تک انفارم نہیں کیا؟“
وہ میرب کو فون ملانے ہوئے بولیں۔ پھر کچھ سوچ کر رک گئیں۔
”ہو گی کلج میں مجھے کچھ نہیں یاد۔ مجھے اس وقت خود اپنی خبر نہیں ہے خالہ! میں کسی کے بارے میں کیا کہوں۔ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔ میری ہی وجہ سے وہ ان حالوں کو پہنچے ہیں۔“ وہ انتظار گاہ میں نصب کر سی پر بیٹھتا ہوا سر ہاتھوں کو مٹھی میں بچھتے ہوئے بولا۔
”تم ساری وجہ سے۔“ مہ پارہ تعجب سے بولیں۔

”کیوں سارا ایسا کیا کیا ہے تم ہے؟“
”میں نہیں بتا سکتا آپ کو۔ میں نے سب کچھ ختم کر دیا ہے۔“ وہ زار و قطار رونے لگا۔ مہ پارہ بھی ابدیدہ ہو گئیں۔ پھر پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

”نہیں بیٹا! اپنے آپ کو قصور وار مت ٹھہراؤ۔“
”نہیں، خالہ! میں سارا قصور میرا ہے۔ میں نے ہی انہیں دکھ پہنچایا ہے۔ وہ اپنی تربیت کو رائیگاں جانا دیکھ کر رونا نہیں کر سکتے۔“

وہ بری طرح رو رہا تھا اور اس کے رونے میں ندامت بھی، شرمندگی بھی، پچھتاوا تھا۔
”آخر ایسا کیا کر دیا تھا اس نے؟“ مہ پارہ نے اذد تشریح سے سوچا۔ اس سے پوچھتا ہے کار تھا کہ وہ کچھ بتانے پر آمادہ ہی نہیں تھا۔ انہوں نے ایک بار پھر میرب کو گل ملانے کا سوچا تھا۔



”میں اب فائبر اسٹینڈرٹس آ گیا ہوں۔ مجھے اب اپنا لاہور والا بڑا سا گھر خوب صورت چھوڑنے سے سجا گاؤں۔ اپنے پرانے فریڈز۔ اسکول ٹیچرز کچھ بھی بہت زیادہ یاد نہیں آتے۔ نیت ملی بھی ہمیں چھوڑ کر اپنی بہن کے پاس بیٹھ کے لیے چلی گئی ہیں۔ اب ہمارے پاس نئی میڈ ہے، ان کا نام صفیہ ہے۔ یہ بہت سخت اور اصول پرست ہیں، مجھ سے زیادہ باتیں بھی

بولیں۔

”کیا؟“ میرب کو دیکھا۔ ”ابا ہوسہ شلا کرؤ میں کیا ہوا میں خیریت سے تو ہیں وہ۔“
”سب ٹھیک ہے بس تم دعا کرو۔“ وہ اتنے متوحش انداز میں بولی کہ مہ پارہ کو اسے ہاتلے پر افسوس سا ہونے لگا مگر ظاہر ہے بتانا بھی ضروری تھا۔
”میں آتی ہوں اسپتال۔“ اس نے کہا۔ مہ پارہ ارے ارے ہی کرتی رہ گئیں۔

اجیرہ ڈرے سے انداز میں گھر کے اندر داخل ہوئی مگر وہاں اس کی توقع کے برخلاف سب ہی کچھ نارمل تھا۔ وہ ہمارے سیدھی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ آج اسے ہر نفس یہ زنداں ہمیشہ کے لیے چھوڑنا تھا۔ اس لیے کسی بھی بات سے زیادہ اسے اس بات کی فکر لاحق تھی مگر تجلے کیلیات تھی کہ باہار اس پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی تھی۔
”اب جو بھی ہو دیکھا جائے گا۔“ اس نے دل کو ٹھنکا تھا۔

میرب، ماریہ، سعیدہ اور سعد کے ہمراہ فوراً ہی اسپتال پہنچی تھی اور اب مہ پارہ کے گلے لگی ہو رہی تھی۔ سائریزی خاموش نگاہوں سے ان سب کو دیکھ رہا تھا۔

”بیٹا کیوں رو رو کر خود کو پٹکان کر رہی ہو۔ اپنی حالت دیکھو۔ تمہیں تو گھر پر رہ کر آرام کرنا چاہیے تھا۔“ مہ پارہ تلخ لہجے میں بولیں۔
”میں نے خواستخواہ تمہیں پریشان کر دیا۔“
”تمہیں آپ نے اچھا کیا جو اطلاع دے دی آخر کڑے وقت میں انسان ہی انسان کے کلام آتا ہے۔“ سعیدہ نے آگے بڑھ کر سارے کندھے پر شفقانہ انداز میں ہاتھ رکھا۔
”تو بھلا تاؤ۔ بچہ بے جاہ اکیلا پریشانی جھیلتا رہا اگر اپنے ساتھ ہوں تو فکر آدمی ہو جاتی ہے اب تم

بالکل فکر مت کرو، دیکھ لینا بھائی صاحب ان شاء اللہ جلد ہی صحت یاب ہو جائیں گے۔“
”ان شاء اللہ آمین۔“ اس نے کہا۔ تب ہی ڈاکٹر ایک مرتبہ پھر ان کی جانب آنا دکھائی دیا۔ سب یکدم خوف سے ارٹ ہو گئے۔
”بیٹا! وہ خطرے سے باہر ہیں مگر پھر بھی تمہیں کھینے نہایت اہم ہیں۔ ہم نے انہیں ایڈر آہرزویشن رکھا ہے آپ بھی دعا کریں۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔
”یا اللہ تیرا شکر ہے۔“ بے ساختہ سائریزی کا مہر چھایا چو کھلا تھا۔ سب ہی اس اطلاع پر اطمینان محسوس کر رہے تھے۔

”اب ایسا کرو بیٹا۔ ہم لوگ یہیں ہیں۔ تم چاؤ مہ پارہ کے ساتھ گھر پر کچھ دیر آرام کرو۔ قریش ہو کر پھر آجاؤ۔“ سعیدہ نے کہا۔
”نہیں۔ میں یہیں رہوں گا۔ یہاں میری ضرورت ہے۔“ وہ ضدی لہجے میں بولا۔
”نہیں بیٹا۔ سعیدہ ٹھیک کہہ رہی ہیں چاؤ گھر چلیے دیکھو اپنا کتنا خراب ہو رہا ہے ایک دو گھنٹے آرام کر کے واپس آجاؤ۔“

مہ پارہ نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ ”اور میرب چلو شہباز تم بھی گھر چلو۔ تم تو شکل ہی سے کمزور اور بیمار لگ رہی ہو۔“ اور میرب نے انکار نہیں کیا کہ اسے بہت سے ایسے سوالات کرنے تھے جن کا جواب صرف مہ پارہ ہی دے سکتی تھیں۔

وہ تینوں ابھی کچھ دیر قبل ہی لاؤنج میں جھکے جھکے اور اپنی اپنی سوچوں میں گم آکر بیٹھے تھے کہ لالی چلی آئی۔
”کیسے ہیں صاحب جی۔ اچھے تو ہیں۔“ اس نے فکر مند سے پوچھا۔
”ہاں۔ تم دعا کرو۔“ مہ پارہ مختصراً بولیں۔ سائریزی صوفے کی پشت سے سر نکال دیا تھا۔ میرب خاموش بیٹھی تھی۔

کی نہ اس میں بہت تھی۔ خط بڑھ کر وہ پتھرا نہیں بلکہ اس کے اندر ساروں سے دہکتا آگش فشاں پھٹ پڑا۔
 ”جیسے کہاں ہے اجیہ؟“ وہ پوری قوت سے دھاڑا تو مہ پارہ لنگھت ہوش میں آئیں اور اجیہ جو اپنا مختصر سا اپنی بس تھامے باہر کی صورت حال سے بے خبر بے نیاز خاموشی سے باہر نکل رہی تھی اس کا جلال دیکھ کر وہیں جم گئی۔

”میں تمہیں جان سے مار دوں گا بے غیرت۔“ وہ اس کی جانب جھپٹا تو مہ پارہ جیسے ہڑیرا کر ہوش میں آئیں۔

جب تک مہ پارہ ان کے نزدیک پہنچیں سڑیک کے بعد دیگرے پھٹیوں سے اس کا منہ سرخ کر چکا تھا۔

”یہ کیا کیا تم نے کیا کیا۔“

”رکھو ہر سارا“ مہ پارہ نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

”تمت رو کیوں مجھے“ میں اسے جان سے مار دوں گا۔“ اس نے ہاتھ پھڑکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”پاکل مت بنو۔ اسے مارنے سے کیا ملے گا۔ مجھے تو افسوس ہے کہ ہمیں پہلے ہی کھل خبر نہ ہوئی۔“

”آپ لوگوں کو تو افسوس ہو گا ہی کہ جس عورت کو آپ لوگ جیتے جی مار چکے تھے وہ زندہ کیسے رہ گئی۔ ظالم ہیں آپ سب۔ میں نے اپنی ماں کا بدلہ لے لیا ہے آپ سب سے۔ آپ مجھے کوئی افسوس نہیں۔“ وہ سرخ چہرے اور وحشت زدہ آنکھوں والی اجیہ، اجیہ نہیں کوئی سودا لنگ رہی تھی اور جو اپنی سب سے قیمتی چیز داؤ پر لگا دے وہ سودا لنگ ہی تو ہوا کرنا ہے۔

”بدلہ لے لیا ہے؟ اپنے باپ کی جان لینے کی کوشش کر کے؟“ مہ پارہ نے ملاحتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ”پور کس بات کا بدلہ ذرا میں بھی تو سنوں۔“ وہ اب قہر آلود نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ سڑیک دونوں ہاتھوں سے سر تھامے زمین پر یوں بیٹھا تھا گویا سب کچھ ہار چکا ہو۔ میرب صورت حال سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ہاں میں تو صبح سے صاحب کے لیے دعا کر رہی ہوں۔ بہت اچھے ہیں وہ بہت خیال رکھتے ہیں ہم سب کا اللہ انہیں لمبی حیاتی دے۔“ ڈاکیا کوئی لفظ نہ دے گیا تھا ان کے نام، جب میں چائے کا پونچھنے لگی تو وہ خط ہی بڑھ رہے تھے۔ خدا کی ماہ۔ لعنت ہو اس لفظ نے پر، مجھے تو لگتا ہے اسی کو بڑھ کر صاحب کی طبیعت بگڑی ہے۔“ وہ ایسے لہجے میں بولی گویا بہت بڑا انکشاف کر رہی ہو اور صبح تو کبھی تھا وہ سب لفظ نے اور خط کا ذکر سن کر رہی طرح چوٹے۔

”ذرا لے کر آؤ۔ کہاں ہے وہ خط۔“ مہ پارہ عجیب بے چینی سے بولیں۔

مہ پارہ خط بڑھ کر دم بخود بیٹھی تھیں ان کے اندر اتنی بہت بانی نہیں رہی تھی کہ وہ میگزین کھول کر دیکھ پاتیں۔

”کیا کیا کیا لکھا ہے کس کا خط ہے؟“ سڑا اپنی نشست سے اٹھا اور بچھٹ کر ان سے کانٹہ چھینا۔ میرب الگ پریشانی اور تجسس سے کبھی کانٹہ کبھی مہ پارہ تو کبھی سڑا کو دیکھ رہی تھی۔

”وقار جیل فارمائی۔ آج سے تقریباً سترو سال قبل تم نے ایک سربراہ مجھے دیا تھا۔ آج میری باری ہے تم نے کیا سوچا تھا کہ چند اتنی ہی ارازاں شے ہے کہ جب تمہارا بی چلے گا اپنی زندگی سے اسے تمہی داماں کر کے نکال بیٹھو گے تو یہ تمہاری بھول تھی وقار جیل۔ اس روز تم نے مجھے برباد کیا تھا آج میں وہ بربادی تمہیں لوٹا رہی ہوں سو سمیٹ۔“

اس میگزین میں چھپی تمہاری ”معموم لوہا کیا ز“ بیٹی کی تصاویر تمہیں احساس دلائیں گی اس بھیا تک قطعی کا جو تم نے مجھ سے سب کچھ دھوکے بازی سے چھین کر رکھی تھی۔ آج کے بعد تم کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔ میرا خود سے وعدہ ہے۔ تم سے وعدہ کر کے میں نے کیا کرنا ہے خود سے وعدہ کر لوں گی تو بھلاؤں گی تو سہی۔

فقط گلخانہ باغ عرف چندہ!!!!

اور میگزین دیکھنے کی اس نے نہ ضرورت محسوس

”بہاگشی تھے، تنگ نظر تھے۔ ان پر شک کرتے تھے۔ انہوں نے ان کی زندگی سچ کر رہی تھی۔ آپ لوگوں نے بھی ان کا ساتھ نہیں دیا وہ انہیں مارتے تھے پینتے تھے کولو کے تیل کی طرح ان سے گھر کے کام لیتے تھے۔ درحقیقت وہ اتنی خوب صورت اور کم عمر ہوئی ڈیور ہی نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے بڑا کر کے رکھ دیا اہی کو۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی نہایت پریشانی میں گزار دی محنت کی مزدوری کی کسی نے انہیں پلٹ کر نہیں پوچھا۔ بہت غلط کیا آپ لوگوں نے ان کے ساتھ بہت غلط۔“ وہ روئے ہوئے بولی۔

”غلط تو ہم نے واقعی کیا اجیہ۔“ مہ پارہ ہائٹ سے اسے دیکھنے لگیں۔

”تمہیں حقیقت سے نا آشنا رکھ کے تمہارا بچپن، تمہاری مصومیت چھن نہ جائے، اس خوف سے ہم نے تمہیں آگے کے عذاب سے بچایا۔ تم لڑکی ذات تھیں، تمہیں آنسو لے وقت کے مسائل سے بچانے کی خاطر تمہارے باپ نے اپنا آہنی شہر چھوڑا، اپنے رشتے داروں سے ملنا جتنا ترک کر دیا۔ تمہیں ایک محفوظ ماحول مستقبل دینے کی خاطر وقار بھائی نے اپنے حال میں کتنے سمجھوتے کیے تھے، یہ مجھ سے پوچھو۔“

”مجھے کسی سے کچھ نہیں پوچھنا۔ جموٹے وقتا باز ہیں آپ سب۔ آپ لوگوں نے بچپن ہی میں میری ماں سے جدا کر دیا مجھے، میں آپ لوگوں کو کسی معاف نہیں کر سکتی۔“ وہ نفی میں سر ہلا کر بری طرح سسک رہی تھی۔

”کیونکر کو وجود سے جدا کرنا ہی بڑا ہے بے وقوف۔ نہیں تو وہ سارا جسم سزا دہا کر ختم کر دیتا ہے۔“ مہ پارہ اب خود بھی روئے لگیں۔ بے بسی کے آنسو۔

”میری ماں کے لیے آپ ایسے الفاظ استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں۔“ وہ درد سے ہلپلائی۔

”حق کی بات رہے تو اجیہ! تم نہیں جانتیں۔ تم کچھ نہیں جانتیں۔ تم نہیں جانتیں کہ وہ کتنی خود

غرض اور مفاد پرست عورت ہے، تم نہیں جانتیں کہ اس نے زندگی میں سوائے خود پرستی کے کچھ نہیں کیا؟ تم نہیں جانتیں وہ رشتوں کو بھاتی نہیں، انہیں استعمال کرتی ہے اور تمہیں سن کر افسوس تو ہو گا، مگر اچھا ہے کہ سن ہی لو کہ وہ تمہیں بھی استعمال کر چکی ہے بہت غلط طریقے سے۔“

”میں نہیں مانتی آپ کی بکواس کو۔“ وہ بدتمیزی سے چٹی۔

”تمہیں مانتا بڑے گا اجیہ۔ تم نے اس کی طرف کی کہانی بھی سنی۔ اب اس طرف کی کہانی بھی سنو۔ اس کے بعد فیصلہ کرو مجھے اپنے بیان کی صداقت کے لیے گواہوں کی ضرورت تو نہیں، لیکن اگر تمہیں ہو تو میں چشم دید گواہ بھی تمہارے سامنے لا سکتی ہوں اور لانا بھی کیلا۔“ وہ کچھ دیر بچھ کر سنا کر دیکھنے لگیں جو لٹے نائزاد میں گم سم ماسیخا تھا۔

”تمہارا یہ بھائی۔ اس سے پوچھو کہ کیا محمود اور اذت ناگ بچپن گزارا ہے اس حمل نصیب نے، کو سچ سننے کی تاب ہے تم میں۔“ مہ پارہ اسے دیکھ کر طنز بولیں۔

اجیہ کے آنسو بھل بھل بہ رہے تھے وہاں کپاری تھی نہ تا۔



وقت بدل گیا۔ حالات تبدیل ہو گئے پاکستان فلم انڈسٹری کا بدترین نوال شروع ہو گیا ہر گری پران بڑھ اور موٹ پرست لوگ قابض ہو گئے۔ نئے نئے کام ٹھہرے ہو گئے۔ انڈسٹری سے وابستہ لوگوں کے گھر کے چولہے بجھنے لگے۔ کراچی میں ڈرامہ انڈسٹری فروغ پاری تھی۔ وہاں اب کلام بہت قہاسو متعلقہ لوگ تلاش معاش کی خاطر کراچی کا رخ کرنے لگے۔ یہاں مواقع زیادہ تھے۔ چندا بھی میس چلی آئی اور اپنی ایک چلنے والی کی وساطت سے میڈم ٹی کے پارٹر میں جاب حاصل کی اور یہیں ایک چھوٹے اور خستہ سے فلیٹ میں رہنے لگی۔ زندگی میں کوئی واقعہ بھی بنا کسی

وجہ کے وقوع پذیر نہیں ہونگے شاید قدرت چننا کو
آخری موقع دینا چاہتی تھی۔
چننا کا اہلیہ اور مہاراجہ کو شہنشاہی میں دیکھتا اس
شہری مروج کا رنگ بنیاد تھا۔ اور اس نے ایک بار پھر
اس مروج کا غلط استعمال ہی کیا تھا۔



”میں نہیں جانتی کہ وہ تم سے کب کہاں اور کیسے
ملي میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ اس نے ثابت کر دیا کہ
وقار بھائی کا فیصلہ کتابت اور درست تھا جیسا نہیں
ہے کہ ہمیں بھی اس کا خیال نہیں آیا یا ہم نے یہ
نہیں سوچا کہ وہ کن حوالوں میں زندگی گزار رہی ہوگی۔
آتا تھا۔ بھائیوں کا تپا نہیں مجھے اور کیا کو ضرور آتا تھا اور
ہم اس کے لیے دعا بھی کرتے تھے مگر افسوس کہ ہماری
دعا میں اس کے کسی کام نہیں آئی۔“ وہ بولتے
پولتے تھک سی گئیں۔ ان کا چہرہ سرخ اور آنکھیں
انگھار تھیں۔ سارے بھی سر جھکا کر بھلے کی طرح
تھا۔ میری ساری کہانی سن کر شہر پر بھی تھی اور
اجیہ۔ اجیہ اب یہ نہیں رہی تھی اس کی آنکھوں میں
چپ طاری تھی۔ اس نے ساری کہانی سن لی تھی۔
مگر یقین۔

”نہیں میں نہیں مان سکتی۔ امی ایسی ہرگز نہیں
ہو سکتیں۔ آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔“ کچھ دیر بعد وہ
بولی تو مہاراجہ نے از حد غصے سے اسے دیکھا۔
”کسے مانو گی تم۔ وہ طریقہ بتا دو۔“

”مجھے اتنا ہی نہیں ہے۔“ وہ ہشدرہ سے بولی۔
”افسوس۔“ وہ کھڑے ہوتے ہوئے فیصلہ کن لہجے
میں بولیں۔ ”میں بھی اور اسی وقت مجھے اس کے پاس لے
کر چلو بہت ہو گیا یہ ڈرامہ۔ آج صبح اور جھوٹ کا فیصلہ
ہو ہی جائے۔“

”میں نہیں لے کر جاؤں گی کسی کو ہاں۔“ وہ خوف
زدہ بچے کی طرح بولی۔

تب ہی مہاراجہ کا فون بجا۔ حمزہ کا تھا۔ انہوں نے اپنا
لیجر استعمال پر لا کر ”ہیلو“ کہا۔

”کہاں ہیں آپ۔“ وہ سچو کی سے بولا۔
”کراچی میں ہوں۔ بھائی صاحب کی طبیعت
ٹھیک نہیں بیٹا! انہیں انٹیک ہوا ہے۔“ وہ سانس ہی
بتانے لگیں۔

”کیوں؟ کیا اپنی بیٹی کے کارناموں کی خبر ہو گئی
انہیں؟“ وہ زہر خنجر ہو کر بولا۔

”یہ کس انداز میں بات کر رہے ہو حمزہ۔“ انہوں
نے تاپ بندھنے کی سے لڑاؤ۔

”پائل ٹھیک کہہ رہا ہوں میں ماہ۔ آج ہی کو رٹیر
ملا ہے مجھے۔ خط ہے اجیہ کا ساتھ میں وہ میگزین بھی
جس میں اس کی دلگرجوز آئی ہیں اس نے صاف
صاف لکھا ہے ماہ وہ ملاؤنگ کرنا چاہتی ہے اور اس کی
شادی زبردستی میرے ساتھ کرنے کی کوشش کی جا رہی
ہے کیا یہ سب آپ کو معلوم تھا ماہ؟“ وہ جیسے رو دینے
کو تھا۔ مہاراجہ بو کھلا کر رہ گئیں۔

”نہیں بیٹا۔ اصل میں۔ دراصل بات یہ ہے
کہ۔“ ان سے بات نہ بنائی جا رہی تھی یہاں کر تیں تو
بیٹے کا احمق گھوٹیں نہ کر تیں تو بیٹا بھانجے لے کیا کرتے۔

”ماہ اس نے مجھے بہت ہرٹ کیا ہے اگر ایسے ہی
کرے کئی لڑکی سے شادی کرنی تھی تو میں کیا کی تھی۔
نہیں ماہ۔ میں زبردستی کے بندھن ہاتھ سے کا قائل
نہیں ہوں۔ مجھے تو ایسے ہی سمجھ جانا چاہیے تھا کہ وہ
میرے ساتھ نہ خوش نہیں ہے۔ میں نے آپ کو ابھی
اسی لیے فون کیا ہے کہ میں اسے طلاق دے رہا
ہوں۔“ مہاراجہ پوری جان سے کلمہ اٹھیں۔

”نہیں بیٹا۔ ایسی حالت پائل مت کرنا۔ ہو سکتا
ہے جنہیں کوئی غلط تھی۔“

”دہات غلط تھی ماہ۔“ وہ یوں ہنسا گیا انہوں نے
کوئی بچکانہ بات کہی ہو۔ ”ڈیٹر غلط ہو سکتا ہے مگر اس
کی تصویریں۔ تو ماہ۔ میں اتنا بے غیرت نہیں ہوں
کہ میری بیوی اتنا لگے اور چپ فون شوٹ کر والے اور
میں ری ایکٹ نہ کروں۔ سو رہی ماہ میں نے پہلے آپ
کی بات مان لی تھی اب نہیں مان سکتا اس لیے میں
اسے طلاق دے رہا ہوں۔“

وہ "حزبہ دولت ڈولٹ" کہتی رہ گئیں مگر اس نے خون بند کر دیا۔ خون بند ہونے پر انہوں نے نہایت کٹ دار اور چستی نگاہوں سے سائت کھڑی اچیہ کو دیکھا۔ بہت حسرتی نگاہوں سے۔

"یہی چاہتی تھیں تا تم" تو مبارک ہو تمہیں۔ تمہارے کارناموں کی خبر اس تک بھی بڑے اہتمام سے پہنچاؤی گئی ہے۔ وہ تمہیں طلاق دے رہا ہے۔" میرب نے بے ساختہ منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی چیخ کا گلا گھونٹا۔ سائز نوخی بیٹھا رہا گویا اب اسے کسی بھی بات سے فرق نہ پڑ رہا ہو اور اچیہ اس کی نگاہوں سے بے یقینی جھلکی اور وہ سائت نہ گئی۔ ہٹا بکا لولی بھی کھڑی گئی۔

"تم بے عزت ہو گئی ہو اچیہ۔ بدنام کر دی گئی ہو۔ یہ کیسا بدمعاشہ! کیا انتقام ہے جس میں سارا نقصان سراسر تمہارا ہی ہوا؟ تمہیں بڑی خوبی سے تمہارے ہی خلاف استعمال کر لیا گیا ہے اچیہ اور تم اندھی محبت میں بے موت ماری گئیں۔ کیا اب بھی تمہیں لگتا ہے کہ میں نے تمہیں جھوٹی کہا ملی سنا لی ہے؟"

"کیا ہو رہا ہے یہ سب مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" وہ بالوں کی طرف اشارے سے پال تو پتے لگی کہ یہ بات اس کے علم میں بھی نہیں تھی کہ حمزہ کو بھی اس کی تصویر ار سال کی گئی ہیں گو کہ اسے حمزہ سے کوئی لگاؤ کوئی اہمیت نہیں تھی مگر مرحلہ وہ اس کا کرن بھی تھا اور اس کے سامنے یوں اہم سمجھو رہا وہ۔

"اور نہ صرف اس کے سامنے اچیہ۔ تمہاری ہو شریا تصویر تو تجھ نے کس کس نے دیکھی ہوں گی۔ کیا تم آج کے بعد خود سے نگاہیں ملانے کے قائل رہ گئی ہو؟" کوئی اس کے اندر درد سے کہتا تھا۔

"کیا تم اب بھی مجھے اس کے رویے لے کر نہیں چلو گی؟" مد پارہ نے بہت کٹ دار لہجے میں سوال کیا تھا۔ اچیہ کے اندر مسلسل ورد کی کوئی بازگشت ہی کو ج رہی تھی۔



"مجھے کیا سمجھا تھا اس نے۔ اب اسے پتا چلے گا کہ

برباد ہونے کے بعد کیا محسوس ہوتا ہے۔ لات مار کر مجھے اپنی زندگی سے باہر پھینکا تھا اس نے آج میں نے اسے ایسی ٹھوک ماری ہے کہ وہ منہ کے کل مگر اہو لگا۔

"ہاں۔" وہ محمود رہی گئی۔ خوشی سے ڈول رہی تھی۔ اپنی چیخ پر توجہ لگا رہی تھی۔ بلند آہنگ خوف ناک تھی۔

تب ہی دروازے کی کھنٹی بجی۔ وہ بل بھر کو خاموش ہوئی۔ پھر بے تلبی سے دروازے کی جانب بڑھی۔ "آگئی میری ہونمار بیٹی۔" وہ دروازہ کھول کر وہالمانہ پذیرائی کو آگے بڑھی مگر اسے جلد ہی ہٹ جانا پڑا۔ کہ دروازے پر اچیہ نہیں۔ مد پارہ اور سائز تھے۔

"ماں تم۔ اور یہ۔ یہ سو تو ہے؟" اس نے پہچان کا مرحلہ بخیر و خوبی طے کر لیا تھا۔ "ہاں میں۔" مد پارہ دوش دوشی سے بولیں۔ "کیوں کیا تمہیں کسی اور کا انتظار تھا؟" انہوں نے بنا بلائے گھر میں داخل ہوتے ہوئے طنز کہا۔

سائز کی بے تاثر نگاہیں اس بے حس چہرے پر جھی تھیں جسے چھوئے "چومنے کی خواہش کبھی بہت چھین میں اس کے سینے میں سر چھا کرتی تھی مگر آج اس کے اندر سوائے رنج و غم و غم کے کوئی اور جذبہ بیدار نہ ہوا۔ "ہاں اسی کا انتظار تھا جس نے تمہیں یہاں کا پتا بتایا ہے۔" وہ ذرا بھی خائف یا شرمندہ نہ ہوئی۔

"مجھے حیرانی ہے تم پر چند۔" مد پارہ ہنس سے اسے دیکھ کر بولیں کہ جس کا تکبر اور خود غرضانہ انداز آج بھی جوں کا توں قائم تھا۔ "تم نے وقار بھائی کی عزت سے کھیلا، ان کی دولت کو برباد کرنا چاہا، تم نے اپنے بچوں کی مصوویت اور ان کا بچپن چھیننا اور آج۔ آج بھی تمہیں ان کی زندگی میں واپس لوٹی ہو تو چلتی اور بربادی میں کے۔ تم ہو کیا شے چند۔ میں تمہیں کبھی سمجھ ہی نہیں پائی۔"

"مجھے لعن طعن کرنے سے تمہیں کچھ مل رہا ہو تو کرتی رہو مگر واضح رہے۔ مجھے تمہاری جذباتی باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا۔" اس کے لبوں پر خند مسکراہٹ مگر نگاہوں میں غصہ بٹھا ہوا تھا۔

”میں جانتی ہوں۔ تمہیں فرق پڑ بھی کیسے سکتا ہے۔ احساس انسانوں کے دل کی میراث ہے۔ بے حس لوگوں کے اندر نہیں پہنچتا۔“ مہ پانے نے نفرت سے کہا۔

”ہاااا۔“ اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ ”چلو یہ ہی سہی، مگر یہ تو بتا چلے کہ آخر تمہارے یہاں آنے کا مقصد کیا ہے اور ہاں۔“ اس نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ”کہاں ہیں میری فرمائیاں؟“ تمہارے ساتھ نہیں آئی کیل۔ اوہ میں پوچھتا تو مہول ہی گئی۔ وہ زندہ بھی ہے یا اس کے عزت دار باپ نے غیرت کے نام پر اسے قتل کر دیا۔“

”تم کیسی مل ہو چنچا؟“ ایک عورت بھلے اچھی بنی۔ ”سن یا بیوی نہ بھی ہو، مگر ایک ماں کے اچھے ہونے، اپنی اولاد سے مخلص ہونے پر شبہ نہیں کیا جاسکتا، مگر تم نے اس بات کی نفی کر دی ہے چنچا۔ کیا کوئی ماں اپنی شقی القلب کی ہو سکتی ہے مجھے یقین نہیں آتا۔“ ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”جس کے خوابوں، خواہشوں، تمنائوں کا گلا قدم قدم پر گھونٹا گیا ہو اس سے تم اور کیا امید رکھتی ہو؟“ اب کی بار وہ گئی۔

”خواب، خواہش اور تمنائیں۔“ مہ بارہ نے دہرایا۔ ”کون سے خواب، کیسی خواہشیں اور کس بات کی تمنائیں۔ زندگی نے تمہیں کیا نہیں دیا۔ بہترین ماحول میں تمہاری پرورش ہوئی، یاد ہے ابامیاں اپنے اور بچوں کی حق تلفی شاید کر جاتے ہوں، تم پر جان چھڑکتے تھے۔ اچھی شکل صورت و وقار کھانا پینا شوہر، پیاری صحت مند اولاد بہترین نہ سہی بہت اچھا گھر اور کیا چاہیے ہوتا ہے اک عورت کو زندگی میں۔ تمہیں تو سب کچھ بنانے ہی مل گیا تھا آخر تم پر کس بات کا بخون سوار رہا۔“

”یہ سب کچھ کسی عام عورت کے لیے متاثر کن ہو گا، میرے لیے نہیں۔“ وہ غور سے بولی۔ ”مجھے آزاد فضاؤں میں اڑنا تھا۔ بہت لوہی۔ بہت بلند پرواز تھی میری، مگر مجھے ملا کیا؟ ایک سنہری قید خانہ جس میں

میرا دم گھٹاتا تھا، سانس رکتی تھی میری۔“ وہ اپنی گردن پر ہاتھ رکھ کر یوں بولی گویا اس کا دم واقعی گھٹ رہا ہو۔ ”تمہاری غلط سوچ نے تمہاری زندگی تو برباد ہی کر تم سے وابستہ لوگوں کو بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔“ مہ بارہ کو اس کے خیالات نے سچا کر دیا۔ ”ایک غلط عورت صرف خود کو برباد نہیں کرتی کئی خلیں تباہ کر دیتی ہے، تم نے یہ بات سچ ثابت کر دی ہے چنچا۔“

تفسیر تمہاری زندگی پر۔
وقار بھائی نے تمہیں محبت، پیار، عیش و آرام کیا نہیں دیا اور تم۔ تم ان کے ساتھ کیا کر رہی تھیں کیا تمہیں یاد ہے۔ تم اپنے محبوب کے ساتھ مل کر ان کی عزت کا جنازہ تیار کر رہی تھیں۔ کیا وہ تمہیں معاف کر دیتے۔“

”میں نے اس سے معافی مانگی بھی نہیں تھی۔“ وہ اپنے آرم سے بولی جیسے اطلاق دے رہی ہو۔ ”مجھ نے اس کی ذات سے دلچسپی تھی نہ اس کے پیار و محبت سے۔ مجھے چاہنے والے سر پہنے والے مرت تھے۔“

”ان سے نہ سہی ان کے پیسوں سے تو تھی۔“ مہ

بارہ بھڑک کر بولیں۔ ”وہ بس بڑی۔“

”اس کے پاس تمہاری کیل ایک گھر۔ وہ بھی میرے کسی کام نہ آسکا۔“

”حالا نکی تم نے اسے اجاڑنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔“

”بس بہت ہو گیا۔“ وہ بھنائی۔ ”کیوں آئے ہو تم لوگ یہاں؟ اگر میرا ماضی مجھے یاد دلائے تو اس کی ضرورت نہیں۔ وہ مجھے پوری جزئیات کے ساتھ یاد ہے۔“

”نہیں۔ مجھے کچھ یاد دلانے کی قطعی ضرورت نہیں، میں کج صرف تمہاری مکروہ صورت تمہیں حقیقت کے آئینے میں دکھانے آئی ہوں۔ تمہیں تمہارے وجود پر گے دل غوکھلے آئی ہوں۔ تم کو کبھی دیکھو کہ تم کتنی زہریلی ہو۔ تمہارے شر سے تمہاری اولاد تک محفوظ نہیں رہ سکی۔ تم ایک بے مہربانے سالیہ بے مصرف فحش ہو۔ ایسی فحش جنس پر کسی کی محبت

زندگی کو بنادیا ہے۔ ورنہ وہ تو کبھی کی بھاگ چکی ہوتی
اپنے عاشق کے ساتھ اگر میں نہیں بروقت فلان نہ
کرتی۔" وہ ناخراہ لہجے میں بولی گویا کوئی بہت قابل فخر
کارنامہ انجام دے دیا ہو۔

"اچھا۔ تو وہ آپ تھیں۔" حال سے بے حال
اتر چلے اور سوچے سوچے سونوں والی اجنبی اچانک کہیں
سے نمودار ہوئی تھی۔ ایک لحظے کو چنداگر بڑی مٹی۔
"اے میری بچی۔ کہاں رہ گئی تھی تو۔" وہ تاملی
والمانہ انداز میں اس کی جانب بڑھی۔

"بس۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے بے
چلک انداز میں اسے ٹوک۔
"وہ ہکا بکا رہ گئی۔"

"ہاں! آنتا مستی اور پرکشش لفظ تھا آج سے قبل
میرے لیے مگر آج آپ نے اس لفظ پر سے میرا اختیار
اٹھا دیا ہے اسی۔ میں نے آنکھ بند کر کے آپ کی ہر
بات پر یقین کیا اس کو ہاں۔ آپ کی کھوئی ہوئی خوشیاں
لوٹانے کے لیے اپنی سب سے قیمتی متاع کو داؤ پر لگا دیا
اور اب مجھے پتا چلا کہ آپ۔ آپ تو مجھے کسی مہرے
کی طرح استعمال کر رہی تھیں۔ میرے خالص جذبوں
سے کھلوا کر رہی تھیں۔ کیوں۔ آخر کیوں کیا آپ
نے میرے ساتھ ایسا؟" وہ اس کے وجود کو جھجھوڑتے
ہوئے بولی۔

"مب میں سمجھی کہ آپ مجھ سے ملاقات اور وہاں
سے کیوں پوشیدہ رکھنا چاہتی تھیں۔ آپ کو چھپ کر
دار کرنا تھا۔ سو آپ نے کر دیا۔" اس کے دونوں ہاتھ
کٹے ہوئے شہتیر کی طرح پہلو میں اگڑے۔
"تو میری بات تو سن۔ یہ سب تو میں نے تیری
خاطر کیا ہے۔" وہ اسے بھڑکانے لگی۔

"تمہیں ای! میرے لیے نہیں آپ نے سب کچھ
پایا سے بدلہ لینے کے غرض سے؟ اپنی انا کی تسکین کی
خاطر کیا مگر مجھے آپ سے نہیں خود سے شکایت ہے،
میں نے کیسے آپ کی باتوں میں آکر اپنے اتنے پیارے
پایا کو دک پہنچائی، کیا ان کی اجازت ویران نما زندگی میں
نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ رکھی تھی۔" وہ ساری

کی بارش بھی بریلی نہیں اگاسکی۔"

"اے۔" مہارہ کے الفاظ چندا کو سر تپا جھلسا
گئے اس نے انگلی اٹھا کر کہا اور نزدیک آکر انہیں دھکا
دیتی ہوئی بولی۔ "نکلو۔ نکلو یہاں سے آج سے کئی
سال پہلے تم لوگ میری لیے مر گئے تھے مجھے تم لوگوں
سے کوئی لینا دینا نہیں۔ بھاڑ میں جاؤ تم سب۔"
"کاش تم اسی وقت واقعی مر گئی ہو تیں چندا! تو آج
پھر وقار بھائی کو ہم لوگوں کو اس ذلت کے ٹرے میں تو
نہ دھکیل پاتیں۔ تم نے اپنی معصوم بچی کے جذبات
سے اس کی معصومیت سے کھیلا ہے چندا تم کیسی ماں
ہو۔"

"اچھا۔" چندا نے چٹخار سا لایا۔ "مب سمجھی
سارا غصہ اجنبی پر ہے جو مجھ پر نکالا جا رہا ہے۔ چلو
نکلو۔ نکالو جو پچھلے دل میں ہے سب کسہ ڈالو۔ میں تو اپنا
کہا پورا کر چکی۔ میں نے جیل کو برباد کرنے کی قسم
کھائی تھی میری قسم پوری ہوئی۔" اس نے کندھے
اچکائے تو اب تک ساڑھو خاموش کچھ کچھ لو اس سا
گھڑالے تک رہا تھا جیسے ہوش میں آکر لولا۔

"کیا قصور تھا ان؟ صرف یہی کہ وہ آپ سے
محبت کرتے تھے، آپ کی بے وفائی برداشت نہیں
کر سکے اور آپ کو اپنی زندگی سے بے دخل کر دیا۔
صرف اس قصور کی اپنی بیٹی سزا کہ آپ نے انہیں
بے عزت کرنے کے لیے اپنی اولاد کو بطور آلہ استعمال
کیا؟ آپ کو ایک بار بھی اس بچی کی معصومیت پر رحم
نہیں آیا جو دل کی محبت کو ترسی ہوئی زندگی گزارنی آئی
تھی جو صرف آپ کی بوجھ سے آیاؤں کی گود میں پئی۔
ایک لڑکی ہونے کے ناطے اس نے زندگی کے ہر رموز
پر آپ کی کتنی ضرورت محسوس کی میں گواہ ہوں ان
ٹھونڈوں تک اور جب آپ ملیں بھی تو۔ تو اس کی زندگی
سے کھیل گئیں۔ ماں نہیں ڈائن ہیں آپ جو ہماری
زندگی کی ہر خوشی کو کھا گئیں۔" وہ بے بسی سے ہونٹ
چہلے ہوئے اضطراب سے چلایا۔

"میرے گھر میں کفر ہے ہو کر چلانے کی ضرورت
نہیں، میں نے اس کی زندگی سے کھیلا نہیں اس کی

آ رہا ہے میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ میں اپنے ہاتھوں اپنے جنم کا ایسا صن اکٹھا کر دی ہوں گی۔

”چلیں خالہ! مجھے پایا کے پاس لے چلیں۔ میں ان کے بیروں میں گر کر معلقا مانگوں گی۔“ وہ چل کر بولی۔

”انسان کو اگر فطرتی کا احساس ہو جائے تو معلقا مانگنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ نہیں تو بہت دیر ہو جاتی ہے اور مجھے امید ہے کہ ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی کہ وہ نقصان کٹتی ہو چکا ہے۔“ مہ پابہ اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہوئی بولیں۔

”میں جا رہی ہوں امی۔ اور مجھے پورا یقین اور امید ہے کہ آج کے بعد میں آپ سے کبھی نہیں ملوں گی۔“ اس کے لہجے میں ڈوبنے والوں جیسی آہیں تھیں۔

مہ پابہ بھی اس کی بات پر رو پڑیں۔ سارے نجلے کیا ضبط کر رہا تھا آنسو! آپریا سسکیاں۔

”نہیں تم ایسے نہیں جا سکتیں۔ ابھی تو میں نے تم سے بہت کام لیا ہے۔“ چندا سرعت سے پیچھے لپکی اور اسے پکڑ کر کھینچنے لگی۔

”کاش آپ نے غرض سے نہیں محبت سے مجبور ہو کر روکا ہوتا۔“ اجیہ رکی اور مڑے بنا بڑی حسرت سے بولی۔ سارے اس کے لہجے پر تکلیف سے آنکھیں پھینچتی تھیں۔

”رکھو مہ پابہ۔ میں نے تمہارے لیے بہت سے ڈائریکٹروں سے بات کر رکھی ہے بہت جاؤ۔ کامیابی تمہاری منتظر ہے۔“ وہ بے بسی سے چلائی۔

”جو سب کچھ چمن جانے کے بعد ملے مجھے ایسی کامیابی نہیں چاہیے۔ مجھ میں آپ جتنا حوصلہ اور ہمت تھیں ہے مل۔ میں رشتوں کے بغیر نہیں جی سکوں گی۔“

”تم پاگل ہو گئی ہو۔ یہ لوگ تمہیں بھٹکارے ہیں۔“ اس کے منہ سے کف اڑنے لگا۔

”نہیں امی۔“ وہ مڑی۔ ”میرے قدم اب جا کر

زندگی ہمارے لیے قربانیاں دیتے رہے اور میں نے میں نے کیا کیا ان کے ساتھ۔“ وہ شدید صدمے کے زیر اثر آئی۔

”تم۔“ مجھ پر اعتبار نہیں کر رہیں؟“ چندا تحیر سے بولی۔

”نہیں ہے مجھے کسی پر اعتبار۔“ اجیہ ہسٹریائی انداز میں چیخی۔ ”یا اللہ۔ یہ میں نے کیا کر دیا“ میرے پایا میری وجہ سے موت کی سرحد پر کھڑے ہیں۔“ وہ ہاتھوں کی طرح خود کو سینے لگی۔ اس کی بات پر چندا ہسٹریائی ہوا آئی آہیز مسکرا ہٹ۔

”دیکھ لیا۔ مجھ سے کھرانے کا کیا انجام ہوں۔“

”بے شرم عورت۔“ جو اس بند کر دیا اپنی اور اگر تم میں ذرا بھی غیرت ہے تو شرم سے ڈوب مو۔“ مہ پابہ نے دانت پیسے۔

”میں کیوں مولا۔ وہ مرے جو میری تباہی کا ذمے دار ہے۔“

”اپنی تباہی کی وجہ اور ذمے دار آپ خود ہیں۔ کیوں ہمارے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ جان چھوڑیں ہماری۔“ سارے نے بے بسی سے ہاتھ جوڑے۔

”ہی آپ نے مجھے بہت دکھ دیا ہے میں نے آپ کو کیا سمجھا اور آپ۔ میں اب پایا کا سامنا کیسے کروں گی۔“ وہ کر لار ہی گئی۔

”کیا پتا اس کی نوبت ہی نہ آئے۔ تب تک وہ مر ہی چکا ہو۔“ چندا سفاکی سے بولی تو اجیہ بے ساختہ کہہ اٹھی۔

”مرنے تو آپ کو چاہیے۔ آپ نے اپنی زندگی میں اتنے لوگوں کا دل توڑا ہے ان کی زندگیاں برباد کی ہیں رشتوں کو نشوونما کی طرح استعمال کیا ہے مرنے تو آپ کو جانا چاہیے۔“

”اجیہ۔ یہ تم کہہ رہی ہو۔“ چندا کی آنکھوں میں بے یقینی اور کھٹے میں حیرت تھی۔

”آپ کو یقین نہیں آ رہا نا کہ میں جو آپ سے انہا حدت محبت اور آپ پر اعتبار کرتی رہی ہوں میں ایسا کر سکتی ہوں۔ تو امی۔“ یقین تو مجھے خود پر بھی نہیں

کے پیر چھوڑ کر وہ صلی آمیز لہجے میں بولی تو وقار تڑپ گئے
 ”بس کرو اجیہ۔ اور میرا کتنا امتحان لوگی۔“ وہ رو پڑے تو اجیہ اور نور نور سے رونے لگی۔ سارے آگے بڑھا اور اس کے کندھوں پر پیار سے ہانڈا حمل کر کے بولا۔

”بس اب خاموش ہو جاؤ۔ پاپا نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ اور پاپا۔“ سارے نے ان کی جانب شرمندہ نگاہوں سے دیکھا۔

”معافی تو مجھے بھی آپ سے مانگنی ہے۔ کیا میں اس قاتل ہوں کہ آپ مجھے معاف کر سکیں۔“
 ”میں تو تمہیں بھی معاف کر ہی دلاں گا بیٹا کہ اولاد چاہے کتنا ہی دل دکھائے والدین کے دل ان سے پیشہ ہی راضی رہتے ہیں۔ اصل گناہ گار تو تم خدا کے بعد میرے بیٹی کے ہو۔ بہت اذیت۔ بہت دکھ پہنچایا ہے تم نے اس بچی کو۔“

ان کی بات پر سارے نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ میرے کو کہ اس سے حد درجہ شاک تھا۔ مگر وہ سب کے سامنے اس کا شرمندگی سے جھکا سر نہ دیکھ سکی۔

”میں پاپا۔“ وہ مضبوط اور ہموار لہجے میں بولی۔
 ”سارے کوئی حل ہی مجرم تو نہیں یہ تو خود حالات کی قسم ظریفی کا شکار تھے انہیں گناہ گار نہیں۔ حالات سے مجبور کہے۔ بسا اوقات حالات انسان سے وہ کچھ کروا لیتے ہیں جو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہوتا۔ اور جہاں تک میری بات ہے۔ وہاں ٹھیک ہے میں ان سے خفا تھی مگر اب نہیں تو انہیں مجھ سے معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

وہ چپٹی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی اور ٹھیک اسی لمحے سارے نے گردن اٹھا کر بڑی حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پورے اٹھو سے مسکرائی۔ جو پاپا سارے کے لیوں پر بھی مسکراہٹ چسکی تھی۔ وہ بے اعتباری تھا۔ بے وقوف تو نہیں۔ اور یہی بہت بڑا علمینان تھا میرے کے لیے، ہاں اسے کچھ وقت لگنا تھا یقین کرنے، اعتبار

ہی تو راہ راست پر بڑے ہیں۔ میں آپ کی طرح ہے نشان منہل کی مسافر نہیں بن سکتی۔“
 ”تمہیں خدا نے بے اندازہ نوازا تھا۔“ مسیحا دیکھی ہو کر بولیں۔ ”اور تمہیں نجانے مزید کس چیز کی ہوس تھی۔“ انہوں نے ایک اداس نگاہ اس کے مختصر اور خستہ ٹیبلٹ پر ڈالی۔

”تم نے اگر تمہوڑا صبر کر لیا ہوتا تو آج تم واقعی عمل میں راج کر رہی ہوتیں۔ یہ جھوٹی زندگی تمہارا مقدر نہیں تھی مگر تم نے اپنے ہاتھوں سے اسے مقدر کیا ہے۔“ اس کے بعد وہ لوگ ہنسرے نہیں ہو کر ان کے الفاظ چترا کی سماعت میں راج ہو گئے۔ ان واحد میں پیشہ کی طرح اس کی پٹا ٹنگ ناکام ہو گئی تھی۔

وہ چند ٹانہیں ساکت کھڑی رہی۔ پھر اچانک ہی اس کے لیوں پر ہنسی آئی تھی۔

”ہاہا۔ ہاہا۔ میں نے دنیا تخیل کر لی، میں نے دنیا تخیل کر لی، کوئی ہے جو میرے مقابلے پر آئے۔ آئے تو سہی اگر اسے بڑا نہ کر دیا تو میرا نام۔ میرا نام۔“ یہ یاد ہی نہ آتا تھا کیا ہے میرا نام۔

”ڈائرن۔ بے حیا۔ ذلیل۔ بے غیرت۔ نہیں نہیں کچھ اور تھا کیا تھا میرا نام۔“ وہ چیخ چیخ کر بے حال دیواروں سے اپنا سر کراتے لگی۔



چوبیس گھنٹے تمام ہوئے۔ وقار کی طبیعت منہل گئی۔ وہ جو نئی ہوش میں آئے اجیہ ان کے پیر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ انہوں نے منہ پھیر لیا۔ سارے۔ مسیحا۔ میرے جتنی کہ ماریہ اور سحر یہ تک صورت حال پر آبدیدہ ہو گئیں۔

”معاف کرو مجھے بھائی صاحب۔ بچی ناراضی میں غلطی کر گئی، کیا کرتی مقلد بہکانے والی ماں ہی تھی۔ بس آگنی باتوں میں۔“ مسیحا نے کہا۔

”میں جانتی ہوں میں نے آپ کو بہت دکھ بہت اذیت سے دوچار کیا ہے، لیکن اگر آپ نے مجھے معاف نہیں کیا تو میں اپنی جان دے دلاں گی۔“ وہ ان

ہو سکتا، مگر میں پھر بھی چاہتی ہوں کہ تم اسے اپنا کراس کی ذات کا ٹیڈ اور احتیاج سمجھ کر لے کر اس کی مدد کرو۔" وہ درود مندی سے کہہ رہی تھی۔

"چاہتا تو میں بھی جی ہوں، مگر آخر ہوں تو مردی تامل میں اس کے لیے اب پہلے والی عزت اور مقام نہیں رہا ہے۔" اس نے صاف کوئی سے کہا۔

"مگر محبت تو ہمت اعلا طرف ہوتی ہے۔" صحبت تو بے شک ہوتی ہے مگر مردانہ اعلا طرف نہیں ہوتی۔"

"مگر عاشر۔ میں تو تمہیں عام مردوں سے مختلف سمجھتی رہی۔" اس نے کسی قدر تامل سے کہا۔ "اس لیے تم سے اپنا خیال شیئر کر لیا۔"

"مجھے کچھ وقت دو۔" وہ پیٹ کے جیوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ "یہ بات تو سچ ہے کہ صرف اسی چہرے نے میرے خیال کی مشغول کو روشن کیے رکھا۔ کوئی اس دل کو اس کے سوا بھلائی نہیں جو کچھ اس نے اپنی زندگی کے ساتھ کیا اس پہ مجھے صدمت السوس ہے۔"

"میں بھی پوائنٹ تو تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اس نے اپنی زندگی کے ساتھ نہیں زندگی نے اس کے ساتھ کیا۔ اس نے اپنی مرضی سے اپنے لیے ایک بڑا کردار مل کا انتخاب نہیں کیا تھا جو کچھ ہوا اس میں لفظی بے شک اس کی ہے مگر سارا تصور اس کا نہیں تب پھر وہ اکیلی سزاوار کیوں بھرنی جا رہی ہے۔" وہ جذباتی ہوئی۔

"کیوں کہ یہی دنیا کا چلن ہے یہاں جرم کے محرکات نہیں مجرم اہمیت رکھتا ہے۔" وہ درود خلاؤں میں دیکھا ہوا بولا۔

"مگر اس کی جگہ تمہاری بہن ہوتی تو۔ تو کیا تم تب بھی اس کے لیے اتنا سخت موقف رکھتے کیا تم اس کی خلاصی کے لیے کوشش نہیں کرتے؟"

"میری بہن اتنی کم عقل اور جذباتی نہیں ہے۔" یہی تو۔ "میرب نے جیسے کتہ پھڑا۔" کیوں کہ میری تربیت ایک اچھی عورت نے کی اور مجھے برکانے

کرنے میں۔ ظاہر ہے برسرِ کی خرابی لہجوں میں دور نہیں ہو سکتی، مگر وہ پرامید تھی کہ ساتھی ذات کے سارے سرسرتہ راز اب اس پر منکشف ہو چکے تھے اور راز مل جائیں تو محفل تک پہنچنے کے راستے آسان ہو جاتے ہیں۔



اور ٹھیک دو ماہ بعد جب میرب نے ایک خوب صورت اور صحت مند بیٹی کو جنم دیا تب ساتھی ذات کے احساس آشنا ہوا تھا۔ جس لمحے اس نے بے ساختگی سے بیٹی کو گود میں اٹھا کر اس کا ہاتھ چما اس کی آنکھیں نم تھیں۔

اسے بیٹی کا والہانہ ہاتھ چومنے دیکھ کر میرب کے سارے خدشات اور فکرات بھاپ بن کر اڑ گئے تھے۔ عاشر اور ابراہیم بھی انگلیڈ سے واپس آچکے تھے۔ بار بار اپنے شوہر کے ساتھ ہنی مون ٹریپ پر گئی ہوئی تھی وہیں سے فون کر کے ڈیڑھوں مبارک پلو پہنچائی تھی اور وہ قاب لہن کی تو خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا انہیں لگتا تھا جیسے لہن کی عمر بھر کی ریاضت کا پھل مل گیا ہو۔ خوش تو ابھی بھی بے اندازہ تھی مگر اس کا چمکتا منہ مگر انہیں اب خواب و خیال کی بات ہو گئی تھی۔ اس کے وجود سے احتیاج تھا ہو گیا تھا وہ لوگوں سے کترانے لگی تھی ہر وقت خود ارضی کی کیفیت میں جتلا رہتی۔ سہارا واپس لوٹ گئی تھی انہیں اس بات کا شدید قلق تھا کہ وہ اجیبہ کو سو نہیں بنا سکی تھیں کہ جنواز سے طلاق نہ دینے پر راضی نہیں ہو سکتا تھا۔ اجیبہ کی آنکھوں کی بھیجی جوت میرب کے دل کو ٹھیس پہنچا رہی تھی کہ وہ اس کے لیے بھیجی ہی سمجھتی تھی کہ وہ تصور دار تھی نہیں جتنی اسے سزا مل رہی تھی۔

عاشر اجیبہ کو چاہتا تھا اور میرب چاہ رہی تھی کہ عاشر اسے اپنالے۔

"میں جانتی ہوں کہ تمہارے لیے اسے اپنانے کا فیصلہ اب ہرگز بھی اتنا خوش گو اور آسان نہیں

”پاکل۔ پاکل۔ پاکل۔“ بچے خوشی سے تالیں بجا رہے تھے۔ اس پر کنگز پتھر اچھل رہے تھے۔
 ”مرے ہو، چلو بھاگو یہاں سے۔“ ایک دکھنار نے سب کو ڈانٹ کر مٹھایا۔
 ”پاکل۔ پاکل ہاں میں پاکل۔“ اس نے بیجانی تقبہ لگایا۔ پھر یک دم خاموش ہو کر وحشت سے چلائی۔

”پاکل۔ تو پاکل۔ تو پاکل۔“ وہ دیوانگی سے پتھر اٹھا کر اب بچوں کے پیچھے بھاگی۔
 ”پاکل۔ دیوانی۔ نگل۔“ بچے نعرے لگاتے آگے آگے تھے۔

بے لگام خواہشوں کے پیچھے انہما و حند بھانسنے والوں کا انجام اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ دو سروں کی زندگی سے بھٹنے والی کج دو سروں کے لیے تماشا بنی ہوئی تھی۔ سٹل کھل گیا تھا گاڑیاں آگے بڑھنے لگیں۔

Downloaded From Paksociety.com

ابن انشاء کی شخصیت اور علمی اور ادبی خدمات پر ڈاکٹر ریاض امیر ریاض کا تحریر کردہ مقالہ

ابن انشاء

احوال و آثار



قیمت: 1200 روپے
 ڈاک خرچ: 50 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
 37، اردو بازار، کراچی
 فون نمبر:
 32735021

بھی کوئی نہیں آیا۔ مجھے اس طرح آزمایا ہی نہیں گیا تا عاشر! اور آزمائش پر ہم میں سے کتنے لوگ پورے اترتے ہیں؟ اگر ناکامی کو اللہ معاف کر دیتا ہے تو ہم کیوں معاف نہیں کر سکتے جبکہ خطاوار غلام بھی ہے؟“ اس کے لہجے میں ہمدردی تھی مگر لڑکی تھی اور بے چارگی بھی۔

”شاید کچھ عرصہ بعد میں اس متعلق کچھ کہادوں۔ فی الحال تو میرا دل نہیں من رہا ہر چند کہ وہ اس کی جانب منتقل ہے مگر ایک دیوار سی ہے جو میرے دل اور اجیبہ کے درمیان کھڑی ہو گئی ہے۔“ وہ بھی اداں تھا۔
 ”نور میں دعا کرتی ہوں کہ یہ دیوار جلد ہی گر جائے۔“ میری بے دل کی گمراہیوں سے دعا کی تھی۔

ذہابی شام کا سہ تھا۔

وقار صاحب سار میری اور اجیبہ۔ سار کی بیٹی جگنو کی دوسری سالگرہ منانے ہوئی جارہے تھے۔ خوشی، اطمینان اور آسودگی ان کے چہروں سے جھلکتی تھی۔ زندگی میں آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہوتا جا رہا تھا۔

”بیلا۔ چاکلیٹ ایک لولہ کی۔“ جگنو نے توتلی زبان میں کہا تو سب ہنس پڑے۔

”ہاں بیٹا۔ چل رہے ہیں نا۔ جو چاہے لے لیتا۔“ ان کی گاڑی سٹپل پر ٹھہری، سڑک کی دوسری جانب قطار سے بنی دکانوں کے آگے کوئی ہلکا کارنگی ہوئی تھی مگر لوگ اس جانب متوجہ نہ ہو سکے۔

”مارول کی۔ سب کو مارول کی۔“ پتھر اٹھا اٹھا کر اپنے پیچھے بڑے شرارتی اور بد تمیز بچوں کو پتھرائی اس عورت کو دیکھ کر پہلی نگاہ ہی میں کراہیت سی آئی تھی۔ جگہ جگہ پیوند والی خاکی موانہ کیس، ٹخنوں سے لونگی لال پھولوں، مٹھے پانچھوں والی شلوار۔ بیٹی اور سنی جو اس کے نیچے تھنے میل سے اٹے پھول میں گری جاتی تھی۔ وحشت زدہ چہرے، مجلسی ہوئی رنگت اندر کو دھکی پتھرائی ہوئی آنکھیں۔

خوشبو

Downloaded From
Paksociety.com



جوت کیا تھی مگر دھسک والی اور فریجہ اندر ہی اندر
کیس جانتی تھی کہ اس عود کی تھلی بیٹی حویلی کے
چھلے سخن کے سامنے والے بڑے کمرے میں دھری
تھی۔ دھراتو وہاں پر اور بھی بہت کچھ تھا۔ کچھ حقیقتیں
وضاحتیں اور شہادتیں بھی۔

یہ تب کی بات ہے جب سارے گھر والے فریجہ کو
فریجہ نہیں بلکہ فری کہتے تھے اور قاسم کو قاسی۔ قاسم
اس کا نکلیا زاد۔ ماں باپ کا اکلوتا س کی طرح۔ اس کا
دوست اس کا واحد گزرن۔ محبوب اور آنے والے
دنوں میں اس کا مکتبہ تری بھی۔ لیکن ابھی ہم بچپن میں ہی
رہتے ہیں جہاں سے خوشبو کا شاخسانہ نکلا ہے۔

بیٹی حویلی کے چھلے کمرے میں سلین کی خوشبو
تھی۔ حویلی میں بڑے کمرے زیادہ اور لوگ کم تھے۔
فری اور قاسی کو ملا کر کل چھ۔ اس لیے زیادہ کمروں پر
تالے پڑے تھے۔ کچھ جو ملاں کے بغیر تھے ان کے
دروازے اندر کی نفاذ کی طرح جلد تھے۔ صرف صبح کے
وقت ملازموں کی آمد سے حویلی میں چل پھل ہو جاتی
تھی۔ اس کے بعد پھر وہی ان چابی اور روز کی چھائی
ہوئی خاموشی۔ لیکن ایک کمرہ ایسا بھی تھا جس کی رونق
سدا بہار تھی۔

دونوں کا بچپن۔ پلغ۔ پرائے۔ صحرا۔ پارش
میدان۔ طوقان۔ سب کچھ وہی تھا۔ جہاں طرح طرح
کے کھلونوں کا ڈھیر بھی تھا۔ مٹی، پیتل، پلاسٹک سے
لے کر ریموٹ کنٹرول گاڑیاں، جہاز، بندوقص، ہڈیاں
اور نمبلے کیا کیا کچھ۔ سب کچھ روز کرتے میں گھمنا
اور روز ہی ستمک خود دونوں کھیلتے گھنٹوں اپنے اپنے
کھلونوں کو بھگاتے، دوڑاتے اور تھک کر وہیں
سو جاتے۔ اسکول بھی دونوں کا ایک ہی تھا۔ کلاس بھی

خوشبو پھیلی تھی۔ چاروں اور۔ جیسا کہ اس کا
خاصہ ہے۔ بڑے ہی دلچسپ انداز سے۔ لیکن پھر عجیب
بات ہوئی۔ اسی خوشبو نے سارے حالات اپنے تالیخ
کر لیے۔

فریجہ تو بچپن سے ہی طرح طرح کی خوشبوؤں میں
مل کر جوان ہوئی تھی۔ لیکن اس خوشبوؤں کے احساس
کو وہ بھی نہ سمجھ سکی۔ اور نہ ہی یہ جان سکی کہ
خوشبو میں بھی بعض اوقات آسیب کا روپ دھار سکتی
ہیں۔ اور سائے کی طرح ساتھ چٹ جاتی ہیں۔ پورا
گھروں کو دھلویا جالے لگا۔ بڑی شیٹ مھونے کے اور
پرے ڈرہمسز پر روز تبدیل کئے جاتے۔ رائیل کا پٹ
سوٹ بھی روز دھلکا۔ لیکن خوشبو تھی کسے پتا نہیں
خیال تھا کہ خواب حقیقت تھی یا بس ایک خوشبو
تھی۔ آسیب کی طرح پچھا کرنے والی۔ جس نے فریجہ
کا بچپن و قرار سب چھین لیا تھا۔

دیکھتے انگاروں پر لوہان کے جلنے کی خوشبو، رتن

سننے ویسے بھی جو آدمی اوسب کی سنا ہو وہ دنیا کی
کو ازل پر پھر کم ہی دھیان دیتا ہے۔

ان کے بتوں نے سمجھایا بھی تھا کہ نہ تو سب وہوا
پہاں کی انجیر کے لیے مناسب ہے اور نہ ہی تنگ۔
لیکن دادا ابو نہ مانے۔ بڑے جتنوں اور معیاری تنگی
اودیات سے پودے درخت تو بن گئے تھے لیکن کسی
ناک نے آج تک ان کی خوشبو نہ سونگھی تھی اور
کسی آنکھ نے ان پر پھل لگنے نہ دیکھا تھا۔

ان ہی بے تماشاً غبدر درختوں میں سے ایک درخت
فریحہ اور قاسم نے اپنے لیے منتخب کر لیا۔ دونوں نے
اپنے اپنے نام اس پر کندھ کیے اور پھر روز اسے پانی
دینے لگے۔ مزارعوں سے پوچھ کر قاسم کوڑی کر
کے اسے کھلا گائے کا کور اور بکروں کی بیگنیاں بھی
ڈالنے لگا۔ ایک سال گزر گیا۔ ان کا درخت دوسرے
درختوں کے مقابلے میں کافی ہرا ہوا ہو گیا لیکن پھل
تب بھی نہ لگا۔

بران کی اصل زندگی کو پھل ضرور لگ گیا۔ دونوں
کی تنگی ہوئی۔ قاسم کو دیکھ کر پودے بھی امی کی کلاں
لگی آنکھوں میں عجیب سی روشنی بھر جاتی تھی۔ اور
ہونٹوں پر بھید بھری مسکراہٹ آجاتی تھی جیسے وہ کسی
خاص وقت کا انتظار کر رہی ہوں۔ نایا ابائی جانیو کا
اکلو توارث تھا قاسم پانی سب تو خیر تھی۔ لیکن اپنی
مدد اور اس کی بیٹی رمشا سے انہیں بڑا دھڑکا لگا رہتا تھا۔
ان کو خدشہ تھا کہ وہ دیکھتی ہی رہ جائیں گی اور نند
رمشا کے لیے قاسم کو لے اڑے گی۔ دونوں کی عمریں
کافی کم تھیں ورنہ امی تو نکاح سے کم پرمان ہی نہیں
رہی تھیں۔

لوہر فریحہ اور قاسم نے اس رات پہلی بار اپنے
اپنے بستر پر خود پرے دریا کو پوری روانی کے ساتھ
گزرتے محسوس کیا تھا۔ یہ بھی ایک خوشبو تھی۔ جس
سے باقی خوشبو میں امتیاز تھیں۔ دریا کے پانی کی
خوشبو اور اسی کی طرح شفاف محبت کی خوشبو۔ یہ تمام
واقعات فصل خریف کی ہیں۔
پھر فصل ریح شروع ہوئی۔ اصل فصل۔

ایک بیٹھے بھی دونوں ساتھ ساتھ ہی تھے۔

نایا اصغر زیادہ تر زمینوں پر ہوتے اور چچا اسلم اپنے
دوستوں کے ساتھ شکار پر یا چوپال پر۔ نائی گھر کے کام
کراتے نہ تھکتے۔ پھلچ چمن کپاس، مریچ
ہلدی، روٹی، لحاف، بن کی زندگی ان چیزوں سے شروع
ہو کر ان پر ہی ختم ہوتی تھی۔ اور چچی اپنے ساتھ ایسا
کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ ہر روز اپنے کمرے میں بیٹھی
۱۰ سرخی پانڈور کو اپنے اوپر نت نئے طرحوں سے آرائی
رہتیں۔ تب ہی تو چچا زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتے
تھے۔ چچوں کی پروا کرتے کرتے دونوں لاہر والی کی حد
تک بے پرواہ ہو چکے تھے۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہ
تھی اور باہر جانے کی انہیں ضرورت نہ تھی۔ مستحق
کھلونوں سے کھیلتے کھیلتے دونوں کو بتائی ہی چلا کہ کب
دونوں نے اپنی اپنی زندگیوں کے ریوٹ ایک دوسرے
کے ساتھ میں دیکھے ہیں۔

کمرے کے چیمے بڑی جگہ خالی مٹی سے بھری تھی۔
جہاں کڑھے کھوڑ کھوڑ کر انہوں نے اپنے لیے محل نما
گھر بنائے تھے۔ پھر تصوراتی آنکھ سے وہ دونوں ان
گھروں میں بیٹھ بھی گئے تھے۔ اور انہوں نے وہاں اپنی
اپنی زندگیوں بھی بتا دی تھیں۔ اسی مٹی پر دونوں نے
ان کت پودے بھی اگائے۔ آم، جامن، مٹی کی گھلیاں
دائیں۔ مڑ کے جڑ نکلے والے کڑھے کھوڑ کر وقت
کیے۔ پھر روز بلانٹہ پانی بھریا۔ جڑیں پھوٹیں۔ نئے
پتے بھی آئے۔ لیکن کسی پودے کو پروان چڑھنا
نصیب نہ ہوا۔ ذرا سی بے دھیانی سے چیزیاں ساری
ہریاں۔ چک جاتیں۔ دونوں ذرا بیڑے ہوئے تو نایا
اصغر کے ساتھ اپنی زمینوں پر جانے لگے۔ وہاں ان کی
بست بڑی اراضی کا کونے کا قدرے چھوٹا حصہ انجیر
کے درختوں سے پر تھا۔ جہاں کی زمین اب کلروالی
ہو گئی تھی اور درختوں کی جڑیں نمودار ہو رہی تھیں۔

دادا ابو کو ایک وقت میں جنون سوار ہوا تھا یہاں
انجیر لگانے کا۔ انجیر کی خوشبو پھیلے گی تو دلوں سے
کدوئیں رنجش ختم ہو جائیں گی۔ دادا ابو بڑے ادنی
ضم کے آدمی تھے۔ ذہن میں کچھ سا جانا تو کسی کی نہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ✦ ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

قاسم سے باتیں کرتی رہی۔ اسے اپنے کالج ہاسٹل، دوستوں اور شہر کی ہر ایک بات جو اس نے دیکھی اور سونے کی گئی بتلائی۔ قاسم خاموشی سے سنتا رہا اور مسکراتا رہا۔ کیا کہتا؟ وہ تو نہیں گیانی نہیں تھا اور گاؤں وہیں کا وہیں ٹھہرا ہوا تھا۔ کچھ نیا نہیں ہوا تھا۔ دونوں میں کوئی پردہ تو نہ تھا۔ بس گفتگو میں ذرا تکلف ضرور آ گیا تھا۔ سارا دن فریجہ کی باتیں ختم ہو گئیں نہ قاسم کی مسکراہٹ پتا نہیں وہ باتیں سن سن کر مرعوب ہو رہا تھا یا فریجہ کو دیکھ دیکھ کر۔ شہر تو وہ بھی جانا تھا اپنے لیا اور چچا اسکے ساتھ۔ نجائے گئی ہی بارہ اور فریجہ بھی دیکھی بھالی تھی۔ اس کے بچپن کی دوست۔ نیا تھا تو صرف وہ جذبہ جو بلند سے بلند تر ہی ہونا چاہتا تھا اور جس کی ہر نئی منزل آخری منزل نہیں تھی۔

رات کو فریجہ مل باپ کے کمرے میں گئی تو شہر کے قصے بھولی گئی۔
 ”شہر میں کمرے؟“
 ”ہاں۔ تمہارے باپ نے اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم اپنے حصے کی زمین بیچ دیں گے اور شہر میں گھر بنائیں گے۔“
 ”تو پھر مائی اور قاسم؟“ وہ شاید صرف قاسم کا پوچھنا چاہ رہی تھی۔
 ”تمہاری مائی کو تو بہت منگایا ہے پر وہ نہیں مانی۔ اب تم قاسم کو مٹا کر دیکھ لو۔“

وہ قاسم کو نہ مٹا سکی۔ وہ تو بات بھی نہ کر سکی۔ اس نے ابھی صرف محبت کرنے کا فن سیکھا تھا۔ محبت تو ہونے کا نہیں۔ کھوٹی سے ہاتھ مناسے آتا تھا نہ وہ جانتا چاہتی تھی۔

اگلی بار اسے میرے گاؤں نہیں جانا پڑا تھا۔ وہ شہر سے واپس آئی تھی کوٹھی میں آگئی تھی۔ کوٹھی ہاسٹل سے دور تھی اسی لیے وہ ابھی تک ہاسٹل ہی رہ رہی تھی۔ گھر پہنچ کر وہ اپنی ابو کے ساتھ مائی سے ملنے گئی تھی۔ اسی نے شہر کے قصے دو بارہ اپنی زبان میں جذب کر کے اہلارے تھے لیکن مائی اپنی بھر بھی نہیں مانی تھیں۔ دو دن بعد یہ قافلہ واپس آیا تھا۔ اب ہر

فصل ریح میں سب سے پہلی خوشبو شہر کی تھی۔ نئی خوشبو۔ جس میں اگلی اور پرچوم ہنگامے کی آمیزش تھی۔ اور نضا لکھی تھی۔ میٹرک کے بعد شہر آگئی۔ آنا قاسم کو بھی تھا لیکن آیا لیا انتقال کر گئے۔ اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کے لیے وہ وہیں رک گیا۔ چچا اسکے لیے اس کے جانے پر بھی اصرار کیا تھا۔ لیکن مائی امی نہ مائیں۔ کہیں اب اسے دیکھ دیکھ کر ہی زندگی بسر کرنی ہے۔ اس لیے فریجہ اکیلی ہی آگئی تھی۔

نجلے نے یہ جگہ کی تبدیلی کا اثر دیکھا قاسم سے جدائی کا غم اپنے ہاسٹل کے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی وہ ان گنت روشنیوں کے طاب کو دیکھتی اور سوچتی اتنی روشنی ہے۔ ہر رنگ کے دس دس عکس نظر آتے ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون سا رنگ لپکا اور سچا ہے۔ ان باتوں کا اظہار وہ اپنی دوستوں سے کرتی تو وہ جھجک جھجک جاتی تھیں۔

”یہی باتیں کرتی ہے تو فریجہ۔ اکیلے کمرے میں رہ رہے گی تو ایسی ہی سوچیں آئیں گی۔ کل تو ہمیں ہمارے ساتھ باہر نکلنا پڑا جا میں گے گھومیں پھریں گے شہر تعلقہ بھی چلیں گے۔“
 ”شہر ہی تعلقہ۔“

”ہاں بہت تاریخی جگہ ہے۔“

شہر آنے کے پہلے ہی پہنچے وہ فریجہ سے فیری ہو گئی تھی۔ فریجہ بھی نہیں۔ صرف فیری۔ اور یہ نکاسا نکل اس کی دوستیں بڑا لبا، ہونٹوں کو بڑا موڑ کر لادیا کرتی تھیں۔ اس نے سوچا یہ شہر بھی عجیب ہے۔ آتے ہی بدل دیتا ہے اور تاریخی چیزوں کو اپنے اندر سیٹھ بھی رکھتا ہے۔

شہر تو واقعی عجیب تھا۔ تب ہی تو اس کا باپ اس کو داخل کروا کر خود واپس گیا تھا لیکن اپنا دل و دماغ ہمیں کہیں چھوڑ گیا تھا۔ عین ماہ بعد پانچ دنوں کے لیے گھر واپس گئی تو اسے اس بات کا پتا چلا تھا۔ سارا دن تو وہ

مہینہ وہ اسی طرح کرتی۔ پہلے شہدرے جاتی پھر گاؤں۔
تائی اور قاسم سے ملنے۔ چھ ماہ تو اسی طرح ہوتا رہا۔
لیکن ساتویں ماہ ہی نے جانے سے انکار کر دیا۔
”بھئی! اس دفعہ نہیں۔ اگلی بار سہی۔“

اسے اور تو کسی چیز کی فکر نہ ہوئی بس اتنا ہی ہوا کہ
قاسم نجانے کب سے گڈ بڈی پر نظریں گاڑے کار
کے اگتے دھوئیں کو دیکھنے کے انتظار میں غرق ہو گیا۔ پھر
اتفاق ایسا ہوا کہ اسی اگلی دفعہ بھی جانے پر راضی نظر نہ
آئیں۔

ای جی بننے کی پوری تیار کر رہی تھیں۔ گھریل رہا
تھا۔ قرینہ بھی، طرفتہ، سلیقہ بھی۔ ابو دھوئی کرتے سے
شہوار تھیں پھر سفاری سوٹ پر آگے تھکان کی بیڑی
بھی سکرٹ سے سگار تک کا سفر لے کر چکی تھی۔ جی
کار اچھا کھل چکا تھا ہاں میں لہریں آگئی تھیں۔ پھر کمر
پر جموتے پل کتے کتے کندھے سے آگے تھے۔
کپڑے تنگ ہوتے ہوتے جسم نمایاں کرنے لگے
تھے۔ کابل کی جیکہ آئی لائسنس سکارے اور نجلے کس
کس نے لیلی تھی۔

”ابو! تائی کی طرف چلیں؟ اس نے ہمت کر کے
سگار پیتے ابو سے کہہ دیا۔ اخبار سے نظریں ہٹا کر اسلم
نے اسے دیکھا۔ ان کے چہرے پر بڑی سی معذرت
لکھی ہوئی تھی۔

”بیٹا! اس ہفتے میں معصوم ہوں۔ جے جے کے
ساتھ جانا ہے منگلا ڈیم۔ چھلی کے شکار کے لیے۔“
ابو۔ نہیں ڈیڑی نے جواب دیا۔

پھر تیسرا مہینہ بھی گزر گیا۔ جو تھا اور بیٹا ہوا بھی۔
تائی اسی دوران اس کی غیر موجودگی میں چکر لگا کر چلی
بھی گئی تھیں۔ اسے پتا ہی نہ چلا۔ چھ ماہ نرے تو وہ
پا قاعدہ لو اس رہنے لگی۔

”کیا ہوا؟“ سیلیوں نے بڑے پیار اور ہمدردی
سے پوچھا۔ جواب میں اس نے اپنی چھٹی کی انگوٹھی
اٹھیں دکھادی۔ جو اب تک اس نے ان سے چھپائی
ہوئی تھی۔

”ہائے، چھپی رستم! تو نے ہمیں بتایا ہی نہیں۔“

کیا ہے۔ کیا کرتا ہے۔ نام کیا ہے بھلا؟“ جذبات کے
ریگ مال سے تھکتی تھکتی وہ اپنے سارے ضبط ان
کے آگے کھولنے لگی۔

”تو میڈیکل کر رہی ہے۔ اور وہ زمن سنبھال ہے۔
واہ۔“ وہ سوچتے لگی شہر کے ساتھ ساتھ لوگ بھی
عجیب ہیں۔ جن کی تعریف میں طرہ ہے اور تائید میں
تقصید۔

”تو کے تو ہم بھی ساتھ چلیں۔“
”یہاں ہاسٹل میں ہی نہ بلوائیں اس بیارے کو۔“
”ہائے دیکھنے میں کیا ہے؟“

”ہنام تو اچھا ہے قاسم۔ دیکھیں کہیں محمد بن قاسم
ہی نہ نکلے۔ عزتوں کا رکھو والا۔“ عیم تھانزی کے کردار
اب کسی لڑکی کو نہیں چاہئیں۔ آج کل کی لڑکیوں کو تو
کچھ اور ہی چاہیے۔ ”تو کیوں نہ متھی نہیں۔“
”تو اکیلی کیوں نہیں چلی جاتی۔“ سارے اسی مذاق
میں کسی ایک نے اسے راہ دکھائی دی۔

”ہاں۔ اکیلی چلی جاؤ۔ تمہا سفر کر دیا تو کافی زٹ لیل
کر دے۔“ می بیگ اٹھا کر اسے کہتے ہوئے باہر چلی
گئیں۔ اور ڈیڑی۔ وہ بھلا گھر پر موجود ہی کب تھے۔
تھوڑا سا سلمان بیک کر کے وہ تائی سے ملنے آگئی۔
یا شاید قاسم سے ملنے۔

”تو آئی ہی آئی فریج؟“ صدقہ واری جانے کے
بعد تائی نے حیران ہو کر پوچھا۔ پھر خود ہی خجیب بھی
ہو گئیں۔ شام کو اس کی قاسم سے ملاقات ہوئی تھی۔

قاسم گھر میں داخل ہوا تو فریج پوچھوں پر بیٹھی آسمان
پر اڑتی چیزوں کو دیکھتے ہوئے گنگنا رہی تھی۔ قاسم کو
دیکھ کر وہ گنگنا ڈاؤں گنگنا ڈاؤں بھول گئی۔

ایک تو اس وجہ سے کہ وہ کب سے اس کا انتظار
کر رہی تھی۔ دوسرا وہ تھوڑا بیل گیا تھا اور تیسرے وہ
اسے اچانک دیکھ کر کھل اٹھا تھا۔ چوتھے وہ توں۔ چھ ماہ
بعد مل رہے تھے۔

قاسم تھوڑا جینپ گیا۔ اس نے اپنی قمیص اتا کر
اسے کندھے پر رکھی ہوئی تھی اور جسم پر جابجا لیلی مٹی
چڑھی تھی۔

”وہاں کوئی تخت نہیں ہے جو تو زمین پر لیٹ جاتا ہے۔“ اپنی چادر کے پلو کو مٹھی میں پکڑ کر وہ اس کے جسم پر پھیرنے لگی۔ وہ چہرہ ہلچلے جانے کی کوشش کر رہی تھی یا شاید بچپن میں۔ قاسم نے اپنے جسم پر لہرائی اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ شام ہونے کے باوجود گرمی رات کا سناٹا فریج کے چرے پر آکر رک گیا۔

”آئی چادر خراب نہ کر۔ میں نہایتا ہوں۔“
 ”مجھے دیکھنے میں کوئی رکاوٹ مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔“ آنکھیں نمولنے کب بجیک گئیں اور آواز بنانے کب رہنا کی ہو گئی۔
 ”فریج؟“ وہ جلد سے جلد تعین کر لینے کے انداز میں پوچھنے لگا۔

”ہاں سچ۔“

”تو جانتی ہے یہ چہ ماہ میں نے کیسے کاٹے۔ روز پہلی سڑک کو دوڑتا تھا۔ دن رات۔ سارے مزارعے بھی مجھے چھیننے لگے تھے۔ میں نے سوچا کہ میں تجھے شہر اس ہی نہ آیا ہوں۔ کہتے ہیں جسے شہر اس آجائے وہ پھر کسی اور کو اس آئے جو گا نہیں رہتا۔“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا۔

”جس دن میں تجھے بھول جاؤں گی۔ وہ دن میری زندگی کا آخری دن ہو گا قاسم۔“
 اندر مگن میں تائی کو نمولنے کیا نہیں مل رہا تھا جو وہ کب سے اپری نہ نکلی تھیں۔ فریج اندر گئی تو وہ خالی مریضان سے نکلتی ٹھیل رہی تھیں۔

”تائی کچھ جل گیا ہے کیا؟۔ خوشبو آ رہی ہے۔ عجیب سی۔“

وہ جان نہ سکی کہ پچھلے کمرے میں پڑا عودوان بھڑک اٹھا ہے۔ پچھتے کڑ اور گلاب کلاب ہوا ہے اور خوب ہوا ہے۔ اسے پتہ ہی نہ چلا۔ شہر محبت میں کس نے اگر کے کھیت کو پروان چڑھایا ہے۔ یہ اس کی خوشبو تھی۔

”قاسم جب گھر آتا ہے تو انجیر کی خوشبو بھی آتی ہے۔“

تائی جیسے بات کو کول کرنا چاہتی تھیں۔

”اس وقت تیری چادر میں سے آئی ہوگی۔“ تائی نے زمین سے لپکتی ہوئی سے اپنی اس کی سفید چادر کی طرف اشارہ کیا اور ہنسی دینے کی غرض سے اپنا منہ مریضان کے اندر نکال ڈالا۔ فریج شہر سے اپنی پائی ہو گئی۔
 اگلے دن صبح اس کے اٹھنے سے پہلے ہی قاسم چاچکا تھا۔ فریج کو قصہ آگیا۔

”تائی! اتنے تو تو کر چا کر ہیں وہاں۔ پھر نہ کیوں ہلکان ہوتا ہے۔“

”کوئی پر اپنا کسی کے کام کو اپنا سمجھ کر تھوڑی نہ کرتا ہے۔ میں نے روکا تھا۔ کہنے لگا جلدی آجاؤں گا۔“
 تائی نے اس کا دل رکھنے کو کہا۔ ہر اس کا دل نہ لگا۔ وہ پھر ہو گئی قاسم نہ آیا۔ پھر سہ پہر بھی ڈھل گئی۔

”اب کی بار جانے کی تو ساگ روٹی بھی لگتی جانتا کیا پتا اسے بڑا اچھا لگے۔“ فریج کو اپنی دوست کا ذرا یاد آیا۔ ساتھ ہی اس کے دل میں ایک خیال آیا یا شاید۔ شرارت۔ تمہارا میں چائے ڈال کر اس نے سینہ صفا اور ابلے انڈے ایک ٹوکری میں ڈالے اور زمینوں پر چل دی۔ قاسم نے اسے دور سے ہی دیکھا تو ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگا۔ فریج کے نزدیک پہنچنے پہنچنے وہ ہنسی بلند و بانگ تھمتوں میں بدل گئی۔

چوڑی چھاتی، موٹی گردن، مضبوط بازو، مسرتی جسم۔ بہت سارے انجیر کے درختوں میں گھر ا قاسم اسے خود بھی کوئی درخت ہی لگا۔ جس کی شاخیں انہیں میں تالی بجاری تھیں اور تے بری طرح لہرا رہے تھے۔ وہ ایک درخت ہی تھا۔ اونچا لمبا تو تاناہ اس کا اپنا جس کے تنے پر وہ اپنا نام کندہ کر چکی تھی۔

”میں نے انتظار لگا کر یہ سب بتایا اور تو نہیں رہا ہے۔“

”میں کوئی مزارع تھوڑی ہوں۔ مالک ہوں یہاں کل انتظام ہو جاتا ہے یہاں پر بھی بھئی۔“ پاسکٹ اور تمہارا وہیں رکھ کر وہ اسے اندر انجیر کے درختوں میں لے گیا۔

”دیکھ سارے ہرے بھرے ہو گئے نہ کیسے خبر تھے سب اب سہ پہر پھل آئے ہیں۔ جس درخت

پر میرا نام لکھا ہے اس پر بھی۔“

”ہاں واقعی۔“ نظر اٹھا کر وہ ایک ایک درخت کو دیکھنے لگی۔

”یہ کہا کر دیکھ۔ کیا بیٹھا اور لہذا ہے۔“ اس نے ایک پھل توڑ کر اسے پکڑ لیا۔

”خوشبو دیکھ۔ میں نے کہا وقت بدل رہا ہے اور ماحول بھی۔ دادا ابو صبح کہتے تھے میرا دل تو واقعی صاف ہو رہا ہے۔“

”اس میں سے تیری خوشبو آتی ہے۔“ وہ لیس وار گودے کو کھاتے ہوئے بولی۔

”میری؟“ وہ حیران ہوا۔ ”خیر میں خوشبو کسلا ہوتی ہے۔“

خوشبو کا ذکر پھر چل نکلا اور کسی نے کستوری کا مسووف ہوا میں اڑا دیا۔ بپتے بپتے فریجہ نے گل کی چادر دلی بات بھی قاسم کو بتادی۔

”تو کمرے لڑا ہے نہ۔ تو نے شور۔ سے مقابلہ کیا ہے۔“

خجرو درختوں کے ساتھ دن رات محنت کی ہے۔ ان میں تیری اور تجھ میں ان کی خوشبو سوچ بس گئی ہے اور۔“

”اور کیا۔ بول فریجہ؟“ اس کا چو جذبیا سے روشن ہو گیا۔

”اور یہ خوشبو میری ذات کا حصہ ہے۔ میرے ہوش کم کرتی ہے مجھے دو لہ کر لیتی ہے۔“

فریجہ نے کہا اور محبت کا طویل پوری دو موم دھام سے بیچ اٹھا۔ فریجہ کی ان باتوں کے گواہ درخت بن گئے اور

سرگم کے آگے کسی نے جیسے جہر رکھ دی ہے بن کر قاسم کی آنکھیں گہرے ہوتے اندھیرے میں چمکی تھیں۔

سنجھوٹی۔ بولی کی طرح۔ فریجہ پیچھے کو ہٹنے لگی۔ ایک درخت اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ موٹے

تخت والا۔ سنجھوٹی بولی کی چمک کے ساتھ اور یہ چمک لہ لہ بہ لہ قریب ہی آئی جا رہی تھی۔ قریب اور

قریب۔ فریجہ دوسرے درخت کے تنے سے جا لگی۔ درخت پر پیچھی چڑھا پھر سے اڑ گئی۔ اور نمبر وار نے بڑی

زور دار تھپی بجائی حالانکہ سبھی بجانے کا کلام تو عشا کے

بعد شروع ہوا تھا۔

ہتے ہوئے وہ پگڈنڈی پر واپس آئی تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ قاسم اسی طرح کھڑا تھا۔ درخت کے تنے پر جھکا۔ اس کی طرف بپت کے جیسے خود سے

شرمتا ہو۔ حالانکہ۔ حالانکہ کچھ بھی تو نہ ہوا تھا۔ فریجہ نے اسے ایک دھکا ہی تو دیا تھا۔

صبح فریجہ کو کہا چلا رات وہ بڑی دیر سے گھرواپس آیا تھا۔



فریجہ کی پرصالی کو ابھی صرف ڈیڑھ سال ہوا تھا۔ ساڑھے تین سال مزید باقی تھے۔ یہ ساڑھے تین سال

بڑی تیزی سے گزر گئے۔ وقت بدلا اور خوشبو؟ خوشبو میں بھی کہیں کھینٹ پڑ گئی۔ انجیر کے درختوں کی بدھوتری کو مزید دیکھ ہی نہ سکی۔

کچھ حالات۔ کچھ تعلیم کا دباؤ۔ وہ ان ساڑھے تین سالوں میں ایک بار بھی گاؤں نہ جا سکی۔ نئی امی شروع

شروع میں تو خود چلی آئی تھیں۔ پھر نیلے می ڈیڈی کے روئے میں انہیں کون سی بات بری لگی کہ انہوں نے بھی آنا چھوڑ دیا۔ سال بعد عید وغیرہ قاسم آجانا

تھا۔ دونوں کی ملاقات تب ہی ہوئی تھی اور یہ ملاقات بڑی مختصر تھی۔ سرعام قسم کی ہوتی تھی۔ اسے پتا ہی نہ

چلتا تھا اور می راو اتا۔ دونوں کو تھانہ چھوڑتی تھیں۔ محبت اور اہللی میں ایک قدر مشترک ہے کہ ذرا

سی باہری ہو لیا دھوپ سب سوکھا کر رکھ دیتی ہے۔ دونوں بچپن کے دوست۔ تکلفات کی آڑ میں

چھپے رہے۔ یہ آڑ ہی محبت کے لیے باہری ہوا ثابت ہوتی تھی۔

پھر صورت حال میں سلکی آئی شامل ہوئیں۔ پڑوس میں بننے والی نئی کوٹھی میں سائے شوہر نادر کے

ساتھ۔ شوہر پوری ڈیڈی کی کالی اور سلکی آئی تھی۔ اتنی کہ می کو ان کے کمرے چھوڑ آؤ اور سلکی آئی کو اپنے

گھر لے آؤ۔ وہ بھی اپنے چار جیلھوں اور ان کی لعلیڈ سے تھوڑے عرصے پہلے ہی آزاں ہوئی تھیں۔

اس لیے مہی کی طرح اپنی زندگی خوب چل لگا کر انجوائے کر رہی تھیں۔ بہت سی منت خانی جس میں انہوں نے مہی کو جتا میں اور بدلے میں اتنی ہی مہی نے ان کو سکھائیں۔ سیاست، گھر، فیشن، کلب، سڑکیں، بوتیکس، سینما، پارک، شاپون، چارجٹ گولڈ، ڈائمنڈ ہیریز، ہر دل کھول کر ہنسنے کے جاتے۔ پھر ایک دن فریجہ ان کے سامنے بیٹھی تو ہاتھوں کا سرخ پانی کے دھارے کی طرح چیل گیا۔

سلمی آئی بولتے بولتے رکھیں۔ فریجہ کو دکھا اور ٹھٹھک ٹھٹھک گئیں۔ اس دن کے بعد عورت نامہ ختم ہو گیا اور ان کا بیٹا نامہ شروع ہو گیا۔ رائیل ان کا اکو آ بیٹا تھا۔ چار سال سے امریکا میں مقیم تھا اور بہت جلد واپس آنے والا تھا۔ لائق تھا۔ سختی تھا اور کامیاب ہونے جا رہا تھا۔ اسی لیے سلمی آئی کے منہ سے اس کی باتیں ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھیں۔

فریجہ کو لگتا دنیا میں جتنے بھی اچھے کام ہوئے ہیں وہ صرف رائیل نے ہی کیے ہیں۔ اور آگے بھی جتنے ہوں گے وہ رائیل کی نسل ہی کرنے گی۔

”بس آنے والا ہے۔ ایک ماہ بعد۔ ملو اؤں گی۔“ سلمی آئی بڑے اشتیاق سے روتی تھی۔ بس انیس۔ بس ستائیس۔ اور بس کل۔“

دعوت کے اختتام پر وہ تین ان تین کو بھی اگلے ویک اینڈ کی دعوت دے گئے جسے مہی نے آگے راستے میں ہی قبول کر لیا۔ مجبوراً فریجہ اگلے سڑے بھی ہو سٹل نہ جا سکی۔

”مہی اچھے کام ہوئے ہیں وہ صرف رائیل نے ہی کیے ہیں۔ اور آگے بھی جتنے ہوں گے وہ رائیل کی نسل ہی کرنے گی۔“

پہلی دعوت میں رائیل جو صرف سوم بنا بیٹھا تھا۔ دوسری دعوت میں بیٹھ کر شمع اور پھر مشعل بن گیا۔ فریجہ کی آنکھیں اتنا روشن سر ہلا دیکھنے کی علوی نہیں تھیں۔ چند ہی چند حیا چھو گیا۔

”بس آپ ایسے ہی کیوں لائیں گی میں دعوت کروں گی یا قاعدہ اس کی پھر لائیے گا۔“ فریجہ سے زیادہ مہی مرعوب ہوئی تھیں شاید۔ پھر جب رائیل آ گیا تو ایک ویک اینڈ مہی نے ان لوگوں کی دعوت کر دی اور اس دعوت کے حساس ہونے کے باعث پورے گھر کو لوہڑ ڈالا۔ فریجہ جان ہی نہ سکی کہ مہی مٹی میں بیج دیا کہ کونسا پھوٹنے کے لیے دیا گیا ہے۔ وہ اکثر اتوار کی شام ہو سٹل واپس چلی جاتی تھی لیکن اس اتوار مہی نے اسے جانے ہی نہ دیا۔

امریکی ماحول کا علوی لڑکا اپنے نظریں پر بیٹیکل جوک سنا رہا تھا جسے سنتے ہوئے فریجہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی۔ رائیل کے ہاتھ پر کب اس نے ہاتھ مارا اسے پتا ہی نہ چلا۔ بس پتا ہی تو نہ چلا۔

”مہی! کیا سوچیں گے وہ لوگ۔ میزبان ہی گھر سے قاتل ہے۔“ منت نے کھانوں سے بھری نیبل پر ڈیڑی کو رائیل

بہت پر دونوں کے کمروں کے ٹیرس آپس میں ذرا سے فاصلے ہی پر تھے۔ دونوں کی شام کو ایک ساتھ ٹیرس پر آنے کی ٹائمنگ دونوں میں سیٹ ہو گئی۔ فریجہ بھی رائیل کی خاطر صبح جاگتے کہنے لگی۔ ہاسٹل، یونیورسٹی سب سے غیر حاضر ہونے لگی۔ یہ ایک نیا ہی کلج تھا جہاں اس نے داخلہ لے لیا تھا۔

”مہی! گھر کی چابیوں دے دیں۔ آپ بے شک

میں نے بھر بعد کا واقعہ سے سلمی آئی نے بھی ان کے گھر ہی ڈنر کیا تھا۔ رائیل بھی چلا گیا سجالے کہاں سے۔ آواہ گری کرنا ہوا۔

یہاں ہی بیٹھی رہے۔ مجھے تو بڑی بھوک لگی ہے۔
 ”اے بھوک لگی ہے تو بیٹھو۔ کھانا بنا ہوا ہے۔ ہم نے بھی ابھی ابھی کھلایا ہے۔“ سملی آئی کے بجائے می نے کہا۔

”دیکھو ذرا کیسے شہوار رہا ہے۔“ اپنی می کا مود مذاق میں دیکھ کر وہ بیٹھ گیا۔
 ”فریحہ نے آج نئی ڈش بنائی ہے۔ تم بھی ٹرائی کرو۔“ اور رائیل نے کھاتے وقت بلی ڈشز چھوڑ کر صرف فریحہ کی ڈش کی ہی تعریف کی۔

”رہنے دیں جناب۔ بنا رہے ہیں مجھے کیا کبھی کسی ایچھے ریستورانٹ میں کھانا نہیں کھلایا؟“
 ”کھلایا ہے۔ بہت بار۔ پر وہ تو پرو فیشنل طریقے سے بناتے ہیں اور آپ نے بار سے بنایا ہے۔“

”مسکرا کر کہا گیا۔“ کبیرا فریحہ نے اپنی نظریں اس پر سے ہٹائیں۔ وہ کھانم اور اسے زیادہ دیکھ رہا تھا۔
 ”ہجرتی کھانا کھلانے کا شکر۔“ آئی۔ اب آپ کا بھی حق بننا ہے مجھ پر۔ کس تو اس کریم کھلاؤں۔“

”محبوبی۔“ سبکی اور پوچھ پوچھ۔ ”گاڑی میں دونوں خواتین پیچھے اور یہ دونوں آگے بیٹھ گئے۔ اس کریم پارک میں می اور آئی نے ابھی تو حاکب بھی شتم نہ کیا تھا کہ ایک وجے کو متنی خیز نظروں سے دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”ہم ابھی آئے ساتھ ہی بوتھ تک پر سیل لگی ہے۔“
 ”میں بھی چلتی ہوں۔“ فریحہ اٹھی۔

”بیٹھو۔ تم تو انجوائے کرو۔“ وہ دونوں ان دونوں کو اکیلا چھوڑ گئیں۔ فریحہ اٹھ نہ سکی۔ اس لیے نہیں کہ می نے صبح کیا تھا بلکہ اس لیے کہ رائیل نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ رات میں صبح کی روشنی فریحہ کے چہرے پر عود آئی۔ پتا نہیں کیوں وہ رائیل کا ہاتھ جھکنے لگی۔ پتا نہیں کیوں اور وہ باہر اپنی بیٹھ رہ بیٹھ گئی۔

”مریکا میں بہت طرح کے لوگ ہوتے ہیں فریحہ۔ بہت ممالک بہت خطوں کے سب کو جانتے جانتے اتنا ماہر ہو گیا ہوں کہ تم جیسی سادہ سی لڑکی کو

جاننے میں ذرا بھی وقت نہیں لگا۔ اگر تم مجھے جانتا چاہو۔ سمجھنا چاہو تو شوق سے۔“ وہ مسکرایا اور بڑی دیر مسکراتی رہا۔ فریحہ کی آنس کریم پھلنے لگی۔

”اور اس سب کے بعد کیا تم مجھ سے شادی کرو گی فریحہ؟“ سبیل کی طرح سے نظریں ہٹا کر فریحہ نے رائیل کو دیکھا اور اگر کے کھیت کو جیسے کسی نے آگ لگا دی۔ خوشبو پٹی اور لیٹ کر بیٹھی۔

راہداریاں پھیل گئیں اور آنکھیں سکر گئیں۔ محسوس کرتے کرتے

”می اور سملی آئی تو آپس میں کتابچہ لیتی ہیں۔ ایک ایک بہت کرتی ہیں۔ پھر می نے سملی آئی کو یہ کیوں نہ بتایا کہ میری منگنی ہو گئی ہے۔“ وہ اپنی کے سفر پر اس نے سوچا تھا۔

اور اگر می نے نہیں بتایا تھا تو میرے منہ پر کس نے تھکا لگا دیا تھا؟ میں کیوں رائیل کو قاسم کے بارے میں نہ بتا سکی اور رائیل کو یہ کیوں کہہ دیا کہ سوچ کر بتاؤں گی۔

”مشرق کی طرف چلتے چلتے بوے قاصدے پر واقع۔“
 قاسم کے ایچھے کے درختوں پر دیکھ گئے لگی تھی۔



”بیٹا! ہم چاہتے ہیں کہ اب تمہاری شادی کر دیں۔“

”اگلے دن می اس کے کمرے میں آئی تھیں۔ اسے جگایا تھا۔ کھڑکی کے پردے سرکائے تھے اور جب وہ

کھل بیدار ہو گئی تھی تو می نے کہا تھا۔ ”پریشس تم شادی کے بعد بھی کر سکتی ہو۔“

”ٹھیک ہے۔ آپ بتائی ہی۔“ وہ بات کھل نہ کر سکی۔ اس کے لب جاہد ہو گئے۔ کچھ دل دماغ نے اس کا ساتھ نہ دیا تھا۔ کچھ می کی آنکھیں ضرورت سے زیادہ کھل گئی تھیں اور ان کے تو اس طرح بگڑے تھے کہ سر پر لگا ایک رولر لڑھک کر پچھے کر گیا تھا۔

ماحول ہلکا کرنے کی غرض سے۔ اس نے کل رات

رائل کے پرنسپل واپس بات نہ ہنٹے ہوئے می کو جتا دی۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتی تھی۔ جس خود اٹھ جاتی وہیں سب کچھ می کے سر کو بوجی اور می کی محفل و دانش پر اسے شروع سے ہی کامل یقین رہا تھا۔

”آپ نے بتایا نہیں تھی انٹی کو کہ میری مشکلنی ہو چکی ہے۔“ ہنٹے ہنٹے اس نے یہ بات بھی کہہ دی۔

می کی صورت جیسے ”سب کچھ جان کر بھی کچھ نہیں جانتی“ کی نمائندگی کرنے لگی۔ وہ ایک نکل فریجہ کو دیکھے گئیں۔

”نہیں۔ اور تم بھی مت بتانا کیونکہ تمہارے ڈیڈی بھی یہی چاہتے ہیں۔“

دن اکٹھے گزار سکتا ہے۔ کوئی دو زندگیوں ایک ہی زندگی میں جی سکتا ہے۔ نہیں۔ نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ اور آج می نے اسے ایک زندگی جن لینے کا موقع دے دیا تھا۔

”آخری فیصلہ تمہارا ہوگا۔ فریجہ میری جان! جو تم چاہو۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھی پھر رکی تھیں۔

”تمہیں پتا ہے کہ رمشا بچپلے چھ ماہ سے گاؤں میں ہے۔ اور۔ اور گاؤں میں طرح طرح کی باتیں اٹھ رہی ہیں۔“ کہتے ہوئے وہاں ہلکی گئی تھیں۔

می اب می نہیں رہی تھیں۔ وہ مام بن چکی تھیں۔ ہائل آنے کے ایک ہفتے کے بعد اسے اس چچر کا اندازہ ہوا تھا۔ سات دن کے اندر راندر انہوں نے گھر بیٹھے بیٹھے ہی خولنے کیا چکر چلایا تھا کہ انہوں میں دن ہائل کے کمرے کی کھڑکی سے اس نے قاسم کو بلاؤنگ کے اندر داخل ہونے دیکھا۔ وہ اپنا کپڑا کیا تھا۔ جسم کا سارا خون اس کے چہرے پر جمع تھا۔

”مس فریجہ! آپ سے کوئی قاسم صاحب ملنے آئے ہیں۔“ ٹوکی نے اسے آکر کہا۔ سوچنے لگی۔

”اس سے کوئی مجھے نہیں ملتا اس سے۔“ ٹوکی چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد پھر آئی۔

”جو اندر رہی اندر تم بھی چاہتی ہو۔“

فریجہ کو کوئی شاک نہ لگا۔ وہ بتی بیٹھی رہی۔

”بچپن میں تم قاسم کے ساتھ گھر گھر کھیلا کرتی تھیں۔ لیکن اب تم بچکے میں رہ رہی ہو اور یہ بچکے بچکے کا کھیل قاسم کے ساتھ نہیں کھیلا جاسکتا۔ یہ بڑنگ اور پگڈنڈی کا فرق نہیں ہے فریجہ! پوری زندگی کا سوال ہے۔ قاسم ایک شخص ہے اور رائیل شخصیت۔ جنہیں بہرحال شخصیت کی ضرورت ہے۔“

”قہ کہتے ہیں۔ ضروری بات کرنی ہے۔“ کمرے میں چکر لگاتی فریجہ نے بین پگڈنڈی پر ٹوٹ لکھ دیا۔

”ساری ضروری باتیں رمشا سے کروا لیں۔“ اور لڑکی کو تھما دیا۔

”مجھے سے بھی ٹوٹ آ لیں۔“

”رمشا میری کچھ نہیں لگتی۔ لیکن اب تو ایسا چاہتی ہے تو اس سے ہی کر لیتا ہوں۔ میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہے۔ مود انسانوں کی جانچ پڑتال کرتی ہے۔ کبھی زندہ انسانوں کے سینے چیرنے کے دیکھ۔ پتا نہیں کیسے کیسے انکشافات ہوں گے۔“

”پہلے سوچتی نہیں تھیں۔ صرف تو بتی تھیں اپنے ذہن کے لٹل پر پنی تصویر۔ جس میں پلزار رائیل کی طرف جھکا ہوا تھا۔ می نے فریجہ کو بھی دکھادی۔ فریجہ تو آگے ہی تڑپ رہی تھی۔ چل رہی تھی۔ سلگ رہی تھی۔ می نے جھنجھٹ کی ہوا دی تو اس نے فوراً ہی آگ پھڑکی جس نے سب کچھ جلا ڈالا۔ خوشبو نے دھوئیں کا روپ اختیار کر لیا۔ مین جو ڈالا گیا تو وہ مرگھٹ کی اداسیوں کو بھی چھبھو ڈکھیل۔

می یہ سہنہ کہیں تو وہ خود ان کے آگے ہاتھ جوڑ دینے کو تیار تھی کہ اسے آزاد کروا لیتے۔ وہ جتوں میں نہیں تھی سکتی۔ وہ مختلف سمتوں۔ وہ صدیوں۔ وہ قرون میں۔ اپنے آپ کو بنا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ وہ ڈکٹیٹوریوں میں ہی نہیں رہنا چاہتی۔ کیا کوئی شخص وہ

قاسم لکھ کر چلا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ محبت کا دونوں طرف سے اصلی ہونا ضروری ہے۔ کسی ایک طرف کی سوسے بازی دونوں کی زندگیوں تباہ کر دیتی ہے۔

فریجہ بڑھ کر وہ م سے اپنے بستر کر لی۔ اگلے ہفتے گھر آکر اس نے انجیر اور قاسم کی خوشبوؤں والی سفید

چادر کو دھلنے کے لیے دوے دیا تھا۔



رجشیں کندھوں میں ختم کرتی ہے تو وہی خوشبو برساتی
بھی ہے اور فطانت بھی ہے برے کام کرنے والوں کے
پچھے آسیب کی طرح چٹ بھی جاتی ہے۔

اس کے پچھے بھی ایک آسیب لگ گیا تھا شاید۔
بڑے بزرگوں کی یہ سچ باتیں۔ کیوں ہی نسل بانٹیں
منوں مٹی تلے دفن کر ان پر فاتحہ بھی پڑھنا بھول جاتی
ہے۔ کیوں ان پر یقین نہیں کرتی۔ کیوں کرنا نہیں
چاہتی۔ نہیں مانتی۔ کیوں ہر تجربے سے خود گزرتا
چاہتی ہے۔ فریحہ اس آسیب سے چھٹکارے کے لیے ہر
روز لوہاں سلگانے لگی۔

میں نے پھر بعد کا واقعہ ہے؟ چلنے چلنے جیسے رک گئی۔
جلد ہو گئی۔ کچھ ہوا سہل بہت کچھ۔ وہ خود پر منکشف
ہو گئی؟ ذات کے تصرف کی روشنی نے اسے خود میں قید
کر لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”روز بیٹہ شیش بدلواتی ہو۔ روز کرو دھلواتی ہو۔ کیا
ہوا ہے۔ کیا خط ہے؟“ رائٹل نے پیار سے پوچھا۔
”کچھ بھی تو نہیں۔“ وہ ایسے بولتی جیسے اپنے خط
کو ضبط کر رہی ہو۔ کسی خزانے کا راز اس کے سینے میں
دیا ہویا اسے قیامت کے دن کا پتلا چل گیا ہو۔

”یہ میرے ہینٹ سوٹ برس نے اس بری طرح
اس پر کیا ہے۔ کیسی خوشبو آ رہی ہے۔“
”خوشبو؟“ وہ کھٹ کھٹ گئی۔ ”کیسی خوشبو؟“
ہاں میں نے ہی لگا دیا ہو گا فریقہ غلطی سے۔“
رائٹل نے آگے بڑھ کر کمر کیوں دوڑا اسے کھول
لیے۔

”مجھے تو پورے کمرے سے خوشبو آ رہی ہے۔“
”میں نے اس پر کیا کیا تھا۔“
”تازہ تازہ۔“ وہ تقریباً چلایا۔ فریحہ اسے کیسے بتاتی
کہ وہ کچھ نہیں کر رہی اور یہ سب کچھ کون کر رہا ہے۔
کون خوشبوؤں سے لبریز آسیب ہے جو اس کے کسی
برے کام کے نتیجے میں اس کے پیچھے لگ گیا ہے۔ تو
خود اس آسیب کا سراغ کھوج رہی ہے اسے بھگانے
یا اسے منانے کے لیے اور اس دن تو رائٹل حیران ہی وہ
گیا جب اس نے فریحہ کو اپنا تکیہ سو گھنٹے دیکھ لیا۔

ایک ماہ بعد۔ رائٹل کے ساتھ اس کی شادی
ہو گئی۔ خوب دھوم دھام سے۔ جس میں دونوں
طرف سے اپنی اپنی اگلوئی اولاد پر دل کھول کر بیٹے خرچ
کیا گیا اور سائلوں کے ارمان نکالے گئے۔ ہنی سون پہ
فریحہ کی فرمائش پر رائٹل فریحہ کو فرانس لے گیا۔ وہاں
سے واپسی پر ہی کچھ عجیب و غریب واقعات ہونے
لگے۔

دو کشتیوں میں سے اس نے ایک کشتی کا انتخاب
کر لیا تھا، لیکن کشتی کشتی ہی رہی گھر نہ بن سکی۔ وہ
زندگیوں تو اس کے خود کے بہتر چھپی بیٹی تھیں،
جنہوں نے اس کے اندر بے چینی کی بھڑکی سی اب
وہ کیسے تک کر بیٹھے۔ رہنے کو تیار نہ تھی۔ رکتی تو لگتا
کہیں کچھ ہو جائے گا۔ چلتی تو محسوس ہوتا کسی اور
ٹریژن میں سوار نہ ہو جائے۔ فریحہ رائٹل کو بدلی بدلی سی
گئی۔ شادی کے ابتدائی دن تھے۔ جب سب کچھ سنہرا
سنہرا سا لگتا ہے، لیکن فریحہ کے چہرے پر تو کچھ اور ہی
رنگ چھائے رہتے تھے۔

”امریکا میں بڑی لڑکیاں مرنی تھیں۔ مجھ پر۔ لیکن
میں نے خود کو بچائے رکھا۔ شاید تمہارے لیے اور تم
ہو کہ مجھے سے شادی کر کے خوش تو ہونا؟“
”جی ہمت۔“ وہ مسکراتے ہوئے کہتی۔
”تمہاری یہ مسکراہٹ مجھے مطمئن نہیں
کراتی۔“

وہ اسے کیسے مطمئن کرتی۔ وہ تو خود غیر مطمئن
تھی۔ کچھ حیران کن تھا۔ کچھ اٹوٹا تھا جسے وہ سمجھ
نہیں پاری تھی۔ مٹی کے مشورے بھی اس معاملے
میں اسے لاچار محسوس ہوتے۔ ان سب کے علاوہ
ایک اور چیز بھی تھی۔ خوشبو اس خوشبو کی چلم بڑی
حویلی کے پچھلے صحن کے سامنے والے کمرے میں
دھری تھی۔ فریحہ بڑے بزرگوں، دانائوں کی یہ باتیں
کیسے بھول گئی کہ خوشبو معطر کرتی ہے۔ دلوں سے

”کیا کر رہی ہو؟“

”نہ میں۔“ وہ گہرا گئی۔ ”مجھے لگا کہیں گندا ہی نہ ہو۔“

”صبح ہی تو تم نے اٹھتے ساتھ کو برد لے تھے۔“ وہ حیران ہوا۔ پھر قریب ہوا۔

”فریحہ! سب خیریت تو ہے۔ نا۔ کوئی بات ہے تو تم مجھے بتا سکتی ہو۔ شہر میں بڑے اچھے اچھے سائیکازسٹ موجود ہیں۔ ایک دو بار جانے سے مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔“ رائفل نے بڑے پیار سے کہا۔ فریحہ ہو کر گئی۔

تو کیا وہ کچھ ایسا کر بیٹھی تھی کہ اسے سائیکازسٹ کے مشوروں کی ضرورت پہنچی تھی۔

غم کی وجہ سے وہ ساری رات اس نے سوئے جاتے گزارے۔ صبح آٹھ بجے کھلی تو بستر کی بائیں طرف خالی تھی۔ رائفل یقیناً غسل خانے میں نہا رہا تھا۔ پتا نہیں لینے لینے وہ دوبارہ سو گئی تھی کہ جاگ ہی رہی تھی۔ بستر کی بائیں طرف ہاتھ پھیرتے پھیرتے اسے ایسے محسوس ہوا جیسے وہیں نرم گھاس آگ آئی ہو۔ آسیب اپنا سراغ دینے لگا تھا۔ گمان سے نکل کر وہ حقیقت میں آئی۔ رفتہ رفتہ گھاس ملائم سے ملائم تر ہوتی گئی۔ سحر نے شام پکڑا۔ سورج نے بھڑک کر لوڑھائی۔ پھر کچھ گیل۔ وہ چونک کر اٹھی۔ بیٹھی پھر کھڑی ہو گئی۔ رات وہ کہاں تھی اور کہاں کہاں ہے۔ وہ فیصلہ نہ کر سکی۔

کیا وہ اغوا ہو گئی تھی راتوں رات یا بھٹک گئی کسی مکان و مہاڑے۔

اس کے ارد گرد انجیر کے درختوں نے پر چھائیاں سی شروع کیں۔ پھر وہ اپنے اپنے چکل و جھول کے ساتھ وہیں ایستادہ ہو گئے۔ اس نے خود کو ان درختوں کے بحرمت میں گھرے ہوئے پایا۔ پھر انہیں میں سے ایک درخت اس کی طرف بڑھلا۔ چوڑی چھائی، موٹی گردن، مضبوط بازو، کسرتی جسم، ساٹوا سا سفید بھری خوشبودار دینے والا اور گہرے ہونے اندر گہرے میں جس کی آنکھیں منجھوٹی بوٹی کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ درخت قریب ہوا۔ قریب اور قریب۔ فریحہ

دوسرے درخت کے تنے سے جا لگی اور اس بار اس نے اس درخت کو دھکا نہیں دیا تھا بلکہ بیڑھ کر اس کے ساتھ لیٹ گئی اور پھر لپٹی ہی رہی۔ درخت نے بھی اسے نہ چھوڑا جیسے وہ اس سے کوئی پرانے حساب کتاب یا کوئی پرانے بدلے لے رہا ہو۔

دریاؤں کے رخ مزگئے اور آبشاروں نے ہنستا شروع کر دیا۔ دوسرے کس سے ایک آواز سنائی دی۔

”فریحہ!“

مدھم۔ مدھم۔ پھر یہ آواز تیز ہوتی گئی۔ تیز سے تیز تر۔ اس کے چہرے پر پھوار کی طرح پانی کے چھینٹے پڑے۔

”فریحہ!“ رائفل نے اسے کندھوں سے تمام کر رہی طرح بلایا تھا۔ پھر شرارت سے اپنے کیلے پانی اس کے چہرے پر پھینکے تھے۔

”اچھا!!“ وہ توجھ میں سے انجیر کی خوشبو آتی ہے؟“ وہ شرارت سے پوچھ رہا تھا۔ فریحہ کچھ نہ سمجھ سکی۔

”اور یہ خوشبو تمہاری ذات کا حصہ ہے تمہارے ہوش گم کرتی ہے۔ تمہیں دیوانہ کرتی ہے۔ ہاں بتاؤ۔ بتاؤ۔“ کالور کی لہر آئی اور فریحہ کو چھو کر چلی گئی۔ ”تمہیں ایشیہ دینے کے لیے انجیر ہی ملی تھی۔ مجھے تو بالکل پسند نہیں، لیکن اب اگر تم کہتی ہو تو روز کھانی ہی پڑے گی۔“ خوشی سے کتنا رائفل فریحہ کو سکتے کے عالم میں چھوڑ کر ہر جلا گیا تھا۔

پہلے تو وہ کچھ سمجھ نہ سکی اور جب سمجھی تو اس کا اندر باہر بھیک گیا۔ آنسوؤں سے، دکھ، غم، پچھتاوے سے کرجی کر رہی ہوتے وجود کے ساتھ فریحہ نے خود کو آئینے میں دیکھا۔ جمل اس کے عکس کے بجائے کچھ اور ہی تھا۔

ایک آسیب۔ ایک انجیر کے موٹے تنے والا درخت۔ جس کی آنکھیں منجھوٹی بوٹی کی طرح چمک رہی تھیں۔ اور جو ہاتھ پر ہاتھ مارتا پتے لہراتا، ظہیر قہقہے لگاتا بڑی لوہی، ہسی اس رہا تھا۔ بڑی ہی لوہی لوہی۔



نومبر

سفرِ سحر

Downloaded From
paksociety.com

”آئی بوا۔۔۔ سلام تادا آپ نے۔۔۔؟“ شوکت بیگم نے اندر پھرن میں جھانکا۔

”ہاں خیر ہے۔۔۔ سب ہو گیا۔“ وہ شیفت صاف کرتے ہوئے بولیں۔

”اور انار دلانے کی چٹنی، ہری مرچی ڈال کر بنائی ہے نا۔۔۔ آپ کو پتا ہے، مڑوہ کو بہت پسند ہے۔“ قرینج کھول کر پھر بھی ایک بار اپنا اطمینان ضرور کر لیا۔ آئی بوا اس میں۔

”ہاں ہاں۔۔۔ سو سب ہو گیا۔ میرے ہاتھوں کی پٹی بڑھی پچھلیاں ہیں سب کی پسند نا پسند ازیر ہے مجھے۔“ آئی بوا سگرا دیں۔

”ہاں۔۔۔ وہ تو ہے پر پچھلی بار جو ہوا، مجھے بس ٹینشن سی ہے کوئی کنی نہ رہ جائے، آپ کے سامنے کی ہی بات ہے اسامہ نے کچھ بھی نہیں کہلایا تھا۔“ شوکت بیگم کے لہجے میں آج بھی اس بات کا مسخ تھا۔
”کوئی بات نہیں، نئے رشتے، نئے لوگ ملیں تو انہیں سمجھنے میں تھوڑا وقت تو لگتا ہے۔“ آئی نے ان

کا حوصلہ بڑھایا۔

”ہاں۔۔۔ لیکن۔۔۔“

”جو ہوا۔۔۔ بس جانے دو۔ تم جھٹ پٹ ٹٹھے پر یاد ام پرست لگا دو۔ میں تو چٹنی بنانے میں تھک گئی۔“ وہ سہارا لے کر کرسی پر بیٹھ گئیں۔

”آئی۔۔۔ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ آپ کا اس طرح کام کرنا۔۔۔ پھر بھی کتنا کچھ کر دیا آپ نے۔“ شوکت بیگم ان کے لیے گلاس میں پانی ڈالنے لگیں۔

”کیا کرتی ہوں میں؟ صفحہ کے امتحان نہ ہوتے تو اس نے سب ہی کچھ خود کرنا تھا۔“ اتنا سارا کام تم اکیلے کیسے کرتی تھیں۔“ آئی بوا نے کہا۔

”اچھا چلیں۔۔۔ اندر چل کر بیٹھیں۔ میں بیٹھا قرینج میں رکھ کر آتی ہوں۔“

”اسما آجاتی تو اچھا تھا، پر بیٹیاں، بھی اپنے گھر کی ہو جائیں تو، اگلے کی مرضی سے ہی آتی ہیں۔“ شوکت بیگم کچھ نہیں بولیں۔
”میں تو کہتی ہوں۔۔۔ صفحہ سے پہلے۔۔۔ تصویر کی دہلیز

مکمل ٹاڈل

Downloaded From
Paksociety.com



پیسے پورے کر دیے۔۔۔ حد موٹی آئی بوا! آج کی دعوت میں پانچ ہزار خرچ ہو گئے۔۔۔ وہ تو دل و جاں سے جل گئی۔

”بڑے گھر میں بیٹی بیانی ہے۔ اس کے سکھ کی خاطر کچھ قیمت۔۔۔ زندگی بھر قسط وار چکانی بڑے کی۔۔۔ ہتا نہیں وہ ملو تمایا آگاہی تو خور تو کہہ کر چلا گیا۔ اور شوکت بیگم پانچ کاٹھ ہی دیکھتی رہ گئی۔



”شوکت بیگم اور انوار صاحب ہنسنا ہستا گھرانہ۔۔۔ جہاں پیسے کی ریل چل پویل تو نہیں، لیکن اتنی آسانی ضرور چھٹی کہ انوار صاحب کے چھوٹے سے کاروبار سے زندگی سسل سی گزر رہی تھی۔۔۔ تین بیٹیوں اور ایک بیٹے کے ساتھ، وہ بہت مطمئن زندگی گزار رہے تھے آئی بوا! جیسا بزرگ کا سہا ان کے لیے کسی رحمت سے کم نہیں تھا۔ ان کے ساتھ کوئی خون کارشتہ نہیں تھا۔ انوار صاحب کی والدہ کی منہ بولی بہن۔ جو تقسیم ہند میں پھنڑ کر ان سے آئی تھیں۔ ان ہی کی بیٹی تھیں، ساری زندگی اسی گھر میں بتادی۔ انوار صاحب انہیں بہن مانتے تھے، وہ ان سے کافی بیڑی تھیں۔ اور انہیں آئی کہہ کر لیا تے تھے شوکت بیگم انہیں ”آئی بوا“ پکارتیں اور آج تک وہ سب کی بوا آئی ہی رہیں۔ ان کی موجودگی گھر کے لیے باعثِ رحمت تھی۔ بڑی دونوں بیٹیوں کی شادی کر کے انوار صاحب کافی حد تک مطمئن ہو گئے تھے؛

ان کی بڑی بیٹی اسماء اور چھوٹی بیٹی مر وہ۔۔۔ دونوں کی شادی خیموں میں ہی ہوئی تھی۔ بڑی بیٹی کو بیاسہ پانچ سال ہو گئے تھے۔ جبکہ مر وہ کو ابھی صرف تین مہینے ہوئے، نئے لوگ، نئے رشتے اور ان کے مزاج کو سمجھنے میں کافی مشکل ہوئی، رشتوں کو نبھانا اور سمجھنا کچھ آسان تو نہیں تھا اور ابھی بھی۔۔۔ اپنے نئے داماد۔ اور بیٹی کے سرال والوں کو پتہ نہ لگتا تھا۔۔۔ دونوں بیٹیوں کی شادی اچھے کھاتے پیتے گھرانوں میں ہوئی۔ جو کم از کم انوار صاحب کے حالات سے

لے آؤ، کچھ تمہیں سولت ہو جائے گی۔“ آئی بوا نے دیکھے لیے میں کہا۔

”آج کل کی لڑکیاں۔۔۔ کہاں یہ سب کرتی ہیں آئی بوا! مجھے تو یہ باتیں بھی اب بے کار لگتی ہیں۔ سب مر وہ کو ہی دیکھ لیں۔۔۔ ان کے لیے میں ہلکی سی فکر مندی کی جھلک تھی۔ آئی بوا نے فوراً انہیں دیکھا۔

”اور صفا، کیسے کھینچ کھانچ کر بچن میں لانا پڑتا ہے۔۔۔ وہ کچھ وقت سے یوں۔۔۔ تو آئی بوا! بس دیں۔

”تم دل بہت جلدی چھوٹا کرتی ہو، بیٹی ہے وہ۔۔۔ اور مر وہ۔ ابھی شادی ہوئے دن ہی کتنے ہوئے پھر بھی کتنی جلدی ان کے رنگ میں رنگ گئی۔“ آئی بوا نے انہیں دلا سہایا۔

”اتنے کے رنگ تھے میرے آئی بوا! وہ ایک لحاظ کو ہاتھ روک کر یوں۔۔۔ ایک دم تو آئی بوا! کچھ نہیں یوں۔ اور جب بولنے کی لیے لب کھولے۔ تو ساتھ ہی تو خیر اندر داخل ہوا۔

”کیا بات ہے؟ آج تو پورا گھر۔ ماں کے بیٹے کھاناؤں کی خوشبو سے مہک رہا ہے۔“ اس نے کھینچ کر لب باس لیا۔

”اور تمہاری ماں پھر بھی بے چین ہے کہ کوئی کی نہ رہ جائے، جو ان کی راجا کی خیانت میں۔“ آئی بوا نے کہا۔

”یہ ڈر تو ہتا نہیں کب تک رہے گا۔ اتنے مہان جو ہیں ہمارے، ہنوتی بالکل ہائی فائی۔“ وہ اک انداز سے ناگ چڑھا کر بولا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی شوکت بیگم کی ہنسی نکل گئی۔

”شکر ہے۔ آپ ہنس تو لیں۔ یہ حساب کتاب دیکھ لیں۔۔۔ صبح جو وہ ہزار آپ نے مجھ ویلے تھے نا۔ اس میں سے یہ پانچ کاٹھ بچا ہے۔“ اس نے ایک رسید کے ساتھ پانچ کاٹھ بڑھا دیا۔

”ہائیں۔ بونگلیں، اس کریم اور تمہارا سا فروٹ اور وہ ہزار لگ گئے، شوکت بیگم کا نہ کھلا رہ گیا۔“ نہیں۔۔۔ رونق نان والے کو بھی پیسے دیے ہیں۔ اور بیکری کا سلمان۔“

”اچھا اچھا بس۔“ چار سوسے۔ چار ہینڈ میں

میں ہی آئی ہے۔“ آئی بوائے بڑے مدلل اور محسوس لہجے میں کہ۔

”ہماری مودہ بہت سمجھ دار ہے، اب اتنا تو ہم بھی سمجھ گئے ہیں کہ اسامہ بہت سلجھا ہوا اور نیک سیرت لڑکا ہے، اچھی بات ہے، وہ جیسا چاہتا ہے مودہ کی ہی ہو گئی۔“ انہوں نے مزید رسالت سے کہا۔

”پر آئی بوا۔ یہاں اس نے زندگی کا ایک حصہ گزارا ہے، مجھے اس کے بدلے ہوئے اطوار بہت عجیب لگتے ہیں۔“ وہاں تھی، کئی کل چمن نہیں آگیا۔ ”ہاں کاسکھ سکون اسی میں ہے کہ اس کی بیٹی اپنے گھر میں خوش رہے اور تمہارے لیے اتنی ہی کلفتی ہونا چاہیے۔“ آئی بوائے حتی انداز میں کہا اور اس بات کے لیے شوکت بیگم کو قائل ہونا ہی پڑا۔



مودہ کی مندر منگاپور سے آئی تھی۔ شادی کے بعد وہ پہلی بار آئی تو مودہ نے فون کر کے کہا کہ اسے کھانے پر بلا میں، بس اسی سلسلے میں یہ تیاری ہوئی تھی۔ مودہ نے فون پر سمجھا دیا تھا کہ کھانا بہت ہلکے مسالے والا ہونا چاہیے۔ وہ تو چاہتی تھی کہ بازار سے ہی آرڈر کر دیا جائے مگر آٹھ نو افراد کا کھانا باہر سے منگوانے تو دس ہزار سے کم کیا خرچ ہوتا، شوکت بیگم کے لیے سمجھ داری اسی میں تھی کہ وہ گھر میں ہی سب کچھ پکا لیتیں، انہوں نے دسی کھانوں کو ہی ”ولایتی“ طریقے سے پکایا، جوان کی بیٹی کے سسرال والوں کو پسند آجائے، مودہ اور اسامہ پہلے ہی آگے سال کھانے میں مرچیں تو کم رکھی ہیں نا، اور۔۔۔ وہ جیبل رائس میں اسپرنگ انین (sorubg onion) ہی یوز کرنا تھا۔ آئی نازی کو وہ بہت پسند ہے۔“ مودہ نے پہلے آکر کھانے کا جائزہ لیا، پتا نہیں کیوں لیکن شوکت بیگم کو دل میں یہ بات بری محسوس ہو رہی تھی۔

”عجیب لڑکیاں ہو تم۔ مشکل میں ڈال رہی ہو؟“ وہ قدرے خفگی سے پوچھیں۔

”اوہ میری بیماریاں ماں۔ میں تو بس اس لیے کہ

مطابقت نہیں کھاتے تھے۔ بڑے دلملو۔ زیرک تو کلفتی حد تک ان سے کھل مل گیا۔ مزاج کا کافی اچھا اور بے تکلف تھا۔ جبکہ اسامہ کی طبیعت کچھ الگ سی تھی، مہرجل ابھی تو آتا تھا۔ وہ اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں دے سکتے تھے۔

اسامہ فطرتاً بریز رہے والے لڑکا تھا، دوسروں میں جلدی کھانا ملنا سے پسند نہیں تھا، اپنے اصولوں اور عادات میں وہ بہت پکا تھا، اس کا زندگی گزارنے کا انداز کافی ہٹ کر تھا۔ اور اپنی شریک حیات میں بھی یہی سب دیکھنا چاہتا تھا، یہ سب مجھ کے گھروالے اپنے داماد کے بارے میں سمجھ سکتے تھے۔ لیکن اپنی بیٹی میں پڑتی ہوئی عادات کو ایک دم قبول کرنا ان کے لیے کافی مشکل تھا۔ خاص کر شوکت بیگم کے لیے۔ یہ ان کی ہی تربیت تھی کہ جس گھر اور جس ماحول میں جاؤ وہاں کے مطابق رچ بس جاؤ، لیکن بعض اوقات کچھ تبدیلیاں مزاج کے ساتھ میل نہیں کھاتیں اور محسوس ہوتی ہیں۔

اسامہ کی خاموش طبع فطرت انہیں اچھی لگی تھی، مگر یہ کیا کہ ان کی ہستی کھلتی باقوتی سی مودہ بھی اسامہ کے ساتھ بیٹھے اپنے ماں باپ اور گھروالوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کر رہی تھی جیسے پہلی بار مل رہی ہو۔ کھانے میں احتیاط، باتوں میں احتیاط، پینے میں احتیاط۔ اور تو اور شادی کے بعد پہلی بار کیکے میں ہونے والی دعوت میں اپنے پسندیدہ کھانوں کو اس نے چھوا تک نہیں۔

شوکت بیگم پریشان ہو گئیں۔ وہ ایک دم چند دنوں میں اتنے کیسے بدل گئی ہے؟ کیکے؟ وہ اسامہ کے ساتھ خوش تو ہے؟ کیکے کیسے خیال ان کے دلغ میں آنے لگے؟ اپنے اس خدشے کا اظہار انہوں نے آئی بوا سے بھی کر دیا، انہوں نے بھی دینا دیکھی تھی۔ شوکت بیگم کے اس خیال کو رو کر دیا۔

”شوکت بیگم۔ وہ دونوں خوش ہیں۔ ایک

دوسرے کی خوشی کے لیے میاں بیوی میں سے کسی ایک کو بدلنا ہی پڑتا ہے۔ اور یہ قربانی عورت کے حصے

نہیں کھایا۔ ای تو ابھی آنے تک کہتی رہیں مگر گھر میں ان کی پسند کا کھانا نہیں بنا تھا۔ نکلے تو اوٹھک کے لیے تھے پھر سوچا کہ آپ سے بھی ملتی جاؤں۔ مل کر کھانا بھی کھائیں۔ وہ اپنی ہی دھن میں بولتی جا رہی تھی۔

”ارے اسماء آئی۔ آج زیرک بھائی کو یہ کھانا کھلا کر دیکھیں۔ کچھ نیا ہو جائے گا اور پھر بتایا بھی تو ہماری ماں نے ہے۔ پسند تو ضرور آئے گا۔“ مروہ نے ای کا چہرہ دکھا تو یونہی کچھ محسوس کر کے بولی۔

”ہاں۔ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ بروسٹ و بروسٹ چھوڑو۔ اور کھانا لگاؤ۔ میز پر۔“ شوکت بیگم نے فوراً کہا، مروہ برتن نکالنے لگی۔

”یہ صفا کھل ہے نظر نہیں آ رہی۔“ ملا خرقصا کو یاد کر رہی لیا گیا۔

”وہ کمرے میں ہے، دوپہر ہیں اس کے کل، صبح سے بڑھنے میں لگی ہے۔“ انہی نے بتایا۔

”کچھ دیر کے لیے آجائے باہر سب آئے ہیں۔ اچھا نہیں لگتا اور آپ صبح سے اکیلی ہی کام میں لگی ہیں، مجھے بلایا ہوتا۔ بتایا تک نہیں کہ مروہ کا سرال بھی آ رہا ہے۔“ اسماء قدرے ناراضی سے بولی۔

”میں نے سوچا، تم کہاں بیٹے کے ساتھ کام کر گئی، ویسے بھی تمہارے سرال کا کام کم ہے کیا۔ مروہ جاؤ، بلا لاؤ صفا کو۔ کچھ دیر بیٹھ جائے اور کھانا بھی کھالے۔“ ماں نے کہا۔

”ہاں۔ ویسے بھی میں بھی ساتھ کام میں لگی رہی تو اسماء برا مان جا جس گے۔“ مروہ نے کہا اور بچن سے نکل گئی۔ شوکت بیگم کو شک ہوا کہ شاید انہیں سننے میں غلطی ہوئی ہے۔ انہوں نے اسماء کی طرف دیکھا۔

”ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے انسان سرال میں بھی کام کرتا رہے اور میکے میں بھی۔ آپ بھی تو ایک کام والی نہیں رکھتیں۔ خود بھی ٹھک جاتی ہیں۔ اور کئی بوا بھی چھوٹے موٹے کام میں الجھی رہتی ہیں۔“ اسماء بلا تامل جو مزہ میں آیا کہتی گئی۔ اور ساتھ ساتھ

رہی تھی کہ کسی کو آپ کے بنائے کھانے پر انگلی اٹھانے کا موقع نہ ملے۔ اور میں نے دیکھا ہے نازی آئی بہت تک چڑھی ہیں۔“ وہ آہستگی سے بولی مگر پھر بھی اندر داخل ہوئی اسماء نے سنا لیا۔

”خیر تک چرچا تو تمہارا سارے کا سارا ہی سرال ہے۔“ وہ ہنس کر بولی تو دونوں ہمیشہ گلے گلے کر رہیں۔

”دیں۔ کیا زیرک بھی آئے ہیں؟“ شوکت نے بیٹی کو گلے لگا کر پوچھا۔

”ہاں۔ اسماء کے پاس بیٹھے ہیں؟ کیا بنایا کھانے میں۔“ اس نے ایک دلچسپی کا ڈھکن اٹھایا، ”ہم، ہم وہ چھوٹیل رانس۔“ اس نے دو سرا ڈھکن اٹھایا۔

”چکن چھاؤ من، دلچسپی کہلپ۔“ اس نے ہاری ہاری سب کھانوں کا جائزہ لیا، ”بہت زبردست مینو ہے۔ سب آپ نے بنایا ہی ہے۔“ اس نے حیرانی سے ماں کو دیکھا۔

”اور نہیں تو کیا؟ صفا کے امتحان تھے۔ میں نے ای کو فون پر گھنڈ کیا۔ یہ چکن چھاؤ من تو امی نے پہلی بار بنایا ہے۔ لہذا چھوٹی نازی آئی کے بچوں کو بہت پسند ہے۔“ مروہ نے خوشی ہو کر بتایا، ”اس نے ایک کانٹا (Fork) اٹھایا اور دلچسپی میں ہی سے چکھا۔“ مئی۔

”بہت مزے کا بنا ہے ای۔“ اسماء نے بھی ٹیسٹ کیا۔

”ہاں بنا تو مزے کا ہے۔ لیکن زیرک کو ایسے کھانے نہیں پسند۔“ اسماء نے کہا۔ شوکت بیگم کا چہرہ مرجھا گیا۔

”تم لوگ اچانک آئے۔ بتا دیتیں تو میں کچھ اور بنا دیتی۔“ شوکت بیگم نے کہا۔

”کوئی مسئلہ نہیں۔ تصویر کو بھیج کر بروسٹ منگوا لیں، ساتھ یہ دلچسپی کہلپ ہیں ناں۔“ وہ دلچسپی کا ڈھکن اٹھاتے ہوئے بولی۔ شوکت بیگم ہونٹیں ہی رہ گئیں۔

”اے مئی۔“

”ہاں۔ وہ کہیں گے کچھ نہیں مگر ٹھیک سے کھانا

نہیں کھلائیں گے۔ اور جی، صبح سے انہوں نے کچھ

دکن

مارچ 2016 کا شمارہ نمبر 137

✽ "کھولے پنکھ یا داول نے" کن کی سالگرہ کے موقع پر

مصنفین سے سروے

✽ اناکارہ "تاجاوید" سے شاہین رشید کی ملاقات

✽ "آواز کی دنیا سے" اس ماہ مہمان ہیں "آصف الیاس"

✽ اناکارہ "اعترافِ سخن" کہتے ہیں "میری بھی سنیے"

✽ اس ماہ "مشل فیاض" کے "مقابل ہے آئینہ"

✽ "ممن مورد کھ کی بات نہ مانو" آسیہ مرزا کا

جاسلطے دارناول

✽ "رائزول" حزیلہ بخش کاسلطے دارناول

✽ "دل ٹوٹ کے ہمارا تھا" نایاب جیلانی کاکامل ناول

✽ "دل ہی تو ہے" نادیہ احمد کاکامل ناول

✽ "شاید" فائزہ افتخار کادکشن ناول

✽ "مرہیبتا" نعیمہ سعید کاناٹ

✽ "تم بن" مصباح علی کاناٹ

✽ "پایا جو تجھے" فرحت شکر کاناٹ

✽ راشدہ رفعت، صدف آصف، امت العزیز اور

دیبا شیرازی کے افسانے اور مستقل سلسلے

ان سلسلے کے سانس لے کر

"گھر میں بیکری"

برتن نکال کر شامت پر رکھتے گئی۔
"آپ جانتیں۔ اندر جا کر بیٹھیں۔ آئی پروا تو پور
کر رہی ہوں گی۔ اس کامیڈی خراب تھا۔
"رہنے دو تم۔ میں خود کروں گی۔ جاؤ بیٹھو جا کر
کھانا کھاؤ۔"

"ہی۔ پر امانے والی کیا بات ہے۔ تو کوئی رکھنا
کوئی فیشن نہیں۔ اس گھر کی ضرورت ہے۔ اور اگر
میں رکھ سکتی تو بتویر کی شادی کر دیں، کم از کم
ہمارے آنے پر ہمیں خود تو کام نہیں کرنا پڑے گا۔"
اسپا نے کہا اور برتن اٹھا کر اندر لے گئی۔ شوکت بیگم
بے یقینی سے بیٹی کو دیکھتی رہ گئیں۔

✽ ✽ ✽

"السلام علیکم آئی پروا!" صفی گلاس ڈور کھول کر اندر
آئی۔ آئی پروا اپنا اندر آن کھولے بیٹھی تھیں۔
"وعلیکم السلام۔ آئیں؟ کیسے ہوئے پرچے؟"
"اچھے ہو گئے۔ وہ دست تھی ہوئی لگ رہی تھی۔"
"ہی کہاں ہے؟"

"صبح سے طبیعت خراب ہے، ابھی لیٹی ہے۔"
آئی پروا نے بتایا۔
"کیا ہوا امی کو؟ ڈاکٹر کے پاس چلی جاتیں۔" وہ فکر
مندی سے اٹھی۔

"تم جانتی ہونا اپنی ماں کو۔ سب کے لیے سب
کچھ کرتی ہے۔ اپنی اس کو فکر نہیں، کبھی ہے سو
جاؤں گی تو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ تھک چکی تو
جاتی ہے۔" آئی پروا نے رسائیت سے کہا۔ صفی نے
شوکت بیگم کے کمرے کا دروازہ کھول کر دیکھا اور
انہیں سوتا دیکھ کر واپس پلٹ آئی۔

"ہم کپڑے بدل آؤ۔ میں کھانا کاتی ہوں۔"
"نہیں مجھے بھوک نہیں۔ کلج میں سینڈویچ کھایا
تھا۔ ابھی کچھ دل نہیں چاہ رہا۔" وہ کہہ کر اپنے
کمرے میں چلی گئی۔

کچھ دیر بعد صفی واپس آئی۔ تو آئی پروا بھی بیٹھی
اوٹھ رہی تھیں۔ وہ لی وی آن کرنے کا سوچ رہی رہی

کو شش کی۔ اور دیکھو ماں سے کتنی ہیں کام والی رکھ لو۔
 ”آئی یو اے ایک اور بات نکال لی۔

”تو غلط کیا ہے اس میں۔ اپنی طبیعت بھی تو
 دیکھیں نا اب کل میں نے پہلپ نہیں کی تو سارا کام
 خود کرنا پڑا۔ آج طبیعت خراب ہے، مجبوری ہے
 آتی بار تو میں کہہ چکی ہوں۔“ صفا بھی اس بات پر
 قائل نظر آئی۔

”آج کل تو کرائیاں ملتی کہاں ہیں، کوئی بھروسے
 اعتماد والی کام والی نہیں بنی۔ مل جائیں تو ہزار خرے
 اور منہ ملنے دام اب منگائی کے اس دور میں کون
 پانچ پانچ ہزار دے۔“ آئی یو اے قدرے برابری کر لیں۔
 ”پانچ ہزار دینے کون کہہ رہا ہے آئی یو۔“ اسے
 آکٹا ہٹ سی ہوئی۔ اس سے پہلے کہ آئی یو اے کچھ اور
 کہیں شوکت بیگم کرے سے نکل آئیں۔

”لو آئی تمہاری ماں۔ اب کو بجٹ میمیری تو نماز
 کا وقت ہو گیا ہے۔“ آئی یو اے ناراض سی جانے لگیں۔
 ”کیا ہوا آئی یو۔؟“ شوکت بیگم نے باری باری
 دونوں کو دیکھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ چلی گئیں۔
 ”کیا کاتم نے ان سے۔ وہ کیوں ناراض ہو گئیں
 ؟“ شوکت بیگم صفا کی طرف متوجہ ہوئیں۔
 ”کچھ بھی نہیں۔ میں ذرا سی دیر سونے جا رہی
 ہوں۔“ وہ بھی چلی گئی۔



انوار صاحب کے مشورے سے توہر کے لیے رشتہ
 دیکھنے کا کام شروع ہوا۔ گو کہ وہ پہلے صفا کا کرنا چاہتے
 تھے۔ لیکن وہ ابھی رہنا چاہتی تھی۔ حالانکہ راضی تو
 ابھی توہر بھی نہیں تھا مگر دونوں بہنوں نے شور مچا رکھا
 تھا شوکت بیگم کی پہلی نظر اسے بھائی کی بیٹی علویہ پر
 تھی اور اس پر کسی کو بھی اعتراض نہیں ہوا۔ سو فیصلہ
 ہی ہوا کہ انوار کے روز جا کر رشتہ کی بات کر لی جائے
 لیکن جب اس کا ذکر اسماء اور مودہ سے کیا۔ تو دونوں کو
 ہی اعتراض تھا۔

تھی کہ فون کی بیل ہوئی۔ اس نے ریسپونڈ اٹھایا تو
 دوسری طرف اسماء آئی تھیں۔ آئی یو ابھی اس کی
 طرف متوجہ ہو گئیں۔ چند منٹ بعد صفا نے فون رکھ
 دیا۔

”کیا کہہ رہی تھی۔“
 ”ٹیکر کو پکڑے بھجوانے ہیں۔“ اپنے دپور سے
 بھجوائیں گی۔“ صفا نے بتایا اور وی آن کر کے پیشہ
 سنی۔

”لو بھلا۔ اب وہاں کوئی درزی نہیں بچا۔“ آئی یو اے
 بڑبڑائیں۔
 ”میں کہوں گی تو برا لگ جائے گا۔ اپنی ماں کی
 طبیعت ہی دیکھ لیں۔ اب دیکھ لیتا۔ سب کپڑوں کی
 سلائی بھی ماں کی جیب سے جانے کی۔“ آئی یو اے لیں
 ۔ صفا چپ چاپ بیٹھ لیتی رہی۔

”کل کی دعوت پر چھ ہزار لگ گئے اور دامانے پھر
 بھی کھانا ڈھنگ سے نہیں کھایا، ذریک ایسا نہیں تھا
 یہ اسماء سے سر۔“
 ”آئی یو اے۔ چھوڑیں نا اس بات کو۔“ صفا جھلا کر
 بولی۔

”لو۔“ آئی یو اے ہنسیوں چڑھا کر اسے دیکھا۔
 ”کیوں چھوڑ دوں۔؟ بیٹیوں سے بڑھ کر ہے
 میرے لیے شوکت بیگم اور۔ تمہارا باپ۔“ احساس
 نام کی بھی کوئی چیز ہوتی ہے اب یہ توہڑی تاکہ شوہر کی
 جی حضوری میں باقی ہر رشتہ بلائے طلاق رکھ دیا جائے
 ۔ کتنا دل برا ہوا تمہاری ماں کا۔ پاس ہو تم۔ اندازہ تو
 ہو گا تمہیں بھی۔ ایک بیٹی دلاؤ کو خوش کرتے کرتے
 ۔ دوسری خواہنا ناراض ہو گئی۔ اتنی لعنتیں گھر میں
 موجود تھیں۔ ایک مودے بروسٹ کے نہ آنے سے کیا
 فرق پڑ جاتا ہے۔ اپنے گھر کیا پر روزیا ہر سے بروسٹ
 منگواتے ہیں؟“ آئی یو اے تو بھری بیٹی تھیں۔ بولنے پر
 آئیں توجہ نہیں ہوئیں۔
 ”اسماء آئی ناراض ہوئیں تو ابھی فون تھوڑا کرتیں
 ؟ اور ویسے بھی سنبھال لیا ہو گا انہوں نے۔ ذریک
 بھائی سمجھ دار ہیں۔“ صفا نے ہات ختم کرنے کی

”ماں۔ فیملی سے باہر دیکھیں کوئی لڑکی، علویہ ہمارے بھائی کے ساتھ سوٹ نہیں کرے گی۔“ اسما نے صاف منہ کر دیا۔

”ایک ہی تو بھائی ہے ہمارا، بھابھی تو دیکھ کر لائیں، دیکھیں بھی لیز بھابھی مجھے پسند نہیں۔“

”تمہاری رضامندی نہیں ہے۔ تو صاف کہہ دو، بھر بھر کے باتیں مت بناؤ۔“ انی ہوائے اسے ٹوک۔

”گھر کی لڑکی ہے۔ اور۔“

”ای، احسن بھی تو گھر کا ہی لڑکا تھا۔ ہماری مراد تو انہیں نظر نہیں آئی تھی۔ اور آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ ہمارے پایا کا ارادہ تھا کہ حسن اور مراد کا رشتہ ہو جائے۔ تب تو مای جان نے اپنی بہن کا گھر دیکھا تو ہم نہیں۔“ اسما نے ساری اگلی چھٹی باتیں کھول کر رکھ دیں۔

”اچھا۔ اب یہ سب باتیں مراد کے سامنے کرنے کی ضرورت نہیں۔ شوکت بیگم نے اسے ٹوک۔

”تم بھی کیسی ماں ہو شوکت؟ مراد سے چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ سب ہی تو جانتی ہے۔ اور تو سیر کے لیے علویہ کا منع کر دیا ہے اس نے بھی پر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اب اس گھر سے بیٹی آئی نہیں سکتی، مراد ماشاء اللہ اپنے گھر میں خوش باش ہے۔ پھر دل میں ملال کیا رکھنا۔“ انی ہوائے سمجھانے کی کوشش کی۔

”کچھ بھی ہے۔ ہمیں نہیں پسند یہ رشتہ، دنیا بھری بڑی ہے حسین لڑکیوں سے باہر لکھیں تو ہوتا چلے تان۔“ اسما نے کہا۔ شوکت بیگم اسے دیکھ کر وہ کہنے لگی۔

”تاہم آئی کو فون کریں، شہری بہترین لڑکیوں کے رشتے ہیں ان کے پاس۔“

”شہری بہترین لڑکیاں۔ کیا یہاں آئیں گی؟ ہمیں اپنے جیروں میں ہی رشتہ کرتا ہے۔ شوکت بیگم نے کہا۔

”آپ رہنے دیں، میں خود تاہمہ آئی کو فون کروں گی۔ اسی بہتے دو چار لڑکیاں دکھادیں۔“ اس کی بات

پرانی بو اور شوکت بیگم نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

”دو چار لڑکیاں۔“ انی ہوائے اپنا سر پکڑ لیا۔

”اچھا۔ ابھی میں چلتی ہوں۔ انی نے صبح اسکول بھی جاتا ہے۔ میں فون کر کے تاہمہ آئی کا نمبر لے لوں گی۔ اور آپ بھی ذرا ارد گرد نظر رکھیے نگ۔“ اس سے پہلے کہ انی پوچھے اور کہیں وہ پھٹے ہی جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔



”اؤ۔۔۔ ارحم میاں۔ کیسے ہو؟“ ارحم اندر داخل ہوا۔

”ٹھیک ہوں انی ہوا، آپ کی دو اسٹیں لایا ہوں۔“ ارحم نے ایک شارٹیکٹ انی ہوا کے پاس رکھ دیا۔

”جیتے رہو بیٹا، محبت مہربانی۔“ انی ہوائے دعا دی۔

”مہربانی کی کیا بات ہے، اسپتال سے آتے ہوئے لے آیا ہوں۔ کوئی ایکسٹرا کام نہیں تھا اور ہوتا بھی تو میں دل سے ہی کرنا۔“ اس نے محبت سے کہا اور پاس ہی بیٹھ گیا۔

”اچھا لیجئے۔ میں آپ کو تیار بنا ہوں۔“

”جیتے نہیں۔ شوکت کو سمجھاؤ۔ میں بھلائی ہوں شوکت۔“ انی ہوائے آواز دی۔

”نہانے لگی ہیں امی۔ کوئی کام۔“ وہ اپنے کمرے سے نکلی۔ یقیناً ”نہانے“ ہوئے پڑھ رہی تھی۔ صفحہ اسے دیکھ کر ذرا رکھی۔

”السلام علیکم۔ ڈاکٹر صاحب۔ کیسے آتا ہوا؟“ اسے دیکھ کر وہ اندر تک کھل اٹھی تھی۔

”وعلیکم السلام۔ میں ٹھیک ٹھاک۔ تم کیسی ہو؟ اسٹینڈر کیسی چل رہی ہیں۔“ ارحم نے اک نگاہ اسے دیکھا اور پھر شارٹے دو اسٹیں نکالنے لگا۔

”ٹھیک۔ انی ہوا کی دو اسٹیں لائے ہیں؟“

”ہاں۔“ ادھر آؤ میں جہیں سمجھاؤتا ہوں۔ ٹائم پر دے دنا، ایک ہفتے کی ہیں۔ تم ہو جائے گی تو میں اور لا دوں گا۔ لیکن پلیر اس کے بعد ایک پار ڈاکٹر کا وزٹ ضرور کیجئے گا۔“ اس نے انی ہوا کو نصیحت کی۔

والی گفتگو میں حصہ لیا۔ تینوں ماں بیٹیاں اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

”پسند کی شادی منع ہے اس کے علاوہ کچھ کہنا ہے تو یولو۔“ اسماء نے تیزی سے کہا تو خیر تھا تو شرارت کے موڈ میں مگر آپنی کی بات سن کر ایک پل کو چپ رہ گیا۔

”بھارت بھارت کی لڑکیاں دیکھ دیکھ کر رہ جیٹ کرتے تو بہر حال بہتر ہے۔“ خیر نے جواب دیا۔ اسماء اور شوکت بیگم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”اچھا۔ تو واقعی کوئی پسند ہے؟“ اسماء نے حکیے سے لیجے میں پوچھا۔ خیر نے فوراً جواب نہیں دیا۔

”آپ کو کیوں بتاؤں۔“ وہ اسے تنگ کرنے کے موڈ میں آ گیا۔

”نہ بتاؤ بھیا۔ پر یاد رکھنا اس پر پسندیدگی کی مہر میری بھی لگے گی۔ تب ہی وہ اس گھر میں آئے گی۔“ اسماء اترا کر بولی۔

”جی۔ جی۔ ضرور کوئی ہے تو بتاؤ۔ دس دن میں دس لڑکیاں دیکھ چکے ہیں۔ اگر تمہاری والی پسند آجائے تو ہو سکتا ہے۔ ہمیں بس ہو جائے۔ صفا نے اسے آکس کریم کی بیانی تمہاتے ہوئے کہا۔

”لہجہ چھوٹی جہاں ان کی تلاش ختم ہوگی۔ وہیں میری پسند شروع ہوتی ہے۔ سولیٹ ایم (them So let) وہ آکس کریم لے کر اپنے کمرے میں جانے لگا۔

”اسی تلاش میں کوئی اور حسینہ مل گئی تو تمہاری والی کا نمبر نہیں آئے گا۔ یاد رکھنا“ صفا پیچھے سے بولی۔

”دل سی۔“ (will see)

”سن رہی ہیں اس کی باتیں۔ یہاں ہم باگلوں کی طرح لڑکی تلاش کر رہے ہیں۔ اور وہ اپنا ہی چکر چلائے بیٹھا ہے۔“ اسماء بڑبڑائی۔

”مذاق کر رہا ہے“ میں بات کر لوں گی اس سے۔“ شوکت بیگم نے اس کا موڈ ٹھیک کرنے کی کوشش کی۔

”ہی۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ اتنا خوار ہوئے

”آپ بھی تو ڈاکٹر ہی ہیں۔ وزٹ تو ہر دوسرے دن ہی ہو جاتا ہے۔“ وہ اسے پھینٹنے والے انداز میں بولی۔ ارجم نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کی ناکام کوشش کی۔

”اچھا زیادہ مت بولو۔ پہلے اسے پانی پلاؤ۔ سیدھا اسپتال سے ہی آ رہا ہے۔“ آئی بوائے اسے ٹوکا۔

”ہیں۔ آئی بوا۔ میں بس چلتا ہوں۔ گھر جا کر کھانا کھاؤں گا۔ ماماٹ کر رہی ہوں گی۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”آپ رک جاؤ ذرا۔“ تمہاری ماں بھی نہیں آئی۔ یہ برابر میں گھر ہے اور عید کا چاندنی رہتی ہے۔ آؤں گی کسی روز۔“ خبر لینے تمہاری ماں کی۔ ”جو ابیا“ ارجم مسکرایا۔

”جی ضرور۔“ لیکن ابھی میں اجازت چاہوں گا۔“ صفا اپنے پر ہاتھ باندھے اسے دیکھتی رہی۔

”جاؤ نیچے۔ جیتے رہو اللہ خوش رکھے۔ بسی عمر چو۔“ آئی بوائے اسے ڈھیر دعاؤں سے نوازا۔

”دواؤں کے بدلے دعا میں۔“ صفا سے چپ نہیں رہا گیا۔ اب کے ارجم کھل کر مسکرایا۔

”سو دامنگا نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”لنڈ حافظ آئی بوا۔ آئی شوکت کو بھی میرا سلام کہئے گا۔“ وہ کہہ کر جانے لگا۔ صفا کے پاس ایک پل کور کا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ صفا کا دل سینے میں اچھلا۔ اس نے نگاہیں چرائیں۔

”ٹیک کیئر۔“ ارجم چلا گیا اور اپنا دل سنبھالنے میں اسے کافی وقت لگا۔



”مجھے اجازت دیں امی میں آپ سب کی مشکل آسان کر دوں۔“ آج پھر سب ”انوار منیل“ میں اکٹھے تھے، ساتھ ساتھ کھانے کی تیاری بھی چل رہی تھی اسماء کے بچوں نے پاپ کارن اور آٹسکویم منگوائی۔ تو صفا سب کو سرو کرنے لگی۔ تب ہی خیر نے اپنے متعلق رشتے کے بارے میں شروع ہونے

کے بعد۔ اس کی پسند کی لڑکی تو۔ اس گھر میں نہیں آنے والی۔ حد ہوتی ہے۔ ہم بھی بیٹیوں والے ہیں۔ ہمیں کیا پاگل سمجھ رکھا ہے اس نے۔ وہ بگڑ کر رہی۔

”اچھا۔ چھوٹے۔ تمہارا کارن کھاؤ۔“

”اور اسی۔ اسے یہ بھی سمجھا دیجئے گا۔ کہ شریف گھرانوں میں پسند کی شادیاں پونہ نہیں ہو جاتیں۔ سب کی رضامندی درکار ہوتی ہے، اکیلا تو نہیں رہتا اور نہ ہی ہم دنیا داری اور رسم و رواج سے کٹے ہوئے ہیں۔ بلکہ سب کی پسند معنی رکھتی ہے۔ ایک ہی تو ہو آئے گی اس گھر میں۔ پونہ کسی کو بھی اٹھالائیں گے، خوبروی کی باتیں سن کر تو اسامہ کے پاؤں تک لگی تھی۔“

”اچھا۔ اچھا تم ہاتھ مت ہو۔ تمہارے لیے اچھا نہیں ہے، ڈاکٹر کے ہاں مٹی تھیں تم؟ شوکت بیگم نے بات بدلی۔

”نہیں۔ نام ہی نہیں ملا، سوچ رہی تھی کہ مرودہ کے ساتھ ہی چلی جاؤں گی، پہنچے کو وہ بھی تو لڑا سا بوڑھے کے لیے جارہی ہے۔ میں بھی ڈاکٹر رائیہ سے چیک اپ کروالوں۔“ اسامہ نے کہا۔ آئی بوا معصوم کی نماز پڑھ کے آ رہی تھیں جب انہوں نے اسامہ کی یہ آخری بات سنی اور ساتھ ہی شوکت بیگم کا چہرہ بھی دیکھا۔

”ڈاکٹر رائیہ۔ بہت اچھی اور قابل ڈاکٹر ہے، اتنے مشکل کیس۔ بہت سہولت سے پنڈل کرتی ہیں۔ آپ بلا تامل اس پر بھروسہ کر سکتی ہیں۔“ اسامہ نے شوکت بیگم کو ”ڈاکٹر رائیہ“ کی خصوصیات بتوا رہا تھا، جب صفائے در داخل ہوئی، اس کے ہاتھ میں کھیر کی ڈش تھی۔

”اسی۔ میں یہ آئی کہ ہاں دے کر آئی ہوں۔“

”ہاں۔ جاؤ اور میرا سلام بھی کہنا۔“ اسامہ بھائی میں بس ابھی آئی، جیسے کامت۔ صفائے کا اور چلی گئی۔

”ابھی چھوٹی آئی، ڈاکٹر تو اور بھی ہوں گے۔ مگر ہماری فیملی کو صرف ڈاکٹر رائیہ پر رٹت ہے۔ اسی لیے میں نے آپ سے کہا۔ کیونکہ فرسٹ ڈیوٹی تو مرودہ کی جیسے پر ہوگی، تو اچھا ہے، ڈاکٹر رائیہ ہی اس کا چیک اپ کریں۔“ اسامہ نے کہا۔

”جتنی جیسے اطمینان ہو۔ ٹھیک ہے۔ شوکت بیگم اس کے علاوہ کیا کہہ سکتی تھیں، آج پہلی بار آئی بوا دماغ ساس کی ٹنگٹو میں نہیں بولیں، مرودہ کو بہت الٹیاں ہو رہی تھیں۔ اور وہ اسے کچھ دن کے لیے بیٹھے چھوڑنے آیا تھا۔ اور آج ایک بار پھر اسامہ۔ تفصیل سے ڈاکٹر رائیہ کی خصوصیات بتا رہا تھا، تاکہ وہ اسی کو وٹ کریں۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ دونوں بہنیں ایک ساتھ رہ سکتی ہیں۔“ اور مٹی کی ”مما“ فرحت، صفائے سے یہ خوشخبری سن کر خوش ہو گئیں۔

”تیسرا بچہ ہے نا اسامہ کا۔ ماشاء اللہ اور مرودہ تو خیر سے فرسٹ ٹائم (کنسوم) Conceive کر رہی ہے۔ کونسا ہتھ چل رہا ہے اس کا۔“ انہوں نے صفائے کو پوچھا۔

”شاید تین مہینے ہو گئے ہیں انہیں۔“

”ماشاء اللہ، پہلی بار عمو تلوڑکیوں کو پتا نہیں چلا ذرا معلومات آگے، خیر میں تم سے یہ کیسی باتیں کرنے لگی۔ کل آؤں گی تمہاری طرف۔“ وہ جانے اور کیا کہنے جارہی تھیں کہ خود ہی صفائی ”معصومیت“ کا خیال کر کے چپ کر گئیں۔

”ہاں۔ یہ ضرور کہنا کہ ڈاکٹر طیبہ۔“ ڈاکٹر رائیہ نے آئی جی۔ ”صفائے اسے اور کچھ کہنے سے پہلے کہا۔“ اسامہ بھائی کی فیملی، ڈاکٹر رائیہ سے چیک اپ کرواتی ہے۔ تو اس بار وہی۔“

”اچھا۔ رائیہ ڈاکٹر۔ ہاں وہ بھی بہت اچھی ہے، ذرا مہنگی ہے۔ اپنے ارحم کے اسپتال کے ایم ایس کی بیوی ہے نا، ہمارے ہاں بھی اکثر آتی جاتی ہے۔

دس سال کا ساتھ ہے۔ صابگی کا۔ اتنا تو حق ہے کہ بنا کے بھی کچھ کام کر لیں۔ ”آئی فرحت کے لہجے میں صرف محبت اور اپنائیت تھی۔

”میں نکل۔ بات کروں گا۔“ اس نے ٹائی کی بانٹ ڈھیلی کی۔

”اجھا آئی میں چلتی ہوں۔ اسلامہ بھائی کو کہہ کر آئی تھی کہ ابھی آئی ہوں۔ اور یہاں باتوں میں لگ گئی۔“

”یہ بڑی بیماری ہوتی ہے لڑکیوں میں۔“ رحم نے چھیڑا۔ اس نے صرف دیکھنے پر اکتفا کیا اور خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔



”کیا ہو رہا ہے بیگم صاحبہ۔“ شوکت بیگم اپنے کمرے میں بیٹھ کر بیٹھی اپنے سامنے کوئی ڈائری کھولے بیٹھی تھیں۔ جب انور اندر آکر ان کے پاس بیٹھ گئے۔

”کچھ خاص نہیں۔“ ایک گہری سانس لے کر شوکت بیگم نے ڈائری بند کر دی۔ انوار صاحبہ جھک کر اپنے چوتھے تار نے لگے۔

”بتوڑ نہیں آیا۔“

”نہیں ابھی کچھ دیر پہلے فون آیا تھا کہ دیر ہو جائے گی۔“ شوکت بیگم نے جواب دیا۔

”ہاں نیا کام ہے۔“ محنت بھی لگے گی اور وقت بھی۔“ ان کے لہجے میں بیٹے کی طرف سے اطمینان تھا۔

”ابھی کل کی بات ہے۔ ہمارے چاروں بچے ہمارے ساتھ، ایک ساتھ، ایک گھر میں، چھوٹی چھوٹی خوشیاں بانٹتے تھے اور اب، زندگی کس برق رفتاری سے پہلو بدل گئی، الحمد للہ، بچیاں اپنے گھروں کی ہو گئیں۔ بیٹا سر سر روزگار ہو گیا۔ اس کی شادی ہو جائے، صفائے گھر کی ہو جائے تو ہماری بھی زندگی میں بھاگ دو ڈر ڈر اچھم جائے۔ سچی میں شوکت بیگم بہت تھک سا گیا ہوں میں۔“ ان کے لہجے کی روانی میں کہیں پہ

پرائیویٹ کلینک دن کرتی ہے۔ پر ارحم ہمارا تھا بیٹے میں ایک دن اسپتال بھی آئی ہے اور اکثر cases بھی کرتی ہے۔ پرائیویٹ کلینک سے تو سستا ہی پڑ جاتا ہے۔ ورنہ سب جانتے ہیں کہ آدھے گھنٹے کے وزٹ کا دو ہزار سے کم نہیں لیتی۔ اوپر سے بے بھی بہت مصروف ڈاکٹر۔ اپائنٹمنٹ میں بہت مشکل ہوتی ہے۔

”آئی فرحت نے اس کے بارے میں ساری تفصیل جاری کی آئی انفارمیشن سے وہ پورے محسوس کرنے لگی۔

”وا اکڑ صاحبہ۔ نہیں آئے ابھی۔“

”السلام علیکم ماما۔“ اس کی بات ابھی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہی آواز سنائی دی جسے وہ سنتا چاہتی تھی۔

”لو۔ آگیا علیکم السلام۔“ ایسی عمر ہے میری جاں کی۔ ابھی صفاتہمارا ہی ذکر کر رہی تھی۔ ”آئی فرحت نے خوشی سے بیٹے کو دیکھا۔

”بے نصیب۔“ وہ تمکا ہوا آیا تھا۔ لیکن بیچ بی تمکا کہ صفاد کہہ کر وہ شاش شاش ہو گیا تھا۔

”میرے لائق کوئی خدمت۔“ وہ صرف اسے چھیڑ رہا تھا کیونکہ ”غلط وقت“ پر اس کا ذکر کرنا اور اس کا آجانا اسے شرمندہ سا کر رہا تھا۔

”ہاں خدمت تو کرنا پڑے گی، مہوہ پر پکھنٹ ہے۔“ ڈاکٹر امیرہ کی اپائنٹمنٹ لے۔ ”فرحت آئی نے گلاس میں پانی ڈال کر بیٹے کو دیا۔

”مبارک ہو۔“ وہ مسکرایا۔

”تو۔ اس لیے میرا انتظار ہو رہا تھا۔“ اس نے پانی کا گھونٹ بھرتے ہوئے۔ صفائی ہونے کی شکل کا مڑا لیا۔

”جی نہیں۔ میں تو آئی میں نے۔“ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیسے صفائی پیش کرے۔ آئی فرحت ہنس دیں۔

”نہیں بچے۔ وہ تو بس باتوں میں ذکر ہوا۔ تو میں نے خود ہی تم سے کہہ دیا۔ میں جانتی ہوں کہ شوکت بیگم پر بہت بوجھ ہے۔ اور یہ میری بھی تویشیاں ہیں

”تھیک ہوں۔“ اس نے ذرا رک کر جواب دیا۔

”کیسی ہو۔“
 ”جی۔“ اس کی اتنی بکھاری سے وہ فون کی دوسری طرف بلاوجہ ہی مسکرائھا۔
 ”آپ۔“ مسکرائیں رہے ہیں؟“ صفائے ایک لمحے میں ہی کچھ محسوس کرتے پوچھا تو ارجم کی حیرتلی بھئی تھی۔

”تھیں کیسے بنا کہ میں مسکرا رہا ہوں؟“ برحسہ جواب آیا۔ اب صفا کو اپنی دھڑکن کو اتار سے تیز چلتی محسوس ہوئی ارجم ہلکے سے ہنس دیا۔
 ”اس لوکے۔“ میں اب اور تنگ نہیں کروں گا“
 مودہ کے لیے ڈاکٹر رائیہ کی اپنا ٹنٹمنٹ لے لی ہے۔۔۔
 نیکسٹ سٹریٹ۔ At-8:40۔“ ارجم نے بتایا۔

”تھیک یو۔“ میں ابھی فون کر کے اسے بتا دیتی ہوں۔ اسلامہ بھائی کو تو تین ہفتے بعد کی مل رہی تھی اچھا ہے پہلے چیک اپ ہو جائے وہ بہت نکلنہ میں ہو رہی ہے اپنی طبیعت کو لے کر۔“ صفائے کہا۔

”جی۔“ فرسٹ پریگنٹنسی میں تو ایسی صورت حال ہے دو چار ہونا بہت عام ہے۔ خیر یہ باتس فی الوقت ڈسکس کرنے کی نہیں۔“ ارجم نے کہا۔
 ”جی۔ تھیک یو۔ آپ نے نام نکالا۔“

”بہت فارمل ہو رہی ہو۔؟ خیر ابھی مجھے ایک پھینٹنٹ کو دکھانا ہے۔ پھر بات کروں گا۔“ وہ کوئی بات کرنے جا رہا تھا۔ لیکن ایک کال پر اسے فون بند کرنا پڑا۔“ صفا کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی۔ پھر واپس سٹیج روم میں آگئی۔ اس کی توجہ اپنے نوٹس کی طرف سے ہٹ گئی دل کی بوڑھن کی جو معمول سے ہٹ گئی تھیں اپنی رفتار برآئے لگیں۔ اپنے دل میں جنم لیتے احساسات جنہیں وہ کوئی نام نہیں دے پارتی تھی۔ یا پھر دینا نہیں چاہتی تھی۔ یہ سچائی کہ وہ ارجم۔ ڈاکٹر ارجم عزیز کو بہت سوچنے لگی ہے۔ اس کی آمد آواز احساس۔ سب کچھ اس کے لیے مستی رکھتا ہے وہ

”جی نہیں کیوں۔۔۔ مگر وہ اس ہاں میں ہاں نہیں ملا سکتیں۔ کیونکہ شاید وہ اچھی طرح سے جانتی تھیں کہ اولاد کو بیاہ دینے کے بعد بھی ان کی محکم ختم نہیں ہونے والی۔ بھاگ دوڑ میں گی تو دور اس کی کتنی ہی شاید سہارنہ سکتیں۔“
 ”کیا سوچنے لگیں۔ یہ آپ کیا حساب کتاب کھولے بیٹھی ہیں۔“

”کچھ خاص نہیں۔ اس مہینے کچھ زیادہ خرچہ ہو گیا۔ وہی دیکھ رہی تھی۔“ شوکت بیگم نے بتایا۔ انوار صاحب کچھ نہیں بولے۔ بیڈ کراؤن کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

”چند دن تک۔ ایک کلاسٹ سے رقم ملنے والی ہے۔ میں کچھ پیسے دے دوں گا۔“ تھوڑی آسانی ہو جائے گی۔“ انوار صاحب کچھ وقفے کے بعد بولے مگر اس بار شوکت بیگم نے کچھ نہیں کہا۔
 ”میں چاہے بتاؤں؟ نہیں گے۔“

”چاہے نہیں کافی کاموڈ ہو رہا ہے اور وہ بھی صفا کے ہاتھوں کی براہ راست ہانپے گا کالی تو مجھے صفا کے ہاتھ کی ہی پسند ہے۔“ انوار صاحب ماحول کو بدلنے کے لیے شرارت سے بولے تو شوکت بیگم مسکرائیں۔

”اچھا میں دیکھتی ہوں۔ اگر وہ فارغ ہے تو۔۔۔ ورنہ چاہئے ہی چلے گی۔“ شوکت بیگم کہہ کر کمرے سے چلی گئیں۔ انوار صاحب کروٹ بدل کر لیٹ گئے ان کے دل میں اس وقت بڑھتے ہوئے اخراجات کی پریشانی چل رہی تھی۔

سٹیج روم میں بیٹھی وہ نوٹس لکھ رہی تھی جب فون کی بیل ہوئی۔ اس نے اٹھ کر فون اپنے پاس رکھا اور ریسیور کھن سے لگایا۔
 ”ہیلو۔“ ارجم! اسپیکنگ۔“
 ”جی۔“ ارجم کا نام سن کر اس کا دل دھڑک اٹھا۔

اسے پسند کرنے لگی ہے۔ یہ احساس۔ اس کے لیے حیران کن نہ سمجھیے۔ ”بے بس“ ماسوا ضرور تھا۔ وہ اس کی بے اعتنائی سے نہیں پار رہی تھی۔ تب ہی ایک بار پھر اپنے آنسوؤں کے سامنے ہار گئی۔



”دیکھو بی بی۔ ہمارے گھر کام کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔ کھانا پکانا خود ہی کریں گے، بس جھاڑو اٹھائیں۔ اور کپڑوں کی دھلائی۔ اور استری کرنا۔ ہم ایک ہزار سے زیادہ نہیں دیں گے“ آئی بوائے اسما کی طرف سے بھجوائی گئی کام والی سے معاملات طے کرنے شروع کیے۔

”اے لو۔ اہاں ایک ہزار تو کوڑا اٹھانے والے نہیں لیتے اب۔“ وہ ٹھک کر بولی۔ ”آئی بوا کا پارہ چڑھنے لگا۔ بات سنو لڑکی، زبان منت لڑاؤ میرے ساتھ۔ بس ایک ہزار سے زیادہ نہیں دیں گے۔ گرتا ہے تو کرو۔“

”آئی بوا۔ کیا ہوا۔“ شوکت بیگم اسما سے فون پر بات کرنے لگیں تو یہاں آئی بوا گرم ہو رہی تھیں۔ ”دیکھو تو۔ ایک ہزار بر ناک بھول چڑھا رہی ہے۔“ آئی بوا جلے گیسے میں بویں۔ شوکت بیگم یکدم ٹھنک ہو گئیں۔ بیٹی کے سسرال سے بیجی گئی ملازمہ۔ نوہمی تو بحث مباحثہ نہیں ہو گا۔

”آپ چپ ہو جائیں آئی بوا۔ میں بات کرتی ہوں۔ کیا نام بتایا تھا تم نے؟“ شوکت بیگم آئی بوا کو چپ ہونے کا کہہ کر اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ”رجیہ (رضیہ) اس نے اپنا نام بتایا۔“

”بی بی۔ میں دو اور بھی گھروں میں کام کرتی ہوں صرف برتن اور کپڑے دھونے کا چندہ سوتی ہوں، ایک سارے گھر کا کام مجھ آسلی کے ذمے ہے، ساڑھے تین ہزار اور مجھے پورے گھروں میں تو میں خود بھی کام نہیں کرتی، قسم خدا کی۔ آپ کے ساتھ کوئی جھوٹ نہیں۔ اسما بی بی کے گھر میری بھابی کام کرتی

ہے اسی کے کہنے پر یہ کام کرنے کو راضی ہوئی، بندے زیادہ ہوں یا نہیں۔ کام تو کام ہوتا ہے، مجھے تو اسما بی بی نے کھاتا سارا ہی کام کرنا ہے، بس کھانا پکانا نہیں ہو گا۔ میں نے ان کو بھی پانچ ہزار ہی بولا تھا۔“ اس کی باتیں سن کر تو شوکت بیگم کا منہ ہی علاوہ گیا۔ آئی بوا تو سر پٹنے لگیں۔

”ہائیں۔ پانچ ہزار۔ منہ بھر کے بول بول دیا پانچ ہزار۔ ایسے ہی کمانے جاتے ہیں پانچ ہزار۔ اتنا کمانی ہو تو اپنا کاروبار شروع کرو۔“ اتنی حد ہوئی ہے۔ وہ ہتے سے اکھڑ گئیں۔

”آئی بوا۔ آئی بوا۔ آپ چپ رہیے۔ میں بات کرتی ہوں نا۔“ شوکت بیگم تو خود کا کاکا تھیں۔ انہیں اسما رضہ آ رہا تھا۔

”دیکھو رضیہ۔ مجھے صرف کپڑے دھونے اور صفائی ستھرائی کے لیے ضرورت ہے ایک ہزار بہت ہے۔ تمہیں اسانے سمجھا ہے تو چلو۔ بارہ سو۔ اس سے زیادہ نہیں۔“ شوکت بیگم نے کہا۔

”بارہ سو۔“ وہ سوچنے لگی۔ ”نہیں بی بی۔ اتنی دور سے آؤں گی بارہ سو دارا نہیں کھانا۔ اچھا ایسا کریں پندرہ سو دے دیں اور کم زیادہ نہیں کر لوں گی، وہ بھی اسما بھابی کے لیے۔“ رضیہ صاحبہ نے بڑا احسان جتایا، شوکت بیگم نے آئی بوا کی طرف سے کھاؤ منہ ہی منہ میں کچھ بیڑا لے لگیں۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں اسما سے بات کر لوں گی۔“ اتنی الجھ اسے ٹال کر شوکت بیگم نے نکالا۔

”اس اسما کو جانے کب عقل آئے گی، سسرال میں چلتی نہیں۔ اور یہاں اپنے فیصلے چلانے چلی ہے۔“ منگانی کے اس دور میں بنا سوچے مجھے بات منہ سے نکال لیتی ہے۔ ذرا خیال نہیں اسے۔“ آئی بوا نے رضیہ کے جانے کے بعد سے بولنا شروع کر دیا۔ سوچ تو شوکت بیگم بھی یہی رہی تھیں مگر کچھ کہہ کر آئی بوا کو مزید جھنسن دینا نہیں چاہتی تھی۔



اور وہی ہوا جو ہوتا ہی تھا، اس کو سمجھا بھلا کر جواب

بڑھے ہوئے ہاتھ کا سہارا لے کر اٹھ بیٹھیں۔

”ابھی گھر نہیں ہیں کیا؟“
 ”برابر میں گئی ہے۔ وہ مٹھائی رکھی ہے۔ تم بھی
 کھاؤ۔“ وہ جس انداز سے بولیں۔ صفا کو سمجھ نہیں
 آئی کہ وہ کس ”ٹون“ میں کہہ رہی ہیں۔

”ہاں“ برابر والے۔ اور مٹھائی ”کانکھن۔“
 اس کے سامنے ایسا کونسلر مارک بن گیا، جس کا
 جواب وہ جانتا نہیں چاہتی تھی۔ آئی بوا اپنے موٹے
 شیشے کی عینک سے اسے دیکھنے لگیں۔ اور پھر صفا کے
 اپنے اندر کوئی رست کی دیواری ڈھسے لگی۔

”ارحم کا رشتہ طے ہو گیا ہے۔ مبارک دینے گئی
 ہے۔“ چھانک سے کچھ ٹونا اور اندر رہی کرچیاں بکھر
 گئیں۔ اسے اپنے چہرے کی رعنائی۔ مرقعائی ہوئی
 محسوس ہوئی۔

”آ۔ اچھا۔“ وہ آئی بوا کے سامنے سے ہٹ گئی۔
 اس کا کوئی انگہار و خیال کا عشق تو تھا نہیں۔ ہاں
 پستری کی کا عیار۔ دل کو چھوچکا تھا۔

”میں تو یہی سوچ رہی تھی۔ اتنا اچھا لڑکا۔“ وہ
 جلنے کیا کہنے جا رہی تھیں کہ اس کا چہرہ دیکھ کر چپ ہو
 گئیں۔

”اچھی بات ہے۔ میں ذرا کپڑے تبدیل
 (change) کر لوں۔“ وہ کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔
 اپنی فائل اور بیگ بیڈر پھینکتے ہوئے وہ خود بھی بیٹھ

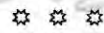
گئی ”ارحم کا رشتہ طے ہو گیا ہے۔“ ایک بار پھر یہ جملہ
 اس کے کانوں میں گونجا۔ اور پھر رگ و پے میں
 گردش کرنا ہوا۔ اس کے وجود کو ہلانے لگا۔ ”تو ارحم
 ڈاکٹر ارحم“ میں کبھی آپ کی نظروں میں تھی ہی
 نہیں؟“ پھر کس آس پر وہ ان رستوں کی طرف چل
 نکلی۔ جملہ وہ اکیلی ہی تھی۔ جسے ہم سفر سمجھا۔ وہ تو
 فقط اک سایہ نکلا۔ ابھی جو اک آنسو نکلا، وہ ہار سے
 زیادہ پچھتاوے کی کیفیت سے سرشار تھا۔ محبت اور
 پچھتاوے کا سفر۔ ایک لمحے میں اس کے دل کی دنیا
 بدل گیا تھا۔

روشیاں بنا کر اس نے میز پر رکھیں۔ اور خود بھی

کیا اور رضی بی بی کی نوکری بنی کر اداوی۔

شوکت بیگم کو فارغ ہونے کی عادت کبھی تھی ہی
 نہیں۔ ایک عام عورت کی طرح زندگی گھر گھر ہستی
 میں گزار دی۔ بے شک وقت کے ساتھ وہ ہمت
 طاقت نہیں رہی تھی مگر پھر بھی انہیں یہ اضافی خرچہ
 ضرورت سے زیادہ مجبوری یا پھر دکھاوا لگ رہا تھا۔
 بہر حال رضیہ کے آنے سے۔ اور کوئی خوش ہونا ہو
 بیٹیاں، بہت مطمئن ہو گئی تھیں۔ آخر آل۔ ملازمہ
 رکھنا۔ ٹرینڈ ہو چکا ہے۔ یہ انوار صاحب کی
 صاحبزادیوں کے کھنٹ تھے۔

”آپ کو بھی سکھ۔ اور آنے والی کو بھی۔“ اور وہ
 آنے والی جانے کب آئے گی۔ تین مہینے ہو گئے
 لڑکیاں دیکھتے مگر مجال ہے جو ایک بھی بھائی ہو۔ ایک
 دو ”برو کھوے“ کے بعد تو ہرنے تو صاف منح کر دیا کہ
 جب ہر طرح سے مطمئن ہو جائیں تب بات کرے گا
 ۔ اور اطمینان تو یہ قسمتی سے ملنے والا تھا نہیں، مر وہ کی
 تو پہلی برہنگنسی تھی۔ وہ زیادہ نہیں جاتی تھی۔ جبکہ
 اسماء اپنی تیری برہنگنسی۔ جو اپنا آپ ظاہر کرنے
 لگی تھی۔ اس کے باوجود ہر تیسرے دن کہیں چائے
 پر چلی جاتی اسماء کے سرال والوں کا تو کہنا تھا کہ اسماء تو
 بس اپنے میکے میں ہی تھسی رہتی ہے، شاید ان کا گھر
 اس کے بغیر چل نہیں سکتا۔ سچ یہی تھا کہ اسماء نے
 وہاں کچھ ایسا ہی امپریشن بنا رکھا تھا۔



صفا کالج سے آئی۔ تو ہاں کمرے میں ”آئی بوا“
 اونگھ رہی تھیں وہ ہلکی آہٹ سے چلتے ہوئے اپنے
 کمرے میں چانا چاہتی تھی، جب آئی بوا نے اسے پکارا

”آگئیں۔ صفا؟“
 ”جی۔“ وہ رک گئی۔ ”السلام علیکم آئی بوا! آپ
 ادھر لیٹی ہیں۔ اندر چل کر سوئیے۔“
 ”نہیں۔ یونہی آنکھ لگ گئی۔ اس عمر میں وہ ہی تو
 کام ہیں۔ کھالیا، سویلیا، رب کو یاد کر لیا۔“ وہ اس کے

شوکت بیگم کے برابر بیٹھ گئی۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے صفا بہت اترا ہوا لگ رہا ہے تمہارا چہرہ؟“ بیبا جان نے بغور اس کو دیکھا۔
”جی ہاں۔ جس سرد ہو رہا تھا اسی کی وجہ سے طبیعت بوجھل ہو رہی تھی۔“

”جانے تمہارا سر کیوں درد کرتا ہے اتنا۔ اور طبیعت خراب تھی تو روٹیاں کیوں بنانے لگی۔“ امی نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر حدت محسوس کی۔
”ٹھیک ہوں میں امی۔“

”کچھ کھائی تو ہے نہیں۔ اتنی مشکل پر کھائی ہے اتنی بار میں نے کہا ہے۔ دودھ اور پلوام نہار منہ کھلایا کرو۔ پر آج کل کی لڑکیوں کو جانے کیا ہے۔“ آنٹی بوا بھی شروع ہو گئیں۔

”اوہو۔ آپ سب میرے ہی اوپر کتاب لکھنے بیٹھ گئے۔ کوئی اور بات کریں نا۔“ وہ چڑ کر بولی۔ تو بیبا جان مسکرائی۔
”کوئی اور بات کرو۔ یہ نا ہو۔ رات کا کھانا بھی مکسک (Skip) کر جائے۔“

”تم کھانا کھاؤ گریا۔ سروہ کی سٹاؤ۔ اور یہ بتویر کہاں ہے۔ کیا سو گیا ہے؟“ بیبا نے پوچھا۔
”ہاں۔ وہ بھی تھکا ہوا تھا۔ کھانا کھائے بنا ہی لیٹ گیا ہے۔“ امی نے بتایا۔

”بہنیں، لڑکی ڈھونڈنے نکلے تھیں چار مہینے ہو گئے شہر بھر کی لڑکیاں دیکھ ڈالیں۔ اب شہر سے باہر کی دیکھنے کی سوچ رہی ہیں۔ ارحم کو دیکھو۔ کیا کمی ہے اس میں۔“ بیبا ڈور اپنے میاں کو۔ کوئی سو پونڈ کی ہے فرحت نے۔
”آئی بوا پر شکوہ ہی بولیں۔“

”آئی بوا۔ جہاں جس کے نصیب ہوں گے وہی ہو گا۔“ امی نے جواب دیا۔ صفا کا دل رک سا گیا۔
”اچھا۔ ارحم کا رشتہ طے ہو گیا۔؟“ انوار صاحب نے پوچھا۔

”ہاں۔ لڑکی گرجوٹ ہے۔ دور کی رشتہ داروں میں سے ہے۔“ امی نے بتایا۔ صفائے حیرانی سے ماں کو دیکھا۔

”اچھا! کچھ ایسی انداز انوار صاحب کا تھا۔“
”ہاں۔ حیرت تو مجھے بھی ہوئی تھی۔ ارحم خود اتنا لائق ڈاکٹر۔ اور لڑکی گرجوٹ۔ میں نے تو کہا تھا فرحت بھائی سے۔ کہ ہم نے سوچا تھا کہ ارحم کے لیے کوئی ڈاکٹری ڈھونڈیں گی۔ کتنے لگیں ارحم گھر پلو لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ کتنا ہے گھر رہنے والی لڑکی۔ خود ان کی تمنا ہی دور کرے گی۔ امی کھانا ڈالتے ہوئے بتا رہی تھیں۔ صفا کے سر میں شدید درد اٹھ رہا تھا۔

”ایک طرح سے صحیح ہی کہتی ہیں، کوئی ڈاکٹر ہیوی لے آئیں۔ تو ان کی تمنا تو وہیں رہتی ارحم بہت سمجھ دار ہے۔“ وہ مزید بتانے لگیں صفا نے پانی کا گھونٹ بھرا۔

”تم بھی چل کر مہارک ہاروے آنا۔ تمہیں بہت یاد کر رہی تھیں۔ لگے مجھے ممکن ہے۔ پھر دو دو واحد شادی کہہ رہی تھیں۔ صفا سے کہو ایک ہفتے میں ساری شاپنگ کروانی ہے مل کر۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔ وہ کچھ نہیں بولی، بس سر ہلایا۔

”میں کہتی ہوں۔ آس پاس نظر رکھو۔ اپنے خوبرو کا بھی کچھ سوچو۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں کچھ نہیں ملنے والا۔“ آنٹی بوا نے کہا۔ تو بیبا نے تائید میں سر ہلایا۔

”امی۔ میرے سر میں بہت درد ہے۔ دو لڑکیاں کھا کر لیٹوں گی۔ پلیز صبح جلدی جگا دیجئے گا۔“ صفا کرسی پیچھے دھکیل کر اٹھی۔
”کچھ کھایا تو ہے نہیں تم نے۔“ آنٹی بوا نے اس کی پلیٹ دیکھی۔ جس میں چاول ویسے کے ویسے پڑے تھے۔

”بس ٹھیک ہے۔“ وہ کہہ کر چلی گئی۔
”کیا ہوا ہے اسے؟ کوئی بات ہوئی ہے۔؟“

”بہت اچھی سی لگ رہی ہے صفا۔“ بیبا کو قدرے تشویش ہوئی پر امی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ معاملہ ان کی سمجھ سے باہر تھا، جبکہ آنٹی بوا کے عمر رسیدہ چہرے پر سوچ کی اک باہمی سی لکیر ضرور گہری

ہو گئی تھی۔



”او ہو ای یہ کیا ڈیرائن سلو ادیا آپ نے...؟ اتنا زیادہ کپڑا تھا اور سلو فیض سلو ادی۔“ مرہہ ایک بہت ہی خوب صورت آگنی شرٹ کو سامنے کھولے پیشی تھی۔

”میں نے تو اسے جدید ڈیرائن کا ہی کہا تھا۔ ٹاپ بھی دی تھی۔“

”یہ ہلکا سا گلے کا ڈیرائن اور شہب شرٹ، جدید ڈیرائن ہے؟“ میں تو نہیں پہن رہی یہ شرٹ۔ صفا کو دے دیجئے گا۔ آپ کو بتا بھی ہے کہ اسامہ کو اچھا لگا ہے کہ میں نت نئے ڈیرائن اور فیشن ایبل کپڑے پہنوں۔“ منہ پھلائے بولتے ہوئے اس نے شرٹ ایک طرف پھینک دی۔

”برسوں تمہیں شادی پر جانا ہے۔ ابھی پہن لو۔ پھر“ اسی نے سمجھانا چاہا۔

”رہتے دیں۔ اتنی اوٹ پٹانگ ڈرنگ کر کے مجھے تماشہ نہیں بننا۔ آپ فرحت آگنی کے ساتھ بازار جاری ہیں نا۔ میں بھی چلتی ہوں کھوٹی ریڈی میڈ سوٹ خرید لوں گی۔“ اس نے صحت فیصلہ کیا۔

”یہ ریڈی میڈ کپڑے لینے تم اپنے میاں کے ساتھ ہی جانا۔ مجھے پہچان نہیں ہے پھر بلووی آؤٹ آف فیشن ہے۔“ اسی نے صاف منع کر دیا۔

”مجھے تو پہچان ہے نا۔ ادھر لہنی میں کتنی شاہیں ہیں۔ بریزے تو میں کئی بار گئی ہوں۔ پانچ سات ہزار میں بہترین سوٹ آجاتا ہے۔“ وہ غرے سے بولی۔

”پانچ سات ہزار۔ رہتے۔ میں فوراً نہیں کر سکتی۔“

”اب چلیے تو سہی۔ میرے پاس بھی کچھ پیسے ہیں۔ مل لا کر لے لیں گے۔“ مرہہ اصرار کرنے لگی۔

”میرے پاس مل لا کر لینے تو بھی نہیں ہیں۔ بچوں والی ضد ہے تمہاری مرہہ۔ ایسی تو نہیں مگی تم

۔ جتنا ہے جو ہے اسی برکتا کرنے والی مرہہ۔ ایسی فضول خرچ ہو گئی۔“ اسی کو اس کی ضد بہت بری لگی۔ تب ہی اسے احساس دلانے لگیں۔ اس دوران صفا کمرے میں آئی۔

”ای۔ فرحت آگنی کا فون آ رہا ہے۔ انتظار کر رہی ہیں آپ کا۔“ مرہہ کاموڈائی کے انکار پر آب ہو چکا تھا، جبکہ اسی ذہنی طور پر سخت لاپ سیٹ ہو گئی تھیں

”میں نہ تو مرہہ کی فضول خرچی اچھی لگ رہی تھیں اور نہ ہی اپنا اس طرح انکار کرنا۔ بیٹیوں کو تو ماں سے پیشہ ہی آس رہتی ہے۔ اور ماں بھی کبھی دریغ نہیں کرتیں، لیکن اس وقت حالات ہی ایسے تھے، شوکت بیگم کے پاس جو آٹھ دس ہزار پڑے تھے اس میں مینے کے ہائی دن کے اخراجات۔ مرہہ کے میڈیکل اور اب ساتھ ہی ارجم کی مگنی کے اخراجات بھی پورے کرنے تھے۔ برسوں کا ساتھ تھا۔ پونہ سو گھنٹے منہ ہاتھ تو خوشیاں دی لی نہیں جاتیں۔ جبکہ

مرہہ کی برہنگینسی میں جو کلمہ لکھن تھیں۔ اس وجہ سے مینے میں دیکر تو ڈاکٹر کا وزٹ ہو ہی جانا تھا۔ وہ بھی ان کے خرچے پر۔“

”میری ماں۔ ابھی کئی پہن لو۔ برا تو نہیں لگ رہا ہے۔“ اسی نے ایک بار اور کوشش کی۔

”ای۔ آپ سمجھتی ہی نہیں۔ اسامہ کی نیلی میں شادی نہیں۔ فیشن شو ہوتا ہے یہ جو شرٹ خراب کی ہے اس ٹیلر کے بچے نے، صرف شرٹ ہی چار ہزار کی ہے، میں نے تو اسامہ کو سر از دنیا تھا، اسے میری چوٹس بہت پسند ہے۔ یہ دیکھو گی کی تو مذاق اڑانے کا میرا۔“

”اب اس مذاق سے بچتے کے لیے تم چار ہزار کی شرٹ ہمارے پلے میں نہ ڈالو۔“ صفا صراحت میں بولی۔

”جب تمہاری شادی ہو گی نا۔ تب دیکھو گی کی شوہر کی پسندنا پسند کا خیال رکھتی ہو یا نہیں۔“

”جب کی جب دیکھی جائے گی۔ فی الحال تو اس شرٹ کا کوئی امیدوار نہیں۔“ اور ویسے بھی اتنے شاعرانہ رنگے جوڑے، فی الوقت ہماری جیب سے باہر

ہیں۔ صفا کے لہجے میں ہلکے سے طنز کی گھلاوٹ تھی،
 مروحہ یکدم مہارنگی منہ پھلائے شرت لگانے میں ڈال۔
 ”آئندہ کچھ نہیں سلوانا آپ کے ہاتھوں۔ آپ
 کی نظر میں بیٹے دھیلے کی کوئی اہمیت نہیں۔ بس جیسے
 خود بے ڈھنگے، آؤٹ آف فیشن بنتی ہیں۔ ویسے ہی
 سب کو چلانا چاہتی ہیں۔“ وہ منہ میں جو کیا کستی چلی
 گئی۔

”مروحہ۔۔۔ ایسے کیسے کہاں جا رہی ہو۔۔۔ اتنا سرلیں
 مت لو۔۔۔ تمہاری حالت ایسی نہیں ہے۔“ شوکت
 بیگم نے محل سے اسے غصہ کرنے سے روکا۔

”کچھ نہیں ہوتا مجھے۔“ وہ نخوت بھرے لہجے میں
 کہہ کر چلی گئی۔ شوکت بیگم پریشان۔ جبکہ صفا کے
 دلخ میں حیرانی اور غصے کے جذبات ابھر رہے تھے۔

ادھر ارجم کی مگنی کی تاریاں چل رہی تھیں ادھر
 صفا نے کتابوں میں پڑھ لینے کی کوشش کی۔ وہ فرحت
 آنٹی کا دل نہیں رکھ سکی پورے ایک ہفتے میں صرف

ایک بار چند منٹ کے لیے گئی اور مبارک دے کر آ
 گئی۔ فرحت آنٹی نے شکوہ بھی کیا تو انیکوہام کی تیاری کا
 بہانہ بنا دیا۔ آج کل ویسے بھی بہت ٹف پیڑ پھل چل رہا

تھلہ دل و دل کی جنگ میں بیچاری صفا تھیں کی زندگی
 تھی، فرحت آنٹی کے بھرپور اصرار پر اس نے مگنی میں
 آنے کی حالی بھولی حیرت کی بات تو یہ بھی کہ اگر اس

نے خود ارجم کو فون کر کے مبارک نہیں دی تھی۔ تو
 اس نے بھی کل نہیں کی۔ مروحہ کی لیاقت منٹ اور کئی
 بوا کی دو آئینوں کا لفافہ بھی اپنے ڈرائیور کے ہاتھ بھجوا دیا

”وہ تو ارجم کا سامنا کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اور ارجم
 ۔۔۔؟ ایک سوالیہ نشان تھا۔

یونیورسٹی سے واپسی پر گاڑی خراب ہو گئی اور
 اسے بس پر اتار دیا، گھر کے پاس ہی سٹاپ پر وہ اتری۔
 موسم صبح سے ہی ابر آلود تھا۔ اور اب ہلکی بوند پانی

شروع ہو گئی تھی، وہ تیز قدم اٹھاتے ہوئے گھر کی
 طرف بڑھ رہی تھی، گھر سے چند قدم کے فاصلے پر وہ
 آنٹی فرحت کے گھر کو عبور کرنے ہی والی تھی جب مین
 گیٹ کھلا۔ اور گاڑی باہر نکلنے والی تھی۔ وہ رک

گئی۔ راستہ بدلنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ ڈاکٹر ارجم
 کو دیکھ چکی تھی۔ اس کے قریب گاڑی لا کر ڈاکٹر ارجم
 نے دروازہ کھولا۔

”السلام علیکم۔۔۔ ہمیشہ والا اعتماد اس کے لہجے سے
 رخصت ہو چکا تھا۔

”و علیکم السلام۔۔۔ شکر ہے نظرو آئیں۔ کہاں ہوتی
 ہو آج کل۔۔۔ مجھے مبارک دینے بھی نہیں آئیں۔“

ڈاکٹر ارجم نے اس کا بھرپور نظروں سے ایک جا تہ لیا۔
 ”مبارک ہو۔“ وہ ہر احساس سے عاری تھی۔
 اس کی ”مبارک“ سن کر ڈاکٹر ارجم کے چہرے پر اک

سایہ سالر لیا، ”خورا“ سنبھل بھی گیا۔
 ”تھہنکس۔“

”میں بعد میں آؤں گی۔ ابھی چلتی ہوں۔“ صفا
 نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا، ایک بل میں کیا نہیں کن
 اترا ان نگاہوں میں، وہ سب جس کا خود اسے بھی

احساس نہیں تھا۔ ”وہ ڈاکٹر ارجم کے قریب سے گزر
 گئی۔ ان آنکھوں کی نمی ڈاکٹر ارجم کو بے تاب کر گئی

کچھ پتھر بھی کہتے ہیں

الٹا دیرا بھی کہتے ہیں

کوئی آوارہ سا پتھی!

پلٹ کر ابھی سلسکے ہے

جو شب!

کہ! مجھ پہ ہنسی ہے

وہی شب وہ بھی کہتی ہے

محبت ہو بھی سکتی ہے



”اسی لوہکیں تو سی کتا کتی پیاری لڑکی ہے۔ وہ
 بھلائی ہیں۔ دونوں باہر پاپ کا برس ٹھانی سبجاتی ہے
 زیادہ اور ملے نہیں۔“

اسلمو نے تصویر میں کے ہاتھوں میں تھمائی۔ وہ
 لڑکی بلاشبہ بہت حسین تھی مگر ساتھ ہی اس کی تھائی
 جانے والی تفصیلات بہت حد تک شوکت بیگم کے لیے

تا قابل قبول تھیں۔ آئی بوا تو پہلے ہی سر پکڑ چکی تھیں۔ یہ سننے کے بعد کہ لڑکی، زیرک کی رشتہ میں پھنسی زاد بھی لگتی ہے۔ فرسٹ کزن ٹاسی۔ کزن تو بھی بنا۔

”اسماء۔ لڑکی بہت پیاری ہے۔ مگر ہماری حیثیت سے بڑھ کر ہے لڑکی کا رویہ چلاتی ہے اور بھائی یا ہر پٹھے ہیں۔ وجہ؟ باپ کا رویہ رکھیں نہیں سنبھالا۔“

”اوہ امی۔ آپ بھی بیل کی کھال اتارنے لگتی ہیں۔ آج کل کیا زمانہ ہے مو عورت میں فرق کرنے کا۔ دراصل شاہ کے چاچو بڑس میں حصہ دار ہیں نا۔ شاہ کے بڑے بھائی کو لندن گرین کارڈ ہولڈر ہونے کے لیے کچھ سال وہیں رہنا ہے۔ جبکہ چھوٹا بھائی ابھی پڑھ رہا ہے اس لیے شاہ باپ کی مدد کرتی ہے۔“ اسماء نے ساری تفصیل بتائی۔ شوکت بیگم نے آئی بوا کی طرف دیکھا۔

”اسماء۔ مجھے اس رشتے پر اس لیے اعتراض ہے کہ۔ دیکھو وہ دور نزدیک سے زیرک کی کزن ہے۔ گھروں میں سو مسئلے مسائل ہوتے ہیں، جو لڑکی کا رویہ چلاتی ہے۔ وہ خیر کے ساتھ کیسے میل کھائے گی۔ تمہیں بتا ہے نا، وہ تو خود مختار وار ہے اور۔ پھر وٹے شے والا حساب ہی ہو جائے گا۔ اس لیے۔“

”مجھے بتا تھا، آپ کوئی نہ کوئی مین بیخ ضرور نکالیں گی۔“ وہ تپ گئی۔

”ہمس اپنے برابر والوں میں ہی رشتہ کرتا ہے۔“ شوکت بیگم نے کہا۔

”ہی۔ آپ کے برابر تو کوئی ہو نہیں سکتا، آپ کی سوچ ابھی تک اتنی ہی محدود ہے۔“ اتنے میں خیر اندر داخل ہوا۔ اور وہ جب ہو گئی۔ کمرے میں تینوں کاموڈ آہ دیکھ کر اس نے اشارے سے ماں سے دریافت کیا وہ نفی میں سر ہلا کر اٹھ گئیں۔

”کیا ہوا۔“ موڈ کیوں آف ہے؟“ اس نے اسماء سے پوچھا۔ اسماء مختصر اس کو بتانے لگی۔

”لڑکی کے بھائی کی بجائے اگر لڑکی خود گرین کارڈ

ہولڈر ہوتی تو میں ضرور سوچتا۔“ وہ ذرا قہقہہ بولا۔ اسماء نے گھور کر اسے دیکھا۔ خیر ایک انگریزی لیتے ہوئے صوفے کی پشت سے لگ کر کھڑا ہو گیا، چند لمحے اسماء کو دیکھا۔

”آئی، اب یہ“ بھابھی ہنٹ شو (show Hunt) ختم کریں میں نے آپ سب کو بہت وقت دیا ہے، اب مجھے آپ میں سے کسی کی بھی تلاش کی گئی لڑکی سے شادی نہیں کرنی میں۔“

”ہاں۔ بس تمہارے بولنے کی کمی تھی وہ پوری کر لو۔ اسماء توجہ نہ کرتے ہوئے اٹھی۔

”اس گھر میں تو جس کا بھلا سوچو۔ وہی کلٹے کو دوڑاتا ہے۔“

”آئے ہائے اسماء، دھیرج رکھو، محل سے بات کرو۔ اپنی حالت دیکھ کر غصہ کھاؤ تو ہوا۔“ آئی بوا نے اسے قابو میں کرنے کو کہا۔

”بس رہنے دو آئی بوا۔ سب کو دیکھ لیا ہے۔ وہ ٹسوے ہلانے لگی۔ خیر سیر سیر جھوٹا شکل بنائے اسے دیکھ رہا تھا۔

”حد ہو گئی ہے۔“ اس نے بے بسی سے بہن کو دیکھا۔ اور کمرے سے چلا گیا۔

”عقرا، قرح۔ چلو۔“ اسماء نے اپنا بیگ سمیٹا اور بچوں کو آواز دی۔

”عجیب لڑکی ہو، کوئی ماں کے گھر سے ایسا خفا ہو کر جاتا ہے۔ زیرک کو فون کرو۔ تمہیں لے کر جائے“

رکشے سے مت جانا۔ آئی بوا نے تو خود سنبھال نہیں پاری تھی اس دن موہ اور آج اسماء۔“ وہ رکی نہیں چلی گئی، آئی بوا ایک بار سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔



اسماء اور موہ بھی مکتفی برہم تھیں مگر وہ گھریلو مصروفیت کی وجہ سے نہیں آئیں۔ خیر کی آج کل ہائٹ ڈیوٹی چل رہی تھی وہ بھی نہیں جاسکا۔ آئی بوا نے اپنی طبیعت کی ہتاسازی کی وجہ سے معذرت کر لی۔ جانا تو صفا بھی نہیں چاہتی تھی۔ مگر امی کا دل پہلے ہی بہت

ہم کیا ہے۔ ایک بار بھی نہیں۔ ایک بار بھی نہیں،
ڈاکٹر ارجمند۔ بہت ضبط کے بلوغت بھی اس کی آنکھیں
آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔

بے بسی کی انتہاؤں پر۔ ضبط کے آخری مراحل
طے کرتے ہوئے اس نے اپنے آنسوئے اندر
اتارے۔ اے خدا مجھے بہت دے دے کہ میں اس شخص
کی سوچ سے بچھا چھڑا سکوں۔ یہ شخص جو میرا نہیں
ہو سکتا کہ میرے دل سے نکال دے یا تو کہ میرا کر
وے۔ یہ آخری کلمت خود اس کے منہ سے نہیں
نکلے تھے بلکہ کیسے لہا ہوا ہوئے۔

”صفا۔ صفا“ اسی نے اسے پکارا تو وہ اپنے کپ
سے باہر نکلے۔
”کیا سوچ رہی ہو؟ میں کب سے پکار رہی ہوں۔“
”کچھ نہیں۔ اسی۔ بس وہ۔ لگ گیا کہ رہی
تھیں آپ۔“

”فرحت بھابھی۔ تمہیں بلا رہی ہیں۔ جلاؤ
انہیں ضرورت ہوگی۔“ اسی نے کہا تو وہ اپنی کرسی سے
اٹھی لگان تک اس جگہ پر وہ کن سوچوں پر سوار ہوئی
اسے اندازہ ہی نہیں ہوا۔ اسے تو اسی کے ہوش
دلانے پر پتا چلا تھا کہ اس کے جذبات۔ وہاں کرنل
سے نکل رہے ہیں۔

اور اب کتنا مشکل تھا۔ ان آنکھوں سے آنکھیں
چرائیہ تو اس ایک لمحے میں جکڑا گیا تھا جب منگنی کی
پرسم لوار کرتے ہوئے اس کی نظریں صفا پر اٹک گئی
تھیں۔ اس کا پورا وجود جیسے تھرو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ
میں عروج کا موم سا ہاتھ جیسے پھسل رہا تھا۔ انگوٹھی اس
کے ہاتھ میں تھی اور وہ اس جرمے کا طواف کر رہا تھا جو
ارد گرد سے بے خبر اپنی ہتھیالیوں میں الجھی ہوئی تھی
۔ ہر اک وہ لمحہ جو صفا کو دیکھ کر اس سے مل کر خوشی بنا
تھا۔ اس کے سامنے کنول بھیرے لگا۔ کیا کر رہا ہے؟
جس لڑکی کو اس کے ساتھ ہونا چاہیے اسے وہ زندگی
سے نکال رہا ہے اور جو اس کی زندگی میں آ رہی ہے وہ
اس کی زندگی میں کہیں نہیں آتی۔ ”ملائے اس کا بازو
دیلیا اور اس نے عروج کو انگوٹھی ہٹا دی۔ یہ کیا ہوا اس

اور اس تھا اس کے انکار پر شاید وہ کچھ اور اب سیٹ ہو
جائیں۔ اسی کی خاطر اس نے دل مضبوط کر لیا۔ اور
منگنی اینڈز کرنے کے لیے تیار ہو گئی گائٹ پینک اور پلو
اسٹائنٹن سے سوٹ میں ہلکا سا میک اپ کھانوں میں
اسٹائنٹن نازک سے ناپیں اور ایک کھلائی میں چوڑیاں
بس اتنی ہی اس کی تیاری تھی۔ قد کاٹھ میں ویسے ہی
بہت اچھی تھی۔ پشت تک لے بل کج کل بالکل
اسٹریٹ تھے۔ اس نے انہیں ایسے ہی رہنے دیا۔
آنکھوں کا کاجل اس کی اواس آنکھوں کو کچھ اور بھی
اور اس کردہ تھا۔

لیکن آج اسے اواس نہیں ہوتا۔ جو طوفان اس
کے اندر ہے۔ اسے دہانے ہی رکھنا ہے کیونکہ جب
تک یہ جذبات اندر ہیں تب تک اس کے ہیں۔ عیاں
ہو گئے تو پھر اس کے نہیں رہیں گے پھر ان کی قسمت
کیا ہوگی یہ وہ جان سکتی تھی اس لیے جانتا نہیں چاہتی
تھی۔

منگنی کی رسم میں اتنے زیادہ مہمان نہیں تھے اس
لیے لڑکی والوں کے گھر کے لان میں ہی انتظام کیا گیا۔
آئی فرحت کی طرف سے کچھ پیسے منگنی لوگ تھے
اور وہ سری طرف سے بھی پیسے منگنی افراد سے کہی
ہوں گے۔ ڈاکٹر ارجمند جب لڑکی والوں کے گھر میں
داخل ہو رہا تھا۔ تب صفا کی پہلی نگاہ اس پر پڑی تھی
بلکہ ٹوپی میں وہ بے حد وجہ لگ رہا تھا۔ اسے لگتا
تھا کہ ڈاکٹر ارجمند سب سے پیارا اس وقت لگتا ہے جب
اور آل اپنے گلے میں اسٹریٹ کو پ لٹکائے وہ بہت
توجہ سے اپنا کام کر رہا ہوتا ہے۔ مگر نہیں! آج اس
نے صفا کے دل کے نازوں کو چھیڑ دیا تھا اس سوٹ میں
اس کی وجاہت۔ اسے ارد گرد شاید سب کو بہت
امیر لیس کرتی۔ اور صفا کو شاید سب سے زیادہ وہ
پہاں آئے تک وائٹ ڈاکٹر ارجمند کے سامنے نہیں آتی
تھی اور ابھی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس کے سامنے جا
کھڑی ہو۔ اسے پوچھے ”وہ اسے نظر کیوں نہیں آتی
؟“ ”کیا وہ اسے نظر ہی نہیں آتی؟ ایک بار بھی اس کو یہ
نہیں لگا کہ اس کا وجود اس کی ذات کسی کی سوچ کا محور

نے ذرا بھی سوچا کہ تمہاری شادی شدہ ہو نہیں سرائل والوں سے کیا کہیں گی؟ لوگ کیسی کیسی باتیں بتائیں گے۔

”میں دنیا والوں کے سامنے جو لہو نہیں ہوں۔“

تویر نے کہا۔

”ابو جان کبھی نہیں مانیں گے۔“

”میں ہنسا پڑے گا۔“ وہ کہہ کر چلا گیا اس نے کئی ہوا کی طرف دیکھا۔ جو سر تھامے چھو جھکائے ان کی بحث سے سخت متلاں ہو رہی تھیں۔



جتنی دھماکہ خیز خبر یہ تھی کہ تویر نے خود اپنے لیے کوئی لڑکی پسند کر لی ہے اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ بیابان۔۔۔ ان گئے تھے وہ ایک بار اس لڑکی سے ملے اور اس کے گھر والوں سے بات کرنے پر راضی تھے۔ تویر کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا اور اسما مودہ دونوں اس رشتے کے خلاف تھیں مگر بیابان کے سامنے کچھ دیر کو ہی سہی انہیں چپ رہنا پڑا بیابان جانے تویر کی بات بدنے عور سے سنی تھی اور پھر اسے کمرے سے بھیج دیا۔ ان کا جواب یہ تھا کہ اگر لڑکی اور اس کے گھر والے ہمارے مطابق ہوتے تو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔ کیونکہ ان کی نظر میں نہ تو نکاح ٹوٹا کوئی بڑی انکار کی وجہ ہے اور نہ ہی عمر میں بڑا ہونا ہاں ان کی یہ شرط ضرور تھی کہ لڑکی کو شادی کے بعد تو کمری چھوڑنا پڑے گی۔ یہی جانتی تھی کہ اسما اور مودہ ایسے رشتے کے ہاں ہونے پر داویلا ضرور بچائیں گی، بہر حال ایک دن ان سے ملاقات کا رکھ لیا گیا۔ اسی بیابان کی باتوں سے کنوئیں ضرور ہوئی تھیں۔ مگر زیاداری بھی ان کے ساتھ ہی تھی بیابان کی حافی بھر لینے سے وہ سارے سوال ختم نہیں ہو جاتے تھے جو سال رشتہ کرنے کی صورت میں کھڑے ہو سکتے تھے اسما اور مودہ کا احتجاج درست مگر انکار کا طریقہ کار غلط تھا۔ ورنہ سوال تو اسی جان کے دلغ میں بھی وہی اٹھے تھے جو ان دونوں کے وہ لوگوں کو کیا جواب

کے ساتھ کوئی مذاق کوئی استحسان۔ آنا نٹس یا پھر اسے نظر انداز کرنے کی۔ سزا جو بھی تھا مگر اس احساس کے بیدار ہونے کلوقت بہت کاظم تھا۔



دن جیسے سینے گزرتے جا رہے تھے۔ وہ دل و جان سے اپنی برصغلی میں غرق ہونے کی کوشش کر رہی تھی باقی سب کچھ اپنی جگہ موجود تھا۔ وہی مودہ اور اسما کی مدد روز لانی سے نت نئی باتوں پر بحث ان کی تنقید۔ اسی کا بچت کا روٹا، بسنوں کی تجویزی اور شہ خرمی کی تقریریں۔۔۔ کئی ہوا کی بیڑھاٹ کوز پھر اچانک ایک دھماکہ ہوا جس نے سارے گھر کو ہلا کر رکھ دیا۔ تویر نے اپنے لیے ایک لڑکی خود پسند کر لی اور اسی سے ہر حال میں شادی کا ارادہ بھی بتا دیا۔ پہلے تو کسی کو یہ بات ہضم ہی نہیں ہوئی۔ اور جب کنوئیں کی توہینا چلا کہ لڑکی کا پہلے ہی ایک نکاح ٹوٹ چکا ہے وہ ایک بچی میں جب کر لی ہے۔ تویر سے دو تین سال بڑی ہے۔ اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی اور تویر یہ سب مانیں جانتا ہے۔

”تمہیں کوئی اور لڑکی نہیں ملی تھی۔ جو اس کو پسند کر لیا۔“ اسما نے خوب احتجاج کیا۔

”نہ تو نکاح ٹوٹا کوئی عیب ہے اور نہ مجھ سے عمر میں زیادہ ہونا۔ دو تین سال بڑی ہے۔ میں تیس سال نہیں۔“ اس نے دفاع کیا۔

”شرم و حیا کوئی چیز ہوتی ہے۔ اس کے نکاح ٹوٹنے کی وجہ بھی تو ہوگی؟“ اسما نے کہا۔

”مجھے کیا لینا دینا اس کے ماضی سے اور ویسے آپنی۔۔۔ اچھا خاصہ خوار ہو چکی ہیں آپ۔ آپ اس لڑکی سے ایک ماہ مل لیں۔ پھر کوئی فیصلہ کر لیں۔“

”فیصلے کی گنجائش ہے کیا ابھی۔“ وہ نخوت سے بولیں۔

”یہ تو کہہ سکتا ہوں کہ آپ کی رائے بدل جائے گی۔“

”ہاں وہ تو بدل گئی۔ تمہارے بارے میں۔ تم

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ✦ ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

دس گے؟ ہمارے اکلوتے بیٹے میں کوئی عیب تھا جو ایسی لڑکی سے رشتہ جوڑا۔ اور سچ تو یہی تھا کہ بیٹیوں کے سسرال والوں کے گن میں کوئی بات بڑی تو وہ تو ضرور سوال اٹھائیں گے۔ لیکن سسرال بابا جان کے کسی حتمی فیصلے پر پہنچنے تک وہ کچھ کہنا نہیں چاہتی تھیں۔



مرودہ کی گود بھرائی کا بیٹھام بھی آ گیا۔ اس کی طبیعت خراب تھی اور ڈاکٹر نے مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا اسی لیے کچھ دن پہلے ہی گود بھرائی کی رسم کر کے اسے ماں کے ہاں بھیجا جا رہا تھا۔ تاکہ وہ مکمل بیڈ ریسٹ کرے۔ یہ رسم تو ہر صورت ادا کرنا ہی تھی حالانکہ حالات خالصے نامناسب تھے، تو خیر نے شادی کی رٹ لگا رکھی تھی۔ دوسری طرف اسماء بھی قاصر ہونے والی تھی۔ اور اس کا بھی ارادہ ہی تھا کہ ڈیوڑھی کے چند دن بعد بچوں کو لے کر نہیں آجائے تاکہ تھوڑا آرام کر سکے اور بچوں کو بھی سنبھالنا تھا اس کام کے لیے صفا تھی۔ اور صفا کے لیے تو زندگی پہلے ہی بہت تھکی تھکی سی ہو گئی تھی۔ تو خیر کا کہنا تھا کہ گود بھرائی کی رسم سے پہلے ایک پارٹھی کو دیکھ لیا جائے۔ تاکہ اگر کوئی رسم ادا کرنا ہے تو ساتھ ہی کر دی جائے۔ سو پہلے اسی کام کو نمٹا لیا گیا۔

لڑکی کا نام رباب تھا۔ وہ ایک پینک میں چاب کرتی تھی، متوسط گھرانے کے لوگ تھے۔ تین بیٹیاں تھیں۔ دو کی شادی ہو چکی تھی۔ رباب دوسرے نمبر پر تھی۔ ماموں زاد کے نکاح میں دو سال رہی پھر کچھ ناچاقی کی وجہ سے علیحدگی ہو گئی۔ یہ سب تفصیل ان لوگوں کے خود ہی بتائی۔ رباب نے حد خوب صورت تو نہیں تھی، قبول صورت ضرور تھی، لڑکی دیکھ کر تو آگے بظاہر انکار کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ انوار صاحب خود بیٹیوں والے تھے، بنا کوئی اعتراض کیے انہوں نے لڑکی والوں سے ہاں کہہ دی۔

اور ان کی اس ہاں نے شادی شدہ بیٹیوں کو ناراض

کر دیا۔ صفا خود بھی دل سے راضی نہیں تھی مگر بابا کی وجہ سے چپ ہی رہی۔ اور ویسے بھی کسی کو مجھے اور ثابت کرنے کے لیے ایک موقع ضرور بنا چاہیے۔ وہ اس ایک موقع کو ہار چکی تھی۔ اور چاہتی تھی کہ تو خیر کا یہ فیصلہ صحیح ثابت ہو، چند دن بعد گود بھرائی کی رسم کے ساتھ ہی تو خیر اور رباب کی بات بھی طے کر دی گئی، مرودہ کے آنے سے مصروفیت کچھ اور زیادہ ہو گئی۔ اسماء کی وقت بے وقت آمد۔ بحث کی بے ترتیبی اور صفا کی پڑھائی عروج پر تھی۔

اسماء آئی کے ہاں بیٹے کی پیدائش ہوئی، تھکی ست زندگی میں اک جمو کا سا آیا، بے ٹیک آنے والے دنوں میں کچھ اور مصروفیت بڑھنے والی تھی۔ مگر فی الحال دونوں طرف بہت اچھی خبر تھی، دو بیٹیوں کی ماں بن کر گویا ”جوڑا“ مکمل ہو گیا تھا۔ اب سب مرودہ کے منتظر تھے کہ کیا خوشخبری سنائے والی ہے۔

وہ کلنگ سے واپس آئی تو آئی فرحت پہلے سے موجود تھیں۔ کمرے میں گھر کی سب ہی عورتیں موجود تھیں۔ خوب کپ شپ چل رہی تھی۔ سامنے نچل پر مٹھائی رکھی تھی۔ شاہد اسماء کے بیٹے کی مبارکباد دینے آئی تھیں، وہ چیخ کر کے آنے کا کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ واپس آئی تو آئی فرحت جا چکی تھیں۔

”آئی چلی گئیں؟“ وہ مرودہ کے پاس ہی تخت پر بیٹھ گئی۔

”ہاں۔ اچانک کچھ مہمان آگئے تھے۔ ارجم کی کال آئی تھی۔“ وہ چادر لپیٹ کر ٹیکے سے ٹیک لگا کر لیٹ گئی۔ صفا جو اب ”کچھ نہیں بولی۔“

”کھانا کھا لیا آپ لوگوں نے؟“

”میں نے تو کھا لیا ہے۔ بہت بھوک لگ رہی تھی تو خیر اسماء آئی کو لینے گیا ہے۔“ مرودہ نے بتایا۔

”ہوں۔“ ”تنتے میں آئی بوا غسل خانے سے وضو کر کے نکلیں۔“

”وہ ذرا جائے نماز میں کرسی پر ڈال دو اور شوکت سے کو کھانا رکھے۔ بھوک سے چکر آرہے ہیں۔“ وہ

”جس کا جو دل چاہے کرتا پھرے اور کرتا پھرے“
 میں تو تھک گئی ہوں ایک کے بعد ایک کو سمجھاتے
 سنہالتے۔ شوکت بیگم بھی ہماری بیچی تھیں کہہ کر
 چلی گئیں۔ صفا کو سمجھ نہیں آتی کہ بات کیا تھی اتنی بڑا
 نے سلام پھیر کر اس کی طرف دیکھا۔

”جاؤ بچے کھانا کھا کر آرام کرو اٹھو میری نماز میں
 خلل ہو رہا ہے۔“ اتنی بڑا نے کہا تو مروہ نے ٹھیک سے
 لیٹتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ صفا وہیں کچھ سمجھ میں
 نہ آنے والی باتوں کو سلجھانے لگی۔ اتنی بڑا دوبارہ نماز کی
 نیت باندھ چکی تھیں۔



”آج کے منگنی کے اس دور میں بھی اتنا کر لینا
 بہت زیادہ ہے۔ آپ خواتمہ کیڑوں کا ڈھیر لگائے جا
 رہی ہیں۔“ شادی کی تیاری نودوں پر تھی۔ فرحت
 بیگم اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے دھڑا دھڑا شاپنگ کر
 رہی تھیں۔

”میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا تم اس معاملے
 میں کچھ نہیں بولو گے اپنے اکلوتے ڈاکٹر بیٹے کی شادی
 پونہمی تھوڑی کر دو گی۔ اپنے سب ارمان پورے
 کر دو گی۔ وہ خوشی سے چمک رہی تھیں۔ ارجم ان
 کے چہرے کی خوشی دیکھ کر خود بھی بہت پر سکون سا ہو
 گیا۔

”آج چھٹی ہے میں نے چور کو فون کر دیا ہے۔ گھر
 آجائے گا تمہیں کہیں جانا تو نہیں؟“
 ”ہی۔ اب ایک ڈاکٹر کو کیا پتا ہو کہ وہ چھٹی کا پورا
 دن گھر گزار سکے گا یا کبھی بھی کل پر جانا پڑے گا۔“ وہ
 صوفے سے ٹیکہ لگا کر بیٹھ گیا۔

”ہاں مجھے پتا ہے پر ایک ڈاکٹر کی زندگی میں بھی کچھ
 ایسے دن آتے ہیں جب اسے اپنی زندگی کے لیے
 لہجوں کو قید کرنا پڑتا ہے۔“ وہ شرارت سے بولیں۔ تو وہ
 ہنس دیا۔ فرحت صحبت سے اسے دیکھنے لگی۔ اس نے
 ایک بل کول کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

”تپ بس خوش رہا کریں سچ جانئے تو یہ شادی خود

سہارے کر بیٹھ گئیں۔
 ”آپ نے کھانا نہیں کھایا۔ وقت پر کھانا تو کھالیا
 کریں۔“ مروہ نے ان کے لیے جگہ خالی کی۔

”کھاتی۔ شوکت نے کئی بار کہا۔ مگر دل نہیں چاہ
 رہا تھا۔ پھر فرحت آگئی ارجم کی شادی کی تاریخ نکلنے
 کر دی اسی کی مشاغل دینے آئی تھی بس باتوں میں لگی
 رہی۔“ اتنی بڑا بولتی جا رہی تھیں اور صفا کادل کہیں
 پاتال میں اترتا جا رہا تھا۔

”اچھا۔“ مروہ بیٹھوٹی ”نیمری ڈیوڑھی کے دن ہیں
 ۔ سوچا تھا قارغ ہو جاؤں تو ہی کوئی فنکشن اینڈ
 کروں اور سنو! تمہارے بھائی صاحب بھی دو ماہ بننے کی
 تیاری کر رہے ہیں۔“ مروہ نے بتایا تو وہ کچھ نہ سمجھنے
 والے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔ اتنی بڑا اسرجھٹک کر
 اسے دیکھا اور پھر نماز کے لیے نیت باندھ لیا۔

”ابھی کچھ دیر پہلے کہہ رہا تھا کہ شادی کی تیاری
 کریں۔ ایک آدھ مہینے میں ہی۔“ مروہ نے بتایا کم
 جتلیا زیادہ۔“

”اتنی جلدی۔ ایسی کیا جلدی؟“ چند روز پہلے تک
 تو ایک آدھ سال تک ارادہ تھا۔ اور اب اچانک ایک
 آدھ مہینے۔ اس کا منہ کھلا ہی رہ گیا۔

”تم کب آؤ گی؟“ شوکت بیگم اندر داخل ہوئیں
 ان کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی وہ خود ہی اتنی بڑا
 کے لیے کھانا لے آئی تھیں۔

”ہی۔“ تو بھائی شادی کا کہہ رہے ہیں۔ اس
 نے ای کا سوال نظر انداز کر دیا۔ اتنی نے مروہ کی طرف
 دیکھا۔

”ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔ مجھ اگلی سے اتنے کام
 نہیں ہوتے۔“ وہ مروہ سے کچھ ناراض نظر آئیں
 کھانے کی ٹرے رکھی مروہ نے پہلو بدل لیا۔

”بس ڈیوڑھی کے فوراً بعد چلی جاؤں گی میں میں
 ہی بوجھ لگتی ہوں آپ کو۔“ وہ تنگ تھی۔

”ارے ارے۔ یہ بات کہاں سے کہاں لے
 گئیں تم۔“ صفا پریشان نظر آنے لگی۔

”سچی تو کہہ رہی ہوں۔“ مروہ کی آواز بھرا آئی۔

نکلے اور شام کو میرے ساتھ واپس آئے۔ ایسی لڑکی اس گھر کی تھائی دور نہیں کر سکتی۔“ وہ سناہیت سے بولا۔ فرحت کا دل یکدم کسی نے چھٹی میں لے لیا۔ ان کا شک تھیک تھا۔ ان کے بیٹے کی آنکھوں کی اواسی جگہ تھی۔

”تم اس گھر کے لیے ”ہو“ لا رہے ہو؟ میں تمہارے لیے ایک بیوی چاہتی ہوں اور وہ جو کوئی بھی ہے۔“ وہ تمہارے دل میں اب بھی ہے ایک سال کا دل او اس ہونے لگا۔

”مما پلیز۔ لیو دس ٹاپک۔“ میں عروج کے ساتھ خوش رہا۔ وہ گا پلیز نام، پلیز۔“ اس نے ماں کو دونوں ہاتھوں سے تھمتے ہوئے پورے دھوق سے کہنے کی کوشش کی۔

”پلیز ماما، آئندہ آپ اس موضوع پر بات مت کریے گا۔“ آواز ضرورت بھی نہیں ہے۔“ اس نے سمجھنے والے انداز میں کہا اور پھر وہاں سے چلا گیا۔



”آج پیسہ خرچ ہو رہا ہے صفائی پر۔ کس کلام کا۔ کون سا قاعدہ ہو گا اب کو اس کی پرہائی کا مکمل کلاں کو شادی ہو جائے گی اور اگلے صبح کریں گے۔“ آج ایک نئی بات ”موہ“ نے نکالی۔ امی تو پٹیا کر رہ گئیں اور ہوتی سی آئی بڑا کو دیکھنے لگیں۔ پھر موہ کو دیکھا وہ آرام سے سیب کھا رہی تھی۔

”ایسی خرافات تمہارے دماغ میں آئی کیسے ہیں؟ ہو کیا گیا ہے ایک سال میں تمہارے دل و دماغ کو؟“ آئی بولا بلا لحاظ بولیں۔

”توقف کیا کہہ رہی ہوں۔“

”موہ ایسی باتیں نہیں کرتے۔ کوئی بھی ماں باپ اپنی اولاد کو۔ اور خاص کر بیٹیوں کو تعلیم اس لیے نہیں دولاوتے کہ وہ کل کو انھیں قاعدہ دیں۔ تم نے اور اسماء نے جو اور جتنا پڑھنا چاہا۔ ہم نے سبھی اس میں بھی رکاوٹ نہیں ڈالی۔“

”زندگی گزر گئی۔ خیر سے سب کی شادی ہو گئی۔

سے زیادہ میں آپ کو خوش دیکھنے کے لیے کر رہا ہوں۔ آپ کی تھائی دور ہو جائے۔ اور بس آپ خوش رہیں۔ یو سنی ہشتے بولتے رہا کریں۔“ ایک بیٹے کی حیثیت سے اس کے بچے میں بے حد اطمینان اور اپناہیت تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنے دل کو چھٹی بار بھی اس نے ٹھلا وہاں عروج کا کوئی وجود نہیں تھا۔ فرحت ایک دم سنجیدہ ہو گئیں۔

”اگر ایسا ہے تو ایک بات صحیح بتانا۔“ وہ ذرا سا کھسک کر بیٹے کے قریب ہو گئیں۔ اس نے سوالیہ نظروں سے ماں کو دیکھا مگر ایک لمحے کو بھی نظریں ملا کر نہیں رکھ سکا۔

”میں نے آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔“ وہ اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے کھٹکنے لگا۔

”میری طرف دیکھ کر بات کرو۔“ فرحت نے اس کا چواہنی جانب کیا۔

”امی جان۔۔۔ آئی ایم فائن۔“

”میں نے یہ تو نہیں پوچھا تم سے۔“ وہ اس کے بے اختیار بولنے پر سنجیدہ ہو کر بولیں۔ وہ پٹیا کر رہ گیا۔

”تم نے عروج سے شادی کا فیصلہ میری خاطر کیا۔ اور خود تمہارے دل میں ہے؟ وہ کون ہے۔“ ایک بل کوہہ بالکل ساکت رہ گیا، جس چٹائی کو وہ خود جھٹلانا رہا ہے۔ ایسا سے امی اتنی آسانی سے پڑھ چکی ہیں۔

”میری بات کا جواب دو ارجم۔“

”مما۔۔۔ کوئی بھی نہیں۔“ وہ ماں کی طرف دیکھے بغیر بولا اور اٹھ کر چلنے لگا۔

”ارجم۔ میں نے کہا تھا جھوٹ نہیں بولو گے۔“ فرحت نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر روکا۔ اس نے رک کر ماں کی طرف دیکھا۔

”مما اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میرے دل میں کون ہے، مجھے اس گھر کے لیے ایک سا مھی چاہیے جو صرف اس گھر کو دیکھے، آپ کو دیکھے اور جو میرے دل میں ہے اس کے خواب کچھ اور ہیں۔ کچھ اور سوچ رکھا ہے اس نے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس گھر میں آنے والی ہو، میرے ساتھ صبح اس کے لیے

ازم پر ان کی بیٹی اتنا اترا رہی تھی۔ وہ یہ ہے؟ چاہے
 نہیں کب آنکھیں آنسوؤں میں ڈوبیں اور اک پانی کا
 قطرہ۔ گل پر برسہ نکلا۔

بعض اوقات یہ رشتے سمجھنے کتنے مشکل ہو جاتے
 ہیں۔ آسان تعلقات آسان کٹھن لگتے لگتے ہیں۔
 پہلی اولاد کی خوشی جس کا کوئی مول نہیں اور اس میں
 پسند ناپسند چاہئے ناپچاہئے کا کوئی دخل ہوتا نہیں یعنی
 ہو یا بیٹا۔ کسی بھی نعمت یا رحمت سے خالی دامن بھر
 جائے تو پانچھ پن یا ”بے اولادی“ کا ڈبک نہیں لگتا
 ۔ ایسی ناشکری۔ اور پھر اللہ انسان کو اس کی من
 چاہی اولاد بنا شروع کر دے تو نظام زندگی تیس تیس
 نہ ہو جائے اللہ چاہے تو ہی سب ممکن ہے ورنہ سب
 ناممکن۔ ایک حسین کے ذریعے انسان خدا کی رضا کو
 نہیں جان سکتا۔ بیٹی یا بیٹا۔ سولو کرانی ہنڈرڈ
 پریسنٹ نہیں ہو سکتی۔ ہر حال اسلام کے ایسے رویے
 پر ان کی اصل خوشی کا فورسی ہو گئی۔ دل میں ہزاروں
 طرح کے دوسے آنے لگے وہ سب باتیں۔ جن کا
 کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا دل کو ستانے لگیں۔ وہ لم
 صم سی ایک جگہ بیٹھی تھیں۔

”مروہ کو پتا چلا تو وہ کیا کرے گی۔ کتنا دکھی کروے گا
 اسلام میری بیٹی کو۔“
 ”مما! ڈاکٹر رحم سے بات ہوئی ہے میری۔ کچھ
 دیر میں روم میں شفقت کریں گے۔ آپ نے اسلام
 بھائی کو بتا دیا نا؟ میں نے کئی بار فون کیا کل ریسیو نہیں
 کر رہے۔ صفاء کو ریڈیو میں مل کے برابر بیٹھ گئی۔
 شوکت بیگم نے خالی نظروں سے اسے دیکھا۔
 ”کیا ہوا امی۔“ آپ بہت تیش لگ رہی ہیں۔“
 چند لمبے خاموش رہنے کے بعد امی نے اسے اسلام کے
 بارے میں بتا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا صفاء کو یقین
 نہیں آیا۔
 ”تبی بچھے کو مے گھٹے سے وہ کل ریسیو نہیں
 کر رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کتی اسلام
 ان کی طرف آنا دکھائی دے۔ وہ دونوں اپنی جگہ سے اٹھ
 گئیں۔

مطلب بخیر کی بھی ہونے ہی والی ہے پر اس گھر کے
 حالات نہیں بدلے۔ نہ سوچ نہ رہن سہن۔
 میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میں اور اسماء آپنی بھی تو
 اچھی زندگی گزار رہی ہیں۔ میں نے بی کام کر کے کون
 سا تیر بار لیا؟ اور اسماء آپنی پونہر شئی جانے کا خواب لے
 کر ہی رخصت ہو گئیں۔ وہ تو قسمت میں اچھا لکھا ہے
 کہ ہمارے شوہر خاص کر اسلام اچھا کھاتے ہیں۔
 اچھا کھاتے ہیں پیسے کی کوئی کمی نہیں۔ بس کہنے کا
 مطلب یہ ہے کہ اگر صفا بھی کسی امیر گھرانے میں
 بیابھی جائے تو چولہے میں جائے گی یہ ڈاکٹری۔ وہ
 سخت پران کر اپنی سوچ پر قائل کرنے کی کوشش میں
 تھی شوکت بیگم اپنی بڑھی لکھی بیٹی کی سوچ پر چکراسی
 تھیں۔ مروہ بھی موڈ آف کر کے گروٹ بدل کر لٹ
 گئی۔ شوکت بیگم فروس والے برتن اٹھنے کرنے
 لگیں سب سی مروہ کی کراہتی ہوئی گوازا آئی۔

”امی“
 دردی ایک تیز لہروہ کے وجود کو دہرا کر رہی تھی۔



پہلو۔ اسلام بیٹا مبارک ہو۔ اللہ نے رحمت کر
 دی تم بیٹی کے باپ بن گئے ہو۔ شوکت بیگم فون پر
 دالو کو خوشخبری سنا رہی تھیں۔ اس کے اپتل آنے
 سے پہلے ہی گڈ نیوز آئی۔ وہ ابھی تک شرفک میں
 چنسا تھا۔
 ”بیٹی؟“ مگر الزا ساؤنڈ میں تو بیٹا چھاپا تھا ناں؟“
 داماد کے ایسے انداز و سوال پر شوکت بیگم کو چچکا سا لگ
 وہ۔ ہوں ہاں کرنے لگیں ان کی سمجھ میں نہیں
 آ رہا تھا کہ کیا جواب دیں۔
 ”میں کچھ دیر میں پچھتا ہوں۔ آپ پلیز فون بند
 کریں۔ بہت شرفک ہے یہاں۔“ اسلام نے رابطہ
 منقطع کر دیا۔ شوکت بیگم کے کالوں میں جیسے تیز
 ہوا نہیں چلنے لگیں۔
 ”بیٹی کاسن کر اسلام نے فون بند کر دیا۔“ وہ خود
 کلائی سے بیٹھائیں۔ جس شوہر اور سرسرا کی لہل

”مبارک ہو اسلام بھائی۔“ صفائے پہلی کوشش
 ’یاکل نارمل نظر آنے کی تھی۔“ وہ جواباً کچھ نہیں
 بولا۔

”یہ سب کیسے ہو سکتا ہے۔ الزام ساز میں تو بیٹا
 تھا۔“ وہ ان سے ایسے سوال کر رہا تھا جیسے بیٹی پیدا
 کرنے کی ذمہ داری ان کے سر ہے۔

”یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں اسلام بھائی۔
 بیٹی ہو یا بیٹا اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اور سو تو کرائی کی
 روپوت پیٹرز پرنٹس تو نہیں ہو سکتی، یہ تو اللہ کی
 مرضی ہے۔“ صفائے اسے سمجھاتا چلا۔

”تم پلیز اس معاملے میں مت بولو، کتنا کچھ سوچ
 رکھا تھا ہم نے۔ سب کو بتا تھا کہ بیٹا آنے والا ہے۔
 میں تو گھر پر اطلاع بھی نہیں کر سکا۔ وہ لوگ تو پوتے کی
 خوشی کا انتظار کر رہے ہیں۔“ وہ ایسے افسردہ ہو رہا تھا۔
 جیسے؟ شاید وہ الفاظ حرم میں آنے کی ہمت نہیں
 رکھتے۔ جواباً ’ماں بیٹی ایک دوسرے کی شکل دیکھتے
 لگیں۔

”اسلم۔ بیٹا یہ تو اللہ کی مرضی ہے، جسے چاہے بیٹا
 دے اور جسے چاہے بیٹی۔ شکر کو اللہ نے صاحب
 اولاد تو کیا۔ بیٹی دی ہے تو انشاء اللہ بیٹا بھی ہو جائے
 گا۔“ شوکت بیگم نے اسے سمجھایا۔

”نی الحال تو مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ سوائے اس
 شرمندی کے۔ جو مجھے اٹھانا پڑے گی۔“ وہ کہہ کر
 وہاں سے چلا گیا۔ ایک نئی پریشانی پورے جون پر تھی۔
 حیرت کا دورہ تو اس وقت شدید ہو گیا۔ جب ان کی
 اپنی بیٹی۔ بیوہ بھی بیٹی کی پیدائش کا سن کر سکتے میں
 آئی۔ ایک تھی سی بری اس کے برابر لٹی تھی اور وہ
 بے لیتی سے بچی کہہ دیکھ رہی تھی اور پھر یکدم رونے
 لگی۔

”یہ کیا ہو گیا ای۔ مجھے تو بیٹا چاہیے تھا۔“
 ”مرہ۔ مرہ میری جان لہٹیاں بیٹیوں سے زیادہ
 پیاری ہوتی ہیں۔ ایسے مت روؤ۔ اچھی بات نہیں،
 اللہ ناراض ہوتا ہے۔“ شوکت بیگم نے بیٹی کو سمجھانا
 چاہا۔

”سب باتیں ہیں۔ کیسے فیس کروا گی میں اپنے
 سرال والوں کو۔“ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی
 شوکت بیگم کے پاس تو وہ الفاظ ہی نہ رہے کہ بیٹی کو
 سمجھائیں ’ولاسدیں یا پھر اس کی کم عقلی پر روئیں۔

”حد ہی کر دینی ہو مرہ تم بھی۔“ بیٹی کوئی گالی تو
 نہیں ہے؟ تمہاری ہی اولاد ہے۔ پتا نہیں تمہاری
 سوچ اس قدر گھٹیا کیوں ہو گئی ہے۔ اسب تم یہ سب
 کرو گی تو اسلام بھائی یا باقی گھر والے کیوں نہ کریں گے
 ؟“ صفائے رہانہ کیل پھٹتی ہی پڑی۔

”بات گھلی کی کی نہیں ہے۔ سب کو بتایا تھا کہ بیٹا
 ہے اور اسب۔“

”تو کیا ہو گیا۔“ صفائے تلخی سے بات کالی۔
 ”یہ بھی تمہاری ہی اولاد ہے۔ معصوم سی بچی کو
 اس طرح رو رہی ہو۔ جیسے۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک
 گئی۔

”لعنت ہے ایسی سوچ پر۔ صفا تلخی سے کہہ کر
 وہاں سے چلی گئی۔



گھر میں ایک دفعہ پھر بے سکوئی کا دور چل رہا تھا،
 سرال سے مرہ کی بیٹی کو دیکھنے کوئی نہیں آیا تھا۔
 اسلام دوسرے تیسرے روز آتو جانا امرہ خوش نہیں
 تھا اور اس کی اوساویہ کر مرہ کی ممتاز امتحان میں بڑ
 جاتی، دوسری طرف خیر جلدی شادی پر زور دے رہا تھا
 ۔ موسم بدل رہا تھا، وہ چھوٹے بچے تھے اسی لیے مرہ
 اور اسماء چاہتی تھیں کہ فل سرودی کا سینز نکال لیا
 جائے جبکہ وہ جلدی چھاپا رہا تھا۔ کچھ بحث بھی بری طرح
 اب سیٹ ہو چکا تھا۔ حالات اجازت نہیں دے رہے
 تھے۔ گھر میں تو سب کو اپنی بڑی تھی۔ شوکت بیگم
 بھی بچی چاہتی تھی کہ مرہ واپس گھر جائے تو ہی کوئی
 قدم اٹھائیں۔ کیونکہ بیس دن ہو گئے مگر وہاں سے ایک
 فنون گل نہیں آئی تھی۔ شوکت بیگم نے خود فنون کیا
 مگر انہوں نے مصروفیت کا بہانہ بنا کر منسوخ کر دیا۔ جوں
 جوں دن گزر رہے تھے۔ شوکت بیگم کی پریشانی بڑھ

رہی تھی۔

چائے لے کر بیڑھیاں مت چڑھو تمہاری ہاں بھی نہ۔
وہ بچی سے کپ لے کر اٹھیں۔



”صفا۔ بیچے جاؤ تم ہی چائے دے آؤ اسے۔
فرحت آئی جاتے جاتے پلٹ آئیں۔ اور ذرا کرو
بھی دیکھ آؤ۔ کیا سیٹ کیا ہے اس لڑکے نے۔ کچھ
اور احوال کرنا ہو تو کر لینا۔ میں پھول بیچواتی ہوں۔“
فرحت آئی نے کپ تھماتے ہوئے ساتھ ہی کام بھی
تھما دیا۔ اسے کچھ کہنے سننے کا موقع ہی نہ ملا۔



اس نے ہلکے سے دروازہ کھٹکھٹایا۔
”اور اجازت ما کرو روانہ کھولا۔ خوشبو کا ایک جھونکا
سانسوں میں گھل گیا۔ وہ ابھی نما کر نکلا تھا۔ صرف
ٹراؤ زر پتے گلے میں تولیہ لٹکائے۔ ڈرنگ ٹیبل کے
سامنے کھڑا ہوا، بنا رہا تھا۔ اس نے شیشے میں آنے
والے کا چہرہ دیکھا تو ہاتھ اپنی جیبی رک گیا۔
”میں۔۔۔ چائے لائی تھی۔“ اس نے وہیں
دروازے پر کھڑے کپ بڑھایا۔

”ارے۔۔۔ تم کہاں ہوئی ہو۔“ اس نے ہاتھ سے
برش رکھ کر اپنا لہجہ بگڑا کر بولنے کی کوشش کی۔
”سوری۔“ اور پھر اپنا تولیہ اتار کر کرسی پر رکھا۔
”ہنگ کی ہوئی شرٹ پہن لی۔

”آؤ۔ اندر آؤ۔“ اس نے چائے کا کپ خود آگے
بڑھ کر لے لیا۔ صفا نے اک اچھتی نگاہ کرے پر ڈلی۔ نیا
فرنیچر۔ بڑے۔۔۔ پیٹ شدہ خوشبو میں رسا کر۔
کسی کے آنے کا شہر تھا۔ ڈبل بیڈ کے سامنے کلاؤچ
کے ساتھ رکھی کارنس ٹیبل پر ”گلدان“ خالی برا تھا۔
ایک فوٹو فریم، ڈائنامو کی تصویر کے ساتھ
۔۔۔ دو سری جگہ عروج کی تصویر کی شہر۔ وہ کمرے کا
جاتا لے رہی تھی اور ڈائنامو اس کا۔۔۔ چائے کا
سب لیتے ہوئے ڈائنامو کو محسوس ہوا کہ کچھ اور
بھی تھا جو اس کے حلق سے اترا۔ کوئی سسکی۔ کوئی
تھکا ہوا آئسو کوئی آؤ۔ ان خالی نگاہوں میں اسے نظر
آئیں تو فقط کرسیاں۔۔۔ نہ اس نے کبھی کچھ کہا۔ نہ

گھر کی اواسی سے دل بہت برا ہو رہا تھا برصالی کی
طرف بھی توجہ نہیں دی جا رہی تھی ناقابل چل رہا تھا
اور اس کا دل ہر طرف سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ دل کی
اواسیاں اور بھی بڑھ گئیں۔ جب فرحت بیگم کی طرف
سے کئی بار بلاوا آیا اور اسے جانتا ہی پڑا۔

فرحت آئی کے ہاں بہت روغن ہو گئی تھی۔
شادی کے دن قریب آ رہے تو اور آئی کے کچھ مہمان
بھی دو دروازے آچکے تھے۔ فرحت بیگم صفا کو دیکھ
کر اس کی طرف محبت سے لپکیں۔

”چاند نکل آیا آج تو۔“ وہ اس کا ہاتھ چوم کر اندر
لے آئیں مہمانوں سے تعارف کروایا۔ چائے کا دور
چل رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ کپڑوں اور زیورات کی
پیننگ چل رہی تھی۔

”عروج کو وراثت کو لڈ بہت پسند ہے۔“ یہ دیکھو یہ
اس کی منہ دکھائی پر ڈاکٹر بیٹا دے گا۔“ فرحت بیگم نے
اس کے پاس بیٹھتے ہوئے ایک نازک سائیکلس سیٹ
دکھایا۔ اس نے چہرے ٹاپتے دیکھا۔

”بہت پیارا ہے۔“
”دکھتی بارطرا بیچھا میں نے شوکت کو۔ وہ بھی نہیں
آپنی مودہ کے سسرال سے آیا گیا کوئی؟“ آئی نے
پوچھا۔

”گویا آئی ہوا۔ اپنے دکھ کو بوجھ بنا کر چکی تھیں۔
اسے اندازہ ہوا۔

”جی۔۔۔ پر سول واپس جا رہی ہے۔ لیکن کوئی رسم
وغیرہ نہیں ہوگی، اسلامہ بھائی آکر لے جائیں گے۔“
اس نے بتایا۔

”کیسے لوگ ہیں سچ میں۔“ وہ ناسف سے بولیں۔
اور پھر آجی وہ کچھ اور کہنے ہی والی تھیں کہ ایک دس
گیارہ سال کی لڑکی چائے کا کپ اٹھائے آدھسکی۔

”ہائو۔ ڈائنامو کی لیے۔ کہاں ہیں؟“ وہ
اپنے کمرے میں ہے۔ لاؤ میں خود لے آئی ہوں تم

اس نے کچھ تنا۔ پھر یہ بے تمکین اور کچیاں یہ سکیں اور آہ کا کھیل۔ کیسے کھیل سکیں شروع ہو گیا۔

”کیا۔ دیکھ رہی ہو؟“ ارحم نے کپ ایک طرف رکھ دیا۔ چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

”کچھ نہیں۔ آئی نے کہا تھا۔ ایک بار دیکھ لوں کہ سب سیٹ ہے سب کچھ تو سیٹ ہے وہ خود کو سنبھالتے ہوئے کمرے کے پچوں آکھڑی ہوئی۔ ارحم کچھ نہیں بولا۔

”صفا۔ سب سیٹ نہیں ہے۔“ اچانک وہ اس کے پیچھے آکر بولا۔ تو وہ گھبرا کر پٹی مل زور سے دھڑکا جیسے ابھی باہر آکر نے کا ارحم کا دل چاہا کہ بول دے کہ اس کی کمی ہے مجھ اس کے سامنے ہے۔ پھر محلوں کی سجائی بہت ہماری تھی چند دلوں میں اس کی نئی زندگی شروع ہونے والی تھی۔ اگر آج ان محلوں کے آگے وہ بار گیا۔ تو خود اس کا ہوتا نہیں مگر پھر شاید ان آنکھوں میں ٹھہری کچیاں اسے خون رلا دیں۔ اور اب شاید کچھ کہنے بولنے کا کام بھی نہیں۔

”کیوں۔ کیا ہوا؟“ کیا کی ہے۔ وہ سنبھل کر اسے دور ہٹی۔ کمرے پر آگ لگھ اور ڈالی۔ چند خانے ارحم سے دیکھا رہا۔ اس کے بند ہونٹوں کے پیچھے لفظ تمہاری تڑپ رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ کچھ اور کہتا تو وہ کھلا اور وہی کچیاں پھول لے کر داخل ہوئی۔

”یہ پھول کمرے میں رکھتے ہیں۔ نالو نے دیے ہیں۔“ اس بچی نے کہا۔

”تھینک یو مانو۔“ ارحم نے پھول لے کر اس کا گل تھکا۔

”یہ تو ر اپنی کی بیٹی ہے۔ وہ جو کراچی میں ہوتی ہیں۔ ممائی لاڈلی بھانجی۔“ ارحم نے تعارف کروایا۔

”ہلو۔“ صفا نے اسے پار کیا۔

”پلیز۔ یہ بہت بورنگ ڈاکٹر ہیں۔ انہیں سمجھا دیں کہ اپنی شادی پر لو اس نہیں گھومتے۔ میں تو نور ہو گئی ہوں یہاں آکر۔“ اس بچی نے اس انداز سے کہا کہ وہ دونوں ہنس دیے۔

”چل مانو۔ بھاگو یہاں سے، ورنہ احتجاج تیار کرنے لگا ہوں۔“ ارحم نے اسے چپت لگائی۔

”کیوں دھمکا رہے ہیں بچی کو۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے، ہم ازم کم کر رہیں تو ابھی شکل لے کر گھبرا کر سن۔ شادی ہونے والی ہے کپ کی شکل کو عروج نے ہی شکایت کر دی تو پھر؟ صفا نے اندر کا غبار دھونے کی کوشش کی۔ وہ بس اسے دیکھنے لگا۔

”یہ پھول وہاں وائس لگا دو اور تم۔ چلو بھاگو یہاں سے۔“ ارحم نے پھول صفا کو تھما دیے اور پھر بچی سے مخاطب ہوا۔

”میں ان کے ساتھ پھول سجائوں گی۔ اور یہ گل دست میں لے خون تپا ہے۔ یہ فلاور کتا پتیا را ہے نا ڈاکٹر مانو۔“ اس نے صفا کے ہاتھ میں پڑے ریڈ روڈ کو نکال لیا۔

”ہوں۔ بہت پیارا ہے۔“ تھینک یو۔“ ارحم نے شرارت سے کہتے ہوئے اس کے ہاتھ سے پھول لے لیا۔ صفا خلی وائس پھول سجانے لگی۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھے پھول لے لے اسے اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ مانو کے ساتھ ہنسی بولتی پھول سجانے لگی۔ ساتھ ہی باتیں کر رہی تھی۔ ایک لمحے کو ارحم کو اس بات کا شدید احساس ہوا کہ شاید اس کا فیصلہ جلد بازی میں ہو چکا ہے۔

”صفا ان ہزاروں لاکھوں لڑکیوں جیسی نہیں تھی۔“ ارحم نے کہا۔

”اس لکھتے ہویری نانس ہے نا مانو۔“

”ہوں۔ اب جاؤ جلدی سے اور چائے بناؤ۔ یہ چائے ٹھنڈی ہو گئی۔“

”اف۔“ وہ سر جھٹک کر چلی گئی۔

”اوکے۔ ڈاکٹر صاحب میں بھی چلتی ہوں۔ کافی دیر ہو گئی۔“

”اوکے۔“ ڈاکٹر ارحم نے کہا۔ وہ آگلی بیڑھی تو ارحم اس کے سامنے آ گیا۔

”مجھے کچھ کہنا ہے۔“ ڈاکٹر ارحم کا یہ انداز اس کے لیے نیا تھا۔ خود اپنی حالت بھی۔ ڈاکٹر ارحم چند لمحے اس کی آنکھوں میں

دیکھتا رہا اور پھر ہاتھ میں پکڑا پھول اس کی طرف بڑھا
 دیا۔ وہ ہار گیا تھا!



جیسے جیسے موندے سسرال مٹی تو شوکت بیگم نے
 سکھ کا سانس لیا۔ اسلام بھی اُسے سسرالی رشتہ داری کی
 شادی میں شرکت کے لیے فیصلہ کیا ہوئی تھی۔
 اب ان کی طرف سے سکون تھا۔ تو خیر شادی برزور
 سے رہا تھا۔ پہلا تو تین مہینے بعد کا کہہ رہے تھے مگر وہ
 اس مہینے کی بات کر رہا تھا۔ اس کا اصرار یہ تھا کہ دھوم
 دھرنا کرنے کی ضرورت ہی نہیں نکاح کرنے کے دلہن کو
 گھر لے لیا جائے۔

لیکن ایسی کیا افلوٹ بڑی۔ بھاگ کر تھوڑی لا
 رہے ہیں لڑکی کو اور ویسے بھی ہمیش تو پہلے ہی اس
 رشتے سے خوش نہیں تھیں۔ اب اس طرح شادی
 کرنے پر تو دوا دینا مجاہدیں کی۔ شوکت بیگم کو ایک نئی
 روشنی نے آیا۔ لہذا رازم کی شادی میں چند دن باقی
 تھے۔ شرکت ضروری تھی۔ پہلے ہی وہ کسی محلے
 میں ان کی کوئی مدد نہیں کروا سکیں۔ اس بات کا انہیں
 افسوس تھا۔

ڈھولک کی تھاپ اس کے کمرے کی دیواروں پر تو ڈر
 سٹائی دے رہی تھی۔ طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی یہ
 مہین بھی کتنا پاگل ہے۔ کسی ایک پوز بٹنی ہوتی ہے اور
 کبھی برستا ہے کبھی سن کی پیاس نہیں بھانا کھانا جیسے
 درو تو ہونا ہے۔ کہ تو نکلتی ہے اس کی خاموش
 محبت کو قبولت کی ضرورت لگی تھی مگر وہ خود اپنا آپ
 دکھا ضرور رہا تھا۔ کبھی شکوہ، کبھی شکر، کبھی شکایت، کبھی
 عنایت۔ کبھی اطمینان، کبھی بے چین۔ خرابی
 طبیعت تو آگ بمانہ تھا جو لمبے اچھالے میں اس کی
 جموٹی میں آن کرے تھے ان کے ساتھ وہ کوئی رخ
 لہوں کو دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ رازم کی شادی شروع
 ہونے میں صرف دو تین دن باقی تھے اور وہ چاہتی تھی
 کہ یہ دن اس کی زندگی میں بھی نہ آئیں۔ وہ اس
 عشق کے ساتھ زندگی تو دیر ان نہیں کر لے گی مگر

بہر حال درو تازہ ہو تو بھی درو۔ درو ہوتا ہے۔ وہ تو
 چاہتی تھی کہ ان دنوں کہیں دور چلی جائے۔ اور محبت
 کے جو بیجام اس نے آخری ملاقات میں ڈاکٹرز رحم سے
 وصول کیے ہیں۔ ان کے بعد ان آنکھوں میں اجنبیت
 نہ دیکھے۔ آجکل سے بھی فراغت تھی۔ گزار کا کوئی راستہ
 نہیں تھا۔

وہ کمزور لہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سب ہوتا
 چلا گیا جس کا اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اسے خود پر
 خیرت تھی۔ وہ ایسا کیسے کر سکتا ہے۔ کسی اور کے
 ساتھ کھینچا ہونے کے بلوغت۔ صفا کو اظہار کے
 پھول کیسے دے سکتا ہے۔ اظہار تھا یا اقرار ہو بھی تھا
 ۔ اسے بہت پچھتاوا ہو رہا تھا۔ وہ اسے سامنے کر
 لینے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکا۔ یا پھر اس کے پیچھے
 صرف یہ سوچ تھی۔ کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے اور
 جانتا ہے کہ صفا بھی اسے پسند کرتی ہے۔ رازم اس
 سوچ کے اظہار کے لیے۔ یہ وقت نہیں تھا اور کچھ
 دنوں میں اسے کمرے میں صوح اچھالے کی اور وہ لڑکی
 جو اس کمرے سے زندگی لے گئی ہے وہ کیا کرے گی
 اپنے فیملے پر اس سے پہلے اسے بھی پچھتاوا نہیں ہوا
 تھا۔

اس سے پہلے وہ خوش رہنے کی کوشش تو کرتا تھا اور
 اب جب شادی کے دن آن بیٹھے تھے اس کو اسپتال
 سے گھر آنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ گھر میں ڈھولک رکھ لی
 گئی۔ مگر اس نے ایک بار پھر صفا کو نہیں پایا تھا۔ وہ کج
 کل فارغ ہے۔ وہ جانتا تھا اس کے نہ آنے کی وجہ وہ
 خود ہے۔ وہ بھی جانتا تھا شاید کبھی وجہ تھی کہ ڈھولک
 کی تھاپ اس کے سر میں درد کر رہی تھی۔ وہ کچھ دیر
 سکون لینے کی خاطر میسر برچلا گیا۔ یوں ہی کھلے آسمان
 پر دوڑتے بادلوں کے پیچھے آٹھ چھوٹی ٹھیلے چاند کو دیکھتے
 ہوئے وہ اپنی مہر کی سوچوں کو سمیٹنے کی کوشش کر رہا
 تھا۔ تب ہی اس کی نظر لان میں شکتی صفا پر پڑی وہ کچھ
 دیر اسے یوں ہی دیکھتا رہا۔ ایسے لمبے زندگی میں ہر کسی کو
 کب نصیب ہوتے ہیں۔ فرصت بھی تمنا ہی اور
 دیدار بھی وہ پوزی توجہ سے اسے دیکھنے لگا۔

کئی بوا کی طبیعت جب کبھی اچانک خراب ہوتی۔۔۔ وہ فوراً اسے بلانے آجاتی تھی۔۔۔ ”ڈاکٹر جلدی چلیے نا۔۔۔ وہ گھبرائے ہوئے کھتی تو وہ فوراً اس کے ساتھ ہو جاتا۔۔۔ جب پہلی بار وہ اسے ملی تھی۔۔۔ تو وہ میڈیکل میں جانے کا خواب دیکھتی تھی۔۔۔ تب وہ نو عمر سی لڑکی تھی۔۔۔ اسے ہمیشہ ڈاکٹر کہہ کر بلاتی۔۔۔ زیادہ بات چیت تو ہوتی نہیں۔۔۔ لیکن کبھی جب وہ پوچھتا۔۔۔ صفا کیا بننا چاہتی ہو۔۔۔ ”تو وہ فوراً جواب دیتی ڈاکٹر صفا۔۔۔ وہ بس روتا ہیبت سے اسے فیصلے پر مضبوط رہنے کی نصیحت کرتا۔۔۔ اور اب اچانک اسے کیا ہو گیا تھا۔۔۔ اس کی سوچ اتنی پسماندہ کیسے ہو گئی؟ وہ خود ایک ڈاکٹر تھا اور ایک ڈاکٹر سے شادی اس لیے نہیں کر رہا تھا کہ وہ اس کے گھر اس کی ماں کو توجہ نہیں دے پائے گی۔۔۔ اس نے صفا کے لیے ایسے کیسے سوچ لیا؟ جبکہ اس کی چھٹی۔۔۔ یا پھر ساتویں حس سے آگے کر چلی تھیں کہ صفا کی آنکھوں میں اس کے لیے پسندیدگی ہے۔۔۔ اس نے اتنی بڑی بات کیسے نظر انداز کر دی؟ ”خود اپنی ہی عدالت میں وہ کثرت میں کھڑا تھا۔۔۔ اس کے پاس اپنے کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔۔۔ مضطرب ہو کر اس نے اپنے ہاتھوں میں ہاتھ پھیرا۔۔۔ صفا کلاں سے جا چکی تھی۔۔۔ اس نے چہرے اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔۔۔ بارش کی چند بوندیں اس کے چہرے پر گریں۔۔۔ چاند ہاتھوں میں کہیں کھو گیا تھا۔

ہے تیرے اختیار میں تو یہ مجھ کر دے
وہ شخص میرا نہیں تو اسے میرا کر دے



”ہی۔۔۔ آپ کے پاس کہاں رکھے ہیں دو لاکھ روپے جو زیر ک بھائی نے منہ کھول کر مانگ لیے؟“
خبر تو امی کے منہ سے پیسے بگٹنے کا سن کر تپ ہی گیا۔
وہ سخت پریشان بیٹھی تھیں۔
”کہہ رہا ہے کہیں سے بھی ارنج کروں، سخت ضرورت آن پڑی ہے۔۔۔ ورنہ پھر اسامہ کا زیور بیچنا پڑے گا۔“

”یہ دھمکی ہے یا بلیک میلنگ۔۔۔ ہم کہاں سے ہوں اچانک ارنج کروں؟ گھر میں دیا کر رکھیں ہیں کیا؟“ وہ بھڑک کر بولا۔
”اب تمہیں قصداں کو کیوں دکھا رہے ہو؟ دماغ ہے وہ۔۔۔ ایسے کیسے منہ اٹھا کر منع کروں۔“ کئی بوا نے اسے ٹوکا۔

”تو کہاں سے دس گے دو لاکھ۔۔۔ میری شادی کے لیے تو ایک روپیہ نہیں شکل رہا تھا۔۔۔ اور اب دو لاکھ ارنج کرنے کا سوچا جا رہا ہے۔۔۔؟“ وہ کچھ اور بگڑ گیا۔
”خبر پڑنا۔۔۔ یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے ذرا عقل سے سوچو۔ اتنے سال ہو گئے اسماء کی شادی کو۔۔۔ کبھی کسی چیز کی تمنا نہیں کی اس نے اور اگر اب پیسے مانگ رہا ہے۔۔۔ وہ بھی ادھار تو لوٹائی دے گا نا۔“ کئی بوا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ شوکت بیگم کو کوئی الوقت کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”ادھار۔۔۔ ایک بار جانے دس دو لاکھ ان کی جیب میں دو بارہ شکل نہیں دیکھیں گی پیٹل کی۔۔۔ لڑکی والے ہیں وہاں ہی کام چلایے کیسے کر سکتے ہیں؟“ اس کے غصے میں ہی نہیں آئی تھی۔

”مہیاں تم توجہ رہو۔ بلکہ جاؤ یہاں سے بجائے مسئلے کا حل نکالنے کے تم لگے ہو ٹیکسی تو کبھی سنانے۔۔۔“ کئی بوا نے ایک بار پھر اسے ٹوکا۔ وہ صفا گھبرا گیا۔
”اگلے مہینے۔۔۔ صفا کی ہاؤس چاہ کے لیے بھی پیسے چاہیں۔“ اس نے یاد دلایا۔

”اور ایک بات میں صفا کے دے رہا ہوں۔۔۔ وہ رہا ب کے ابا رشتہ چھوڑنے کا سوچ رہے ہیں۔ انہیں کوئی اور امیر لڑکا نظر آ رہا ہے۔ اسی لیے میں شادی کے لیے جلدی بھاڑا تھا۔ مگر آپ کے تو مسائل ختم ہوتے نظر نہیں آ رہے اور میں رہا ب کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کروں گا۔ چاہے مجھے کورٹ میرج کرنا پڑے۔“ اس کی اتنی تیزی سے کہی بات کئی بوا اور شوکت بیگم پر یمن کر گری۔

”کہیں۔۔۔؟“ شریف لوگوں کے تو یہ طور طریقے نہیں ہوتے۔ شوکت بیگم صدمے سے باہر نکلیں۔

ہاں نے تو فون کرتے مودہ سے بھی ادھار پٹیوں کا تذکرہ کیا کہ شاید اسلامہ کی طرف سے مل جائیں خود اس کے پاس ایک لاکھ رکھے تھے وہی دینے کی حامی بھری اسی کے لیے یہ بھی بہت تھا۔ بیٹی لاکھوں کا زیور مشکل وقت میں کوڑیوں کے بھانجے کو نہیں گوارا نہیں تھا کچھ اسی طرح کرتے۔ ڈیڑھ لاکھ ڈیرک کو سونپا۔ جس نے جلدی لوٹانے کا وعدہ کیا۔ پھر وہ وہ اور دلاؤ وفا کرے۔

پھر رات اجانک وہ ہوا۔ جس کا کبھی کسی نے خواب میں بھی نہیں سوجھا تھا۔ سب لوگ مہندی کی رسم پر جلنے کی تیاری کر رہے تھے۔ شوہر اور بیابان تو کہیں یاہر گئے تھے گھر کی خواتین۔ تیاری کر رہی تھیں جب دروازے پر بھل ہوئی گئے کالوں میں بندے بیٹھے ہوئے وہ دروازہ کھولنے لگی تو سانسے۔ فرحت بیگم کھڑی تھیں۔ گھر کے ہی سادہ پٹوں میں۔ ”میں بہت اس لے کر آئی ہوں شوکت۔ بن۔“ روتے ہوئے فرحت بیگم کی آواز سنائی دی۔ آئی ہوا اور شوکت بیگم کو حیرت کا بت بنے بیٹھی تھیں۔ ان کی ہونے والی ہو ”شوکت بیگم“ گھر سے بھاگ گئی تھیں۔ وہ کسی اور کو پسند کرنی تھی ماں باپ نے زبردستی رشتہ طے کر دیا اور اب جب شادی کا دن آن پونچا تو گھر سے بھاگ گئی۔ ماں باپ جلنے کہاں سے ڈھونڈ کر لائے اور اب اسی لڑکے سے شادی کروا رہے تھے۔ فرحت بیگم سے بہت معذرت کرنی تھی پھر ان لوگوں کی معذرت ان کے دل کے خون ہونے سے نہیں روک سکی۔ وہ سخت دلہواشتہ تھیں۔ ”گھر میں مہمان موجود تھے۔ کارڈز تقسیم ہو چکے تھے۔ آج مہندی کی رسم ہونا تھی۔ وہ لوگ اپنی کسی اور بیٹی کا رشتہ دے رہے تھے لیکن فرحت بیگم نے منع کر دیا۔

”آپ صفا کو میری بیوی بنا دیں۔“ وہ ہاتھ پھیلائے آنسوؤں میں کہہ رہی تھیں۔ گھرے میں بیٹھا ہر شخص بے یقینی میں جھٹلا تھا اور کمرے سے باہر دروازے کی لوٹ میں کھڑی صفا بے یقینی کی آخری جھلک کو چھوری تھی۔

”ہاں۔ جیسے آپ کی مجبوریاں ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں ویسے کسی اور کی بھی۔ تیرے چند ہزار کی تنخواہ پر میں۔“ وہ جانے کیا کہنے جا رہا تھا کہ بیکم چپ ہو گیا بیابان اور صفا اندر داخل ہو رہے تھے۔ وہ رکا نہیں وہاں سے چلا گیا۔

”اسے کیا ہوا؟“ صفا کو ایک لمحے کی دیر نہیں ہوئی اندازہ کرنے میں کہ کوئی بہت سیریس مسئلہ چل رہا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ شوکت بیگم کیانی لینے چلی گئیں۔
 ”کیا ہوا آئی ہوا۔ آپ لوگ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟ بیابان نے بیٹھے ہوئے پوچھا۔
 اور اتنی پریشیاں۔ آئی ہوا انہیں سہا سکتی تھیں۔



اگلے دن۔ عجیب سا موسم تھا۔ سورج کی آنکھ چھلی، کبھی یونہی باہل سورج کی کرنوں کی پروانہ کرتے ہوئے بوندیں برس لے لگتے اور کبھی۔ سورج کی تپش سے زمین کا ہر کونہ جھک اٹھتا، کبھی کبھی ایسے بے اعتبار سے موسم سے کٹتی کوفت ہوتی ہے اور کبھی دھوپ میں برستی بارش من کو دھو کر ایک نئی تاب دے دیتی ہے۔ کبھی دل چلتا ہے۔ تو کبھی ٹھیک کر سلائے گئے بچے کی طرح پرسکون ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی سکون صفا محسوس کر رہی تھی حالانکہ۔ مسئلے مسائل تھے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

ساتھ ہی ساتھ برابر میں جتنی ہوئی شہنائی اسی شہنائی نہیں دے رہی تھی۔ من جیسے ہر طرف سے پلو بیل گیا تھا شام کو مہندی کی رسم تھی اور اسے جانا ہی تھا۔ اہی نے مودہ اور اسلامہ کو بھی آنے کا کہا تھا مگر اسلامہ نے تو منع کر دیا تھا جبکہ۔ مودہ کے اپنے سرسراں میں کوئی لنگھن تھا، یہاں شوہر الگ خراب موڈ لے محوم رہا تھا۔ بیابان دلاؤ کے لیے دو لاکھ ارنج کرنے کی پریشانی میں جھلا تھے، تو اہی کو شوہر کی بروقت شادی کی فکر کھائے جا رہی تھی، اگر واقعی اس نے کورٹ میج کر لی تو۔ اس کی دھمکی سے فی الحال بیابان بلاطم تھے۔

جو رنگ یہاں چل رہا تھا وہ کچھ اور دیر تک چلنا تھا۔ شاید یہی زندگی ہے۔ انسان پیدا ہوتے ہی ایک معمول میں مصروف ہے۔ وقت اور عمر کے ساتھ معمولات بدل جاتے ہیں مگر مصروفیات ختم نہیں ہوتیں۔ اپنی بیٹیوں کو تو یہ سبق پڑھا کر بھیجا تھا کہ جہاں بیاہ کر جانا۔ اسی رنگ میں رنگ جانا، اسی گھر کو اپنا گھر بنا لینا، کبھی کبھی اپنا یہ پڑھایا گیا اصول انہیں خود بہت تکلیف دے گیا۔ مگر آنے والی ایک اگلوئی ہونے کچھ اور نئے سبق اور اصول بھی پڑھا ہے۔

کچھ انسانوں کی زندگی میں ٹھکن کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ایک ماں کی تو کبھی نہیں۔ کبھی اپنی اولاد کو سکھانا پڑھانا پڑتا ہے۔ اور کبھی گھر بنانے رکھنے کے لیے بہت کچھ خود سکھانا پڑتا ہے۔ یہ سترنا تمام ہے۔ اس کا کوئی اختتام نہیں۔

صفا شادی کے بعد تعلیم جاری رکھے ہوئے تھی۔ وہ ارحم کے ساتھ ہی اس کے ہاسپتال میں ہاؤس جاب کر رہی تھی۔ فرحت بیگم بھی اس سے بہت خوش تھیں۔ ماں کے ہاں پڑھانے جانے والا سبق تھوڑا طویل تھا۔ مگر آج بہنوں سے سیکھی گئی غلطیوں دہرائے بنا وہ خوش تھی۔

اسما اور مراد کے وہی جھیلے تھے۔ انہیں عادت ہو گئی تھی۔ اپنے ہر مسئلے کا بوجھ ”ماں“ کے گھر اٹھا لانے کا۔

تی آنے والی ہو بیگم۔ بہت نازک اندام تھی، اسے ایک نہیں سکی کام والیوں کی ضرورت تھی۔ کپڑے دھونے، استری کرنے، برتن صفا کرنا اور بہت سارے لوگوں کا کھانا بنانا ابھی سیکھنا باقی تھا، شوکت بیگم کی محنت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ شاید ایک ماں کی ٹھکن کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ”فرض“ کے نام پر وہ کبھی کبھار اپنے نہ حق بحال جاتی ہے جو اس کی اولاد کی طرف سے ملنے چاہیے۔ اور ان میں سب سے بڑا حق عزت کے بعد سکون ہے۔ جو نصیب سے ملتا ہے۔

نہیں سوچا تھا کہ زندگی کی کلیاں پلٹ جانے کی جہاں عروج کو آتا تھا۔ وہاں صفا بیگم ہوگی۔ نہیں شاید وہ صفا کی جگہ پر کسی اور کو لانے کی غلطی کر رہا تھا اس نے رک کر صفا کو دیکھا۔ وہ حسن بیگم اس وقت دنیا کی سب سے حسین لڑکی لگ رہی تھی۔ وہ دھیرے سے مسکرایا۔ اس کی بے چینی، قرار میں بدل گئی، ان نگاہوں کی تپش میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ جسے صفا نے محسوس کرتے ہوئے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اور یہ پھر کبھی نہ لوٹ کر آنے والا لہجہ، ٹھہر گیا۔ وہ نگاہیں جلتی گئی تھیں۔ ارحم کھینچتا ہوا اس کے پاس چلا آیا۔

”ویگم۔“ ”ویگم ان مائی لائف۔“ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ محبت سے چور لہجے میں بولا۔

”ایڈ۔ تھینکس۔ تھینکس میری زندگی میں آنے کے لیے۔ تھینکس۔ میرے کمرے میں بہا لانے کے لیے۔ ایڈ۔ تھینکس۔ مجھے خوش نصیب۔“ وہ شرارت سے مسکراتا ہوا کچھ اور کہنے والا تھا۔ جب صفا نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹایا۔ اس کا چہرہ شرم سے سرخ اور ہاتھوں میں لرزش تھی۔ یہ زندگی کا انجام نہیں ہے۔ شاید ایک کہانی کا ہو سچائی کچھ اور ہے۔

یہ خواب ناک سے منظر!

یہ دفتر بے لمحے
یہ کھٹکتی مسکرائیں
یہ نئی زندگی کی نرم گرم سانسیں
تھوڑی میں دھڑکتی ہیں

ان لمحوں کے قیام کی شاید کوئی حد نہیں۔ نوعیت بدل جائے تو زندگی کا آنے والا ہر لمحہ خوب صورت ہوتا ہے۔ انسان خوابوں کو حقیقت کا پہناوا ہی سمجھتا ہے۔ اب اس پہناوے کے رنگ کیسے ہوں گے، یہ تو مقدر لکھنے والا ہی جانتا ہے۔ اک حقیقت تو یہ بھی تھی۔ کہ شوکت بیگم کی زندگی میں آنے والے مسائل کا سرکل ایسے ہی چلنا چاہتا تھا، تین بیٹیوں کی شادی کے بعد ایک اگلوئی ہو بھی گھر آگئی تھی، زندگی کا



بخشہ احمد

تعلی

خدا جانتا ہے میں نے تیری کوشش کی!
کہ ابن کو معلوم نہ ہونے دوں!
وہ اچھی لڑکی بن جاؤں جو مجھے بڑا تھا
پٹھالوں، محسوس نہ کروں گن کو پتا نہ چل جائے
مگر تیرے اب جان گئے سب!
سو جانے دو۔ جانے دو
اب نہیں دیا سکتی اس کو اندر
جانے دو۔ جانے دو

ماہ کامل کی وہ برقی رات!

کو سارے سفید برف دک رہی ہے
ایک قدم کا نشان تک نہیں ہے
ایک تخیلی کی سلطنت ہے۔
اور یوں لگتا ہے جیسے میں ملک ہوں!
میرے اندر کے طوفان کی طرح باہر کی ہوا بھی غرا
رہی ہے
میں اپنے شر کو اندر نہیں دیا سکتی۔

بیسویں صدی

Downloaded From
Paksociety.com

ہے!
 میں کسی واپس نہیں جاؤں گی، ماضی، ماضی میں رہ گیا۔

جالے دو۔ جالے دو۔
 اور میں انہوں کی تازہ صبح کی طرح
 جالے دو۔ جالے دو۔
 وہ پر لہکتے گرل اب نہیں رہی
 اور یہاں کھڑی ہوں میں دن کی روشنی میں
 طوفان کو یہاں ہونے دو۔
 ٹھنڈے مجھے فرق پڑا، کبھی نہیں!
 Queen Elsa (فونٹ)



صبح نے تیز قدموں سے راہداری عبور کی اور
 اضطراب پہ قابو پاتے ہوئے دو واہ کھولا تو گاڑی اور
 میری خاموش کھڑے نظر آ رہے تھے سجدی کے

مکہ مکملہ تارخان

مڑ جاؤ۔ اور دو واہ نہ دو
 لوگ کیا کہیں گے مجھے پرواہ نہیں
 طوفان کو یہاں ہونے دو
 ٹھنڈے مجھے فرق پڑا، کبھی نہیں!
 عجیب بات ہے کہ مجھے ذرا سے فاصلے سے
 چیزیں چھوٹی دکھائی دینے لگتی ہیں
 اور وہ خوف جو کبھی مجھے گہرے روتا تھا
 اب مجھے چھو بھی نہیں پاتا
 اب یہ دیکھنے کا وقت ہے کہ میں کیا کر سکتی ہوں
 اب اپنی حدود کو آزمانا ہے اور توڑنا ہے
 نہ کوئی صبح نہ کوئی غلط کوئی اصول نہیں میرے

میں ہوں آزاد! جالے دو۔ جالے دو۔
 تم اب مجھے کسی روٹے ہوئے نہیں دیکھو گے
 یہاں کھڑی ہوں میں اور یہیں رہوں گی میں!
 طوفان کو یہاں ہونے دو
 کسی برف سار کی طرح ایک خیال دل میں جم سا جاتا



رہے ہر شے اللٹاوی، بکھرا دی، گمراہ ہر ملی سمنج نہ ملی۔ فصیح، جواہرات کو کل ملا لانا وہاں سے نکل گیا۔ وہ سخت پریشان لگتا تھا۔ کمرے میں وہ تھما رہے تھے تو خاور نے ایک گہری نظر سجدی پہ ڈالی جو پھر سے فرش پہ اکڑوں بیٹھا تھا۔ شل، سناکت، لاش اب وہاں نہیں تھی۔

”شکر کرو، بروقت میری نے وہ پین چھپا دیا۔ ویسے کہاں سے آیا وہ تمہارے پاس؟“
وہ سن نہیں رہا تھا۔ کس ایک ٹکے دیوار کو دیکھ رہا تھا۔

”وہ تم پہ حملہ کرنے آیا، تم نے اسے مار دیا۔ ٹھیک کیا۔ اب ہم زیادہ دن یہاں نہیں رکھیں گے، ماہ کاٹل کی رات قریب آ چکی ہے۔“
اس نے اب بھی کچھ نہیں کہا۔ خاور سر جھٹک کر باہر نکلنے لگا تو وہ بولا۔
”اس کی بھی جیٹی تھی۔“ دھیرے سے کہتے ہوئے اس نے غلطی کھولی۔ ”یہ اس کی جیب میں تھی۔ اس

کی بیوی کی تصویر۔ ساتھ میں ایک بچی بھی ہے۔ دو افراد۔ دو افراد تھے اس کی جیٹی میں۔ میں نے جس کی جان لی وہ ایک سیپ بھی تھا۔“

”وہ ایک قاتل تھا۔“ خاور تاگواری سے بولا۔
”وہ۔ ایک انسان تھا۔“ سجدی نے آنکھیں اس کی طرف موڑیں تو وہ سرخ تھیں، مگر خشک تھیں۔ ان میں اس وقت بہت سے جذبات تھے۔ دکھ، غصہ، احساس جرم، بے بسی۔ اور ان میں اس وقت کچھ بھی نہیں تھا۔

”تو پھر مبارک ہو سجدی پوسٹ، آج سے تم بھی ہم جیسے قاتلوں میں شامل ہو گئے ہو۔“ خاور بگڑ کر کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ سجدی نے زخمی نظروں سے اسے جاتے دیکھا تھا۔ اس کا دل ابھی تک ساؤف تھا۔



میں ایسے جھگڑے میں کھو گیا ہوں
جہاں میرے سوا کوئی نہیں ہے

کمرے کی چوکھٹہ، خاور کھڑا فرش کو دیکھ رہا تھا جہاں بے سادہ گاڑ لیا تھا لٹا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کسی نے بند نہیں کی تھیں۔ وہ ہنوز شاک کے عالم میں معلق ہوئی تھیں۔ ساتھ ہی زمین پہ سجدی اکڑوں بیٹھا تھا۔ کھٹنے سینے سے لگائے، وہ شل سا سامنے خلا میں دیکھ رہا تھا۔ غلطی سختی سے بند تھی۔

”کیا ہوا ہے اوہر؟“ فصیح خود پہ غصہ طاری کرتا، گاڑز کو ہٹاتا چیزی سے اندر داخل ہوا۔ لاش کے قریب قدم روکے۔

”وہ کھانا لے کر اندر گیا۔ پھر کچھ دیر بعد سجدی نے کو اڑی۔ میں انکی توبہ دونوں اسی حالت میں تھے۔ یہ کچھ بتا نہیں رہا تھا تو میں نے خاور کو بلایا۔“ میری جلدی جلدی کرنے لگی۔

گاڑز بھی دم بخود تھے۔ مرنایا مارتا، ان کی جانب میں شامل نہ تھا۔ وہاں کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ ان کا سامھی گاڑز سجدی پوسٹ کو قتل کرنے اندر گیا تھا۔ اور کس نے اسے بھیجا تھا۔

”اس کی موت زہری اور سے ہوئی ہے۔“ بیچوں کے بل لاش کے قریب بیٹھے ہوئے خاور نے خشک لہجے میں اسے مخاطب کیا، مگر فصیح نے جھک کر اس کی نبض چھوئی، گردن پہ ہاتھ رکھا۔ پھر احتیاط سے ہاتھ کی پشت دیکھی۔ وہاں موجود نشان واضح تھا۔ ”کہاں سے آیا زہر تمہارے پاس بولو۔“ اس نے سجدی کو جھٹ کر کھڑا کیا۔ سجدی اب بھی اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں سامنے دیوار پہ جمی تھیں۔ فصیح نے پہلے جہرا ”اس کی غلطی کھولی۔ اندر مڑی تڑی تصویر تھی۔ پھر اس نے اس کی تلاشی لی، جیسیں تھپتھپائیں۔“

”پورا کھو چیک کرو، ایک ایک چیز چھان مارو۔ زہریلا آنجنشن کہاں سے آیا؟ مجھے جواب چاہیے۔ اس کی بھی تلاشی لو۔“ خاور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ گر جا۔ خاور نے اہوا لڑکا کر ہاتھ اٹھادیے۔ گاڑز آندھی طوفان کی طرح کھوٹھٹانے لگے۔ میری وہاں سے ہٹ گئی۔

”قریباً ایک گھنٹہ گاڑز اس کے کمرے کو چھاننے

میری فیس نہیں لوا کی تم نے؟“
 فارس نے کہی سانس لی۔ ”میری دو سری چاہ
 بھی جا چکی ہے، تنی پتی ہی اوا کروں گے۔ کچھ دن کی
 مہلت دے دیجئے۔“ زمر نے بمشکل مسکراہٹ
 دیا۔

”صرف کچھ دن! تنبیہ کی اور پھر حنہ کے
 کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

فارس نیچے آتر آیا۔ ندرت ان کو نارمل دیکھ کر
 واپس کاموں میں لگ گئیں مگر بابا بالکل خاموشی سے
 کچھ سوچتے رہے۔

اس نے حنہ کے کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ بیڈ پر
 کبیل لیے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اچھے بل، سونے
 شکل بالکل حب ہتھنوں۔ جسے لیپ ٹاپ کو دیکھ رہی
 تھی۔ زمر بیڈ کے کنارے آ بیٹھی۔

”سو ہماری اتنے مینوں کی محنت ضائع ہو گئی۔ وہ
 فلیش بے کار ہے۔“

”ہوں۔“ اس کی خاموشی غیر معمولی تھی۔

”ہمیں فارس کو تانا چاہیے۔ پچھلے تین چار ماہ
 فارس کی وجہ سے ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے، مگر اب
 ہمیں سہی کے لیے فوراً کچھ کرنا ہے۔ ہمیں وہ
 فلیش چاہیے حنہ گیا دیکھ رہی ہو؟“

”سیرو کا آن باکس۔ وہ رات علیشا سے بات کرتا
 رہا تھا۔ یاد ہے اس کو ایک دفعہ ایک لڑکی نے پڑایا تھا۔
 ہارون عید کی بیٹی۔ آبدار عید۔ مگر علیشا سے بتا رہی
 ہے کہ اسے ہاسم نے پڑایا تھا۔“ وہ سارا قصہ ستا رہی
 تھی۔ پتھرائی ہوئی نظریں اب بھی اسکریں پہ جھی
 تھیں۔ زمر اس کے ساتھ آ بیٹھی اور غور سے ساری
 گفتگو پڑھنے لگی۔ حنین نے شروع کا پورشن چھپا دیا
 تھا۔ اب زمر کو کیا پتا ہے؟

”کون ہے؟ آبدار عید؟“

حنہ نے ٹوکھل کر کے نتیجے اس کے سامنے رکھ لیا
 کسی سیسی نار میں بسنے والے دھکے مہرا کھڑی تھی۔ سرخ
 اسکارف لیے مگرے آنکھوں والی خوب صورت لڑکی
 جو سفید بیٹھ اور محورے کوٹ میں بلبوس تھی۔ کسی

صبح دھند میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کہیں کوئی مشری کرنا
 زرا دیر کے لیے جھاگتی پھوہند لکوں میں کم ہو جاتی۔
 زمر نے اسٹری مدم (سٹے نئے کمرے) کا دروازہ کھولا
 تو لاؤنج میں معمول کی گھما گھی نظر آئی۔ صداقت ابائی
 وہیل چیئر پر باہر لا رہا تھا۔ حینہ اینڈے چینٹ رہی
 تھی۔ ندرت فرنیچر کو لے کھڑی تھیں۔ سیم یو فارم
 میں بلبوس ناشتے کے لیے وہاں دے رہا تھا۔ ایسے میں
 سب نے سیاہ کوٹ میں بلبوس تراسی زمر کو اسٹری
 سے لٹکتے دیکھا۔ ندرت بالکل گھبر گئیں۔ (ابھی کل ہی
 تو فارس آیا تھا اور۔؟) ابانے بھی چونک کر اسے
 دیکھا۔

”تم۔ اور تمہیں؟“ ندرت نے صداقت کے باہر
 جانے کا انتظار بمشکل کیا اور پھر مجھے بتانے دے سکیں۔ وہ
 جو بیڈروں کی طرف بڑھ رہی تھی، اس نے مڑ کر بنا
 کسی تاثر کے ندرت کو دیکھا۔

”جی ایچھے دیر تک کیس اسٹری کرنا ہوتا ہے۔“
 سادگی سے کہہ کر زمر نے پرچھنے لگی۔ بابا کو بالخصوص

نظر انداز کیا جو بالکل خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔
 زمر عبور کرتے ہوئے اسے اپنی پشت پہ سب کی
 حتیٰ کہ حینہ تک کی نظریں محسوس ہو رہی تھیں۔
 ابھی وہ اوپر پہنچی ہی تھی کہ فارس اور اس کے ساتھ
 کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ باہر نکلا۔ جینز پہ پوری
 اسٹین کا سفید سوئیٹر پہنے، وہ ماہ دم لگ رہا تھا۔ اسے
 دیکھ کر مسکرایا۔

”السلام علیکم۔“ ایسے مسکرا کر بولا کہ وہ نہ چاہتے
 ہوئے بھی مسکرا دی۔ (انہیں اب تک پشت پہ کھڑی
 محسوس ہو رہی تھیں۔)

”وعلیکم السلام۔“ میرے جانے کے خیال سے کتنے
 خوش لگ رہے ہو۔“

وہ ہلکا سا ہنسا اور نفی میں سر ہلایا۔ پھر اس کی تیاری
 دیکھ کر اتھنسا کر گیا۔ ”گورٹ جارہی ہو؟ کیوں؟“
 ”تمہارے کیس کی وجہ سے جتنے لوگوں کے کیسز
 میں نے لٹکائے ہیں تا مکن کو بھی تو دیکھنا ہے اور ہاں۔“

باہر کے ملک کی تصویر تھی۔

”یہ تو۔۔۔ وہ کتنے کتنے چپ ہو گئی۔ اب حنین کو کیا بتائے؟“

”مجھے کئی تو فارسی ہمدرد اور اسلامہ بچن میں گول میز کے گرد نشست کر رہے تھے۔ سیم بولے جا رہا تھا اور فارسی مسکرا کر سن رہا تھا۔ ایسے میں لبا لاؤج کے دوسرے کنارے بیٹھے تھے۔ چپ بالکل چپ۔ زمر نے اپنا کپ لیا اور ان کے ساتھ آئی تھی۔“

”ہم ٹھیک ہیں۔ آپ نے دیکھ تو لیا ہے۔“
قدرے بے نیازی سے شانے اچکا کر کپ لہوں سے لگا لیا۔

لبا نے ان ہی سنجیدہ خاموش نظروں سے زمر کو دیکھا۔ ”میں نے دیکھا ہے۔ تم دونوں نارمل طریقے سے باتیں کر رہے تھے۔ میں جہیں بتاؤں اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب ہے، یہ سب پہلے ان سے چلا آ رہا ہے۔ اب تم لوگ حاوی ہو چکے ہو۔“

ان کے لہجے میں کیا کیا نہیں تھا۔ چائے اس کو اندر تک تیزاب کی طرح چلائی۔ وہ بالکل سن رہ گئی تھی۔ پھر ہنسا کچھ کے باہر نکل گئی۔

”اور اپنے پیڑ پر بیٹھی حنین اسی سطر کو بار بار پڑھے جا رہی تھی جو یہ روئے علیشا سے کہی تھی۔“

”بھائی شادی کر رہا ہے۔ بھائی شادی۔ بھائی۔“
شیخ کی دوا۔ اپنی بچہ کی دوا۔ بھری کھٹا صلوٰۃ سب اس کے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔ اس کی ساری دنیا برف ہو گئی تھی۔



میری کشتی کو بھلا موج ڈبو سکتی تھی؟
میں اگر خود نہ شریک کف دیا ہوتا
قصر کارو اور بھی اس صبح دھند میں ڈوبا ہوا تھا۔ اپنے
کمرے میں سنگھار میز کے سامنے کھڑا ہاشم اپنے
نکس کو دیکھتے ہوئے ”ٹائی کی گرہ لگا رہا تھا۔ چرے یہ
سنجیدگی تھی۔ کیلے بال پیچھے کو برش کیے وہ اب ہنسنے لگا
تھا گویا پچھلے چند ماہ کی بے گسٹری بوجھ سے دھڑلے سے

رہی تھی۔ تب ہی اس کا فون بجلا۔ اس نے سنگھار میز
پر رکھے موبائل کا اسپیکر آن کیا اور کف لنکس
اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”ہاں بولو نسج۔“

”سر۔۔۔ رات میں آپ کا فون آف تھا۔ میں بتا
نہیں سکا۔ سحری نے ایک گارڈ کو قفل کر دیا ہے۔“
کف لنک کو کف۔ پتھری کرتی اس کی انگلیاں ٹھہر
گئیں۔ لہجے بھر کے آجیوہ مجدد ہو گیا۔
”دیکھ لیں؟“

”گارڈ اس کے کمرے میں گیا اور کچھ دیر بعد اس
کی وہاں سے لاش ملی۔ زہر کے انجکشن سے مارا گیا ہے
اسے۔“

”کیسا انجکشن؟“ وہ چونکا۔
”ہم نے بہت ڈھونڈا مگر انجکشن نہیں ملا۔ اس
کے اس سے کچھ بھی نہیں ملا۔“

”نسج! میری بات کن کن کھول کر سنو۔“ وہ بولا تو
آنکھوں میں قصد اور چرے پہ سختی در آئی تھی۔ ”مگر
مجھے کبھی یہ علم ہوا کہ تم خاوریا سحری کو میرے خلاف
۔ کسی بھی طرح۔ استعمال کرنا چاہتے ہو تو میں جو

تمہارے ساتھ کھول گا، وہ تمہاری سات تسلیم یاد
رکھیں گی۔“

”سر! ہم خود شاکنڈ ہیں کہ انجکشن۔۔۔“
”اوہ شٹ اپ! بے وقوف سمجھ رکھا ہے تم نے
مجھے؟“ وہ خرایا۔ ”زہر تم لوگوں کے علاوہ کون دے سکتا
ہے اسے؟“

”سر! آپ تعین کیجئے میں۔۔۔“
”سحری یوسف کبھی کسی کو قتل نہیں کر سکتا۔ مجھے
کیا معلوم اس نے ایسا اپنے بچاؤ میں کیا ہے یا تم اپنے
کیے گئے قتل اس پہ ڈال رہے ہو۔ کل رات سے پہلے
مجھے وہ انجکشن چاہیے۔ ورنہ میں تم سب کو زمین میں
گاڑوں گا۔“

فون بند کیا تو اس کا موڈ سخت خراب تھا۔ اسٹینڈ
سے اٹھا کر کوٹ پہتا اور کینے میں خود کو دیکھتے برہنہ
گردن پہ چمڑ کا تب ہی روانہ ہتا کسی دستک کے کھلا

ہاشم نے ناگواری سے چوکت کو دیکھا۔ وہاں نوشیرواں کھڑا تھا۔ شبِ خرابی کی ٹی شرٹ میں بیوس وہ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھتا چند قدم اندر آیا۔
 ”میں اس وقت بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں“
 ”شیرو!“ وہ مڑ کر مدِ مزاجی سے کتاٹائی پن ٹالی پہ لگانے لگا۔

”وہ کون تھا؟“ وہ اتنی عجیب آواز میں فرمایا کہ ہاشم نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ہاتھ سلو میں پڑیں۔
 ”تمہارے میز رکھ گئے شیرو؟“

”شیرو!“ جواہرات اوپر کسی کام سے آئی تھی۔ کھلا دروازہ دیکھ کر اور شیرو کی آواز سن کر وہ متعجب سی چوکت میں آکھڑی ہوئی۔
 ”وہ لڑکا جس نے مجھے پونہ روشی میں بیٹا تھا وہ کون تھا؟“

ہاشم کے ابو سمجھے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ صرف ٹالی پن کو جوڑتی انگلیاں سختی سے سچھ لیں۔
 ”تم نے مجھے کبھی ایسے کسی لڑکے بارے میں نہیں بتایا۔“

”مگر آپ جانتے تھے“ وہ چلایا۔ ”آپ نے اسے بھیجا تھا مجھے مارنے کیونکہ میں نے آپ کی آواز کو کالری تھیں۔“

”شیرو“ تم سے کس نے کہا ہے یہ؟“ جواہرات محتاط آواز میں کہتی اس کے قریب آئی۔ نوشیرواں نے پلٹ کر صدمے اور دکھ سے اسے دیکھا۔ ”آپ بھی جانتی تھیں۔ آپ بھی اس میں شامل تھیں۔ اور وہ آپ کا شو ہر بھی۔“

”نوشیرواں!“ ہاشم گرجا۔ ”مجھے سے آنکھیں سرخ ہوئیں۔“
 ”میرے اوپر مت چلاؤ۔ نہیں تھا وہ میرا باپ۔ جو ایک بڑے کو دوسرے سے پٹوائے“ وہ میرا باپ نہیں تھا۔“ وہ حلق جما کر چلایا تھا۔
 ”تمہیں کس نے بتایا یہ سب؟“ آئی نے؟“

جواہرات نے اس کا بازو تھامنا چاہا مگر وہ قدم دوڑ رہا تھا۔ ”میرے قریب مت آئیے۔ میں نے اس نے کبھی آپ کو نہیں بتایا اس لڑکے کا“ کیونکہ اس نے میری توہین کی تھی۔ اس نے۔“ جی اس نے مجھے اندر سے تو ڈر کر رکھ دیا تھا۔ اتنے سارے لوگوں کے سامنے اس نے مجھے زینن پہ گرا کر مارا تھا۔ سحری نے مجھے نہیں بچایا۔ میں اتنے سال سحری سے ناراض رہا مگر اس کو آپ ہی نے کتا تھا اور رہنے کے لیے۔“
 ”میں نے اس سے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔“

شیرو نے نمی میں سر ہلایا۔ ”کس منہ سے آپ لوگ مجھے الزام دیتے ہیں کہ میں نے اپنے آپ کو اغوا کر کے آپ کو دھوکا دیا۔ میں نے دھوکا دیا؟ شروع تو آپ۔ آپ سب نے کیا تھا۔“ اس کی سرخ آنکھوں میں پانی تھا اور وہ غصے سے کلن رہا تھا۔
 ”میں تمہاری حفاظت کر رہا تھا نوشیرواں۔ اور پچھلے کئی ماہ سے میں تمہاری غلطیوں کو ہی سنبھال رہا ہوں۔ سحری نے رات ایک گارڈ کو قتل کر دیا ہے۔ اب مجھے اس کو بھی سنبھالنا ہے۔ (جواہرات کی گردن میں گھٹی سی ڈوب کر ابھری مگر چہرے پر درد آیا تعجب مصنوعی تھا۔ اسے خبر مل چکی تھی۔) تمہارے پیچھے میں کتنا خوار ہوا ہوں! اندازہ ہے تمہیں؟“ وہ ڈنٹ کر بولا۔

”آپ ہمیشہ اپنا دفاع دوسرے سے چڑھائی کر کے کرتے ہیں۔ جیسے ہر دفعہ میری فلتگی ہو۔ مگر اب نہیں۔“
 ”شیرو“ ڈیڈ نے ایک دفعہ مجھے بھی پوچھ لیا۔
 ”بہن کر دیں میرے ساتھ جموٹ بولنا۔“ وہ چیخا۔
 ”اسی طرح۔ اسی طرح ڈنر ٹیبل پہ بیٹھ کر تھار کے خاندان کو اپنے پاس کھانے پہ بلا کر آپ دونوں ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جموٹ بولتے ہیں۔“
 ہاشم کا ہاتھ بے اختیار اٹھا مگر اس سے قبل کہ وہ نوشیرواں کے چہرے پہ طمانچہ رسید کرنا شیرو نے ایک

جواہرات نے اس کا بازو تھامنا چاہا مگر وہ قدم دوڑ رہا تھا۔ ”میرے قریب مت آئیے۔ میں نے اس نے کبھی آپ کو نہیں بتایا اس لڑکے کا“ کیونکہ اس نے میری توہین کی تھی۔ اس نے۔“ جی اس نے مجھے اندر سے تو ڈر کر رکھ دیا تھا۔ اتنے سارے لوگوں کے سامنے اس نے مجھے زینن پہ گرا کر مارا تھا۔ سحری نے مجھے نہیں بچایا۔ میں اتنے سال سحری سے ناراض رہا مگر اس کو آپ ہی نے کتا تھا اور رہنے کے لیے۔“
 ”میں نے اس سے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔“

شیرو نے نمی میں سر ہلایا۔ ”کس منہ سے آپ لوگ مجھے الزام دیتے ہیں کہ میں نے اپنے آپ کو اغوا کر کے آپ کو دھوکا دیا۔ میں نے دھوکا دیا؟ شروع تو آپ۔ آپ سب نے کیا تھا۔“ اس کی سرخ آنکھوں میں پانی تھا اور وہ غصے سے کلن رہا تھا۔
 ”میں تمہاری حفاظت کر رہا تھا نوشیرواں۔ اور پچھلے کئی ماہ سے میں تمہاری غلطیوں کو ہی سنبھال رہا ہوں۔ سحری نے رات ایک گارڈ کو قتل کر دیا ہے۔ اب مجھے اس کو بھی سنبھالنا ہے۔ (جواہرات کی گردن میں گھٹی سی ڈوب کر ابھری مگر چہرے پر درد آیا تعجب مصنوعی تھا۔ اسے خبر مل چکی تھی۔) تمہارے پیچھے میں کتنا خوار ہوا ہوں! اندازہ ہے تمہیں؟“ وہ ڈنٹ کر بولا۔

”آپ ہمیشہ اپنا دفاع دوسرے سے چڑھائی کر کے کرتے ہیں۔ جیسے ہر دفعہ میری فلتگی ہو۔ مگر اب نہیں۔“
 ”شیرو“ ڈیڈ نے ایک دفعہ مجھے بھی پوچھ لیا۔
 ”بہن کر دیں میرے ساتھ جموٹ بولنا۔“ وہ چیخا۔
 ”اسی طرح۔ اسی طرح ڈنر ٹیبل پہ بیٹھ کر تھار کے خاندان کو اپنے پاس کھانے پہ بلا کر آپ دونوں ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جموٹ بولتے ہیں۔“
 ہاشم کا ہاتھ بے اختیار اٹھا مگر اس سے قبل کہ وہ نوشیرواں کے چہرے پہ طمانچہ رسید کرنا شیرو نے ایک

جواہرات نے اس کا بازو تھامنا چاہا مگر وہ قدم دوڑ رہا تھا۔ ”میرے قریب مت آئیے۔ میں نے اس نے کبھی آپ کو نہیں بتایا اس لڑکے کا“ کیونکہ اس نے میری توہین کی تھی۔ اس نے۔“ جی اس نے مجھے اندر سے تو ڈر کر رکھ دیا تھا۔ اتنے سارے لوگوں کے سامنے اس نے مجھے زینن پہ گرا کر مارا تھا۔ سحری نے مجھے نہیں بچایا۔ میں اتنے سال سحری سے ناراض رہا مگر اس کو آپ ہی نے کتا تھا اور رہنے کے لیے۔“
 ”میں نے اس سے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔“

اندرا ہر ہر جگہ ایک ہی منظر چھایا تھا۔ دو آنکھوں کی
بجٹی جوت۔ دو پتی سے اندھیرا۔ اس نے کبھی کسی
کو اپنے سامنے مرتے نہیں دیکھا تھا اور جس کو دیکھا تھا
میں اب وہی یاد رہا تھا۔

میری نے سنہری پتلیں سے میز بچھایا تو وہ چونکا۔
”اسے سنبھال کر رکھو۔ یہ وہ آخری فیور تھا جو میں
نے تمہیں دیا سہدی!“ وہ برہمی سے بولی۔
سہدی نے خلی خالی نظروں سے اس قلم کو دیکھا۔
”میں نے ایک انسان کی جان لی ہے!“
”اتنا آپ پیٹ مت ہو۔“ وہ نرم بڑی۔ ”تم نے جو
کیا سیلف ڈینس میں کیا۔ سیلف ڈینس ہر انسان کا
حق ہوتا ہے۔“

”ہاں میری اونچو۔“ وہ تنگی سے مسکرایا۔ ”اللہ
گارٹی دیتا ہے کہ سیلف ڈینس میں کیے جانے والے
قلب یہ گناہ نہیں ہے۔ قانون گارٹی دیتا ہے کہ سیلف
ڈینس جرم نہیں ہے۔ مگر کوئی یہ گارٹی نہیں دیتا کہ
اس کا ”غم“ نہیں ہو گا۔ جب انسان کسی کو قتل کرتا
ہے تو اس کا ایک حصہ مرتے والے کے ساتھ مرجانا
ہے۔ وہ حصہ سبھی داپس نہیں آتا میری! چاہے وہ قتل
ناحق ہو، قتل خطا ہو یا قتل دفاع ذات۔ قتل کا غم بہت
بھاری ہوتا ہے۔“ اس نے ادا سی سے کہتے ہوئے

رجسٹر بند کر دیا۔ پھر گری سانس لی اور مڑ کر اسے دیکھا
جو بیڈ شیٹ تبدیل رہی تھی۔

”بہر بہت جلد یہاں سے نکل جائیں گے میری یہ
سب ڈرامے ہو جائے گا۔ تمہاری قید۔ تمہاری اذیت۔“
وہ تسلی دینے والے انداز میں نکلن سے کہہ رہا تھا۔
”تم آزاد ہو گی اور اسے ملک جاسکوگی۔ اپنے بیٹے کے
ساتھ ایک پرسکون زندگی گزار سکو گی۔ کاروبار زور لین
کی محلاتی سازشوں سے دور۔ تم اپنی پھولوں سی دنیا میں
واپس چلی جاؤ گی۔“

”چھوٹی سی دنیا کی بات کس نے کہی؟“ اس کے
الفاظ یہ سہدی جو داپس پلٹنے لگا تھا چونک کر دوبارہ سے
اسے دیکھنے لگا۔

چمکنے سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
”مجھے دوبارہ مارنے کی کٹلی مت کرنا ہاشم کاروار۔“
اس کی کلائی کو جھٹکا دے کر نیچے گرایا۔ ہاشم
نجدہ کیل با نکلن۔
”شیرو!“ جواہر ات نے ششدر سی بمشکل آواز
نکللی۔

وہ اسے گھورتے ہوئے غرایا۔ ”میرا نام تو شیرواں
ہے۔“ اور سامنے رکھے کوٹ اسٹینڈ کو ٹھوکر ماری وہ
دیوار کی طرف لڑھک کتنی ہی چیزیں گریں۔ اور
تو شیرواں غصے سے کانپتا، ہانپتا، دروازہ دھاڑ سے بند
کر کے باہر چاچا تھا۔

چند لمحے وہاں سناٹا چھایا رہا۔ پھر جواہر ات ہاشم کی
طرف بڑھی۔ ”میں وہ غصے میں ہے ڈر اور میں۔“
”مجھے آگیا چھوڑ دوں گی۔“ وہ آگینے کی طرف مڑ
گیا اور گھڑی اٹھا کر کھولنے لگا۔ چھو پات اور سخت ہو
چکا تھا۔
”ہاشم!“

”کوٹ، می! ہاؤ!“ وہ دھاڑا۔ جواہر ات بے بسی
سے وہاں سے نکل آئی۔ اس کی رنگت سفید بڑھی
تھی اور آنکھوں کی جوت بجھی بجھی سی تھی۔ ایک
کینہ تو نظر اس نے اس دیوار پہ ڈالی جس کے پار
انکی تھی۔

فارس بخاری جب بھی داپس آتا تھا ان کی زندگیوں
یوں ہی خراب ہونے لگتی تھیں۔ کل وہ آیا اور آج بھی
ان کے قصہ میں نخواست آئی۔ اب وہ کیسے اپنے دونوں
بیٹوں کو جوڑائے گی؟



وہ جو پہچان میرے اخلاص کی تھی
چھین کر لے گئے احباب وہ چرو میرا
وہ کلتھ سامنے پھیلانے بے توجہی سے انہیں دیکھ
رہا تھا۔ سامنے بند قرآن مجید رکھا تھا۔ اس کا کھلا قلم
خنگ ہو رہا تھا مگر صفحہ قرطاس ابھی تک خالی تھا۔ لکھ
نہیں پڑھا تھا۔ وہ اب لکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ ذہن کے

میری نے چار بجشکی اور گھوم کر سڑک کی جانب موڑا۔



مجھے جو بھی دشمن جاں ملا وہی پختہ کار جفا ملا نہ کسی کی ضرب غلط پڑی نہ کسی کا تیر خطا ہوا وہ گھر آئی تو انیسویں کی طرف چلتے مسز جو اہرات کے کمرے کے پچھلے برآمدے پر نظر پڑی۔ جو اہرات وہاں اسی سرخ اسکارف والی لڑکی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ زمر نے ایک خاموش نظر اس پہ ڈالی اور اپنے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ دروازہ کھولا تو حسین لڑکی کا پردہ ہٹا کر ٹیکسی نظروں سے باہر جھانک رہی تھی۔ زمر اس کے ساتھ آگڑی ہوئی۔

”تمہیں کس نے کہا کہ مجھے میری چھوٹی دنیا واپس چاہیے؟ چھوٹی دنیا میں تو میں پہلے بھی گئی۔ جانتے ہو قلیائن کیا ہے؟ میرا سارا ملک کیا ہے؟ لکڑی کے بنے چھوٹے چھوٹے گھر کیسے ہوتے ہیں؟ سارا دن ساری رات کتلی کی طرح کام کرتی رہتی تھی۔ دو وقت کی روٹی جتنے پیسے نہیں دین پاتے۔ جانتے ہو جب سیلاب آتا ہے وہاں تو کیسے گھر نکالوں کی طرح رہتے ہیں؟ جانتے ہو کتنا مشکل ہوتا ہے اپنے ملک کو چھوڑنا اور غیر ملک میں لوکری کے لیے جانا مگر ہم قلیائن کی عورتیں جاتی ہیں دوسرے ملکوں میں۔ کیونکہ بادشاہوں کے ظلام خود بہت سوں کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ کس نے کہا تم سے کہ مجھے اپنی چھوٹی سی دنیا پر سکون زندگی اور بے فکر ضمیر واپس چاہیے؟ مجھے اپنی جاں واپس چاہیے تھی، سعدی یوسف! مجھے اپنا مقام واپس چاہیے تھا۔ میں۔ اس محل کی۔ ملکہ تھی۔ وہاں میرا حکم چلنا تھا۔ میری اتھالی تھی۔ قلیائن کی بھوک اور غربت خوف اور ظلم میں اپنے بچے کو بڑا کرتے ہیں نے ایک ہی خواب دیکھا تھا۔ پیسے کا اونچے محل کا۔ میں تمہارا ساتھ اس لیے دیتی رہی کیونکہ تم نے مجھے میری پوزیشن واپس دلانے کی امید دلائی تھی۔ تمہارے ساتھ بھاگنے کا مطلب ہے میں نا عمر مقفور رہوں گی۔“

”یہ فارس سے ملنے کوڑا آئی تھی۔ فارس نے کہا یہ اس کی کرمل فریڈ ہے۔“
حسین کے ابو سمجھے خنگی سے باہر بیٹھی لڑکی کو دیکھا۔ ”آئی ڈونٹ لائیک ہر۔“

”یہ اس کی کرمل فریڈ ہے۔“
حسین کے ابو سمجھے خنگی سے باہر بیٹھی لڑکی کو دیکھا۔ ”آئی ڈونٹ لائیک ہر۔“

”ہی ٹو۔“ زمر کے لبوں سے نکلا۔
”ہی تھری!“ اسلمہ پیچھے آگڑا ہوا تھا۔ وہ دونوں پائیس۔

”ہی ٹو۔“ زمر کے لبوں سے نکلا۔
”ہی تھری!“ اسلمہ پیچھے آگڑا ہوا تھا۔ وہ دونوں پائیس۔

”تمہیں کیا مسئلہ ہے اس سے؟“
”مجھے ایسی خوب صورت لڑکی پسند نہیں جو قد اور عمر میں مجھ سے بڑی ہو۔“ چمک کر کتا اندر بھاگ گیا۔

”تمہیں کیا مسئلہ ہے اس سے؟“
”مجھے ایسی خوب صورت لڑکی پسند نہیں جو قد اور عمر میں مجھ سے بڑی ہو۔“ چمک کر کتا اندر بھاگ گیا۔

زمر اور حسین نے ایک دوسرے کو دیکھا۔
”ابھی خبر لیتی ہوں میں اس کی۔“ حسندانت بدستی اس کے پیچھے لگی۔ زمر مسکرا دی۔ سعدی۔ وہ کچھ کچھ سعدی کی طرح ہوتا جا رہا تھا۔

زمر اور حسین نے ایک دوسرے کو دیکھا۔
”ابھی خبر لیتی ہوں میں اس کی۔“ حسندانت بدستی اس کے پیچھے لگی۔ زمر مسکرا دی۔ سعدی۔ وہ کچھ کچھ سعدی کی طرح ہوتا جا رہا تھا۔

سبز زار کے اس طرف۔ برآمدے میں بیٹھی آبدار نے جانے کا کپ لیوں سے لگا کر ٹھٹھایا اور سوچتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ”یہ کون تھی؟“

سبز زار کے اس طرف۔ برآمدے میں بیٹھی آبدار نے جانے کا کپ لیوں سے لگا کر ٹھٹھایا اور سوچتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ”یہ کون تھی؟“

”یہ اورنگ زیب کے بھانجے فارس کی بیوی ہے۔“
آئی کے دل کو کچھ ہوا مگر سنبھل کر بیٹھی رہی۔
”تو کھنے میں بس ٹھیک ہے۔ فارس زیادہ اچھا ہے۔ ہمارے گھر آیا تھا تو میں نے دیکھا تھا۔ پسند کی شادی

”ہم جمعرات کی رات یہاں سے بھاگ رہے ہیں۔ خاور میرے کمرے میں آئے گا اور ہم مل کر گاؤں پہ حملہ کریں گے۔ اگر تم نے چلنا ہو تو تیار رہو۔“ سنجیدہ لہجہ تھا۔ اور دونوں کا انداز تھا اس کا۔
میری عجیب سی کیفیات میں گھری اس کو دیکھتی رہی۔ پھر دروازہ زور سے بند کر کے باہر نکل گئی۔ وہ فیصلہ کر

تھی کیا؟ سرسری سا پوچھا۔

جواہرات نے ہنس کر سر جھٹکا۔ ”میرج آف convenience (کنویجینسی شادی) ہے۔ طلاق ہونے والی ہے۔ چھ دن کا مکمل ہے۔“

کلی سن رہ گئی۔ پھر۔۔۔ بظاہر بہت سنبھلے انداز میں پوچھا۔ ”کیا واقعی؟“

”یہ لڑکی اس سے نفرت کرتی ہے، انتقام کے لیے شادی کی تھی۔ آئے دن جھگڑے ہوتے ہیں۔ اب بھی اس کا پس اس لیے لڑ رہی تھی مگر اس کو پھینکنا سکے مگر شش۔۔۔ یہ راز ہے۔“ آخر میں رازداری سے آواز دھکی کی اور اس پر پڑی۔

”اوہ۔۔۔ اس کا مطلب ہے کہ۔۔۔ یہ شادی ختم ہونے والی ہے؟“ آبدار کی آنکھوں میں خوشگوار سی حیرت چمکنے لگی تھی۔

”بالکل۔ اچھا تو تم کہہ رہی تھیں کہ شہر سے تمہاری کوئی بات نہیں ہوئی اس حوالے سے؟“ جواہرات وہ بات کہہ رہے تھے کہ لڑکی جس کے لیے اس نے کئی کئی بولیا تھا اور کئی مسکراتے ہوئے بظاہر سن رہی تھی۔ مگر اس کا دلغ نہیں اور تھا۔ شاید دل بھی۔

”شادی کروا کر آئی؟“ آخر میں جواہرات نے کہا تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا اور نرمی سے کہنے لگی۔

”شادی زندگی کا سب سے بڑا جوا ہوتا ہے، آئی! وہیں کھیلتا چاہیے جہاں بدل جاتا ہو۔“

”تو دل کہاں آتا ہے تمہارا؟“

”دل۔۔۔“ وہ پھر مسکرائی۔ اس مسکراہٹ میں غلوں بھی تھا، سلوگی اور مصومیت بھی۔ ”بس کوئی ایسا ہو جو نڈر ہو، بہادر ہو۔ جس کو حامل تنہیم کو hypnotize (پھینکا نائز) کرنا آتا ہو۔ جس کے لیے میں بڑے سے بڑا غلو لینے کو تیار ہو جاؤں، بدلے میں صرف ایک کپ چائے کے لیے، جس کا ایک فقرو دو سروں کی تقریروں پر بھاری ہو۔ وہ بولے تو سب سنیں۔ وہ خاموش ہو جائے تو اس کی خاموشی بھی بولے۔“ پھر ذرا مزید سنبھل کر بولی۔ ”اور جس دن ایسا

کوئی مل گیا تو اس پر لگا unavailable کا ٹیک بھی available میں بدل دلوں گی۔“

جواہرات کو اس کی باتوں نے چونکا دیا تھا۔ وہ ایسی ہی باتیں کیا کرتی تھی۔ پھر وہ اٹھ گئی تو جواہرات بھی اندر چلی گئی۔ اوپر پوچھوں پر ہاتھ پھیلتی، مدغم آواز میں خود سے باتیں کرتی، ابرائی لڑکی اور جاری تھی۔ سرسری سے اس کی ناک سے سرخ پڑ رہی تھی مگر سرسری آنکھوں میں بے پناہ خوشی بھری چمک تھی۔ تب ہی وہ رکی۔ سامنے فارس کار سے نکل رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ وہ نہیں مسکرایا۔ وہ محض تھا۔

”ہیلو۔“ وہ اس کے قریب آ کر۔۔۔ فارس نے سر کے خم سے جواب دیا۔ وہ ہر کا وقت تھا۔ انیسویں اور قصر کی ہر کھڑکی سے یہ منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔

”آپ کے اوپر میرا ایک ادھار ہے۔“

”چائے؟“ اس نے ٹیک لٹھلی استفسار کیا۔

”جی ہاں۔ مشر ایڈ مسز فارس عازمی میرے اور پاپا کے ساتھ چائے پیئیں گے۔ وقت اور جگہ میں ٹیکٹ کروں گی۔“

”آپ کے پاس میرا نمبر ہے؟“ فارس کار لاک کرتے ہوئے بولا۔

”آپ کے پاس میرا ہے۔ مجھے ٹیکٹ کریں گے تو میں محفوظ کروں گی۔“ وہ مسکرائی تھی۔ فارس نے کار لاک کرتے ہوئے سر کو خم دیا۔

”ایک بڑی خبر بھی ہے۔“ وہ ذرا ٹھہری۔ ”اس نے آپ کا بیجا ہوا ختم استعمال کر لیا ہے۔ کل رات ایک گارڈ اپنی جان سے گیا ہے۔ اوکے پھر جلد ملاقات ہوگی چائے۔“ وہ برابر سے نکل کر چلی گئی۔ لاؤنج کی کھڑکی سے دیکھتی جواہرات نے اس سرسری ملاقات کو علیحدہ علیحدہ سے یاد کیا۔ نہ سمجھا اور ذمہ نے ناک سیدھ کر پڑھا۔ پس گرا دیا۔

مگر ایک وہی تھا جو چالی ہی ہول میں لگائے، وہیں ٹھہر گیا تھا۔ منجھ، ہشل، ششدر۔ پورے جسم کو کسی نے برف کے ڈبیر میں ڈال دیا تھا۔ سفید پڑے چہرے

کے ساتھ اس نے بدقت تمام کارلاک کی گوری پھر قدم اٹھاتا۔ ہماری قدم اٹھاتا۔ اکیسی کی طرف بڑھنے لگا۔

سہری؟ قتل؟ اس کا پورا جسم سنسناتا تھا۔



تجھ کھل جاتی مری روح کی تمہاری بھی میری آنکھوں میں بھی جھانک کے دیکھا ہوتا قریباً پونے چھ برس قبل وہ واقعہ ہوا تھا جب اس نے اپنی زندگی کی ترجیحات طے کر رکھی تھیں اور اس لحاظ سے ڈمر کے پینوروشی چھوڑنے کے سال بعد اس نے ندرت سے کہا تھا کہ وہ ڈمر کے لیے رشتہ بھیج دیں۔

ان دو سالوں میں متعدد بار اس کے ذہن میں یہ خیال کیا کہ کہیں اس کے والدین اس کی کہیں اور شادی نہ کر دیں، مگر اتنا تو وہ جان گیا تھا کہ وہ چلے وہ وہ کے بڑے تجربے کے بعد پونے کسی کو بھی اپنی بیٹی نہ دیں گے، خود کرنے میں یا ہل کرنے میں بھی مینے لگا نہیں گے اور اس کی لاعلمی میں یہ سب ہو جائے یہ ناممکن تھا اسے خبر ہی چلتی تھی۔

ندرت اس کی دلچسپی کا سن کر پہلے خوش ہوئیں پھر خاموش۔ وہ ان کی آنکھیں بڑھ سکتا تھا۔ وہ سوال نہیں لیتے برسوں کے باخوشگوار تعلقات کے بعد ان کو اپنی ساس سے امید نہیں تھی کہ وہ ان کے بھائی کو

اپنی بیٹی کا ہاتھ تمہاری ہی۔ خود فانس کو اگر اپنے بارے میں کوئی خوش قسمتی نہ تھی تو کوئی احساس کمتری بھی نہ تھا۔ گو کہ اس نے ہمیشہ ڈمر کی عزت کی۔ احترام کیا۔ اسے خود سے برتر سمجھا مگر اس نے بھی خود کو کمتر نہیں سمجھا تھا۔ جس ساہ زندگی کی خواہش اسے تھی اس میں ان پھیر گئیوں کی جگہ نہیں تھی۔

رشتہ بھجوانے کے چند روز بعد وہ آفس میں تھا جب جنین کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ ڈمر اس سے ملنا چاہتی ہے، کوئی بات کہنا چاہتی ہے۔ وہ یوں ایک ہلکے سے

پہلے جانے کے حق میں نہیں تھا، مگر اسے انکار کرنا بھی اچھا نہیں لگا۔ وہ حسد سے گھر آیا اسے امید تھی کہ ڈمر اس کے رشتے کے حوالے سے بات کرنا چاہے گی۔ اسے دو ٹوک انداز میں، سمجھ واری کے ساتھ ترجیحات گوری تو تھا تھا واضح کر کے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ اس پر یونزل سے ان جان لگ رہی تھی۔

وہ تو اپنی ناک میں پتی اس لوٹک سے بھی ان جان لگتی تھی۔ کچھ روز قبل وہ ایک چیلر کے پاس کسی تکنیش کے سلسلے میں گیا تو اسے شوکیس میں تھی یہ ڈائمنڈ ڈیزائن اتنی خوب صورت لگی کہ وہ لے لے بغیر نہ رہ سکا۔ صحیح وقت اپنا نام اس لیے نہیں لکھا کہ کسی اور کے ہاتھ لگ گئی تو تماشائین بن جائے۔

اس کو وہ پہنے دیکھ کر دل میں جہاں خوشگوار احساس اترتا وہاں مایوسی بھی ہوتی۔ وہ اس کی لکھائی نہیں پہچان سکی تھی۔ اس نے ایک سال تک پڑھا تھا وہ اس سے کبھی تو ٹوٹ کی ہو گی اس نے فانس کی لکھائی۔ مگر وہ ٹوٹ نہیں کر سکی اور پھر جب وہ اپنے عہدے پہ آئی، اس کے سامنے صوفے پہ بیٹھے وہ اپنا مسئلہ بتانے لگی تو فانس غازی کے دل میں مزید مایوسی اترتی گئی۔ وہ کسی طرز کے بھائی کی ہر اس منٹ کی وجہ سے پریشان تھی۔ یہ اچھا تھا کہ ایک قریبی مور رشتے دار ہونے کے باعث اس نے فانس پہ محمودہ کیا اور اس کو اپنا مسئلہ بتایا مگر اب اچھا نہ تھا۔ وہ مدد کی ہائی بھر کہہاں سے اٹھ گیا۔ مگر دل میں ایک عجیب سا احساس بڑھنے لگا۔ وہ جانتی تھی اور جان کر ان جان بنتے ہوئے اس کو آنا

رہی تھی؟ یا وہ جانتی ہی نہیں تھی؟ مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کو رشتہ دینے سے تنہا گزر چکے ہوں اور ڈمر کے والدین جو ہر بات میں اس کی رائے مانگا کرتے تھے اس کو خبر ہی نہ کریں۔

اگلی دفعہ جب وہ ندرت کے پاس گیا تو ان سے کہا کہ وہ ڈمر کی والدہ سے پوچھیں۔ ہاں تو ہاں، ہاں تو ہاں۔ ندرت نے ایسا ہی کیا اور اپنی ساس کا جواب سن کر ان کے اندر تک خاموشی چھا گئی۔ ڈمر نے انکار کیا ہے اور

سے میل ملاپ چھوڑ دیا۔ زمر کی امی کی فتنہ ہوئی تو وہ گیا ضرور بلکہ دو چار دفعہ گیا، مگر کوشش کی کہ زمر سے سامنا نہ ہو۔ نگاہ جھکنے کی تو دل جھکنے کا، مگر چونکہ نیت صاف تھی اس لیے اس کا دل پر سکون ہو گیا۔

اس نے زمر کو چھوڑ دیا۔ اس سے دستبردار ہو گیا اور خود کو ایک نئے انسان کی زندگی میں شامل ہونے کے لیے تیار کر لیا۔

وہ شادی سے پہلے ذر تاشہ سے صرف ایک دفعہ ملا تھا۔ وہ اس کے ابو کے رشتہ دار کی بیٹی تھی۔ ایم ایس سی سائیکولوجی کر رکھا تھا اور دل سے آرٹس تھی۔ رنگت خاصی گوری اور شو لڈز کٹ بل بے حد سیاہ تھے۔ وہ خوب صورت بھی تھی اور طبیعت کی بھی اچھی تھی۔

ذر تاشہ ذرا بچکانہ ڈراما جلد باز ڈراما فخری ضرور تھی، لیکن یہ سارے عناصر اس میں ذرا ذرا سے تھے۔ ان کو چھوڑ کر اس میں ڈیجیٹل ساری محبت، ڈیجیٹل سارا غلطی اور ڈیجیٹل ساری خوش مزاجی بھری تھی۔ شادی سے پہلے اس نے فارس کے سامنے صرف دو شرطیں رکھی تھیں۔

میرے لیے ایس کے مگر مجھ سے نہیں ایس کے اگر میں بھی جا ب کرنا چاہوں تو مجھے منع نہیں کریں گے۔

اس نے دو سری شرط مان لی تھی اور پہلی کو حالات اور خود ذر تاشہ کے دہنے سے مشروط کر دی تھی۔ البتہ دل میں وہ بے حد محظوظ ہوا تھا۔ ذر تاشہ میں ویسے تو ہر بات زمر سے مختلف تھی، مگر ایک بات جو اس میں اور زمر میں زنن آمان جتنا فرق کرتی تھی وہ

ساواگی تھی۔ زمر ساوا نہیں تھی، اور ذر تاشہ کی اس معصومیت بھری ساواگی (جو بہت سے لوگوں کو اس کا بچکانہ پن اور جذباتیت لگا کرتی تھی) نے فارس کے دل سے پہلی محبت کو قربان ختم کر دیا تھا۔ زمر یوسف کہیں بہت پیچھے رہ گئی تھی اور جس دن وہ ذر تاشہ سلیم سے ذر تاشہ غازی بن کر اس کی زندگی میں آئی تھی پہلی

کتنی ہے کہ وہ فارس جیسے غصہ ور اور ہٹا نہیں کیا کیا آدمی کے ساتھ گزارا نہیں کر سکتی؟ سوسلی؟ وہ بچہ تو نہیں تھا کہ اس بات پر یقین کر لیتا۔ دو دن پہلے تنگ زمر اس سے مدعا مانگ رہی تھی اور اب اس کو یہ سب کے گی؟ صاف ظاہر تھا، زمر کی امی نے ندرت سے ساری زندگی کے حساب چمکا کیے تھے۔ بیٹی سے پوچھے یا شاید بتائے ہی بغیر انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ ندرت دو بار بات کرنے کے حق میں تھیں مگر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ عزت اور غیرت سب میں ہوتی ہے۔ ان کے سامنے محبت پیچھے رہ جاتی ہے۔ اس میں بھی اتنی غیرت تو تھی کہ اگر ایک دفعہ اتنا صاف جواب مل گیا ہے تو وہ اس خاندان سے دوبارہ سوال نہیں کرے گا۔ وہ اس سے برتر تھی، مگر وہ اس سے کم تر نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا جن ندرت کی بات سن رہی تھی اور وہ جانتا تھا کہ وہ سوچ رہی ہوگی، ماسوں نے اتنی جلدی پارہن لی، مگر یہ پارحیت کی بات نہیں تھی۔ عزت اور غیرت کی بات تھی۔ عزت وار لوگ خاموشی اور وقار سے راستہ بدل لیتے ہیں۔ اس نے بھی یہی کیا۔

فارس کو سات سو سال قبل کی ابن تیم کی کھسی کتب بڑھنے کی ضرورت نہ تھی یہ جاننے کے لیے کہ مرض عشق کی دوا کیا ہے؟ ایک سمجھ دار اور پریکٹیکل آدمی ہونے کی حیثیت سے اتنا تو اسے معلوم ہی تھا کہ یہ عشق وغیرہ ٹھیک ہو جاتا ہے وقت کے ساتھ۔ اگر انسان اس گل جانا چھوڑ دے، اس شخص سے ملنا اور اسے دیکھنا چھوڑ دے (شخص بصر) اور خود کو کہیں اور مصروف کر لے۔ زندگی میں کوئی نیا رشتہ آجائے، ایک

اچھی بیوی ہو تو پرانی محبت یا دہلے رہ جائے، تکلیف نہیں رہتی۔ مگر یہ سب صرف تب ہو سکتا ہے جب انسان کی نیت صاف ہو، اور ارادہ ”آگے بڑھ جائے“ کا ہو۔ جو لوگ مرض عشق سے شفا یاب نہیں ہو پاتے، ان کی دوا اصل ”نیت“ نہیں ہوتی۔ محبوب کی یاد کے ”نشے“ سے نکلنے کی۔

اور فارس نیت کر چکا تھا۔ اس نے زمر کے خاندان

دلچسپ یہ ہوا کہ فارس کے ذہن میں زمر کا خیال آنا بھی
ختم ہونا گیا۔
پہلی دفعہ وہ زمر کو بھولنے لگا تھا۔ عارضی طور پر ہی
سی۔



ہم کریں بات دلیلوں سے تو رو ہوتی ہے
اس کے ہونٹوں کی خموشی بھی سند ہوتی ہے
مگر اس وقت وہ لاؤنج میں خاموش بیٹھا، زور ناکہ
کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔ نگاہیں کسی غیر مرئی
نقطے پر جمائے، وہ دور کہیں کم تھا۔ پریشان بھی تھا اور
فکر مند بھی۔ ذہن میں صرف سہری کا خیال چکر کاٹ
رہا تھا۔ یہ یقین تھا کہ وہ شام کے اس محفوظے ختم ہو
چکا تھا اور چھٹلے کچھ دنوں سے کوئی رات ایسی نہیں گزر
رہی تھی جب سہری کے زندہ بیچ جانے کی امید نہ لٹی
ہو۔

فارس نے آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگا۔ وہ
شدید پریشانی کے باوجود گھر میں کسی سے یہ مسئلہ شیئر
نہیں کر سکتا تھا۔ پچھلے دس ماہ سے وہ جس جگہ کی
تجارتی کر رہا تھا، وہ قریب آج بھی تھی مگر اسے اس سے
پہلے ایک کام کرنا تھا۔

اس نے آنکھیں کھولیں اور دوسرا دیکھا۔
ندرت استری والے کپڑے الگ رکھ رہی تھیں، الیا
اخبار پڑھ رہے تھے۔ حین خاموش سی کونے میں بیٹھی
تھی۔ زمر کچن میں کھڑی چائے بنا رہی تھی۔ سیمپلی وی
کے آگے جم کر بیٹھا تھا۔

”ابا۔۔۔“ اس نے سنجیدگی سے پکارا۔ آواز اتنی تھی
کہ ہر کوئی چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ ”میں نے آپ

کے ریسٹورنٹ سے پانچ مہف کی ڈرا سو۔ ایک اچھا گھر
دھونڈا ہے، کافی بڑا ہے اور قیمت بھی اچھی ہے۔“

سب مگر گراس کا چہرہ دیکھنے لگے۔
”یعنی کو ہمیں وہاں شفٹ ہونا ہے۔ آپ لوگ
پینٹنگ کر لیں۔“ وہ موبائل نکالا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

ایک حیرت بھرے سناتے میں سب نے ایک
دوسرے کو دیکھا۔ زمر بھی کچھ نہ بول سکی حین الگ
شل۔ ندرت کو ہی ہوش آیا۔
”اور یہ گھر؟“

”میں اسے بیچ رہا ہوں۔“
”مگر کیوں؟“ ایلے نے اچھٹے سے پوچھا تھا۔
”کیونکہ یہ ضروری ہے۔“ ایلے کا سا مسکرا کر مگر اسے
حتی لہجے میں بولا کہ کسی سوال کی گنجائش ہی نہ رہی۔
سب اسے ہی دیکھ رہے تھے اور وہ موبائل پر نمبر لانا
یہ دھیان چھینے لگا۔ کمرے کے دروازے پیچھے گم
ہونے سے پہلے انہوں نے اسے فون کمان سے لگائے
کتے سن۔

”یہ میرا نمبر ہے، اس کو آپ سید (محموظ) کر لیں
۔ اور دروازہ بند ہو گیا۔ سب ابھی تک چپ بیٹھے
تھے۔

پھر زمر نے مک کلوشٹر دیکھا تو کراچی کے پتھر سے
نگرانے کی آواز پیدا ہوئی۔ حین نے کم صم سی ہو کر
اس کی طرف گردن موڑی۔

”ماہوں کی سوج کر ایسا کہہ رہے ہیں؟“
زمر نے ہلکے سے شلے اچکا گئے۔ ”اس پہ بھروسہ
کر۔ وہ کہہ رہا ہے تو اس کے پاس کوئی حل ضرور ہو
گا۔“

”آپ کو کب سے ان کے فیصلوں پہ بھروسہ ہونے
لگا؟“ حین نے کسی دوسرے کی پروا نہ کیے بغیر اس کو
مٹھوک نظروں سے گھورا۔

”جب سے میں نے اس کو کورٹ میں اپنا دفاع
کرتے دیکھا ہے۔ وہ معاملات کو سدھارتا اور سنوارتا
جاتا ہے۔ اگر وہ کہہ رہا ہے کہ ہم گھریل میں تو ہم
بدل لیتے ہیں۔ اس کو نئی جگہ کی تلاش ہے، وہ اسی
محافظ سے بہتر علاقے میں شفٹ ہونا چاہ رہا ہو گا۔“ وہ
رسلن سے کہہ رہی تھی۔ دوسرے ندرت کو اب نئی فکر
نے آن گھیرا تھا۔ رسلن، پینٹنگ، شفٹنگ، کمان سے
کام شروع کریں؟ اس نے ابھی ایک گھونٹ ہی بھر اٹھا

بے شک وہ حج آپ کے ہاتھ میں تھا مگر کالے کوٹ والے اپنے چینی بھائیوں کے خلاف کم ہی کھڑے ہوتے ہیں۔“

”یہ مجھے بھی معلوم ہے زمرہ میں پوچھ رہی ہوں کہ تمہارے ہوتے ہوئے وہ ہائیے ہوا؟“

”تو تم نے مجھے استعمال کیوں کیا؟“ وہ تڑخ کر لولی۔
 ”آپ کو کوئی چیز نہیں ہے جس کو میں استعمال کر سکوں۔ مجھے کچھ عرصہ قبل تک اس کی بے گنتائی کا علم نہیں تھا۔ جب ہوا تو میں نے اس کے تیس کو درست سمت میں چلایا۔ انسان کو غم اور خوشی دونوں میں حق بات کہنی چاہیے۔“ وہ پر سکون تھی۔

”ہاؤ سوئیٹ اور مجھے تپانے کا ارادہ کب تھا تمہارا؟“

”جہاں تک مجھے یاد ہے، میں آپ کی ماتحت ہوں نہ ملازمہ، جو ہرات کی رپورٹ آپ کو کر لوں۔“

جواہرات نے زخمی نظروں سے اسے دیکھتے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ پرف سی عورت کہاں گئی جو انتقام کے لیے بے تاب تھی؟“

زمرہ چند لمبے آنکھیں سکڑ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔

”شاید وہ پکھل گئی؟“
 ”ظلمی کر رہی ہو تم۔ اتم نے اسے جیل میں ڈالا تھا۔ وہ کبھی نہیں بھولے گا۔ اور اگر تم اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا سوچتے گی ہو تو مجھے تمہارے ساتھ ہمدردی ہے۔ کیونکہ۔“ وہ دو قدم قریب آئی اور شیرینی سی چکتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ”کیونکہ تم اس کو کچھ بھی نہیں دے سکتیں۔ اولاد کتنی بڑی نعمت ہے، تم کبھی نہیں جان سکو گی۔ اور تمہارے ساتھ وہ ساری زندگی ایک محروم انسان کی طرح گزارے گا۔“

زمرہ کے چہرے پہ سلیہ سا کزرا، پھر وہ ہلکا سا مسکرائی۔ ”جیسے اورنگ زیب کاردار نے آپ کے ساتھ گزارا تھی۔“

کہ مویا کل تھر تھر لیا۔
 نیایا پیغام۔ ”میں اپنے برآمدے میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں زمرہ!“

اس نے مک وہن دھرا اور۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھی گردن اور پر سکون چہرے کے ساتھ قصر کے برآمدے کے زینے پر چڑھ رہی تھی۔

”گنڈ آفزون سز کاردار۔“ مسکرا کر جواہرات کو سلام کیا۔ جو سینے پہ ہانپ لپیٹے وہاں کھڑی مسکتی آنکھیں اس پہ جمائے ہوئے تھی۔ نو سیر واں اور آئی والا معرہ حل نہیں کر سکی تو اب اصل مسئلے کی طرف آئی۔ زمرہ سے پٹنا تھا۔

”سوکل فارس رہا ہو کر آ گیا۔ میں نے سوچا تمہیں چاہیے کتنے دے دوں کوئی وضاحت کھڑے کے لیے۔“

مسکراتے ہوئے ہونٹوں مگر انگار آنکھوں سے چبا چبا کر لولی۔ زمرہ نے ہلکے سے شانے اچکائے۔ ”آپ کل بھی پوچھ سکتی تھیں۔“

”تو پھر تازہ زمرہ کہ فارس۔ کیسے رہا ہوا؟“
 ”وہ اس رات ایک ایسے مردوں کے لیے مخصوص کلب میں تھا جہاں بڑے خاندانوں کے بیس مرد بھی تھے۔ نو نو قوم لوط کے عرب اپنی اپنی بانی ثابت کرنے کے لیے آکر، ان لوگوں کے نام عدالت کو دیتے تو

عدالت ان کو Subpheona کرتی۔ (پولیس بھیج کر حاضر ہونے کا حکم دیتی) ایسے میں وہ بیس عزت دار لوگ پوری دنیا کے سامنے آجاتے اور بے

شک وہ گولٹی کے وقت مگر جاتے، کیونکہ کوئی بھی ایسی جگہ کے بارے میں گواہی نہ دیتا، مگر ایک نیا اسکینٹل کھڑا ہو جانا، اور سب کی بدنامی ہوتی۔ ان میں سے ایک سابق پراسیکوٹر جنرل کا بیٹا بھی تھا۔ جج صاحب نے اس کلب کا ذکر آنے پر سمجھا کہ موجودہ پراسیکوٹر جنرل، پچھلے پراسیکوٹر جنرل سے انتقام لیتے ہوئے اس کے بیٹے کے خلاف اسکینٹل بنوانا چاہتا ہے، اس لیے اس کلب میں موجود ایک گواہ یعنی فارس کو پکڑ رکھا ہے سو جج صاحب نے فارس کو رہا کرنے کا حکم دے دیا۔

جو اہرات کا چہرہ سرخ ہوا۔ بے اختیار اس کا ہاتھ اٹھنے لگا مگر اس نے ٹٹھی سمجھ لی۔ ”تم۔“
 ”میرے کمرے کی بالکونی کو دیکھیے، وہاں فارس کھڑا ہے اور اوہری دیکھ رہا ہے۔ فکر ہے کہ آپ نے ہاتھ نہیں اٹھایا ورنہ وہ آپ کا کیا حال کرتا۔ مجھے یہ سوچ کر ہی آپ سے ہمدردی ہونے لگی ہے۔“ سرخ بھسکو کا چہرے کے ساتھ جو اہرات نے گردن موڑی۔ وہ بالکونی میں کھڑا آگھوں کی پتلیاں سیکڑ کر سنجیدی سے اوہری کو دیکھ رہا تھا۔

”مسد ہے آپ آئندہ بھی میرے ساتھ ذرا احتیاط سے بات کریں گی ورنہ میری انگلیاں بیک وقت کٹتی دوڑیاں کھینچ رہی ہیں“ آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا۔ گڈ آفٹر نوں! کہہ کر وہ مڑی اور تیز تیز بڑے اترتی گئی۔
 جو اہرات لمبے لمبے سانس لیتی، غصے میں مل کھاتی وہیں کھڑی رہی۔



منزل کو نہ پہچانے وہ عشق کا راہی

تلاں ہی سہی، ایسا بھی ساتھ تو نہ تھا
 ہارون عید کی رہائش گاہ پر سرشام ہی دھند اٹھتی
 ہونے لگی تھی۔ صبح بستہ بڑیوں کے اندر تک گھر
 جانے والی ہوا میں ہر ایک کو بخارا ہی تھیں۔ ایسے میں
 داخلی دروازہ کھول کر ہارون اندر داخل ہوئے تو بیٹری
 گراٹس سے بھرے لوٹک دم میں کئی کو شکر بیٹھے
 دیکھا۔

”اوہر کھول بیٹھی ہو؟ کوئی بات کرنی ہے؟“ وہ اس
 کا چہرہ بڑھ چکے تھے صوفیے آکر بیٹھے اور پوچھا۔
 ”بابا۔“ وہ جلدی سے فریب ہوئی۔ سرخ اسٹارک
 سر پہ لیٹ کر گردن کے پیچھے آنکھار کے ڈالا تھا اور
 ملائی جیسے چہرے پہ تذبذب تھا۔

”آپ میرے لیے کچھ کر سکتے ہیں؟“
 ہارون نے گہری سانس لی اور موبائل نکالتے ہوئے
 ”بولو“ کہا پھر عینک ناک پر بجا کر اسکرین پہ انگلی

پھیرتے مسد کا لڑو کھینچے گئے

”فارس غازی۔ میں نے اسے چائے پہ بلایا ہے
 بیوی کے ساتھ۔ وہ میرا ممنون تھا کہ میں اس کے لیے
 ایک دفعہ تھا نے گئی۔ میں نے سوچا اس بامنے آپ کی
 بھی اس سے ملاقات ہو جائے گی۔“

انہوں نے خشکی سے اسے دیکھا۔ ”تم ہاشم اور
 فارس غازی کے سارے مسکوں کو جانتی ہو۔ ایسے میں
 کیا ضرورت تھی اس سب کی؟“

”بابا! اس طرح زیادہ اچھا ہے نا“ اس کا شک کبھی
 بھی آپس نہیں جائے گا۔“

”مجھے اس کے شک کی پروا ہے بھی نہیں۔ خیر تم
 کو جانا تو چلی جانا۔ میں مصروف ہوں۔“

”اب ایک دفعہ اس سے مل کر تو دیکھیں۔ میں
 اس جیسے کسی انسان سے آج تک نہیں ملی ہوں۔“ اس

نے سچی انداز میں ان کے ہاتھ تھامے۔
 ”میں مصروف ہوں آئی اتنی چلی جانا۔ اور اگر ملانا تھا
 تو ڈرنیہ بلائیں۔ صرف چائے کیوں؟“

”جیسے پاپہ وہ زبان کا پابند ہے۔ چائے کی بات
 ہوئی تھی سوچانے ہی پینی ہے۔ خیر آپ سوچ لیں۔“

کھولنا کھینچ کا گھر والو (کھولنا کھینچ) کا گھر والو

کا تار ایڈیشن نمبر 750/- روپے

کے ساتھ کھانا پکانے کی کتاب

کھانا کھانا

قیمت 225/- روپے بالکل مفت حاصل کر لیں۔

آج ہی 800/- روپے کا نئی آڈار سال کرنا لیں۔

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32216361

اور میں بھی اب اپنی زندگی کو ایک مثبت رخ نہ چاہتا ہوں۔
وہ مزکورہ ایس لکھنے لگا۔ جو اہرات اب کے چوکی۔
پھر قریب آئی۔

”کیا کر رہے ہو تم؟“ غصہ کم ہوا۔ تشویش سی دور
آئی۔ ہاشم کے کندھے کے پیچھے سے جھانکا تو وہ چپک
بکسے۔ چپک ساٹن کر رہا تھا۔

”جس کو ہم نے سری لنگا میں ہونا ہے پرا
ہرا (ریڈ) کے لیے میں اس سے پہلے ایک کینسر
اسپتال کے نام کچھ چیکس لکھ رہا ہوں۔ اور کچھ
اور گلزیب کا دروازے کے لیے۔ وہ چپک لکھ
لکھ کر الگ کر رہا تھا۔ جو اہرات کی آنکھیں سنبھ اور
بے یقینی سے پھیلیں۔

”ایک دم سے اتنا سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت
ہے؟“

”مجھے یہ کر کے خوشی مل رہی ہے مہی۔ جب آپ
نے مجھے لوگوں کو قتل کرنے سے نہیں روکا تو ان کو
پہلے سے بھی نہ روکیے۔“ وہ بالکل مایوسی طرف سے
بے نیاز تھا۔

”مگر تمہیں لگتا ہے کہ تم یہ کر کے ایک بڑے
philanthropist (انسانیت کے ہو رہو) بن رہے
ہو تو میرے نزدیک یہ کٹھنی کلنڈس کے سوا کچھ نہیں
ہے۔“ وہ تھلا گئی تھی۔ پہلے تو شیر وال اور اب ہاشم۔
ہاشم نے ناگواری سے کچھ کہنے کے لیے نظریں اٹھائیں
کہ اس کا مایوس تھر تھرا لے لگا۔

”ہات کراؤ۔“ وہ اسی بے نیازی سے فون سننے لگا۔
”ہاں میری بولو۔“

جو اہرات جو کلس کر جانے لگی تھی، بے اختیار ٹھہر
گئی۔ پھر اسے اشارہ کیا۔ ہاشم نے اسپیکر آن کر کے
فون سامنے کر دیا۔

ہزاروں میل دور لیکن کا دروازہ بند کیے کھڑی میری
انجیو آہستہ آہستہ سے فون میں کہہ رہی تھی۔ ”وہ
جمہرات کی رات کو بھاگنے کا پلان کر رہے ہیں۔ سعدی
اور خاور۔ وہ مل کر گاؤں پر حملہ کریں گے، اور ان کو

میں اس کو دھتے کی شام کو دو گوری ہوں۔ وہ پورے
چاند کی رات ہوگی۔ ایک بہت خوب صورت
رات۔“ جلدی جلدی جوش سے کہہ کر وہ اندر کو
بھاگی۔

”کن اس کے پاس توجہ دینے کے شکوے تھے؟
نہ وقت کی کمی کی شکایتیں۔ کن وہ خوش لگتی تھی۔
معصوم اور پرجوش۔ اردان نے بہت غور اور الجھے
سے اسے اندر بھانسنے دیکھا تھا۔



کوئی ہم نفس نہیں ہے، کوئی رازداں نہیں ہے
فقط ایک دل تھا اب تک سو وہ مہیاں نہیں ہے
جو اہرات جب لالچ میں دلپس لگی تو غصے سے
کلب رہی تھی۔ سیدھی لوہ ہاشم کے کمرے میں
آئی۔

وہ اسٹڈی ٹیبل پر کنبیاں رکھے بیٹھا گردن تر جھی
کے کچھ لکھ رہا تھا۔ نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا اور مصروف
لگتا تھا۔

”اس دو ٹکے کی لڑکی نے میری اتنی بے عزتی کی
کہ۔“

”کچھ چکا ہوں۔ میری بالکونی سے آپ کا پھیلا
پر آندہ نظر آتا ہے۔“ وہ گردن کو جنبش دینے بغیر لگتا
رہا۔ جو اہرات جمل کر کو تلمہ ہو گئی۔

”اور تم بیٹھے دیکھتے رہے؟ وہ مجھے فارس کے نام
سے دھمکا رہی تھی اور تم؟“ وہ غصے سے لڑ رہی تھی۔

”آپ کو اسے کنڈرٹ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہم
نے کبھی فارس سے دشمنی ظاہر نہیں کی۔ یوں وہ ہم پر
شک کرے گی اور میں یہ نہیں چاہتا۔“

”میزائل چاہ رہا ہے میں اس کو شوٹ کر دوں اور تم
کہتے ہو کہ۔“

”نہف‘ مہی۔“ اس نے آٹا کر گردن موڑی اور
بے زاری سے لال، بھسوا کا چہرے والی ماں کو دکھا۔
”ہم مزید کوئی قتل نہیں کر سکتے۔ اب سو آئن کرنے کا
وقت ہے۔ وہ دو دفعہ جیل جا کر اسے بھی سبق مل چکا ہے۔“

حنہ اس کے ساتھ نیچے کارٹھ پہ بیٹھ گئی اور لب ٹاپ
مرد میں رکے، اسی فلش کو لگائے پھر سے کو خوش
کرنے لگی۔ گاہے بگاہے نظر اٹھا کر اس کو بھی دیکھ
لیتا۔

”آپ سیٹ ہیں؟“

”جانتی نہیں۔“ وہ بے زار تھی۔ بیٹھی لب کا تھی

رہی۔

”کوئی مسئلہ ہے تو فارس غازی ساتھ والے کمرے
میں ہیں۔ لن کے پاس یقیناً محل موجود ہوگا۔“

”شٹ اپ!“ خشکی سے سرخ بھی موڑ لیا۔ حنہ
مسکراہٹ دینے لگی۔ ”اسکرین کو دیکھنے لگی۔“

”حماسٹیں۔“ تو ٹوٹی دیر بعد اس نے پکارا۔ ”یہ
وہی فلش ہے جو بھائی نے سوئی کاپی پر تھوڑے ہنٹ پر
چراغی تھی۔ یعنی کہ اس میں ہاشم (اب نام لیتے ہوئے
بھی عجیب محسوس ہوتا تھا) کے کیپیوٹری لگائی گئی تھی مگر

وہ ڈیٹا اب اس کے اندر کیوں نہیں ہے؟ اس کی جگہ
بھائی نے اس کے اندر فریڈن کیوں ڈال رکھی ہے؟ اگر

ڈیٹا اندر نہیں ہے تو یہ وہ فلش نہیں ہے اور اگر یہ وہ
فلش نہیں ہے تو غلطی کے اسٹائل کی انٹریشن کیوں؟

اف۔“

مگر زمر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ کڑکی کا پرہیز اس کا
کر وہ دور نیچے دیکھ رہی تھی۔ حنین بھی پیچھے گھومی۔

وہاں جو اہرات اور ہاشم زینہ اتر کر سبزہ زار پہ کھڑی کار
کی طرف بڑھتے دکھائی دے رہے تھے۔ (حنہ نے
فورا ”سرخ موڑ لیا۔“ وہ دونوں کہیں جانے کے لیے تیار
لگتے تھے۔ دوسری طرف سے نوٹسرواں آنا دکھائی دیا۔

ہاشم اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ گیا۔ جبکہ
جو اہرات اسے لے بسی سے دیکھ کر ہاشم کے ساتھ

ہوئی۔ زمر کی آنکھیں سکتزیں۔

”جب علیشا نے نوٹسرواں کو بتایا کہ ہاشم نے
اسے پڑھایا تھا تو اس نے آگے سے کیا کہا؟“

”کچھ نہیں۔ تب سے علیشا کو مسیج نہیں کیا
اس نے۔ لوزر کے دل یہ بہت زور سے لگی ہے۔“ وہ

ہلکا سا ہنسی۔ اندر کچھ ٹوٹا تھا۔ وہ کھٹو صرف شیروکے

پر غل بنا کر وہاں سے بھاگیں گے۔ آپ نے مجھے
نہیں بتایا کہ ہم سری لنکا میں ہیں مگر میں آپ کو یہ
سب بتا رہی ہوں۔ اس نے مجھے بھی چٹنے کی دیکھنے کی
مگر میں نہیں بھاگوں گی۔ ہاشم اور جو اہرات نے
ایک دوسرے کو دکھا۔ پھر ہاشم مسکرایا۔

”جیسے کیا چاہیے میری آجیاز۔“

”مجھے صرف اپنی جاب والیوں چاہیے۔ احمد اور
بھروسے کے ساتھ۔“

جو اہرات نے موبائل ہاشم کے ہاتھ سے لیا اور
جب اس میں ہوائی تو چرے پے ڈیویسوں اطمینان تھا۔

”تم نے میرا اٹھو کھلایا ہے۔ میری اپنی دن میں ہم
تھیں وہاں لے آئیں گے۔“ ذرا گھبرائی۔ ”زہر کے
انجکشن کا کچھ معلوم ہو سکا ہے؟“

”میں مسز کاردار! اس بارے میں میں کچھ نہیں
جاتی۔“ اور میری لہجہ جتنی مجبور اور مضطرب سنی

وہ یہ بات لن کو نہیں بتا سکتی تھی مگر جو اہرات مطمئن
ہو چکی تھی۔ سوائے شہادتوں کے کہ ہاشم کو تھما

دیا۔

”تم خاموشی سے لن یہ نظر رکھو میری باقی میں
سنبھال لوں گا۔“ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ جو اہرات

چوگی۔ ”مگر ہر؟“

”ہارن عبید سے دو نوک بات کرنے۔“ وہ سختی سے
بولتا تھا۔ جو اہرات کا عارضی اطمینان غائب ہونے لگا مگر

پھر بھی کڑا کر رہی۔ ”شہباز، ہم ساتھ جائیں گے میں
تیار ہوں۔“ اور باہر نکل گئی۔ اس کا ذہن تیزی سے
تج تفریق کرنے لگا تھا۔

کچھ نہ کہنے سے بھی چمن جانا ہے اچھا رخص
ظلم سینے سے بھی ظالم کی مدد ہوتی ہے

جو اہرات کے پاس سے لے کے بعد سے زمر
ندرت کے کمرے میں کھڑکی کے پاس کرسی ڈالے

چپ چاپ بیٹھی تھی۔ جو کہ آگے تو جو اہرات نے
من لیا مگر جو خود اس نے ساوا الگ داستان ہوئی۔

دل پہ تو دور سے نہیں گئی تھی مگر ہر خیال ذہن سے جھٹک کر زمر کو دکھلا۔

”آپ اتنی زبرد کیوں لگ رہی ہیں؟ مجھے کیوں لگتا ہے کہ دن بدن آپ کی صحت بگڑ رہی ہے۔ کوئی وہم سا تھا۔۔۔ زمر سچید کی اس کے ساتھ کرسی بھیج کر بیٹھی۔ اسے کسی کو تو بتانا تھا مگر حسب توقع اگلے دس منٹ اس کو شاکڈ اور پریشان سی حد تک یہ تسلی دینے میں لگے کہ وہ ٹھیک ہو جائے گی اور یہ کہ فارس نے ڈونر ڈھونڈ لیا ہے۔

”کون ہے ڈونر؟“ حند نے بے تابی سے پوچھا۔
 ”اس نے نہیں بتایا۔ مجھے ڈونٹ کرنے والے لوگ جانے کیوں خفیہ رہنا پسند کرتے ہیں۔“ شائے لپکا کر دہائی۔

حند ایک دم جو گئی۔ ”کیا یہ تمام میں خود۔۔۔ زمر۔۔۔“
 ”تو وہ پلیر فضول باتیں نہ کرو۔“ وہ بے زار ہوئی مگر حند سارا اٹھ بھول کر ایک دم ہرجوش ہو گئی تھی۔

”ہو سکتا ہے وہ خود ڈونر ہوں نہ آپ کو بہت پسند کرتے ہیں۔“
 ”یہ ناممکن۔۔۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔“ زمر نے ناک سے کسی اڑائی تھی۔

”کیوں نہیں کر سکتے۔ وہ بہت اچھے ہیں اور ان کا دل اتنا بڑا ہے کہ۔“
 ”اس کا پلڈ گروپ اے یا بیٹو ہے؟ میں اونیٹنگ ہوں۔۔۔ مجھے بھی اونیٹنگ میں کر سکتا تھیں۔“

اس نے بڑے رساں سے حنین کی بڑھتی جذبیت کو روک لیا۔ ”ایک دم جھاک کی طرح بیٹھ گئی۔“ وہ۔۔۔
 زمر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میں آئی ہوں۔“ اور حند کو ایک دفعہ پھر زمر کی صحت کی فکر ہونے لگی، لیکن وہ ظاہر کرتی تو زمر اسے بتانے پہ بچھرتائی سوچ بیٹھی رہی۔

زمر ہاشم کے کمرے کی پچھلی سیڑھیاں چڑھتی اور آئی تو جانتی تھی کہ ہاشم اور جو اہرات گھر سے جا چکے ہیں۔ (اسے اپنی پشت پہ بالکونی میں بیٹھے فارس کی نگاہیں محسوس ہو رہی تھیں مگر نظر انداز کیے رہی۔)

اس نے نو شیر والوں کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ خلاف توقع وہ فوراً ”کل کل“ اسے چونکھت میں استناد دیکھ کر شیروں کے ابوالحسن ”ڈی اے؟ پہلو!“
 ”مجھے کچھ کام کرنا ہے۔“ اپنی ٹوٹ بک اور فائلز دکھائیں۔ ”ہاشم کی لائبریری سے پٹی ایل ڈی دیکھ سکتی ہوں؟“

”شیر۔۔۔“ وہ پہلے اسے اسٹری کار سے ہٹانے لگا۔ پھر خود ہی باہر آیا اور ہاشم کے کمرے کے اس طرف اسٹری کا۔۔۔ دروازہ کھولا۔ سامنے شیفت اور میزس نظر آ رہی تھیں۔ زمر اندر آئی، میز پر اپنی چیرس رکھیں اور سامنے شیفت سے سیاہ جلدی والی کتابیں دیکھنے لگی۔

”مجھے صرف پندرہ منٹ لگیں گے۔ تم یہیں بیٹھ جاؤ۔“ اسے جلتے دیکھ کر مصروف انداز میں پکارا۔ وہ ٹھٹک کر رکھا۔

”آپ کر لیں آرام۔۔۔“
 ”PLDs ہیں جیتی کتابیں ہیں کل کو کوئی آگے پیچھے ہوتی تو میرا نام نہ آئے، اسی لیے کہہ رہی ہوں۔“

”آپ کا نام کیوں آئے گا؟“
 ”چند ماہ پہلے ہمیں روک کر تلاشی لینی چاہی تھی خاور نے کسی فیکٹس کے لیے۔“ وہ دو کتابیں لائی اور کرسی کھینچتے ہوئے اسے یاد دلایا۔

”وہ تیس۔۔۔ ہم تو ہیں ہی بڑے لوگ۔“ شیروں نے کندھے جھٹکے بیٹھا نہیں۔ کھڑا رہا۔ پھر موتا۔
 ”آپ کو کچھ چاہیے؟“

”وہ تھنک یو۔ کیا تم مجھے ان تمام سوالوں کے کیسز اس کتاب میں سے ڈھونڈو گے؟ یہ لو۔“ ایک کتاب اس کے سامنے دھری۔ وہ مصروف نظر آ رہی تھی۔

”میرا مطلب تھا چائے یا کافی۔“
 زمر قلم ہونٹوں میں دبائے لٹی میں سر ہلا کر بڑھنے لگی۔ وہ گہری سانس لے کر کرسی بھیج کر بیٹھا کتاب

کھولی اور مطلوبہ کھسڈ کی لسٹ دیکھی۔
 بالکونی میں بیٹھے فارس کو سامنے اسٹری کے کھلے
 شیشے کے دروازے سے دونوں میز کے گرد بیٹھے صاف نظر
 آرہے تھے وہ خاموشی سے ان کو دیکھا۔ (یہ اور کیا
 کر رہی ہے؟) وہ اس کا دلغ پڑھنا چاہتا تھا مگر نہیں
 پڑھ پا رہا تھا۔ جانتا تھا کہ ذمہ کار وارڈ کی حقیقت سے
 واقف ہے اور وہ اب بے چین ہے کیونکہ اس کے
 خیال میں فارس پچھلے مئی ماہ سے کچھ نہیں کر رہا سعدی
 کے لیے۔ (ہاں فارس تازی تو بے کار آدمی ہے نا!)
 ”سوف یہ کیا ہے؟“ شیرو نے تھوڑی دیر بعد
 پوچھا۔

”میں اپنے کلائٹ کو مرزا سے بچانا چاہتی ہوں۔
 مؤثر کیس ہے۔ قتل اس کے چھوٹے بھائی نے کیا
 ہے مگر باپ اور بھائی نے بڑے کو آگے کر دیا ہے۔“
 ایک فائل اسی مصروف انداز میں شیرو کے سامنے
 ڈالی۔ اس نے انچھ سے ذمہ کو دیکھا۔

”مگر وہ بھائی نا کر وہ جرم کا اعتراف کیوں کر رہا ہے؟“
 ”کیونکہ اس کے باپ اور بھائی کا اس پہ بہت زور
 چلا ہے۔ انہوں نے ساری زندگی اس کو اپنی محبت کی
 تسلیاں دے کر بھی بڑا ہی نہیں ہونے دیا۔ کچھ
 پیرس ایسا بھی کرتے ہیں۔ ایک بچے کو فوجیت دیتے
 ہیں اور دوسرے کو لاڈ پیار دکھا کر سلائے رکھتے ہیں۔
 اس کے اوپر کوئی اہم ذمہ داری نہیں ڈالتے اس پہ
 بھروسا نہیں کرتے۔ اس کو ہر وقت کنٹرول کرنا چاہتے
 ہیں۔ ایسے زندگی تباہ ہو جاتی ہے اس بچے کی۔ وہ زندگی
 میں جو غلط فیصلے کرتا ہے اس کی وجہ اس کے وہی ماں
 باپ اور بہن بھائی ہوتے ہیں۔“ چند لمحے کے لیے
 شیرو کچھ بول نہ سکا۔

”ہو سکتا ہے وہ اس کو محفوظ رکھنے کے لیے ایسا
 کرتے ہوں۔“ وہ کتاب پہ خالی خالی نظر سر جلائے
 آہستہ سے بولا تھا مگر ذمہ نے اسی مصروف انداز میں
 صفحے پلٹتے ہوئے کہا۔
 ”کسی کی حفاظت کرنے کے لیے اسے ہرٹ کیا
 جاتا ہے کیا؟ جموت بولتے ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ

وہ یہ سب اپنے پیاروں کے لیے کر رہے ہیں۔ صرف
 اپنے مفاد کے لیے کیے جاتے ہیں برے کام اپنے گناہ
 چھپانے کے لیے۔“

نو شیرواں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ تیز حیرت
 پڑی۔ کتاب سے دیکھ کر کچھ لکھتی جا رہی تھی۔
 ”تو آپ اپنے کلائٹ کہ کیا کرتی ہیں؟“

”ہی کہ اسٹینڈ لے اپنے لیے کھڑا ہو۔ وہ کرے
 جو اس کا دل چاہتا ہے۔ اور وہ کرے جو ان لوگوں کو
 نہیں پسند۔ پتا ہے نو شیرواں۔“ سر اٹھا کر اس کو دیکھا
 اور سادگی سے بولی۔ ”تم نے کہا تم بڑے لوگ ہو۔
 میں تمہیں بتاؤں اب تو ہم بھی اچھے لوگ نہیں
 رہے۔ میں بھی وہ نہیں رہی۔ کیونکہ میں نے یہ سیکھا
 ہے کہ شیروے لوگوں کے ساتھ شیروے رستے اپنانے
 پڑتے ہیں۔ خیر اور شر کی درمیانی لیکر کو دھندلا کر ناپڑنا
 ہے۔“

شیرو نے خاموشی سے سر ہلایا وہ الجھا الجھا سا تھا۔
 اب وہ اس سے مطلوبہ کھسڈ کا پوچھ رہی تھی۔ وہ سر
 جھٹک کر صفحے پلٹنے لگا۔
 فارس تازی ابھی تک انہیں دیکھ رہا تھا۔



عزم یہ شہر نہیں ہے لفسا نفسی کا صحرا ہے
 یہاں نہ دھوٹو کسی مسافر کو گھبرانے والے
 ہارون جب ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو
 جو اہریت سامنے اونچے صوفے پہ ٹانگہ ٹانگہ جھاکر
 بیٹھی تھی۔ تک سب سے تیار چہرے پہ مسکراہٹ
 سجائے وہ کان کے بندے پہ مسلسل انگلی پھیر رہی
 تھی۔ ہاشم کارنر ٹیبل کے ساتھ کھڑا تھا اور سر جھٹکائے
 کالج کی بوتل سے مشروب گلاس میں اینڈیل رہا تھا۔ ان
 کی آہٹ پا کر اس نے سر اٹھایا اور مسکرا کر ہارون کو
 دیکھا۔ ”شام بخیر۔“ اور پھر گلاس میں مائع اینڈیل پلٹنے لگا۔
 ”بنا اطلاع کے وہ کاردار ڈکی آند انسان کی شام کو بخیر
 نہیں رہنے دیتی۔“ مسکرا کر وہ ایک بازو صوفے کی
 پشت پہ پھیلا کر سامنے بیٹھے۔

”یہ محض لفاظی ہے ہارن اور نہ تم سچ میں کاردارز کو ہلکے رہے ہو۔“ وہ ہارن پہ نظر گاڑے سخت سے بولی تھی۔

”ہماری ایسی مجال کہاں۔ کوہا شہم اتم قیدی“ اپنے مہمان کے متعلق بات کرتے آئے ہو،“ انہوں نے اطمینان سے دیکھا۔ وہ دو گلاس اٹھائے چلا ہوا آیا اور پھر کوٹ کا بن کھولے، سامنے بیٹھ کر ٹانگ پہ ٹانگ جلائی۔

”میں اپنے مہمان کے بارے میں بات کرنے نہیں آیا۔ میں تمہارے گاڑے کے بارے میں بات کرنے آیا ہوں۔“

جواہرات کسی پلاسٹک کی گزیا کی طرح مسکراتے ہوئے ہارن پہ نظریں جمائے ہوئے تھی، البتہ انگلی مسلسل بندھے یہ پھیر رہی تھی۔

”میں نے جانچ پڑتال کی ہے۔ گاڑے سے سحری کی پہلے بھی لگتی تھی۔ اس رات دونوں کا جھگڑا ہو گیا اور سحری نے اس کو زہر دے دیا۔ زہر اس کے پاس کیسے آیا میں معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”میں نے بھی جانچ پڑتال کی ہے ہارن۔ اور چونکہ میں اندر جا نہیں ہوں، اس لیے دو کچھ سنا ہوں کہ جو گاڑے مرا ہے وہ قدرتی ڈیوٹی والا تھا۔ مجھے ایک ایک گاڑے کی شکل حفظ ہے۔ ان کا نام ڈیوٹا ازر ہے۔ وہ قدرتی ڈیوٹی والا گاڑے رات کو اوھر کیا کر رہا تھا۔“ ایک مہرے پر غور اس مہرے کے بارے میں دو ممکنہ باتیں ہو سکتی ہیں۔“ وہ بہت سکون سے کہہ رہا تھا۔ ہارن لب بھیچھے مسجیدی کی سے اسے سن رہے تھے۔

”یا تو تم نہیں جانتے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا، کیسے ہوا۔ اگر ایسا ہے تو بے فکر ہو جاؤ کیونکہ میں نے اپنے آدمی لگا دیے ہیں، اور وہ اس معاملے کی کھال اور پائل تک پہنچ جائیں گے اور میں تمہیں بروقت اطلاع کروں گا کہ تمہارے لوگوں میں کتنی کٹی کٹی بھیڑیں ہیں۔ وہ ساری بات یہ ہو سکتی ہے کہ تم جواہرات سے واقف ہو، تم نے میرے مہمان کو مارنے کی کوشش کی ہے اور اگر ایسا ہے تو تمہیں فکر کرنے کی ضرورت

ہے کیونکہ جس دن مجھے یہ علم ہوا کہ تم جانتے تھے اور تم نے مجھے دھوکا دیا ہے تو اس دن میں تمہارے ہر معاملے کو ”مہاجل“ لوں گا۔“ ایک ایک لفظ پہ زور دیا۔

”ایک دوست کے گھر جا کر اس کو دھرنا پانگل بھی منڈب نہیں ہے ہاشم!“

”نہ نہیں۔“ اس نے مسکرا کر ناک سے کھسی اڑائی۔ ”میں دھرنا کرنے تو نہیں آیا۔ میں تو اطلاق دینے آیا تھا۔“

ہارن بھی چونکے اور جواہرات نے بھی بے اختیار گردن موڑ کر ہاشم کو دیکھا۔ ”کیسی اطلاع؟“

”میں اپنے قیدیوں کو شفٹ کر رہا ہوں۔ تمہارا سیف ہاؤس اب مجھے نہیں چاہیے۔ وہاں غیر محفوظ ہیں۔“

”مگر تمہیں مجھ پر اتنا بھی اعتبار نہیں تھا تو تمہیں ان کو میرے پاس رکھنا ہی نہیں چاہیے تھا۔“ وہ بھی ٹھنڈے کچھے میں ڈالے۔

”ہم اعتبار کی وجہ سے ایک ساتھ کبھی بھی نہیں تھے۔ مفاد کی وجہ سے تھے۔ جس دن وہ ختم ہوا میں تمہیں پہچانوں گا بھی نہیں۔“ کوٹ کا بن بند کرنا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں جیسے کہ کوہا شہم میں ہوں گا۔ اپنی گمرانی میں اپنے قیدیوں کو وہاں سے لے جاؤں گا۔ تم بھول جاؤ کہ میں نے کسی ان کو تمہارے حوالے کیا بھی تھا۔“

”ہاشم دوست کہہ رہا ہے۔“ وہ بھی اس کے ساتھ اٹھتے ہوئے بولی۔ اس کا ذہن تیزی سے کنٹراں ملانے لگا تھا۔ ”ہم اپنے قیدی لے جا رہے ہیں کیونکہ تم ان کی حفاظت نہیں کر سکتے تم اپنے عملے کی کٹی کٹی بھیڑیں تلاش کرو ہارن لیا، ہم خود تلاش کر کے تمہیں آگاہ کر دیں گے۔“

اور ہارن نے ہلکا سا مسکرا کر ان دونوں ماں بیٹے کو دیکھا جو مضبوطی سے ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے تھے۔ جواہرات کی آنکھوں میں صاف (میں تمہاری ناکھی کو دکھور“ کر رہی ہوں) ہارن) والے تاثرات

پہلے تھے۔

ہارون بلکا سا سر جھٹک کر اٹھے۔ ”تم مجھ سے پہلے سارے جوان تلاش کر لو گے ہاشم۔ میں انتظار کروں گا۔“ وہ دونوں دوہانے کی طرف بڑھے تو ہارون نے جھک کر گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

”فارس کہ تم مجھے کو سہل نہیں ہو گے فارس عازمی کی پہیلی کو میں نے چاہتے ہی مدعو کیا ہے۔ میں بھی تو دیکھوں، کون یہ ہے فارس عازمی۔“ مصروف سے انداز میں کہہ کر انہوں نے گلاس لیوں سے لگایا۔ وہ جو اتنی دیر ٹھٹھے مسکراتے چہرے کے ساتھ بشارتہا تھا اس حلق کو کڑوا کر دینے والے ذکر پہ ابھرتا ہوا تھا۔ جو اہرات بھی چوگی تھی مگر ابھی کچھ پوچھتا ہے کار تھا۔ وہ تیز تیز ہر نکل گئے۔

ممکن نہیں ہے مجھ سے یہ طرز مخالفت دنیا جیسے مزاج کا بندہ نہیں ہوں میں نیا گھر کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا نہ فارس نے دیکھنے کی پیش کش کی تھی۔ وہ بس یہی کہے جا رہا تھا کہ جیسے کو ہم نے شفقت ہونا ہے۔ ایسی گویا بکھری پڑی تھی۔ ہر طرف گتے کارٹن، کھنڈ، سلمان کے ڈبیر، عذرت حسین، حسین، زمر سب کاموں میں لگے تھے حسین نے پینک سے پہلے اپنے دست کو گل بھائی جان سے چیکے سے بات کر لی تھی اور اب بڑے ہی سائے انداز میں لائونج کے فرش پہ بیٹھی گتے کے ڈبے کو چوڑے ٹیپ سے بند کرتی کہہ رہی تھی۔

”حسین، نازک کرا کر گی کو بیڈ شہنشاہ میں پیٹ کر کارٹن میں رکھو۔ کہیں کو صاف جرابوں میں پیٹو۔ ایک تیر سے دو شکار۔ اور ایک جیسی چیزیں اک ساتھ رکھو۔ ہر کارٹن کے اوپر اس کا ٹیک لگا ہونا چاہیے کہ اس میں کیا ہے، اور سنو یہ ٹیک ہم نے کارٹن کے اوپری طرف نہیں لگانے سمیٹاؤ پھلگتے ہیں۔“

”وہ کیوں حسین پلٹی؟“

”کیونکہ جب شہنشاہ ہوتی ہے تو کارٹن ایک

دوسرے کے اوپر رکھ کے ڈبیر لگا دیا جاتا ہے اب ٹیک بڑھنے کے لیے ہم کارٹن ہٹا ہٹا کر دیکھیں گے کیا؟ اس لیے سمیٹو۔ ٹیک لگا ہوا تو ہم آسانی سے بڑھ لیں گے اور صرف وہی کارٹن نکالیں گے۔“ اور حسینہ واقعی اس سے متاثر ہو رہی تھی۔ حندہ کا خبر بندہ ابھی جاری تھا۔

”ہر شخص اپنا ایک چھوٹا بیک بنائے گا جس میں اس کا نوٹھ پرش ٹولہ، ایک جوڑا ویسٹوں کے وہاں جا کر اتنے ٹھکے ہوں گے ہم کہ کہاں پورا سلمان کھول کر چیزیں ڈھونڈیں گے۔ سو پہلے دن رات کا الگ سلمان سب کے پاس ہونا چاہیے۔“ وہ لوہی آواز میں کہہ رہی تھی۔

عذرت برتن پیک کرتے ہوئے بار بار اسے ایک گھوری سے نوازتیں اور طنز کرتیں۔

”شکر ہے تمہیں بھی کچھ بتا چل گیا ہے۔“ یہ الگ بات ہے کہ اندر سے وہ بہت خوش تھیں لیکن ابھی ماؤں کی وہ قسم پیدا نہیں ہوئی جو غیر شادی شدہ بیٹیوں کی تعریف ہر وقت ان کے منہ پہ کرے۔

اور حسین نے پہلی دفعہ محسوس کیا تھا کہ اسے اس گھر کو چھوڑنے کا غم، ہاشم کی ہسٹنٹی چھوڑنے سے زیادہ تھا۔ (انتا دل لگا کر اس گھر کو صاف کیا تھا، اب چھوڑ دین؟ ماموں بھی نا!) ایک ٹھکے کنٹن نظر اوپر ڈالی جہاں سے فارس بیڑھیاں اترتا آ رہا تھا۔ منہ میں کچھ چباتے ہوئے، وہ سوئیٹر اور جینز میں ملبوس تیار لگ رہا تھا۔ زمر جو صوفے پہ بیٹھی ایک کارٹن پیک کر رہی تھی، نظر اٹھا کر پہلے اسے دیکھا اور پھر حسینہ کو ذرا سا اشارہ کیا۔ ”چالو۔“

”کو نہیں۔“ وہ میں اپنی ممالی کے ساتھ پیوں گا۔“ مسکرا کر کتابا ہر نکل گیا۔

زمر ذرا سی چوٹی۔ ”یہ مسز کاروار کے پاس کیوں جا رہا ہے؟“ شاید وہ با آواز بلند سوچ رہی تھی اسی لیے ساتھ وہ ٹیل چیئر پہ بیٹھے بولے لیا آہستہ سے بولے۔ ”وہ ان کے ساتھ اس گھر کو بیچنے کی ڈیل کرنے جا رہا ہے۔“

زمر اور خود حندہ بھی بے اختیار مڑ کر انہیں دیکھنے لگی۔ ”آپ کو کیسے تھا؟“
 ”تمہارے خیال میں وہ اور کس کو بیچے گا گھر؟ اور وہ مسز کاردار کے ساتھ صبح کی چائے کیل پیسے لگ۔“ ان کے انداز میں حنکلی تھی۔ زمر خاموشی سے اٹھی اور ان کا کونٹ اور مظفر لائی۔ ٹولی وہ اوڑھے ہوئے تھے اس نے ان کو کونٹ پستایا، مظفر لیٹا اور وہ ٹیل چیئر باہر لے آئی۔

”ہمیں بات کرنی ہے لہذا سو اگ پہ چلتے ہیں۔ میں سو اگ کر لیں گی اور آپ بات۔“
 جو اہرات ڈاکٹنگ ہل سے نکل ہی رہی تھی اور احمر کو ہدایات دے رہی تھی جب اس نے دیکھا بیویوں میں ہاتھ ڈالے فارس، مسکراتا چلا آیا ہے اور وہ ایسے کب مسکراتا تھا؟ احمر کو اس نے دور سے ہی ہاتھ ہلا دیا اس نے بھی سر کے خم سے جواب دیا اور اندر چلا گیا۔

جو اہرات آگے آئی اور بہت پار سے ”فارس“ کہتے ہوئے اسے گلے سے لگایا اور پھر اس کی کبھی میں بانڈو ڈالنے لے چلنے لگی۔
 ”مجھے دیکھ کر اتنی خوش ہوئی ہیں آپ۔ میری آنکھیں بھر آئیں۔“ وہ ہلکا سا ہنس دی۔
 جب دونوں کونٹی کے ساتھ ترقی ریکی دو کرسیوں پہ بیٹھ گئے تو جو اہرات مسکراتے ہوئی ہوئی۔

”مگر تو تم اپنی بیوی کے بارے میں مجھ سے باز پرس کرنے آئے ہو؟“
 ”میں انکیس پچھتا چاہتا ہوں۔ خریدیں گی؟“
 جو اہرات کے بھر کو بالکل ساکت ہوئی پھر جلدی سے سیدھی ہوئی۔ ”مسکریں؟“

”پیسے چاہیے ہیں۔ دو دفعہ نوکری سے نکالا گیا ہوں۔ اب کوئی تیار نہیں مجھے چاہ دینے کے لیے۔ کاروبار شروع کرنا چاہتا ہوں۔ شاید کراچی چلا جاؤں۔ شاید ملک سے باہر۔ اب بتائیے، کتنے میں خریدیں گی؟“

اور جو اہرات کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ ان کی زندگی سے جا ہاتھا، اور بہت دور۔ اور وہ گھر جو اس کی ضد تھا وہ اب اس کو ملنے والا تھا۔

”مارکیٹ پر اس پر!“
 ”نہیں آئی! مارکیٹ پر اس سے دس فیصد زیادہ۔“

”بالکل نہیں، فارس!“ وہ سخت سے پیچھے ہو کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”مارکیٹ پر اس پہلے ہی بہت زیادہ ہے اس سے اور کوئی نہیں خریدے گا۔“
 وہ ہلکا سا مسکرایا۔ ”اب مارکیٹ پر اس سے بیس فیصد زیادہ!“

جو اہرات کے ابرو استجاب سے اٹھے۔ ”فارس“ اتنی قیمت نہیں ہے اس جگہ کی کہ۔“
 ”تیس فیصد زیادہ!“ وہ جتنا احتجاج کرتی، وہ اتنی قیمت بڑھاتا جا گیا۔ جو اہرات نے حنکلی سے اسے دیکھا۔ ساری خوش خلقی غنٹا ہوئی۔

”اور اگر میں خریدوں ہی نا؟ ہماری چار دیواری کے اندر کی عمارت کس کی اور کون نہیں بیچ سکتے۔“
 ”میں جس کو پھیل گا وہ کوئی فقیر نہیں ہوگا۔ آپ جیسا دولت مند اور شان و شوکت رکھنے والا ہوگا۔ آپ کا کوئی دشمن بھی ہو سکتا ہے اور دشمنوں کو چاہتا ہوں کہ تنازعات شروع کرنے میں بہت مڑا آتا ہے۔ وہ مجھ سے دینی قیمت پہ خریدنے کو تیار ہو جائیں گے۔ سو مارکیٹ پر اس سے تیس فیصد زیادہ مسز کاردار!“ اس کا انداز حنکی تھا۔

وہ چند لمحے جب بیٹھی اسے گھورتی رہی۔ یہ گھر تو وہ دینی قیمت پہ بھی خریدنے کو تیار تھی۔ سو ہاتھ مصافحہ کے لیے پڑھایا۔

”تین فیصد زیادہ، اور یہ فائنل بات ہے۔ اب بڑھا کر مجھے خصہ مت دلاتا۔“

”کلائریٹ، نوائیں اور مجھے دس اور کن جرات تک میرے اکاؤنٹ میں ساری رقم ٹرانسفر کرواؤں۔ یہ گھر آپ کا ہے۔ اب ہاتھ ملائے بغیر اٹھ کھڑا ہوا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ نہ اس نے چائے مانگی نہ

جو ہرات نے پلائی۔

دوسرے دھند کے میں۔ فارس نے دیکھا کہ زمر لیا
کی وہیل چیر دھکیلتی جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ
یہاں سے ان کی منتظر نہیں بن سکتا تھا کہ زمر کے
وہیل چیر پکڑے ہاتھ جم رہے تھے۔ ناک بھی گلابی پڑ
رہی تھی۔ ٹوپی سے نکل کر کندھوں پہ کمرے
تھمکے بالے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔

”واک کا آئیڈیا بہت برا تھا لہذا میں برف ہو رہی
ہوں۔“

”تم حرم پہلے برف ہو سکتی تھیں۔ شاید ہمیں
خود بھی اندازہ نہیں ہے۔“ وہ خفا تھے۔

وہ دونوں ہاتھ رگڑتی ان کے سامنے آبیٹھی بیچوں
کے بل وہیں گھاس پہ۔ دھند میں ڈوبے اونچے درخت
اور گرد خاموشی سے اس کو دیکھ رہے تھے۔ اس کی
بحوری آنکھوں میں خفگی بھر نکلتی تھی۔

”مجھے بتا ہے وہ بے گناہ ہے یہ بھی کہ وہ اچھا ہے
اور یہ بھی کہ میرا خیال رکھے گا لیکن میں اس کو ڈر رہی
نہیں کرتی۔ میرے پاس اس کو دینے کے لیے کچھ بھی
نہیں ہے۔ میں اس کے لیے برف کی بن جاتی ہوں اور
میں پھلتا نہیں چاہتی۔“

”تو کیا تم اس کو بھی برف کھینا چاہتی ہو؟“
اور اس فقرے پہ تو وہ اس لفظ میں بھی اندر تک
جل گئی۔ ”ہاں!“ شکایت سی ابھری بحوری آنکھوں
میں۔

”تم سہمی کے لیے بھی ایسی ہو گئی تھیں۔ تم ہر
وقت جمع تفریق کرتی رہتی ہو۔ خود سے باتیں فرض
کر کے لن کو ذہن میں بیٹھا چڑھا دیتی ہو لیکن بچی
محبت سے کے گئے کام تھے ہوئے دل کو کھلا دیتے
ہیں۔ اور کچھ لوگ اس قتل ہوتے ہیں کہ ان کے لیے
پھلنا جائے۔“

(خین کو اب بھی امید تھی کہ اس فلیش میں رکھی
”فروزن“ سے شاید ہاشم کی فالٹو نکل آئیں سو جس
وقت وہ بیکنگ نہ کر رہی ہوئی گونجی لڑاؤ میں اولف کے
ساتھ ٹکنا رہی ہوئی۔ لہا بھی سارا دن وہی سنتے تھے۔

اسی لیے ”بکوتے“ جا رہے تھے۔

”مگر کسے پھلوان میں؟“ اس نے ہارمن کی تھی۔
انہیں دور آنکسی کی طرف جاتے فارس پہ جی تھیں جو
دھند میں دھندلا نظر آ رہا تھا۔

”یہ فریزر کیسے پھلایا جاتا ہے؟ کیسے؟ اس کا سوچ
نکال دیا جاتا ہے۔ اس کا اس کی پرانی زندگی سے سارا
رابطہ منقطع کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ اس کو ماضی کی توانائی
پرانی یادیں، کچھ بھی نہ مل سکے۔ اور پھر اس کا دروازہ
کھول دیا جاتا ہے۔ محبت کھلا دروازہ ہوتی ہے زمر۔
تازہ ہوا کو آنے دو۔ دروازہ کھول دو۔ اس نے یہ اور یہ
کیا میں نے یہ کیا یہ سب کچھ کھول کر چند لمحوں کے
لیے۔ پھر ساری برف خود بخود کھل جائے گی۔“

وہ سنتی رہی۔ پھر نکلتان سے مسکرائی اور اٹھ کھڑی
ہوئی۔ لہا کی بات کھل ہوئی اور اس کی بواک وہ ابھی کا
سفر خاموشی سے کھلے لہانے پھر کچھ نہیں کہہ سکا کہہ کر
چھوڑ دیا کرتے تھے۔ پیچھے بچ جانا اور بار بار ہرانا گولاد کو
ڈھیس جتنا ہے اور لہا ایسا نہیں چاہتے تھے۔



ایک ضرب اور بھی اسے زندگی تیشہ بدست
سائس لینے کی سکت اب بھی مری جان میں ہے
اگلی صبح فارس قادی نے کاردار اینڈ سنٹر کے ہیڈ
آفس میں ہاشم اور جو ہرات کی موجودگی میں دھند
کیسے اٹھ کر ان سے باری باری ہاتھ ملایا اور چند
مصنوعی مبارک باتیں اور نیک تمنا میں سن کر وہ وہاں
سے چلا آیا۔ اس کے جانے کے بعد جو ہرات نے ہاشم
کو دیکھا۔

”وہ کراچی جانے کی بات کر رہا تھا۔ کیا واقعی وہ
ہماری زندگیوں سے چلا جائے گا؟ ہاشم!“
”اب سو ان کرنے کا وقت ہے تمہی ساشی کی ماضی
میں چھوڑ کر نئی زندگی شروع کرنے کا وقت ہے۔ اس کو
اس کی زندگی شروع کرنے دیں۔ جیل نے اسے
سارے سبق سکھا دیے ہیں۔ اب وہ انتقام اور انصاف
کے چکروں سے دور رہے گا۔“

وہ کافی مطمئن لگ رہا تھا۔ میوہ انیکسی کی چالی رکھی تھی۔ جو گنڈیل پیپر کے طور پر قارس اور ہر چھوڑ گیا تھا۔ یہ انیکسی لن کی ضد تھی اور وہ اور تک ذیاب کاردار کی وجہ سے اتنے سال خاموش رہے تھے۔ پھر بڑے بھی نہیں بننا چاہتے تھے اور اب وہ لن کی جھولی میں آگری تھی۔ کیا شان دار تھا؟ تھائی زندگی کل

”پراپر لپہ جیلے کی تیاری کریں میوہ“ وہ سکون سے بولا تھا۔ شیرو اور سعدی کے معاملے ذہن سے ہٹا کر وہ پراہر سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔

سری لنکا میں تین ہونے پراہر (ریڈ) ہوتے تھے۔ تینوں ”میوہ“ یعنی ماہ کامل (پورے چاند) کی راتوں کو ہوتے تھے۔ پہلا جنوری میں ہوتا تھا۔ سرفورڈی اور تیسرا جولائی میں۔ بیماری اور ہاتھیل کا لنگر مند سے شروع ہوتا اور شہر کی مختلف گلیوں کا چکر لٹ کر اپنی منزل تک پہنچتا تھا۔ پورا شہر اور پوری دنیا سے لوگ آکر فٹ پاتھ پر گھنٹوں گھڑے ہو کر بیڑے کے لن کی گلی تک پہنچنے کا انتظار کرتے تھے اور پھر اس کو گزرتے دیکھتے تھے۔ کاردار کو لیبو کا ایک پراہر پیش دیکھنے جاتے تھے۔ شہرین پہلے ساتھ جاتی تھی۔ لیکن اسپتال میں اس کو نہیں لے کر جا رہا تھا۔ شیرو سے اس نے پوچھا تھا کہ نہیں۔ سوئی کی جان تھی لن ہاتھیل میں۔ وہ اس کو لے جا رہا تھا جو اہرات کے ساتھ اور وہ مطمئن تھا۔

ماہ کامل کی رات سے دو روز پہلے گاڑڑ سعدی اور خاور کو ان کے کمروں سے نکال کر لائے اور ایک سرے کمرے کے دھاتی دروازے کھولے جو صرف نکلی سے کھلتے تھے اور لن کو اندر دھکیلا۔ وہ اس کی اونٹ کا تقریباً تمام حفاظتی کمو تھا۔ اندر دو لوہے کے پتنگ رکھے تھے۔

”ہمت جلد تم لوگوں کو اس جگہ سے منتقل کیا جا رہا ہے۔ تب تک تم لوہر روگے۔“ حیران سے سعدی کو بتایا گیا تو وہ فوراً خاموش کھڑی میری کو دیکھنے لگا۔ جیسے بے حد صدمہ ہوا ہو۔

”تم نے بتا دیا ان کو؟“ میری نے نگاہیں جو کھلیں۔

خاور نے ہنسے سعدی کو دکھا۔ ”تم نے اسے کیوں بتایا؟“

”میں سمجھا ہی جاتا چاہے گی۔ میری باتم ایسا کیسے کر سکتی ہو؟“ وہ بے حد رکھی لگا تھا۔ میری خاموشی سے باہر نکل گئی۔ اس نے اپنے کان کو لاپٹ لیے تھے۔ جب دروازے قفل در قفل بند ہوتے گئے اور وہ دونوں تنہا رہ گئے سعدی اس کی طرف گھول۔ ”تمہیں یقین ہے ہماری باتیں دیکھا نہیں ہو رہیں؟“

”کوئی بھی اپنی ذاتی جیل میں کیسے دیکھا یا سرویلنس نہیں لگا تھا سعدی یا آپ کو کیا مظلوم ڈی وی آر پہ بیٹھا گاڑڑ بک جائے اور وہ ویڈیو جو آپ کے خلاف ڈیٹا وارنٹ ہیں چاکر پولیس کو دے دے۔ پھر بھی مجھے چیک کرنے دو۔“

خاور کام پہ لگ گیا۔ دروازوں کو چھو کر منتقل کر محسوس کیا۔ کوئی چیک کیے پھر پتنگ صحیح کر کے حال اور ہمت کا معائنہ کرنے لگا۔

”موسمیری لہجہ نے وہی کیا جو میں نے کہا تھا۔“ سعدی کمری سانس لے کر اپنے بیڈ کے کنارے بیٹھا۔ ”تمہیں اتنا یقین کیسے تھا کہ میری ان کو بتا دے گی؟“

”وہ میرے لیے بہر روزی رکھتی ہے، مگر اسے اپنی جاب واپس چاہے گی۔ اسی لیے میں نے اس کو یہ موقع دیا تاکہ اس کی نوکری لے واپس مل جائے اور ہمارے بھانگے کے خوف سے ہمیں وہ اس سے شکستہ سیکورٹی سیل میں شفٹ کریں۔“ کہہ کر وہ ہمت کو دیکھنے لگا۔ میری کو لن دونوں نے کیسے استعمال کیا تھا؟ میری کو کچھ علم نہ تھا۔

”موسمیری سیل ہے جہاں ہارن ہیر نے اپنی بیوی کو رکھا تھا؟ اور اس کو یہ سیل سے نکالنے کے لیے تم نے رات بنایا تھا۔ ویسے کیا تم اسے نکالنے میں کامیاب ہو گئے تھے؟ کیا بتا تھا اس کا؟“

”تم میرے ہسٹ فرینڈ نہیں ہو۔ ایسے سوال مت پوچھو۔ آج رات سے ہم کام شروع کریں گے۔“

اب وہ دلی کواڑ میں کتا اس کو اس کے حصے کا کلام سمجھا رہا تھا اور سعدی یوسف جانتا تھا کہ یہاں سے نکل کر بھی وہ خاور مظاہر حیات کا قیدی ہوگا۔

درپیش صبح و شام یہی سیکھش ہے اب اس کا ہنوں میں کیسے کہ اپنا نہیں ہوں میں فارس قازی اس رات جس وقت ان کیسی پوچھا پورا گھر خالی خالی سا لگ رہا تھا۔ خالی دیواریں۔ سلن کے چیک شدہ ڈھیر۔ کارٹن۔ ڈمر کے (اسٹڈی کم ٹے گمرے) کہ دو ازبے پہ رک کر اس نے دستک دی۔ پھر اسے دھکیلا۔

وہ اپنے صوف کم بیڑے بیٹھی (جو زمین سے دو پاشت بنی اونچا تھا) فائٹرز سائے پھیلائے ٹوٹ بک یہ کچھ لکھ رہی تھی۔ بال جوڑے میں بندھے تھے اور ایک لٹ جھک کر کانڈ کو پھور رہی تھی۔ آہٹ یہ۔ جموری آگھیں اٹھائیں تو اسے جو کھٹ میں کھڑے دیکھا۔ ”آجائوں؟“ جیتڑی جیسوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا وہ سنہری آگھیں اس پہ جملے ڈر اسما مسکرایا تھا۔ ”تمہارا گھر ہے؟“ کو کیا جاؤ۔ ”وہ وہاں سر جھکا کر کلم کرنے لگی۔ فارس دو واہ بندہ کر کے اندر گیا اور اس کے ساتھ بیٹھا۔

”اب یہ میرا نہیں رہا میں نے بچا دیا۔“
”تمہارے اپنے بیٹے ہیں فارس۔ کسی کو کیا اعتراض ہوگا۔“

فارس خاموش رہا۔ یہ اس کی ماں کا گھر تھا اس کی عمر گزری تھی اس میں۔ ذر تاش کے ساتھ گزرا وقت۔ اچھی بری یادیں۔ وہ لمحے بھر کے لیے وہ سب سوچنے لگا پھر سر جھک کر ڈمر کو دیکھا۔
”کلنی بیوی؟“

وہ سر جھکائے ڈر اسما مسکرائی۔ (واوہ فارس قازی! آج آپ میرے لیے کلنی بنائیں گے!) اور چروا اٹھایا۔
”مشور۔“

”تمہیں نکس۔ میری کلنی میں چینی مت ڈالنا اور

کلنی زیادہ ہو۔“ اب وہ ٹیک لگا کر بیٹھ چکا تھا۔ زمری مسکراہٹ حجاب ہوئی۔

”ایک مشف ہم میں سے کون کلنی بنا رہا ہے؟“
”زمری بی! ابھی میں اتنا زن مرید نہیں ہوا کہ رات کے ساڑھے گیارہ بجے اپنی بیوی کے لیے کلنی بناؤں۔“ وہ کبھی نہ اٹھتی مگر اس نے اسے آپ کہا تھا۔ عرصے بعد۔ اچھا لگا تھا ہر کھنڈ پر کراٹھی۔
”صرف اس لیے بناری ہوں کیونکہ میرا اپنا دل چاہ رہا ہے۔“

تھوڑی دیر بعد وہ دو بھاپ اڑاتے کپ لیے اندر داخل ہوئی ایک اسے تھمایا اور دو سراخوٹے کر ساتھ بیٹھی۔ فارس انکوں انداز میں بیٹھا تھا اور وہ پیر اور سپیٹ کر دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے تھی۔ دونوں اپنی سرچوں میں کم گھونٹ گھونٹ کلنی پینے لگے۔
”کلن ہارون عبیدی کی چالے سید عمو ہیں ہم۔“
”یہ دعوت تمہاری گمراہ فریڈ نے دی ہے یا اس کے باپ نے؟“

وہ لپکا سا سن رہا اور کلنی کا گھونٹ بھرا۔ ”وہ میری گمراہ فریڈ نہیں ہے۔“

”وہ سواری میں بھول گئی تمہاری کوئی گمراہ فریڈ کیسے ہو سکتی ہے تمہارے تو بیٹس ایللی ہائی تھے۔“
”مستحق اللہ!“ اس نے حنکی سے اسے دیکھا۔
”میں صرف کلنی پینے گیا تھا۔ صرف ایللی ہائی بنانے۔ فوج نکالی، پچھڑیں اور آئیل۔ ایسی جگہوں پہ نہیں جانا میں۔“

”مجھے کیا معلوم۔ رات گئے تک گھر سے باہر ہوتے ہو۔ کہاں جاتے ہو گہرا کرتے ہو۔“ شائے لپکا کہہ گھونٹ گھونٹ کلنی پینے لگی۔

وہ مسکرا کر رہ گیا۔ ”نارٹل کھلا ایسی باتیں پوچھتے ہیں۔ ہم نارٹل نہیں ہیں۔“

”سعدی کی غیر موجودگی میں ہم میں سے کسی کی زندگی نارٹل نہیں ہو سکے گی۔ فارس! اس نے کپ پرے رکھا اور سجدی کی سے اس کی طرف مڑی۔ ”ہم اسے کیسے ڈھونڈیں گے اب؟ مجھے تو کوئی راستہ نظر

نہیں آتا۔“

پری اپنے لکڑی کے ساتھ رہتی ہے اور اس نے
آب حیات پی رکھا ہے۔

بدھ مت لوگ بلو کال کو مبارک جانتے ہیں،
کیونکہ بدھ کی زندگی میں سارے اہم واقعات بلو کال
کی رات کو پیش آئے تھے۔ وہ اس رات کو انسان کی
روحانی اور مذہبی زندگی کے لیے اہم سمجھتے ہیں، ان کا
عقیدہ ہے کہ اس رات انسان اپنے دین کی طرف پلٹتا
ہے۔

ہندوؤں کا ماننا ہے کہ چاند پانی کو جو تک کنٹھول کرنا
ہے اس لیے ساری دنیا کو کنٹھول کرنا ہے اور وہ اس کا
تعلق مقدس گائے سے جوڑتے ہیں۔ چند لوہان اس
بات پہ بھی ایمان رکھتے ہیں کہ بلو کال کی رات عید
لینے یا وعدے کرنے کے لیے اچھی نہیں ہے۔ طبی
ماہرین کہتے ہیں کہ چاند انسانی جسم کے اندرونی پانی پہ
بھی ایسے ہی اثر انداز ہوتا ہے جیسا کہ سمندر کی لہروں
پہ۔ دماغی امراض یا دے اور جلد کی بیماریوں میں جتلا
لوگوں کی حالت اس رات زیادہ خراب ہو جاتی ہے۔
Yale میں ہونے والی ایک تحقیق یہ بھی کہتی ہے
کہ پورے چاند کی رات اگر کسی کا خون سے تو وہ عالم
دلوں سے زیادہ ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ چاند کی چند مخصوص تاریخیں
کھنگھ (جاسم) گے لیے زیادہ شفا بخش ہیں اور قدیم
داستانیں یہ کہتی ہیں کہ اس رات کچھ (ویزہ لوف)
انسان بھیڑیے بن جاتے ہیں اور صبح ہوتے ہی ٹھیک
ہو جاتے ہیں۔ امریکی کہتے ہیں کہ انہوں نے چاند پہ
قدم رکھا تھا اور دنیا میں ہمت سے گنہگار کسی
تھیورسٹ اس بات کو ایک ڈرامے کے سوا کچھ نہیں
مانتے اور وہ ٹھوس دلائل سے ثابت کرتے ہیں کہ آج
تک کسی انسان نے چاند پہ قدم نہیں رکھا۔ نیل آرم
اسٹراٹک کی موت کے ساتھ ہی یہ راز کہ انسان نے
چاند کبھی کیا تھا یا نہیں بھی دفن ہو گیا ہے۔

اور دنیا والوں سے بے نیاز وہ چاند کی کا قتل اس
رات سرد سے آسمان پہ چمک رہا تھا۔ پورا مکمل پویا۔

”میں ڈھونڈ رہا ہوں، وہ مل جائے گا۔“ اس نے
تسلی دی۔ اور دمر نے اس پہ اعتبار کر لیا۔ وہ کرنا بھی
چاہتی تھی۔ پچھلے چند ماہ فارس کو جیل سے نکالنا ان کی
بڑا کام مسئلہ بن چکا تھا اور سعدی کی تلاش پلس منظر میں
چلی گئی تھی۔ کوئی اور چارہ بھی تو نہ تھا، مگر فارس کو رہا
ہوئے تین دن بیت چکے تھے اور تین دن سے وہ یہی
سوچ رہی تھی۔ کیا کرے؟ کیسے کرے؟

”ہاں، عید کی چائے تمہارے حلق سے اتر جائے
گی، یہ جانتے ہوئے کہ اس کا ہاتھ ہے اس سب
میں؟“ وہ کی دلہہ پہ بات اس سے کہہ چکی تھی اور
فارس کبھی اس پہ ہمو نہیں کرنا تھا۔ (اسم کا نام وہ
نہیں لگتی تھی، وہ لے کوئی ہی نہ بار آئے!)
”میرے حلق سے ہمت کچھ اتر جاتا ہے۔“ کپ
اشٹاٹھ کھڑا ہو گیا۔

”مکمل ہم سو کر جائیں گے مجھے پتا ہے تم تنگی
ہوئی ہوگی، مگر چائے پہ جانا ضروری ہے۔ تیار رہنا۔“
دمر نے صرف سر ملا دیا۔ وہ اب سوچ میں کم کھوٹ
بھرتا پتا ہر جا رہا تھا۔



میرے شوق کی بیخیں لاج رکھا!
وہ جو طور ہے ہمت دور ہے!
وہ ایک ساکن سی شام تھی۔ سردی گویا کھٹی، جمائی
تھی اور ہڈیوں کے اندر تک دو کر رہی تھی۔ آسمان پہ
پورا چاند چمک رہا تھا، ماہ کال۔ پویا۔ بدر۔

چینی پورے چاند کو ”چینی ری یونین“ کی علامت
سمجھتے ہیں۔ ماہ کال کی رات چینی خاندان کے دور مقیم
بٹے بیٹیاں لوٹ کر اپنے گھروں کو آتے ہیں۔ ان کا کہنا
ہے کہ ”گاؤں کے (خاندانی گھر) کے آسمان کا چاند زیادہ
چمکیلا ہوتا ہے۔“ ساری دنیا کہتی ہے کہ جوڑے
آسمانوں پہ بننے ہیں مگر چینی کہتے ہیں کہ جوڑے بننے
آسمانوں پہ ہیں مگر ان کی تباہی چاند پہ ہوتی ہے۔ ان کی
لوک کہانیاں میں آتا ہے کہ چاند پہ چانگ اسی نام کی

بھی منافق نہیں ہوتا پھر منافق کون ہوتا ہے بھلا؟
 ”جو بات کرے تو جھوٹ بولے امانت رکھے تو اس
 میں خیانت کرے لڑے تو کھل بولے وعدہ کرے تو اس
 کے خلاف کرے۔“

”جھوٹا خان“ وعدہ خلاف اور بد زبان۔ ”بچنے
 انگلیوں پہ گتوایا۔“ یہ چاروں بیان میں سے ایک سچ بھی
 کسی میں ہو تو وہ منافق ہوتا ہے۔ جھوٹ زبان سے بولا
 جاتا ہے کھلی زبان سے دی جاتی ہے وعدہ زبان سے کیا
 جاتا ہے امانت کی ذمہ داری زبان سے لی جاتی ہے۔“

حتمی نے اذیت میں سر ہلایا۔
 ”تو کیا چیز منافق کو نماز سے دور کرتی ہے؟“
 ”اس کی زبان! وہ سچو گی۔“

”جھوٹ، خیانت، بد زبانی، غلط الفاظ بولنا، بات سے
 پھر جانا، حیلے بھانے کرنا، عقیقت کرنا کہ مسلمان کی عزت
 بھی ہمارے پاس امانت ہوتی ہے، یہ سارے گناہ انسان
 کو دوغلا بنا دیتے ہیں۔ گناہ کر دیتے ہیں۔ ان سے دور
 رہو گی تو نماز کے قریب آؤ گی۔ اب یہ مت کرنا کہ
 فلاں تو اتنا جھوٹا اور بد زبان ہے مگر پھر پڑھتا ہے ہمیں
 کچھ نہیں پتا معلوم کیسی نماز پڑھتا ہے نہ کسی کو
 بول سچ کرنا چاہیے۔ صرف اپنا معاملہ سمجھو۔“
 حتمی کے اندر باہر کچھ بل کر رہ گیا تھا مگر وہ بولے
 جاری نہیں۔

”یہ تو ہو گیا کہ نماز سے کیا روکتا ہے اب بتاؤ نماز
 خود کیا ہے؟“ بچھلی دفعہ کا سوال دہرایا۔ وہ اب بھی
 چپ رہی۔

”بات کرنا“ جسے معراج پہ عطا کی تھی رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ معراج یہ وہ اللہ سے ہم کلام
 ہونے گئے تھے ہم تو نہیں جاسکتے آسمانوں پہ ہم تو طور
 یہ بھی نہیں جاسکتے تو ہمارے شوق کلام کی لانج اللہ نے
 نماز کے ذریعے رکھ لی ہمارا طور ہماری معراج ہماری
 نماز ہے اس کی عادت پکی ہونی چاہیے کیونکہ اگر ہم
 اپنے بچوں کو نماز کے لیے ویسے نہیں اٹھاتے چسے

فارس عازدی کا خاندان ایک پوش علاقے سے اس
 بچکے میں آبا تھا۔ بچکے سبز بیلوں سے ڈھکا تھا اور کھلی
 خوب صورت تھا۔ انیکسی سے کئی گنا کم قیمت مگر اس
 سے کہیں زیادہ کھلا اور بڑا۔ ہر کسی کو اس کا اپنا کرا لے
 گا۔ سیم اس بات پہ خوش تھا اور اب ندرت حسینہ اور
 صداقت کے ساتھ مل کر سامان رکھوا رہا تھا۔ سب
 تھک بھی گئے تھے اور اس وقت وہ محل تھا کہ ندرت
 کچھ مانگیں تو حنہ اور سیم ایک دوسرے کو اشارہ
 کرتے۔ ”متم قریب ہو تم اٹھاؤ گے۔“ اور یہ تو بہن
 بھائیوں کا پرانا اصول ہے کہ ”قریب“ والا ہی کلام
 کرے گا سونیا وہ شامت سیم کی آرہی تھی۔

مگر کسی حد تک سیٹ ہو چکا تھا، ذرا اور فارس
 چائے چاہئے تھے۔ حتمی اب صرف خالی خالی سی
 تھی۔ قہر کو گردن لوٹتی کر کے دیکھنے کی اتنی عادت
 ہو چکی تھی کہ اب گردن اور دل دونوں دیر کرنے لگے
 تھے۔ اتنے دن سے نماز نہیں پڑھ رہی تھی۔ نہ لوانہ
 تھا، دل ویران تھا۔ سوائی کی ڈانٹ ٹیٹ کو ان سنی
 کر کے وہ اپنی بچھ کے پاس چلی آئی تھی ان کا گھر چند
 منٹ کے فاصلے تھا۔ (وہ اپنے پرانے
 علاقے میں رہتورنٹ کے قریب ہی آئے تھے)
 اب ان کے ڈرائنگ روم میں ان کے سامنے سر
 جھکائے بیٹھی وہ ایک دفعہ پھر اپنی کمزوریوں کا اقرار
 کر رہی تھی۔

”نماز کی عادت نہیں بنتی وہ کیا کرے؟“ وہ ٹیک
 اتار کر اسے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

”دیکھو اور مغرب تو سب پڑھ ہی لیتے ہیں، لیکن عصر
 کس کی قضا ہوتی ہے اور فجر اور عشا کون چھوڑتا
 ہے؟ کیا آتا ہے حدیث میں۔“
 ”منافق! وہ حدیث بولی۔“

”اور منافق کون ہوتا ہے؟ کافر؟ مشرک؟ ہندو؟
 یہودی۔“

حتمی نے نفی میں سر ہلایا۔
 ”چوری کرنے والا منافق نہیں ہوتا حتیٰ کہ بدکار

لفظ نشتر کی طرح دل میں اتر جاتے ہیں
خط محبت کا بھی وہ لکھتا ہے کھوار کے ساتھ
اسلام آباد میں اس چھ ستارہ ہوٹل کے زرد
دوشنبوں سے جگمگاتے شاہانہ طرز کے ڈائمنگ امیریا
میں ایک میز پر وہ چاروں براہمن تھے اور میرے اوپر
سے اسٹائے طعام پیش کر رہے تھے۔ وہ یوں بیٹھے تھے
کہ میز کے ایک طرف آلی اور ہارون تھے اور دوسری
جانب وہ دونوں۔ ہارون شلوار سوٹ کے اوپر کوٹ
میں بلبوس مسکرا کر آب دار سے پوچھ رہے تھے کہ اس
نے اپنے مہمانوں کے سامنے اپنے والد کی شکستہ کی
ہیں یا نہیں۔ آلی بھی مسکرا کر کہہ رہی تھی کہ ایسا کچھ
نہیں ہے۔ اس نے سرخ اسکارف کشمیری لڑکیوں کے
انداز میں چہرے کے گروپٹ کر پیچھے ڈال رکھا تھا۔
کالوں میں زمر اور ڈائمنڈ ٹیبلٹس روک رہے تھے۔
مجھے سفید مٹام سا سوئیٹر تھا جس کی ہالی ٹیک کے اوپر
زرد کا لیکسل جگمگا رہا تھا۔ وہ خوش اور آسودہ لگ
رہی تھی۔ بولنے کے ساتھ ساتھ مسلسل کھا رہی
تھی۔

فارس ابھی تک خاموش تھا۔ چہرے پر وہ رسمی
مسکراہٹ سجائے وہ گہرے شرٹ پہ سیاہ کوٹ پہنے
ہوئے تھا۔ کبھی وہ سنہری آنکھیں اٹھا کر ہارون کو
دیکھ کر مسکرا کر ان کی بات کا جواب دے رہتا پھر سر جھکا
کر پیٹ کی طرف مصروف ہو جاتا گو کہ وہ زیادہ کھا
نہیں رہا تھا۔

زمر کج دل سے تیار ہوئی تھی۔ آلی کے کورے
سفید رنگ کے برعکس اس نے سلگ کی سیاہ لمبی ٹیپس
پہن رکھی تھی۔ کھنکھرائے بھورے ہل سامنے سے
ذرا سا پیچھے کر کے پن لگا کر کھلے چھوڑ دیے تھے اور
بھوری آنکھوں میں گہرا کجل تھا۔ جب کوئی اسے
مخاطب کرتا تو وہ آنکھیں اٹاپے جاکر جواب دیتی اور پھر
اوجھڑا ہر دیکھنے لگ جاتی۔
مصنوعی باتیں مصنوعی روٹھنیاں۔

”سوفارس غازی۔ آپ کتنا عرصہ جیل میں رہے
ہیں؟“ بران کا ٹکڑا کانٹے میں پھنساتے ہارون نے
سرسری انداز میں سوال کیا۔

آلی ذرا غیر آرام نہ ہوئی، مگر فارس نے مسکرا کر
انہیں دیکھا۔ ”آپ سے تین سال کہ۔“
ہارون کو اس کے جواب نے چونکایا بھی اور محظوظ
بھی کیا۔ لقمہ چباتے ہوئے مسکرا دیے۔

”میں نے ساڑھے سات سال کی قید کاٹا ہے۔ نکل
ملا کہ تین دفعہ جیل جا چکا ہوں۔ تم ابھی مجھ سے بہت
پیچھے ہو۔“ طرز مخاطب بدل دیا۔ آب دار نے آسودہ
سی سانس لی۔ زمر خاموش نظر رکھا ہے بلکہ فارس اور
ہارون پر ڈال لیتی تھی۔

”آپ جیل بھی رہے ہیں، آپ اے کلاس قیدی
تھے۔ میں سی کلاس قیدی تھا۔ آپ میرا مقابلہ نہیں
کر سکتے سزا۔“

آلی کے ابرو تعجب سے اکٹھے ہوئے۔ ”آپ تو
اٹلی جنس آفیسر تھے، بڑھے لکھے تھے، اچھے خاندان
سے تھے، آپ کو تو عدالت کو اے کلاس الاٹ کرنی
چاہیے تھی۔ تعلیمی خاندانی پس منظر اور چاب وغیر
کی بنیاد پر یہی قیدیوں کی کلاس کا تعین کرتی ہے نا
عدالت۔“ اور تائیدی نظروں سے زمر کی طرف دیکھا
جس نے محض سر ہلادیا۔ (ہا ہے تو مجھ سے کیوں پوچھ
رہی ہے؟)

”عدالت نے میری کلاس ”بی“ مقرر کی تھی، مگر
چونکہ میں ہارون عید نہیں تھا اس لیے جیل کے اندر
مجھے وارڈن کی مرضی کے ہلاک میں بچنا گیا تھا۔ وہ
مردم مسکراہٹ کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کرتا رہا تھا۔

”اور اس دفعہ؟“ ہارون نے تشویش سے پوچھا۔
”اس دفعہ میں اپنی مرضی سے سی ہلاک میں گیا
تھا۔“ اور مسکرا کر سر جھکاے کانٹے کے کمانے کا ٹکڑا
توڑنے لگا۔

”جیل کیسی ہوتی ہے؟“ آلی اب کما نہیں رہی
تھی۔ کنڈیاں میز پر رکھے، آگے ہو کر بیٹھی، پورے
دھیان سے اس کی طرف متوجہ تھی۔

میں تو وہ تکلیف دہ آپ کے اندر بہت کچھ مار دیتی ہے اور دن کی روشنی میں تو ویسے بھی مارنے والے بہت ہوتے تھے۔

اپنی پلیٹ کو دیکھتے ہوئے وہ کہتا جا رہا تھا۔
 ”ہر روز شام پانچ بجے قیدیوں کی چیکنگ ہوتی تھی۔ قطار میں جاؤں گی طرح کھڑا کر کے ان کا معائنہ کیا جاتا تھا۔ صرف مارنے، پینے کا برانا تھا اور کھانا۔“ میسر تھی انواع و اقسام کی ڈشز کو دیکھ کر وہ مسکرایا۔ زخمی ہنسی کا اظہار کیا۔

”قانون کے مطابق ہر ہفتے میں تین دن چکن اور ہفتہ ملازی ہے، بریانی بھی سنے کی اور دو وقت کی چائے بھی۔ صبح ٹہنٹے میں سبزی کی بھجیا بھی ملے گی، ٹکری سب کلاس قیدی اگر گوشت کی شکل دیکھتے ہیں تو وہ بڑے فلو سے مری ہوئی مریضوں کا ہونا تھا یا پھر ہونامی نہیں تھا۔ وال اور سبزی کی بھی سب سے سستی قسم کی تھی کھانے میں۔ ایک احسان حکومت کرتی ہے کہ گھر کا کھانا الاؤڈ (اجازت) ہے، مگر میری بہن جو حلوائے، میوے اور کھانے میرے لیے بھیجا کرتی تھی وہ بہت کم کچھ تک پہنچتا تھا۔ راستے میں ختم ہو جاتا تھا۔ میں ان کو منع کرتا تھا کہ وہ محنت نہ کیا کریں۔ میں نے زندگی میں اس سے پہلے کبھی رشتہ بندی نہ کی، لیکن یہ کام بھی جیل میں شروع کیا۔ والوں کو پانچ سو روپیہ فی ہفتہ ماہ وار دو تو چار پانچ لوگ مل کر اپنا چھوٹا لگا سکتے ہیں اور اپنا کھانا لگا سکتے ہیں۔ جگہ جگہ پانچ پانچ لوگوں نے گروپ بنا کر یہ کام شروع کیا ہوا تھا۔ اسے ”پانچویں وال“ کہتے تھے۔ میں بھی اس ”غیر قانونی“ اور ”رشتہ انگیز“ کام میں چار سال شامل رہا، کیونکہ میں نظروں والی وال اور مری ہوئی مری نہیں کھا سکتا تھا۔ ہمارے جیسے معاشروں میں۔ جہاں قانون نام کی کوئی چیز نہیں ہے، اپنی بقا کے لیے انسان قوانین توڑنے پر مجبور ہو جاتے اور اس کے پاس دو سرا کوئی راستہ نہ ہو تو کیا یہ کرنا غلط ہو گا؟ اسی لیے اسہنی۔ امر شفیع جب کہتا ہے کہ پرزن رائٹس ملنے چاہیے ہیں تو وہ ٹھیک کہتا ہے۔“

”جیل۔“ فارس نے رک کر سوچا۔ اس کے چہرے پر یہ تکلیف سی ابھری۔ پھر اس نے نگاہیں اٹھا کر آپ وار کو دیکھا تو سنہری آنکھوں میں کچھیلی سی تھیں۔

”جیل میں آپ اکیلے ہوتے ہیں۔ کوئی آپ کا دوست نہیں ہوتا۔ کوئی آپ کا خیال نہیں کرے گا۔“ اسے بہت کچھ یاد آیا۔ ”جب میں جیل میں گیا تو سب سے پہلے مجھے ایک کمرے میں جانا تھا۔ قراطین سے ملنے۔“

”قراطین۔؟“ کلبی اور ہارون دونوں نے نا بھگی سے اسے دیکھا۔

”ان کا مطلب ہے کورٹائمن“ ذمر نے سنجیدگی سے وضاحت کی۔ وہ بالکل چُپ سی ہو گئی تھی۔ یہ سب اس کے لیے بھی تکلیف دہ تھا۔
 ”تھمپا کستان میں کورٹائمن“ نہیں ہوتا۔ قراطین ہونا ہے۔ جیل کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ اپنے لیے ہوتے ہیں۔“ پھر کلبی کے ہنوز اچھے چہرے کو دیکھ کر کہنے لگا۔

”قراطین وہ شخص ہوتا ہے جو سنے قیدی۔ جس کو آپ امر کی فلموں میں ”سینس“ کہہ کر پارکارتے سنی ہوں گی۔ اس نئی چھٹی کو قراطین کے پاس سے گزرتا بڑا ہے۔ وہ اس کو اس کی کلاس اس کا بلاک اس کی بھوک اس کے ذمے کی مشقت سب کچھ لاث کرنا ہے۔ قراطین جیل کا بادشاہ ہوتا ہے۔ وہ قیدی کو پہلی ملاقات میں اسے نہ مارنے کے چیکس ہزار لیتا ہے۔ وہ قیدی کو ہاتھ تک نہ لگانے کے چائیس ہزار لیتا ہے۔ وہ ہلکا کام دینے کے بیٹھہ ہزار لیتا ہے اور یہ رقم ہر مہینے قیدیوں سے ملنے آنے والوں سے لیا کرتا ہے۔ وہ ملے کرتا ہے کہ آپ کی جیل میں قسمت اور زندگی کیسی ہونے جا رہی ہے۔ اگر آپ اس کو ذرا سا بھی خفا کریں تو قراطین بادشاہ آپ کو بدنام زمانہ مجرموں میں ڈال دیتا ہے اور آپ پوری پوری رات اس خوف سے سو نہیں سکتے کہ آدھی رات کو کوئی آپ کو صرف تکلیف پہنچانے کے لیے چہرہ مار جائے گا اور آپ نہ بھی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ✦ ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

نے چونک کر پہلے آئی کو دیکھا پھر ذمہ کو اسے بُرا لگا تھا اور وہ ناگواری سے ٹوکنے لگا تھا جب۔

”آف کورس۔ میں نے فارس کو گرفتار کروایا تھا۔ وہ آئی کی آنکھوں پہ نظریں جمائے مسکرا کر بولی تھی۔ ”کیونکہ مس عبیداء میں نے ساری زندگی لوگوں کو انصاف دلوانے کے لیے جدوجہد کی ہے۔ اگر میرے اپنے خاندان میں میرے وژن آف ٹو جھ کے مطابق کوئی شخص مجرم ہے تو میں انصاف کے حصول کے لیے اس کے خلاف بھی کڑی ہوں گی اور قانون کی پوری مدد کروں گی۔ کیا آپ ایسا کر سکتی ہیں؟“

گردن اٹھا کر وہ ہموار حمر غریزہ لہجے میں بولی تھی۔ (دل پہ جو گزری سو گزری۔)

آب وار کا چو پیکا پڑ گیا اس نے بمشکل تھوک نگلا۔ بارون نے بھی اتنی ہی نظروں سے اسے عبور۔

”شاید میں ایسا نہ کر سکتی۔ آئی ایم سو ری۔ میں نے سنا تھا آپ نے سٹی یوسف کے میڈیٹل ڈسٹریہ کیا تھا۔ (بارون نے غیر آرام دہ پہلو بدلا۔) کہ آپ کے پیچھے نے آپ کو اپنا گروہ ڈونٹ کیا تھا یہ سب بہت مشکل ہو گا آپ کے لیے۔ اس کا کھوجانا۔“ وہ اب سخت الفاظ کا اثر ڈال کر کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ذمہ نے گہری سانس لی۔ ”مجھے نہیں پتا وہ کون ہے مگر مجھے امید ہے کہ وہ زندہ ہے۔ ان آٹھ ماہ میں میں چند لکھوں کے لیے بھی اپنا فون آف نہیں کرتی اس ڈر سے کہ وہ کل کرے گا اور اگر میں نے نہ اٹھایا تو کیا ہو گا؟ کیونکہ مجھے پتا ہے وہ سب سے پہلے مجھے کل کرے گا۔“

میزبہ خاموشی کا دورانیہ بٹھ گیا پھر بارون نے ہمدردی اور اپنائیت سے پوچھا۔ ”وہ کس طرح کا انسان تھا؟“

”مہمان، نرم دل اور۔“ ذمہ کہنے لگی مگر فارس نے چرواٹھا کر اطمینان سے کہا۔ ”مقرب کار۔“

سب نے چونک کر اسے دیکھا اب وہ سر جھکا کر پلیٹ میں چھری کاٹتا چلائے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”اس نے اپنے خاندان کے ہر فرد کو یہ یقین دلوا رکھا تھا کہ

وہ فہر اور سر جھکائے کٹنے کو پلیٹ میں پھیرا۔ میرا محور کن سا سناٹا تھا۔ آئی کا گلا رندہ چکا تھا اور آنکھوں میں پانی تھا۔ ذمہ بالکل خاموش اور ساٹھی ہمدان نے گہری سانس لی۔

”تمہارا واقعی مجھ سے کوئی مقابلہ نہیں ہے۔“ وہ جیسے پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھے۔

”مگر تم نے قرطین والی بات پوری نہیں بتائی۔ رشوت تو تم نے ہائی وال کو پہلی دفعہ دی تھی۔ تو قرطین کو کیا دیا؟“

فارس ان کو دیکھتے ہوئے ذمہ سا مسکرایا۔ ”اس سے پہلے ملاقات کرنے والے خوف سے کلب رہے ہوتے تھے وہ بلاشبہ تھا ان کو کچھ بھی کہہ سکتا تھا ان کی عزت کا جناح نکل سکتا تھا میرے ساتھ اس نے کنگو میری پوری کے نام سے شروع کی تھی۔“

آئی کا سانس رک گیا۔ ”اور آپ نے کیا کیا؟“

”میں نے اسے مارا۔“ اپنی امید کی طرف اشارہ کیا۔ ”میرے خون نکلنے لگا تھا اس کا۔ باہ ٹانگے آٹھ کے قریب لگے تھے اس نے مجھے ہی کلاس میں بدنام زبان بجز میں کے ساتھ شفقت کروا۔ تب وہ جیل میں ایک مہلا احمدی سے پرفائز سرکاری ملازم تھا۔ آج وہ اسی جیل میں قید ہے۔“

”اور اس کو قید کس نے کروایا؟“ آب وار نے سانس روکے پوچھا۔ وہ ذمہ سا مسکرایا۔

”شاید کسی نے اپنی پوری کے کردار پر حملہ کرنے کا انتقام لیا ہو اور صرف مارنے سے اس کا دل نہ بھرا ہو۔“ اور کندھے اچکا کر پوری توجہ سے کہا۔ ”لگا۔ آئی بے اختیار مسکرا دی۔ اسے اس لیے فارس سے غر ہوا تھا۔ نگاہیں موڑ کر بارون کو دیکھا۔ وہ بھی اس کی کہنی سے لطف اندوز ہوتے دکھائی دیتے تھے۔ آب وار کی گردن مزید آڑ گئی۔ اس نے ذمہ کی طرف چوٹ مہلایا۔

”اور آپ نے ڈلویا تھا فارس کو قید میں ہے نا؟“

بہت سادگی اور معصومیت سے اس نے ذمہ کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا تھا۔

”جیسے بھر کے لیے اس میزبہ شدید تاؤ ڈر آیا۔ فارس

سب سے زیادہ محبت وہ اسی سے تو کرتا ہے، رازدار بھی وہ اسی کا ہے، اور سب سے بڑی قربانی وہ اسی کے لیے دے گا۔ جب وہ نہیں رہا تو ہمیں معلوم ہوا کہ ہم میں ہر شخص ہی خود کو سحری کا سب سے اچھا دوست سمجھتا ہے، اے شخص کو آپ فریب کار نہیں کہیں گے تو کیا آپس گئے؟

زمر کی آنکھوں میں آنسو آگئے، مگر اس نے کمال ضبط سے ان کو اندر آنا لیا۔ اس نے فارس سے سحری کا ذکر بہت کم سنا تھا اور اس طرح تو شاید پہلی دفعہ ہم پر ملے کہ وہ اسے بولنے کا موقع برقی تھی؟

”فارس غازی!“ بارون نے بہت اُمید سے اسے دیکھ کر کہا۔ ”میرے لیے کام کرو۔“

”میں جا بجا اٹھو چاہتا ہوں، نہیں دیا کرتا اور آپ سے اتنے اچھے دوستانہ ماحول میں ملاقات کرنے کے بعد میں آپ کے لیے کام کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا“ کیونکہ دوستوں کے ساتھ کاروبار نہیں کیا جا سکتا۔

”مگر تم سیاست دان ہوتے تو اتنی جیل کٹ کر ووٹ ملتے سیاست دان نہیں ہو اس لیے اب تو کئی تک ملنا مشکل ہوگی۔ تو کئی کے بغیر تمہارا کیا بنے گا؟“ وہ سمجھانے والے انداز میں کہہ رہے تھے۔

فارس بند ہو نکلے سے لقمہ چبائے ہوئے مسکرایا اور ذرا آگے کوچک کر بارون کی آنکھوں میں دیکھا۔

”آپ ایک بے گناہ آدمی کو ایک بدنام زندہ جیل کے سی بلاک میں بے رحم اور خطرناک وحشت گردوں، اسمگلرز اور قاتلوں کے ساتھ چار سال کے لیے بند کریں اور اگر وہ سوائیو کر جائے تو کیا اس کے کچھ بن جانے میں آپ کو شک ہوتا ہے؟“

بہت عرصے بعد بارون کو کسی نے اتنا محفوظ کیا تھا۔ مسکرا کر انہٹ میں سر ہلایا۔ ”میری پیش کش تمہاری میری ذمہ داری ہے۔ مجھے جواب کا انتظار رہے گا۔“ اتنی بھی ہائیدی انداز میں مسکرائی اور زمر کو بتائیں کیا ہنر کچھ بہت بڑا لگ رہا تھا۔



تم بڑے لوگ ہو، میرے ہی گزر جاتے ہو

ورنہ کچھ تنگ سی گھلیاں بھی ہیں بازار کے ساتھ کو لبوہ شام کی تاریکی پوری طرح چھا چکی تھی۔ شہر کی چھپائی پتیاں روشن ہوئی تھیں۔ اسٹیوٹ بہتھر کوزے تماش بینوں کا رش بڑھتا جا رہا تھا۔ ایسے میں تاریک ایلی ویٹر شافٹ۔ میں وہ کٹنی اور چہ آئے تھے اور نیچے لوہے کی چادروں کو مسلسل توڑنے ٹکٹنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ چند گارڈز اور بھی دوڑے تھے، کہیں تو کھلتی ہوئی وہ شافٹ، مگر موٹوں کے نشوون پھینکی ہی نہیں تھی۔

تیسری منزل پہ رک کر خاور نے دیوار پر دستک دی۔ روحم میں۔ عین دلچسپ وہاں جو کور سا کارڈ بورڈ لگا تھا۔ اگلے ہی لمحے کارڈ بورڈ اندر سلائیڈ ہوا اور روشنی نظر آئی۔ آگے ایک کھلی ہوئی لماری تھی۔ وہ دونوں یکے بعد دیگرے لماری کے اندر سے ہو کر اس کمرے میں آکھڑے ہوئے۔ اتنے عرصے بعد سحری یوسف نے کوئی اور کمرہ دکھا تھا۔ روشن اور ہوا دار۔ مگر اس نے ضبط نہیں کھویا۔ سنبھلا ہوا محتاط کھڑا رہا۔

ساتنے کچن کا ہیڈ شیفت کھڑا تھا۔ ان کو اندر لاکر اس نے جلدی سے کارڈ بورڈ برابر کیا اور لماری سے ایک بیگ نکال کر خاور کو تمباہیا اور لماری کو لاک کیا۔ ”سو تمہیں ہمارے۔ مطلب کرنل خاور کے بیانات ملتے رہے تھے؟“ سحری نے خاور کو بیگ کی زپ کھول کر اندر تمام چیزوں کی تسلی کرتے دیکھا تو شیفت کو مخاطب کیا۔

خاور سینٹروچ کے رہیے۔ کونے میں الفاظ لکھتا تھا اور توڑ موڑ کر بیٹھ میں رکھ دیتا۔ سارا کوڑا میری بن میں پھینک دیتی۔ روز شام کو گارڈز کو ڈا اور پکن میں جا کر ڈال دیتے۔ شیفت ایک ایک رہے چیک کرنا تھا۔ یقیناً اس کو بیخام ملتے تھے۔

”کرنل خاور کے مجھ پہ احسان ہیں۔ میں ان کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ تمہارے لیے نہیں۔“

دو ذریعہ نظروں سے سحری سے خشک لمحے میں کہا اور کپڑوں کا بیگ تمباہیا۔ وہ بھی بس اسی کو کھورنا ہوا

آگے بڑھ گیا۔ خلود اب اس کے شانے کو تھپک کر اس کا شکر یہ لدا کر رہا تھا۔
 نیچے لابی میں ہاشم کا روادار نمودار ہوا۔ وہ بیٹھا بیٹھا کا جو اب دے رہا تھا۔ گلاب بگ بگ سے کھڑی یہ بھی نظر ڈال لیتا۔ براہ راست اس کے اسٹریٹ تک پہنچنے میں کم وقت نہ کیا تھا۔

اور تیسری منزل کی لفٹ کے دروازے کھلے اور اندر خلود اور سعدی کھڑے نظر آئے۔ سیاہ پیٹنٹ سفید شرٹ اور سیاہ کوٹ پہنا تھا۔ وہ بیٹھنے کی مخصوص ٹوپی پہناتے۔ وہ دونوں باہر نکلے۔

”سی سی بی وی آر کی پوائنٹ ہو چکے ہیں۔ کنٹرول میں کوئی نہیں نہیں دیکھ سکتا، بس کسی شاسا گاڑ سے نہ ٹکرائے۔“ خلود اس کو ہدایت دے کر رواداری میں ایک طرف کو چلا گیا اور سعدی سر ہلا کر ٹرائی دھکیلتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔

نیچے بیٹھے ممبروں سے ہاشم کی طرف دو گاڑز تیز چلتے آئے تو ریس الٹ سا ہوا۔ ہاشم کو کرا کر اس نے چواٹھایا اور ان دونوں کے چولہے پڑنی ہو ائیاں دیکھ کر بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہ جلدی جلدی گھبراہٹ میں اسے کچھ بتا رہے تھے اور ہاشم کے چہرے کی رنگت خنجر ہو رہی تھی۔ پھر وہ بے اختیار آگے کو بھاگا۔

سعدی یوسف سر جھکائے ٹرائی دھکیلتے۔ رواداری کے موڑ پہ آٹھرا۔ گردن نکال کر اگلی راہ داری میں جھانکا۔ ایک کمرے کے بند دروازے کے باہر دو مستعد گاڑز کھڑے نظر آئے۔ سعدی نے جیب سے شو بالٹ کی ڈبی جتنی شے نکالی، پھر سانس روک کر اس کا ڈھکن گھمایا اور جھک کر زمین پہ آگے کو لڑھکا دیا۔ وہ گاڑز کے قریب بنا آواز کے لڑھک کے ٹھہر گئی۔ اس میں سے بغیر رنگ کی گیس نکلنے لگی۔ لوٹ میں کھڑا ناک بہ دھال رہا۔ سعدی دھڑکتے دل سے کھڑی دیکھنے لگا۔ ایک منٹ۔ دو۔ ساڑھے تین منٹ بعد اس نے گاڑز زمین پہ لڑھک چکے تھے۔ بے حس اور بے

سرد۔ وہ ٹرائی دھکیلتا جیڑی سے آگے آیا اور مختلف دروازے کے سامنے ٹھہرا۔ دوسری جیب سے ماشکی کارڈ نکال کر دروازے میں لگایا۔ دروازہ کھولا اور ان دونوں کو نصیحت کر دوسرے کمرے میں ڈالنا۔ پھر ان کو وہاں ملاک کر کے اس کمرے تک پہنچا۔ جہاں وہ بیٹھے رہے تھے۔ ابھی وہ دروازے کے قریب گاڑز لے کر گیا تھا کہ۔

”Savan“ مختلف سمت سے ایک اسی حلے والا بیڑا آتا دکھائی دیا اور قدرے خشکی سے سنہلی زبان میں اسے مخاطب کیا۔ سعدی بالکل مجبور ہو گیا۔ پھر لگا سا چوموڑا۔

”Savanir! ehidi tuva ve“ پھر ذرا اونچے سے اسے دیکھا۔

”oba alut“ (کیا تم نئے ہو؟) وہ ایک انجان زبان میں سعدی یوسف سے بات کر رہا تھا اور جواب مانگ رہا تھا۔ سعدی نے گہرا سانس لیا۔

”danne nae oba ahanna“
 ”Mama“ (مجھے نہیں معلوم۔ نیچے جا کر خود معلوم کر لو۔) اور رخ موڑ کر ٹرائی میں جیڑس درست کرنے لگا۔ بیٹھ بیٹھا ہوا آگے بڑھ گیا اور سعدی یوسف نے دل میں اس دن کے لیے شکر ادا کیا۔ جب اس نے فارس غازی کے پیغام پر عمل کر کے خلود کو اپنا صاحب المسجن بنایا تھا۔ گزارے لائق سنہلی صرف وہی اس کو سکھا سکتا تھا۔

”وہ تمہیں نیچے بلا رہے ہیں، کب سے کل کر دیا ہوں۔ جلدی جاؤ، مٹھے میں ہیں۔“ وہ کوئی انجان مگر غیر ملکی لڑکی تھی، اس کو انگریزی میں ڈھٹا تو قدرے پریشان ہو گئی اور جلدی سے باہر کو بھاگی۔ سونیا نے گردن کھما کر پیچھے دیکھا۔ سعدی فوراً ”پلٹ گیا۔ جب لڑکی باہر نکل گئی تو اس نے دروازہ بند کیا اور ٹوپی اتارتے ہوئے آہستہ سے سونیا کی طرف گھوما۔

”میلو پرس۔“ اسے مسکرا کر کہتے ہوئے وہ قریب آیا۔ سونیا کے ابو اکٹھے ہوئے۔ معصوم چہرے پہ جیرانی اور ابھمن ابھری۔ خوب صورت آنکھیں

سکریں۔

”مسعدی“ وہ بچان کر اسٹول سے اٹھی۔ سرخ لمبی
میکسی میں وہ اٹلی کی چنی ہلے بے حد خوب صورت
لگ رہی تھی۔
”تم تو چلے گئے تھے۔“ اپنی عمر کے لحاظ سے وہ
صرف اتنی جوان ہو سکتی تھی۔ وہ قدم قدم چلتا اس کے
قریب آ بیٹھا اور نرمی سے اس کے دونوں ہاتھ تھامے۔
”مگر میں واپس آ گیا ہوں سوئی کے ساتھ ایک کیم
کھینے یا رہے۔ جب میں تہیاری می سے ملنے آیا تھا
جب تم دونوں فلم دیکھ رہی تھیں۔ سال میں اور پھر میں
نے تمہارے ساتھ ایک کیم کھیلا تھا۔“ سوئی کی
آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ شرارت سے مسکرائی۔
”اگلی رات۔“

”سو۔ سوئی۔“ مسکرا کر اس کی آنکھوں میں دیکھ
کہہ دیا۔

”Wanna build a snowman.
Do You

اور سوئی کھلکھلا کر ہنس دی۔ گردن پیچھے پھینک
کے دل کھول کے۔ اس کو یہ فکروں جیسے گرد گرد آتا تھا۔
نیچے خانے کے دروازے کھلے بڑے تھے اور ہاشم
وسط میں کھڑا سرخ چرے کے ساتھ گاؤڑیہ گزارا تھا
چل رہا تھا۔ ”وہ کہاں جا سکتے ہیں۔ وہ ڈھونڈو ان کو۔ وہ
ہول میں ہوں گے، ٹریکر سے ڈھونڈو۔“ اور گرد
افرا تفری مچی تھی۔ گاؤڑ آگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔
ریش کپڑوں کے سامنے بیٹھا کٹ کٹ چپ کر رہا
تھا۔

تب ہی ہاشم کے مواصل کی ہب بچی۔ اس نے
جھلا کر دیکھا۔ ایک نئی ویڈیو موصول ہوئی تھی۔ سوئی
کے ٹیلیٹ سے۔ وہ ٹھہر گیا اور جب اس پہ کلک کی
تو۔

مغز سوئی کے کمرے کا تھا۔ وہ وسط کمرے میں تیار
کڑی تھی۔ دونوں ہاتھ مخصوص سرخ۔ اٹھائے منہ ذرا
کھولے آنکھیں بند کر کے وہ ساکت کڑی تھی۔ جیسے
برف کا مجسمہ ہو۔ (ہاشم گویا خود برف بنا گیا۔) کیرا

ایک طرف کو تین ہوا اور سہری کا چہرہ۔ صرف چہرہ
دکھائی دیا۔

گڈ ایوننگ ہاشم کاردار اسوئیا اور میں بہت انجوائے
کر رہے ہیں۔ سوئیا اس وقت سوئیا نہیں ہے۔ وہ
”اولف“ ہے اور فریز ہو چکی ہے اور یا کوانتا کو معلوم ہوگا
کہ صرف سچی محبت سے کیا گیا عمل ایک جیسے دل کو پگھلا
سکتا ہے۔“ ہے نا اولف۔“

وہ بند آنکھوں سے مسکراہٹ دیئے سر کو ذرا سا خم
دے کر رہ گئی۔ اس سے زیادہ وہ ہل نہیں سکتی تھی۔ کیمو
واپس سہری کے اوپر ہوا۔ وہ اب اٹھ کر سوئی کے عقب
میں آکھڑا ہوا۔

”میں سوئی کے روم میں ہوں اور میرے پاس باہر
کمرے گاؤڑ کے ٹواڑ بھی ہیں۔“ ہاتھ لہرا کر بریٹا
پستول دکھایا۔ ”رور میں پہلے بھی ایک گاؤڑ کو اس کے
گردن پر تیس تک پہنچا چکا ہوں۔ سو میری صلاحیتوں
تعمیریں شک تو نہیں ہونا چاہیے۔ اب وہ کتنا ہے
تم سوئی کے پاس سوئی کے۔ سوئی اولف کے لیے کیا
کر سکتے ہیں۔ میرے سارے لیگل ڈاکو متھس نے کر
اس کمرے میں آجائیں اور مجھے یہاں سے بخیریت
نکلنے دیں تو میں سوئی کو پگھلا دوں گا۔ ذرا سوئی ہار جائے
گی۔“ اور ویڈیو بند ہو گئی۔

زندگی میں پہلی بار۔ ہاشم کاردار کو اپنا سر اپنا
دل۔ اپنی ساری دنیا کھومتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔
اس کی رعیت پہلے سفید بڑی اور پھر سرخ۔ بوکھلا کر
اس نے چہرہ اٹھایا۔ ”وہ میری بیٹی کے کمرے میں
ہے۔“

تب تک کپڑوں کے سامنے بیٹھا ریش بھی بول
اٹھا تھا۔ ”وہ واقعی اسی فلور ہے۔ وسط میں۔ یقیناً“
مس سوئیا کے کمرے میں۔ اس کے کندھے کے اندر
لگا ٹریکر میں نے لپکتی وٹ کر دیا ہے۔ وہ اب بیچ کر
نہیں جاسکتا۔“

”اور خاوند۔ وہ کہاں ہے؟“ وہ زور سے چلایا تھا۔
ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کرتے ہوئے اس نے آستین سے تر

پیشانی پر بھی مدغم ابھی تک گھوم رہا تھا۔

”وہ بھی وہیں ہے۔“

”اس نے اپنے پیر زبانتے ہیں۔ میں اوھر جا رہا ہوں۔ میرے پیچھے پانچ گوی میری بیٹی کے کمرے کی طرف بھیج دو۔ تم دونوں کمرے کی چنگی طرف سے آؤ اور نہیں۔“

ہے۔ کوئی انسانیت، کوئی اخلاقیات باقی ہیں تمہارے اندر یا ایک قتل — کرنے کے بعد تم ان سے بھی گزر چکے ہو؟“ وہ انیسوس اور بے یقینی سے کہہ رہا تھا۔

”کوئی کھنٹی، جی ہاشم کاردار؟ یاد ہے وہ دن جب مجھے بے بس کر کے تم میری بہن کے بارے میں بات کر رہے تھے؟ میری بھی یہی حالت ہوئی تھی۔“ الفاظ کے برعکس اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ ہاشم نے پیشانی کو مسلتے ہوئے بمشکل خود سے قابو پایا۔

”اچھا میں کمرے کے باہر ہوں۔ بتاؤ کیا چاہتے ہو؟“ دروازے کے سامنے کھڑے اس نے قلم مندی سے اوھر اوھر دیکھا۔ مستعد گارڈز اپنی گن نکالنے چو کس کھڑے تھے۔

”میرے تمام لہنگے ڈاکو منٹس جن کی مدد سے میں واپس جا سکوں۔“

”میں نے منگوائے ہیں، چند منٹ لگیں گے تم مجھے اندر آئے دو۔“ کہہ کر اس نے دروازہ بجایا۔ لاک کھمایا۔ وہ بند تھا۔ بجک آئی بھی بند تھی۔ وہ اندر جھانک بھی نہیں سکتا تھا۔ وہاں کل ہو رہا تھا۔ ”مصدقی“ دروازہ کھولو۔“ اس نے زور سے بجایا۔

”اگر تم نے ایک دفعہ پھر دروازے کو ہاتھ بھی لگایا تو میں اس کی جان لے لوں گا۔ دروازہ صرف تب کھلے گا جب تم ڈاکو منٹس لٹاؤ گے اور سنو تم آگے آؤ گے۔“

”ہاں۔ میں آگیا آؤں گا۔ مجھے پانچ منٹ دو۔“ وہ بے چینی سے اوھر اوھر ہنسنے لگا تھا۔ دو سرئی طرف سے فون بند ہو گیا۔ ہاشم اب ریش کو کال کر کے اسے جلدی وہ کھنڈرات اور بیچنے کو کہہ رہا تھا۔ ایک خاکی لفافے میں چند روپی کھنڈ۔ وہ یہ دکھا کر صدی کو کم از کم دروازہ کھولنے سے مجبور کر سکتے تھے۔ ایک دفعہ دروازہ کھل گیا تو اس کے بہترین مارکس میں ان دونوں خنڈوں کو سنبھال لیں گے۔

جب تک ایک گارڈ اوپر آیا وہ لفافے لے کر جس میں ریش کا پاسپورٹ اور چند روپی کھنڈ تھے۔ اس کمرے کو دونوں اطراف سے گھیرا جا چکا تھا۔ ہاشم کاردار کی ادھی فٹری وہاں موجود تھی۔ پچھ لوگ بالکل

وہ چیزی سے دریافت دے رہا تھا۔ ”سنانہر ڈکو بلواؤ“ وہ ہمت پہ بیٹھ کر بیوی دروازے کو باگ میں رکھیں گے۔ سالہ کپڑوں میں گارڈز کو ہوش کے چاروں طرف یکبیر دو۔ وہ دونوں زندہ میل سے نہیں لگیں گے۔“ دانت نہیں کرھے سے کہتا وہ باہر کی طرف بھاگا۔ دو گارڈز اس کے ساتھ دوڑے تھے۔

وہ لفٹ میں تھا جب فون بجلا۔ سونیا کے نمبر سے کل آ رہی تھی۔ اس نے چیزی سے فون کن سے لگایا۔ ”مگر تم نے میری بیٹی کو چھوا بھی تو میں تمہارے گلے گلے کر دوں گا۔“ لال بھسوا کا چہرے کے ساتھ وہ چیخا۔

”گارڈز اب تک ہاشم کیسے ہو۔ مجھے بھی تم سے بات کر کے اچھا لگا موسم کیسا ہے؟“

”سونیا سے بات کرنا تم سن نہیں رہے میں کیا کہہ رہا ہوں؟“ تیز تیز شخص کے ساتھ ہانپتا کانپتا وہ پھر غزایا تھا۔

”وہ تو بات نہیں کر سکتی۔ وہ فون کن ہے۔ کیا فلم ہے ویسے کبھی ہمیں دیکھا آگئے بیٹھ کر دیکھنی چاہیے۔“

”مصدقی!“ لفٹ کے دروازے کھلے تو وہ باہر نکلا۔ چند گہرے سانس لے کر خود سے قابو پایا۔ ”میں تمہارے ڈاکو منٹس لے آؤں گا“ ہمیں جانے دوں گا تم میری بیٹی کو کمرے سے باہر نکالو، خود بے شک کرا بند کر کے بیٹھے رو میں تمہارے ساتھ پورا تعاون کروں گا مگر اسے جانے دو۔“

”خخ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوگا۔“ وہ منگٹایا تھا۔

”تم اتنا نیچے کیسے کر سکتے ہو؟ وہ ایک معصوم بچی

”سونی تم ٹھیک ہو؟“ فکر مند ہی سے کہتی وہ اس کے قریب بیڑے کے کنارے آجیٹی اور اسے خود سے لگا لیا۔ جوتا تھا اس نے اسے ہلا دیا تھا۔

”کہاں ہیں وہ دونوں؟ کیسے ہمارے وہ؟“ وہ تشویش سے ہاشم سے پوچھ رہی تھی۔

ہاشم جواب دے بنا سوال پہ نمبر ملائے لگا لگا کارڈ

بھی کمرے میں داخل ہو کر لوہر اور پھیل گئے تھے اور گویا ہر کوئی چھان رہے تھے۔ لیکن کابھی شیفت بھی ہاتھ پانڈھے ساتھ آگھڑا ہوا تھا اور لب و جواہرات سے کھنکھرتا تھا۔

”کوئی اندر سے ان کی مدد کر رہا ہے ورنہ ان کے پاس ہاشمی کارڈ کیسے آسکتا تھا؟ یہ ایک بھی وہ لیکن سے ایسے اٹھا کر لاسکتے ہیں بشیر مددگار کے؟“ ہاشم فون کن سے لگائے جیزی سے بولا۔ ”رہیں وہ جا چکے ہیں۔“

میں اتر آئے تھے۔ کچھ بندو قس سنبھالے راہ واری میں کھڑے تھے۔ ہاشم نے اتفاقاً پکڑا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ جواب نہ ملا۔ اس نے کارڈ سے ہاشمی کارڈ لیا اور دروازے میں ڈنگایا۔ دروازہ کھل گیا۔

”مسعدی! میں تمہارا بچہ پھرنے آیا ہوں۔“ اس نے احتیاط سے کہتے ہوئے دروازہ کھلا۔

گمراہ دشمن تھا اور وسط میں سونیا کھڑی تھی اور پھوہا نہیں۔ وہ اس کو منع کرتا تھا ”زیادہ بیٹھا کھانے سے واقف ہو نقصان نہ ہو، مگر وہ اس کیک کو آٹھ سے زیادہ کھا چکی تھی۔ آج ہاشم نے کچھ نہیں کھلا۔ شل سا چائیا آگے کیا۔“

سونی کمرے میں آگئی تھی۔ ”مسعدی۔ کہاں ہے؟“ اسے کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا۔

”مسعدی میرے لیے ایک لایا ہے، ہیلو۔ اس نے کہا میں نے آپ کے آنے تک اس کو ختم کرنا ہے“ ورنہ میں لو لفس بن جاؤں گی۔“

ہاشم بے اختیار اس کے قریب آیا اور اس کو لپٹنے پاندول میں اٹھا لیا۔

”ہیٹا! میرے کپڑے۔“ وہ کسمنٹاں گھمرو پڑواند وار اس کا چہرہ اور سر جو م رہا تھا۔

”مسعدی کہاں گیا سونی؟“ پھر اس نے پوچھا۔ ”اس نے ویڈیو کب بنائی؟“

”وہ تو کب کا چلا گیا ہیلو۔“ سونی نے جواب دیا۔

حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ اس کے منہ پہ ذرا سی کریم لگی تھی اور وہ ایک واٹر پمپر سے ایک منہ میں ڈالتی مگنٹا نے لگی تھی۔

”I Wanna stuff some chocolate in my face“

ہاشم نے دھیرے سے اسے نیچے اتارا۔ ششدر چہرے اور شل اھصاب کے ساتھ وہ آہستہ سے مڑا۔ کسی نے جواہرات کو بھی بتا دیا تھا اور وہ جو اس باختہ سی اندر داخل ہوئی تھی۔

خواتین ڈائجسٹ
کئی دنوں سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

دستِ ڈگر

نوزیرا سیمین



قیمت - 750/- روپے

32735021

ٹریکر سے ٹریس کرو، وہ کدھر ہیں؟

اسکرین پہ نگاہیں جمائے بیٹھے رہیں نے انجنے سے ابرو پکڑے۔ ”تو سب وہ دونوں اسی کمرے میں ہیں۔ سکتل ابھی تک ایکٹو ہے۔“ گور اگر وہ نہ کتابت جی ہاشم کی نظر ڈالنے کے بجائے خانے میں پڑ چکی تھی جہاں ٹشو میں دو تھے بن جتنے ٹریکر رکھے تھے ہاشم سختی سے مسکرایا اور ٹشو اٹھا کر دیکھا خون جما ہوا تھا۔ وہ بت پہلے اپنے کندھوں سے ٹریکر ڈاکٹ کر لوچ چکے تھے ”ڈیٹ اٹ“۔

”سوئی کا فون ٹریس کرو، وہ اسی کے پاس تھا۔ جلدی رہیں۔“ وہ چلایا اور پھر برہمی سے راہ داری میں کھڑکی کے ساتھ بڑی میز کو ٹھوک رہا۔ میز لڑھک گئی۔ کلچ کا پھول دان بچھے جا کر۔ ہاشم نے سرخ آنکھیں اٹھائیں۔ کھڑکی سے بیچے کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ پراہرا اسٹیٹ میں پہنچ چکا تھا۔ ہوٹل کی کوئی چار دیواری نہ تھی۔ وہ کھلون صورت لوہی عمارت اس مصروف شاہراہ کے موڑ پہ کھڑی تھی۔ مین دسپشن سے نکلے تو سامنے سڑک تھی، جو اس وقت لوگوں سے بھری تھی۔ ان کے بھر مٹ میں پراہرا کے روایتی ملبوسات اوڑھے پجاری چلتے جا رہے تھے۔ سوا تھیل کا قافلہ اس وقت سڑک سے گزرتا تھا۔

ہاشم نے ایک دم چونک کر سر اٹھایا۔ اس کے اوپر جیسے کوئی انکشاف ہوا تھا۔

”پراہرا۔“ وہ پراہرا کے جھوم میں گم ہونے والے ہیں۔“ پھر تیزی سے منزل ”سڑک پہ جاؤ۔ اسٹیٹ میں پھیل جاؤ۔ وہ نظر آجائیں گے۔“ موبائل بجا تو

اس نے تیزی سے کل اٹھائی۔ دوسری طرف رہیں تھا۔

”سرسو سنی کا فون باہر کی طرف جا رہا ہے۔ باہر پراہرا کی طرف۔ میں بھی لوہر جا رہا ہوں۔“ رہیں دوسرے ہاتھ میں ٹیبلٹ پکڑے، ان کی لوکیشن کو سامنے رکھے بھانکے ہوا پن سے نکل رہا تھا۔

ہاشم اب لوہر کھڑا اپنے گاڑو کو چلا چلا کر ہدایات

دے رہا تھا۔ چھتے یہ موجود اساتھو تیار تھے کہ جیسے ہی ان کو سدی یا خاور دکھائی دے وہ ان کو کوئی بار دیں گے۔

چند ہی منٹوں میں گاڑو پوری اسٹیٹ پہ پھیل گئے تھے ایک ایک کو دیکھتے وہ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ ایسے میں رہیں ٹیبلٹ کو لوکیشن کو سامنے رکھے دوڑتا ہوا باہر آیا تھا۔ دائیں بائیں گردن کھمانا وہ سیاہوں کے جھوم کو چرتا ہوا آگے بڑھنے لگا مگر راستہ نہیں مل رہا تھا۔ بمشکل لوگوں کو برے ہٹانا دیکھے دیتا، معذرتیں کرتا وہ آگے آیا۔ موبائل ٹریکر کا سرخ نشان ایک جگہ رک گیا تھا۔

وہ بدقت اس جگہ پہنچ پایا۔ سیاہوں کی شکل اور ڈانٹ پھٹکار کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے ٹیبلٹ کو دیکھا۔ سرخ دائرہ (سوئی کا فون) سبز دائرے (خود رہیں) کے ساتھ کھڑا تھا۔ پھر وہ دائیں طرف مڑنے لگا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ سامنے ایک یورپین غیو خلی کی سرے ہانپ والی بچی دائیں طرف جا رہی تھی۔ وہ آندھی طوفان کی طرح اس کے سر پہ پہنچا۔ اس کے ہڈی والی سوئٹر کا ڈبچے کو گرا ہوا تھا اور کمر پہ پینے بیک پیک میں ٹیبلٹ رکھا تھا۔

”مخفت ہے۔“ اس نے ٹیبلٹ اٹھا کر بروا سی سے ادھر ادھر دیکھا۔ ہر طرف انسانوں کا سمندر بھرا تھا اور اس سب میں ان دونوں کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔

وہ دوڑتے قدموں سے لوہر ہاشم کے پاس آیا تھا۔ وہ وہیں کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔

”سرسو“ پھولے شخص کے دور ان اس نے کہا۔ ”وہ نہیں ہیں یہ فون انمول نے پراہرا کو دیکھے والی ایک

بچی کے اوپر پلانٹ کر دیا اور خود رش میں آگے نکل گئے۔“

”میں لوگ سڑک پہ پھیلے ہو اور کسی سے وہ بندے نہیں پکڑے گئے۔“ وہ دعاڑا تھا۔ پار پار آستین سے پیشانی پونچھتا سدل چاہ رہا تھا اس کو شوٹ کر دے۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اتنی جلدی نکل گئے ہوں

انہیں اکھاڑ کر ان کے لیے مین ہول کھول کر نہیں رکھے گے؟ وہ چیخا تھا۔ جس کے منہ پر کلی تھی وہ خون آلود منہ پہ ہاتھ رکھے سر جھکائے سیدھا ہاتھ کھڑا ہوا۔

”کہہ رہیں مین ہول؟ لے کر چلو مجھے اوہ۔“ ایک دلچھ بھر گاڑ ڈکی دوڑیں لگ گئی تھیں۔

ہاتھ دو مزار یا میں اس مین ہول کی جگہ کا پانگ لگنے کے لیے کسی راکٹ سائنس کی ضرورت نہیں تھی۔ کوئے والا ہاتھ دم بند تھا اور اس کے اوپر ”خراب ہے“ کا سا تن صاف نظر آ رہا تھا۔

”سیرے کل سے لیک ہو رہا تھا“ آج بھی ٹھیک نہیں ہو سکا۔ ”بیڈ آف سیکورٹی اس کا دروازہ کھولنے لگا تو وہ اندر سے لاکڈ تھا۔ ہاشم نے اسے پرے دھکیلا اور پوٹ سے دروازے پہ ٹھوک ماری۔ ایک دم اور دروازہ اڑتا ہوا دوسری طرف جا لگا۔

اندر فرش کے کوئے میں اتنی جگہ اکٹری ہوئی تھی کہ ایک آدمی بچے اتر سکے۔ بچے تیس فٹ کی گہرائی تھی اور اس کے نیچے لمبی سرنگ۔ ہاشم آگے آیا اور اس مین ہول کے دہانے پر کھڑے ہو کر ’گرفٹ جھکائے‘ اندر کو جھانکا اور ایک ٹائل تلے ایک کلنڈر رکھا تھا۔ ہاشم نے جھپٹ کر اسے اٹھایا اور چہرے کے قریب لایا۔

abit of a foxed upper!
'Everyones

وہ سحری کی کھسالی لاکھوں میں پہچان تھا۔ فیسے موڑ کر کلنڈر بے پیمینکا۔ گاڑو اور ریش باہر کو بھاگے تھے۔ کچھ لوگ اندر اتر رہے تھے۔ کچھ باہر سے اس کے دوسرے دہانے تک جا رہے تھے، مگر ہاشم کا روادار جانتا تھا کہ وہ لوگ اب تک بہت دور جا چکے ہوں گے۔



زہر کے پیالے کا گھونٹ گھونٹ پی لینا آگ میں اتر جانا“ سر کو آہن رکھنا کافی دیر پہلے جس وقت ہاشم کا روادار سحری سے فون

اور تمہیں نظری نہ آئے ہوں؟ سلیمانی چنے پن رکھے تھے انہوں نے یا۔“ ہاشم رکا۔ ایک دم سے اس کے اوپر ڈیڑھ ساری ٹھنڈی برف گر گئی تھی۔ آہستہ سے اس نے گرفٹ موڑی اور بچے سرنگ پہ پتے پر اہرا کو دیکھا۔ سیاہوں کے رش کو دیکھا۔ ہاتھیل کو دیکھا۔

”نہیں۔ ہم غلط ہیں۔ پر اہرا۔ پر بڑے صرف ڈسٹرکشن ہے۔ ہمارا دھیان بنانے کے لیے۔ وہ پر اہرا کے جھوم میں گم ہو کر نہیں نکلنے والے تھے۔“ چونک کر ان لوگوں کو باری باری دیکھا۔ ”کیا اس ہوش سے نکلنے کا کوئی اور راستہ بھی ہے؟“

ریش نے سوالیہ نظروں سے گمے کوٹ والے گاڑو کو دیکھا جو ہوش کی سیکورٹی میں سے تھا۔ اس نے فوراً ”نہی میں سر ملایا۔“ نہیں سب دروازوں کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔“ پیچھے کھڑا شیفت خاموشی سے ان کو دیکھتا رہا۔

”بھارا! ہاشم شعلہ پار نظروں سے اسے گھورتا تو قدم آگے آیا۔“ میں ابھی تک ایسے کمرشل سے نہیں ملا جو ایک عظیم الشان ہوش بنائے اس کے نہ خلتے میں اپنی ذاتی تیز رکھے اور پھر پولیس کے اچانک ریڈ سے بچنے کے لیے کوئی خفیہ راستہ نہ رکھے۔ مجھے بتانے کوئی۔ اور۔ راستہ ہے یا نہیں؟“

”سرا! آپ میرا یقین کریں یہاں یہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ ہو تا تو میں آپ کو پہلے بتاتا۔ پہلے یہاں مین ہول تھے مگر بعد میں ان کے اوپر سرو سز ہاتھ دو مہین گئے تو وہ بھی بند ہو گئے اور۔“

ہاشم نے پوری قوت سے اس کے جہڑے پہ مکا دے مارا۔ وہ پیچھے کو لڑھک گیا۔ دیوار کا سارا لیا اور گرتے گرتے بچا۔

”ان کے پاس کمرلوں کے ہاشم کی کارڈز ہیں بے ہوش کرنے والی کیس ہے اسلحہ ہے ہوش کی دوسری ہے کوئی اندر سے ان کی مدد کر رہا ہے اور تمہارے چہرے گدھے کا خیال ہے کہ ان کے مددگار فرش کی چند

نہیں ہے۔ جب تک ہاشم کاردار کے آدمی اس میں ہول تک پہنچے، وہ دونوں مفروضہ قیدی وہاں سے مسترد چاہتے تھے۔



اب یہ داغ بھی سورج بن کر چمکے گا جس کو ہم نے دامن دل میں اتنی عمر چھپایا ہے ہارن اور ابدار کے جانے کے بعد وہ دونوں اس ارادے سے اٹھے تھے کہ اب ہوٹل سے باہر نکلیں مگر باہر جانے کے بجائے لان میں چلے آئے اور قدم خود بخود پل کے قریب اٹھے گئے۔ ندرت کا فون آیا تو فارس نے کہہ دیا کہ وہ در سے واپس آئیں گے۔

”تم واپس نہیں جانا چاہتے؟“ اس کے ساتھ چلتے ہوئے زمر نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، سر جھٹکے قدم اٹھا رہا تھا۔ کسی سوچ میں گم تھا۔

”کیا اپنی گریڈ کو کس کر رہے ہو؟“ اسے گل کر لو شاید کوئی بات رہتی ہو جو اس نے تم سے نہ پوچھی ہو۔“ ہمدردی سے ”دورہ دیا۔“ فارس نے سنہری آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا اور ذرا سا مسکرایا۔

”تمہیں اس سے کوئی خط لکھا نہیں ہے؟“ مصوم سی لڑکی ہے۔ سادہ اور لڑہائی سی۔ وہ مجھ میں بالکل بھی انٹریٹ نہیں ہے۔“ ہول کے کنارے وہ دونوں آنے سے آگے آگے تھے۔ اور تاریک رات میں چمکتا پورا چاند پل کے نیلی پانی پہ جھللا رہا تھا اور پانیوں کی روشنی زمر کے چہرے پہ پڑ رہی تھی جو سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”نہ وہ مصوم ہے نہ توہی۔ اس کا اسکراف ایرینی کلپر کا حصہ ہے یا اس کو اپنے ہل نہیں پسند۔“ مذہبی اسکراف ایسا نہیں ہوتا۔ مجھے تو وہ ایک بڑی بچی کے

سوا کچھ نہیں گئی۔ خیر وہ اتنی اہم نہیں ہے کہ ہم اس کو ڈسکس کریں۔ تم ہٹاؤ گھر کیوں نہیں جانا چاہتے؟“ سینے پہ بازو پٹینے وہ پوچھ رہی تھی۔ ٹھوٹھوٹے والے

یہ اس کے ڈاکو منٹس لانے کی بات کر رہا تھا اس سے کچھ ذہیر بعد وہ سڑک کے کنارے سے اس میں ہول کے اوپر رکھی لوہے کی پلیٹ اٹھا کر باہر نکل رہے تھے۔ سونی کا لمبہ وہ سروس ہاتھ روم تک جاتے ہوئے راستے میں ایک سیاح بچی کے بیک پیک میں گرا کر آگے بڑھ گیا تھا۔

اندر صبری سڑک پہ وہ تیزی سے باہر نکلے اور لوہے کی پلیٹ برابر کر کے اسی طرح آگے بڑھتے گئے سڑک قریب ”سنان تھی۔ عموماً وہ بروقت ہوتی تھی مگر چونکہ یہ پراہرا کا روٹ نہیں تھا سو سارے لوگ گویا یہاں سے سمٹ کر ادر چاہتے تھے۔ جو پھر رہے تھے، انہوں نے بیک پیک اور ٹارچہ پکڑے وہ دونوں کو میں ہول سے لگتے دیکھ کر ان کو صفائی یا ہلبنگ کا عملہ خیال کیا اور نظر انداز کیا۔

”تین تو تیس منٹ لگیں گے کم از کم اس میں ہول کا پتا چلانے میں۔“ خاور نے تیز تیز چلنے لگزی دیکھتے ہوئے کہا۔ سہی خاموشی سے چلتا ہوا وہ اسے دونوں ہتھوں۔ مہینوں بعد۔ نازہ ہوا میں آیا تھا۔

سراٹھا کر پورے چاند کو دیکھا جو سیاہ آسمان پہ دیک رہا تھا۔ پورا۔ بلکہ کمال۔ اور اس کی چاندنی میں فوج بچتے پراہرا کی موسیقی اور شور میں تک سٹی پڑے رہا تھا۔

ایک موٹر سائیکل خاور نے منہ میں انگلی ڈال کر سنی بھائی۔ تین دفعہ ”فورا“ اسے ایک ٹک ٹک (سری) لیکن رکشا (تیزی سے چلا ان کے قریب آ رہا۔ وہ دونوں جلدی سے اس میں بیٹھے اور ٹک ٹک سڑک پہ گویا اڑتا ہوا اور چلا گیا۔

”اور یقیناً“ یہ ٹک ٹک ڈرائیور بھی تمہارا جاننے والا ہو گا؟“ سہی نے تیز ہوا کے شور میں اونچی آواز سے ساتھ بیٹھے خاور سے پوچھا۔

”میں نے اس شہر میں ہاشم کاردار کے لیے برسوں کام کیا ہے۔ کیا میرے چند وقار کاٹھ کٹھن بھی نہیں ہوں گے یہاں؟“ وہ ہنسنے لگا۔

سہی مسکرا کر رہ گیا۔ مگر وہ جانتا تھا ابھی وہ آزاد

بحورے ہل سمیٹ کر چرے کے بائیں طرف ڈال رکھے تھے اور بحوری لائنوں سے مزین آنکھیں سیٹھ کر اس پر بھرا رکھی تھیں۔ ناک میں پڑی سونے کی ہالی ماہ کمال کی چاندنی میں دیک رہی تھی۔

”مجھے ڈپریشن ہو گا، زمر! میرے لیے پہلی رات بیٹھ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ تمہارے کی پہلی رات، جیل کی پہلی رات، دوبارہ گرفتاری، جیل کی پہلی رات اور اب۔“ سر جھٹکے جوتے کی ٹوک سے گھاس کو مسلتے وہ کہہ رہا تھا۔ ”وہ گھر مینے لیے بہت اہمیت کا حامل تھا۔ مجھے بہت پیارا تھا۔ اس کوچ میں خوش نہیں ہوں۔“

”اب کیا کرو گے؟ چاہے کب ڈھونڈو گے؟“ وہ فکر مند تھی۔ وہ باپ بیٹی دونوں سے محو ہونے لگے۔ ”مل جائے گی چاہے۔ نہیں تو پیسے ہیں میرے پاس۔ چھوٹا موٹا کاروبار تو کر ہی سکتا ہوں۔“ کندھے جھٹک کر لاہروالی سے بولا۔

”مدرت بھابھی چاہتی ہیں کہ تم ریٹائرمنٹ میں ان کے ساتھ شراکت داری کرو۔ یا اوپر والے پورشن میں کچھ بنا لو۔“

اس نے استہزائیہ انداز میں سر جھٹکا۔ ”وہاں سارے رشتے دار آتے ہیں ہمارے، میں ان سے ملنا نہیں چاہتا۔“

”فارس تم بے گناہ ہو، عدالت نے تمہیں بری کیا ہے تو کیوں بھاگتے ہو اپنے رشتے داروں سے؟“

”زمر بی بی، لوگوں کو اس بات سے غرض نہیں ہوتی کہ یہ آدمی بے گناہ تھا یا گناہ گار۔ جیلوں میں جانے والے لوگ ہی صد لوگ مجرم ہوتے ہیں مگر لوگ سمجھتے ہیں سب مجرم ہیں۔ جن نظروں سے میرے رشتے دار مجھے دیکھتے ہیں، میرے قریب آنے پہ میرے بارے میں سرگوشیاں کرتے ہیں، گنہگار بننے کے لیے میرے پاس نہ وقت ہے نہ توانائی۔“ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھا اور پول کے کنارے بیٹھ گیا۔ زمر بھی گہری سانس لے کر ساتھ آ بیٹھی۔ ڈنر کے دوران کی کئی جیل

کی باتوں نے اسے ڈسٹرب کر دیا تھا۔ ”میں چاہوں بھی تو تمہارے قتل کے الزام سے کبھی بچھا نہیں چھڑا سکتا۔ میں کبھی بھی نارمل نہیں ہو سکتا۔“ وہ سنجیدگی سے سر جھٹکے کہہ رہا تھا۔

”مگر میں ہونا چاہتی ہوں۔“ وہ گھٹنوں پہ ٹھوڑی ٹکائے، پورے چاند کو پانی میں تھیرتے دیکھ کر گویا خود سے بولی تھی۔ ”میں بھی اس برف کو پھیلانا چاہتی ہوں۔ مگر مجھے نہیں پتا میں کیا کروں۔ تمہارے بارے میں سوچوں یا نہیں؟“

فارس نے رخ موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ اس نظر آ رہی تھی۔

”تمہارا اور میرا ایک ساتھ کوئی مستقبل نہیں ہے۔ اس رات جو میں نے اس ریٹائرمنٹ میں کہا تھا، میں اس کے لیے شرمندہ ہوں، مگر صبح تھا۔ جلد یا بدیر ہم الگ ہو جائیں گے۔ مگر تم نے اس دفعہ برا نہیں مانا۔ وہ نارمل رہتی۔“

”تو پھر کب دے رہے ہو تم مجھے طلاق؟“ پول میں جیسے چاند سے کوئی چیز آن گری تھی۔ کچھ جھنجھے کی آواز سی آئی۔

”طلاق“ الگ ہونے کا واحد راستہ نہیں ہوتی۔ گو کہ میرے دل میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ صرف محبت ہے۔ عزت ہے۔ مگر میں ایک Cursed (خمس) آدمی ہوں۔ میرے ساتھ بہت سے مسئلے ہیں۔ میرے دشمن ہیں۔ میری دشمنیاں ہیں۔ میں بہت جلد خود کو تم سے الگ کر لوں گا، تاکہ میری curse (خمس) تمہیں مزید نقصان نہ دے۔ پہلے ہی تمہارا بہت نقصان ہو چکا ہے۔“

”وہ میری قسمت تھی، فارس! زندگی میں پہلی دفعہ اس نے تسلیم کیا۔“

”وہ میرا قصور تھا۔ میں خود سے وابستہ کسی عورت کی حفاظت نہیں کر سکتا۔“ وہ پول کے پانی کو دیکھتے ہوئے یاسیت سے کہہ رہا تھا۔

”تمہاری ریٹورٹ دلی کوئی بات نہیں بھولی، نمبر دو۔“
 ”میں تمہارے چوہ نکات سن چکا ہوں، اب تم۔“

فون ایک دوسرے پھر زوں نکل کر لگے غیر شہما نمبر
 تھا فانس کے ابوتھے

”مجھے سنئے دو، کوئی ضروری کل نہ ہو۔“ اس نے
 موبائل فون کلن سے لگایا۔ ”ہیلو؟“ فانس غور سے
 اس کے اثرات دیکھنے لگا۔

”کون؟ حسین؟“ اچھا یہ تمہارا نمبر ہے۔ اور اس
 سے زیادہ فانس غازی کے لیے بروا شت کرنا مشکل
 تھا۔ فون زمر کے کلن سے لوجا اور اپنے کلن سے لگایا۔

”حسین! تم اسی وقت اپنی نوکری سے فارغ ہو۔
 سلمان سمیٹو، اور اپنی شکل گم کرو۔ میرے دلہن آئے
 تک اگر تم مجھے نظر آئیں تو اچھا نہیں ہوگا۔“ غصیلے
 اور اکڑے لہجے میں ٹیٹ کر اس نے فون بند کیا۔

”ساتھ لٹ کر رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں اس وقت
 تم صرف مجھے سونو۔“ موبائل اس نے اپنی جیب میں
 ڈال لیا۔ (زمر سمجھی اس نے واقعی ساتھ لٹ کر کیا ہے، مگر
 اس نے خاموشی سے فون آف کر دیا تھا۔)

”کیا سنوں؟“ وہ غھوڑی گھٹنے پر رکھے دلچسپی سے
 اسے دیکھنے لگی۔ نیلے پھل کے اوپر جھلسلائی جانے لگی
 منکس ہو کر فانس کے چہرے پر بڑھ رہی تھی۔ اور کرو
 ٹیلے لوگوں سے بے نیاز، بس اسی کو دیکھے تھی۔ سوئیٹر
 کی آستینیں ذرا اچھے چڑھائے، منہ میں کچھ چباتے
 ہوئے وہ پانی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے سوال پر شہری
 آنکھوں کا بس اس کی طرف موڑا۔
 ”مجھے نوٹس ملے تھے۔“

”سوری؟“
 ”تمہاری کلاس میں جو نوٹس تم نے کاپی کروا کر
 دیے تھے، وہ مجھے ملے تھے۔ میں نے پھینک دیے
 تھے۔ مجھے تم سے ریمڈ ٹیل کلاس لینے کا بہانہ درکار
 تھا۔“

زمر کے ابوتھا جواب سے اٹھے چوکھٹے سے اٹھا

”مگر۔“ اس نے کمری سانس لیا۔ ”جب تک ہم
 ساتھ ہیں، ہم خوش تو رہ سکتے ہیں، تاہم ایک ایسے
 کپیل کی طرح حلو۔“ زمر سے کوئی جواب نہیں بن بڑا
 تھا جب فانس کا موبائل بجنے لگا۔ اس نے ایک نظر
 دیکھا۔ ”آپا کاتنگ۔“ اس نے کل کٹ کر فون آف
 کر دیا۔

”ہماری کیری فیملی ہمیں خوش نہیں رہنے دے
 گی۔“ وہ جل کر بولا تھا۔ ”جب بتا دیا ہے کہ نہیں آ
 رہے ہم، گھر تو بار بار کل کر کے بلائیں گے کہ بھنڈی
 گوشت دتا ہے“ آکر کھاؤ۔“ وہ ایک دم زور سے ہنسی۔
 دلہتا۔ اس کا اپنا موبائل بھی تھر تھرانے لگا۔ زمر
 نے ہنسی روک کر اسکرین فانس کے سامنے لرائی۔
 ”حسن کاتنگ۔“ اور کل کٹ دی۔ وہ سلسلہ کلام
 چوڑے ہی لگا تھا کہ گھر کے بی بی سی ایل سے کل آئے
 لگی۔ اسے یاد تھا کہ نئے گھر میں صحیحی حصہ نے فون
 کے کارڈ جوڑ دیے تھے۔ وہ پھر سے کل کٹ کر
 فانس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”تم کیا کہہ رہے تھے؟“ اچھا بن کر پوجا پانڈ
 گھنٹوں کے گروپیٹ کر وہ بیٹھی تھی اور سیل ابھی
 تک ہاتھ میں تھا۔

”یہی کہ کل کی کل دیکھیں گے، کیا پتا ہم کبھی الگ
 نہ ہوں۔ کیا پتا سب ٹھیک ہو جائے تو پھر۔“ بیٹھے
 بیٹھے وہ اس کی طرف مھوا اور نرمی سے مسکرا کر اس کا
 چہرہ دیکھا۔ ”زمر یوسف خان! کیا تم فانس غازی کی
 بیوی کی حیثیت سے ایک نارمل زندگی گزارنا چاہو گی؟“
 زمر نے بے اختیار اڑ کر آئی مسکرا ہٹ دیا۔
 ”ہلکے مجھے اب گو۔“

فانس نے سر کو اٹھت میں ٹم دیا، اور ذرا سا
 کھنکھارا۔ ”زمر یوسف خان۔“ اس کی آنکھوں
 میں دیکھ کر آہستہ آہستہ سے دہرایا۔ ”کیا تم فانس
 غازی کی بیوی کی حیثیت سے زندگی گزارنا چاہو گی؟“
 اور فانس غازی کو کون سی بات کے لیے مجبور کر
 سکتا تھا؟ ہاں، صرف وہی مجبور کر دیتا تھا۔
 زمر نے کمری سانس اندر کو کھینچی۔ ”نمبر ایک میں

لیا۔ ”تمہیں وہ سب بچہ روزہ ٹیکس سمجھ میں آتے تھے؟ پھر میں کیوں گمنام گمنامہ تمہارے ساتھ سرکھپائی تھی؟“ وہ برا نہیں بولی تھی۔ اسے دیکھا سا لگا تھا۔ اس نے فارس بخاری کو بھی زمین نہیں سمجھا تھا اور اس کی بڑی وجہ وہ شیون تھی جو وہ اسے دیتی تھی۔ ایک ہی ٹاپک بار بار اس کو پڑھانا پڑتا تھا۔

”مجھے ہر چیز سمجھ میں آتی تھی زمینی بل! صرف آپ نہیں سمجھتی تھیں۔“ اب کے وہ مسکرایا تھا۔ وہ مختاسی چپ ہو رہی۔

”اور وہ لڑکا جسد۔ جس کو آپ میرے ساتھ ٹاپک سمجھانے لے آئی تھیں لاہوری۔ بہت برا لگا مجھے اس کا سیل فون میں نے غائب کیا تھا اور اس کو ڈھونڈنے کے لیے چارہ اٹھ کر کیا تھا مگر آپ سمجھیں وہ لاہری ہے، اس لیے دوبارہ آپ نے اس کو نہیں پڑھایا۔“

”تم ہمیشہ سے ایک دو نمبری انسان تھے۔“

”اور وہ برادرہ جو آپ کو ہراساں کر رہا تھا۔ اور آپ میرے پاس آئی تھیں۔“ وہ مخلوط سالے بتا رہا تھا۔

”اور میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ اس سے بات کروں گا۔ جانتی ہیں میں نے کیا کیا؟“

”جانتی ہوں۔“ سابقہ ڈسٹرکٹ پراسیکیوٹر نے چو آگے جھکا کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ فارس بالکل ٹھہر گیا۔

”تم اسے اپنے کسی تاجر سیل لے کر گئے اور اسے مارا بیٹھا ہے نا؟“

وہ لمحے بھر کے لیے لاجواب ہوا۔ ”اس نے آپ سے کچھ کہا تھا جس میں؟“

”فارس۔ تمہارے پاس کیوں آئی تھی میں؟ اگر اس سے صرف بات کرنی ہوئی تو میں خود کرتی۔ مجھ سے بہتر manipulative talk (جوڑ توڑولی گفتگو) کون کر سکتا ہے بھلا؟ تم سے اس لیے کہا تھا کیونکہ تمہاری جانب۔ اور تمہاری شہرت کتنی تھی کہ تم اس کی طبیعت اس طریقے سے صاف کر دو گے جس طریقے سے میں کروانا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی

تھی کہ تم اس کو مارو۔ وہ باتوں کا بصورت نہیں تھا۔ اور اٹھا کر افغان خانہ تائیڈ چاہی۔ وہ چند خانے چپ رہا۔ پھر سر جھٹکا۔

”تم میں اور مسز کاردار میں کبھی کبھی مجھے زیادہ فرق نہیں لگتا۔ پھر جیسے کچھ پوچھنا چاہا مگر راز بدل دیا۔ کم از کم آج کی رات نہیں۔“

”اور پتا۔ اور کیا کچھ کر چکے ہو تم میرے علم میں لائے بغیر؟ مسکرا کر پوچھنے لگی۔ فارس نے کھڑی میں وقت دیکھا۔

”پہلے چل کر کھانا کھاتے ہیں۔ ہاؤنٹن عید کا حرام کا بل تھوڑا بہت زہر مارا کیا تھا۔“ اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”ویسے بھی ہمارے پاس ابھی بہت وقت ہے۔ کم از کم آج کی رات ہم وہاں نہیں جا رہے ہیں۔“

”اسے ہنگے ہوئیں میں؟“ اس نے گردن اٹھا کر استغاب سے اسے دیکھا۔

”دو روز توڑوا ہی کرنا ہوں آپ۔ اتنا خرچا؟“

مسکرا کر اس نے ہاتھ بڑھایا۔ اور پھٹنے والے انکار نہیں کیا کرتے۔ وہ اس کا ہاتھ تمام کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اب پول کے کنارے وہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے۔

”تم ہمیشہ میرے سامنے ایک مختلف روپ میں آتے ہو۔ پہلے تم میرے رشتے دار تھے۔ پھر اسٹوڈنٹ بنے۔ پھر میرے مجرم۔ پھر ایک کھنڈی انتہائی رشتے کا ایک پروردہ۔ پھر سعدی کے لیے میرے پارٹنر بنے۔ پھر ایک بے گناہ انسان کی حیثیت سے میرے سامنے کھلے پھر میرے کلائنٹ بنے۔ اب شوہر بن جاؤ گے۔ پتا نہیں پھر کس روپ میں سامنے آؤ گے؟ کیا ابھی ابھی کچھ ایسا ہے جو میں نہیں جانتی تمہارے بارے میں؟“

”ہاں۔ یہی کہ تمہارے کلائنٹ کا تمہاری فیس ادا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ وہ اس سوال سے بچتی تھا سو مسکراہٹ دیا کر لولا تو وہ ہنس دی، پھر مصنوعی خشکی سے بولی۔

”نمبر ایک، اب مجھے اس بات سے فرق نہیں پڑتا

کہ تم اور میں مستقبل میں ساتھ رہیں گے یا نہیں، میں مزید کوئی بلا ٹنک کیے بغیر، نفع نقصان سوچے بغیر اس شادی کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر مبرود اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میرے دل میں تمہارے لیے کوئی لہلہت ہو، کیونکہ نمبر تین میں تمہاری ریٹورنٹ والی کوئی بات نہیں، معمولی طور نمبر چار بھی تک۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اعتماد سے بولی۔ ”آئی ہیٹ یو۔“

وہ مسکرا کر اس کی طرف جھکا۔ ”آئی ہیٹ یو۔“ اور اس نے بہت دقت سے مسکراہٹ لیوں پہ روکی تھی۔ چاندنی میں نہائے جھلملاتے پانی کے ساتھ سبز زار یہ وہ دونوں ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے اور اولف صبح کھتا تھا۔ کچھ لوگ واقعی اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کے لیے پھلکا جائے۔



کھانے کے بعد حنا بنے کرے میں آئی تو اس نے فوراً سے پہلے میونہ کو کال ملائی۔ میونہ اس سے دو سال سینئر تھی۔ کالج میں دونوں ساتھ تھیں۔ کسی کام کے سلسلے میں تعارف ہوا اور پھر دوستی ہو گئی۔ وہ حافظ قرآن تھی اور شادی شدہ تھی۔ ایک بیٹا بھی تھا۔ ”میونہ بلی! آپ میری نماز کی نگہبان بنیں گی کچھ دن کے لیے؟“ مہذب انداز میں مدعا بیان کر کے اس نے پوچھا۔

”جین، دیکھو میں اول تو کسی کی ذمہ داری لیتی نہیں لیکن اگر لوں تو اسے آخری سانس تک نبھاتی ہوں۔ میں ہر روز فجر کی اذان کے پینتالیس منٹ بعد تمہیں کال کر کے پوچھوں گی کہ تم نے نماز پڑھی یا نہیں اور روز رات کو تمہیں مجھے ٹیکسٹ کر کے بتانا ہو گا کہ آج تم نے پانچ میں سے کتنی نمازیں پڑھی ہیں۔ جس دن تم کو تہی کرو گی میں تم سے وضاحت مانگوں گی اور مجھے امید ہے کہ تم خود کو اور مجھے شرمندہ نہیں کرو گی۔“

میونہ سے ویسے ہی ایک ریڑرو سار شدہ تھا تب تو مزید لحاظ آ گیا۔ وہ جلدی سے بولی۔ ”ان شاء اللہ میں

صبح اٹھ جاؤں گی۔“

اور زندگی میں پہلی دفعہ حنین یوسف کی سمجھ میں آیا تھا کہ بیچے کو نماز پڑھانے کے لیے ماں باپ کو ان پہ سختی کھیل کرنی چاہیے۔ عادتیں ڈالنے کے لیے سختی کرنی پڑتی ہے۔ اس نے فون بند کر کے لوپر آسمان کی طرف دیکھا۔

”اللہ تعالیٰ ہمیشہ میں نے اللہ مگلا کہ یہ بھروسہ کیا ہے مگر آج نہیں۔ کل صبح آپ مجھے اٹھاؤں گے مجھے نہیں پتا کیسے یہ میرا مسئلہ نہیں ہے، لیکن آپ مجھے اٹھاؤں گے ہر حال میں۔“



برا نہ مان۔ مرے حرف زہر سی میں کیا کہوں کہ یہی ذائقہ زبان کا ہے کو لمبو کی اس برف رات میں تیزی سے بھاگتا تک ایک جگہ رکھ دو دونوں بنا کچھ کے اترے اور پھر جہاں خاور چلا گیا وہ اس کے ساتھ کھینچا چلا آیا۔ سڑک پار کرتے ہوئے وہ دھکتا ”رکا۔ سڑک جھٹکا۔“ چلے پاتھ رکھا۔ خاور نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کیا ہوا؟“

”یونہی۔ منہ کا ذائقہ عجیب سا ہوا ہے شاید گلا خراب ہے۔“ ابھن سے سر جھٹکا وہ آگے بڑھ گیا۔ سڑک کے کنارے سے انہوں نے ایک اور تک تک روکا اور یوں، تقریباً ”تین سواریاں بدل کر وہ دونوں اس لپار ٹنٹ بلڈنگ کے سامنے رگے اندر بیڑھیاں چڑھتے سہری نے پوچھا تھا۔ ”تو اس عمارت میں ہے تمہارا خفیہ قلیٹ جس کے بارے میں کاردارز نہیں جانتے؟“

”میرے پاس ایسی کئی خفیہ جگہیں ہیں۔“ وہ ماتھے پہ ہل لے لے کھودے لہجے میں بتانا چاہتے چڑھتا گیا۔ قلیٹ معمولی اور سستا سا تھا۔ سہری گردن اوپر اوپر کھماتا، طائرانہ نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ بیک صوفے پہ دھرا۔ خاور سیدھا اندرونی کمرے میں چلا گیا۔ سہری چونک پہ آیا تو کھلا۔

خاور کا رٹ بنا کر نیچے زمین پر جھکا ہوا تھا اور فرش کے اندر بنے ٹرپ ڈور سے ایک باکس نکال رہا تھا۔ سحری آگے گیا۔ وہ ایک دھاتی باکس تھا۔ (ایسے باکس کو Go باکس کہتے ہیں) اس میں خاور کے ٹم کے ٹمن پاسپورٹ تھے بہت قلیل تھا اور لوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ ایئر چینی میں بھل گئے وقت کا سارا سلن کو باکس میں موجود تھا۔

”اب ہمارے پاس بیسے بھی ہیں اور پلان بھی سب سحری ہمیں فیز نوپہ ملن کرنا ہے۔“ وہ لوٹ نکال نکال کر باہر ہرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”بھئی کہ ہم نے تمہارا نام کلیئر کروانا ہے، ہاشم کے سامنے تمہیں بے گناہ ثابت کرنا ہے۔“ جانتا ہوں۔“ وہ کندھے اچکا کر مڑا پھر دوڑاڑے کی چوٹ پکڑ کر کاہلکا سا ڈھرا ہوا۔ خاور نے پھر سے چوٹ کر اسے دیکھا۔

”تمہیں ٹھیک ہوں شاید کچھ غلط کھایا تھا۔“ وہ سر کو پھرتے ٹھی میں جھٹکتا باہر لائن میں چلا گیا۔ ذرا دیر گزری تو خاور کو اس کے کھانسنے کی آواز آئی۔ وہ تیزی سے اٹھا اور باہر نکلا۔

”چکن سٹیک بھجوا کر رہا ہوا ہے کر رہا تھا۔“

”کیا کھایا تھا تم نے؟“ خاور تشویش سے کہتا اس کے سر پر آپٹیا۔ وہ دہرا ہوا، نڈھال سا چو جھکائے مزید نے کے لیے منہ کھولے ہوئے تھا۔ نقابت سے کراہی رہا تھا۔

”میری نے۔ شاید کھانے میں کچھ ملایا تھا۔“

”تھوڑا سا شایہ کوئی دوا رکھی ہو تمہاری جان میرے لیے بہت قیمتی ہے۔“ کہہ کر وہ سر کی طرف لپکا اور کیبٹ کھولی۔ دلفعتا ”خاور ٹھہر۔“ مگر ایک منٹ نہیں تو اس کھانے کو چکھائی نہیں تھا۔“ وہ چوٹ کر پلٹنے لگا تھا کہ

اس کے سر کی پشت پر زور سے کوئی بھاری چیز آکر گئی۔ خاور بے اختیار آگے کو لڑھکا مگر پھر ہاتھ سلیب رکھے، سٹھکانا چلا، لیکن سحری نے پیچھے سے اس کی گردن دیوچی اور مخصوص رگ کو دبا لیا۔ خاور نے

پوری قوت سے مزاحمت کرنی چاہی ہاتھ پیرا سے سلیب سے شیشے کے گلاس گر کر ٹوٹ گئے اس کی مزاحمت دم توڑی گئی اور گردن بھٹک گئی۔

”آف کورس! ہم نے وہ کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس کو کندھے سے تھامے زمین پر احتیاط سے لٹاتے ہوئے ہشاش بشاش سا سحری بولا تھا۔

”تمہیں بروقت یاد آ گیا، مگر تمہاری باتیں تمہیں بھول گئے کرنا خاور۔“ اس کے سر پر کھڑے وہ پُرش نگاہوں سے اس کے بے ہوش وجود کو دیکھ کر کہہ رہا تھا۔ ”بھئی کہ اپنے دشمن کو درخت پر چڑھنا نہیں سکتاتے تم اور میں دشمن تھے ہیں اور میں گے تم نے میرے وعدے پر اعتبار کیا۔ تمہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں وہ سچا ایمان دار سحری یوسف نہیں رہا جو وعدے سے نہیں پھرتے۔ گگ گاڑ کی موت کے ساتھ وہ کو گیا ہے۔ تمہارا نام کلیئر کرانے کا روانہ میرا کل تھا نہ آج ہے۔ میں نے تمہیں صرف استعمال کیا ہے کیونکہ صرف تم اس جیل کو توڑنے میں میری مدد کر سکتے تھے۔ اور وہ تم نے کر دی۔ تمہیں کس بیٹ نو تمہیں کس۔“

کہہ کر وہ اندر دینی کمرے کی طرف چلا گیا اور جب باہر آیا تو کندھے سے بیگ میں خاور کی تمام رقم اور اسلحہ رکھا تھا۔ اس کا ایک پاسپورٹ بھی وہ لے آیا تھا۔ باقی چھوڑ آیا تھا۔ ایک نظر اس نے چنن میں بے سدھ کرے خاور پر ڈالی اور پھر وہ پنی کیپ اٹھالی جو کارلس پہ دھری تھی اور اسے سینتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔

دو واہ باہر سے بند کرنا وہ بالکل نہیں بھولا تھا۔ تیزی سے زینے اتر کر وہ عمارت سے باہر نکل آیا۔ اور اب پورے چاند کی اس نچ بستہ رات میں اندھیری سڑک پر اپنا پنی کیپ والا سر جھکائے۔ عینوں میں ہاتھ ڈالے کندھے سے بیگ لٹکائے وہ دوڑ چلا جا رہا تھا۔



زخم جیتنے بھی تھے سب منسوب قاتل سے ہوئے

تیرے ہاتھوں کے نشل اسے چارہ کر دیکھے گا کون؟
 ہوش کے شانہ سوچتے ہیں بیٹھے سوئی، کبیل میں
 دیکھیے خبر سوری ہی تھی گورہ بھی سوئی کی طرح مہکتی
 ساٹانگ پہ ٹانگہ جلائے بیٹھا جواہرات کو دیکھ رہا تھا جو
 بے چینی سے اور حراؤ حراؤ چکر رکھ رہی تھی۔ جب تک
 وہ ان کا پتھا کر سکتا تھا اس نے کیا، لیکن جب یہ یقین
 ہو گیا کہ وہ ان کی پہنچ سے نکل چکے ہیں تو ہاشم اطمینان
 سے اس صوفیہ آکر بیٹھ گیا تھا۔

”اب کیا ہو گا ہاشم؟ وہ دونوں نکل گئے۔“
 ”سعدی کی تصویر سے ملتا جلتا اکتچ اور خلود کی
 اصلی تصویر پولیس کو دے دی ہے۔ اور ان مسنگ
 لوگوں کی تلاش شروع کر چکی ہے۔ ہمارے آدمی بھی
 لگے ہیں۔ جیل کو ہم نے صاف کر کے اس میں فائو
 سلمان بھر دیا ہے اور اب وہ ہسٹنٹ اسٹور سے زیادہ
 کچھ نہیں ہے۔ اگر ہم ان کو نہ بھی پکڑ سکے تب بھی
 کوئی ثبوت نہیں ہے کہ سعدی کو ہم نے قید کر کے
 رکھا تھا۔“

”ثبوت!“ اس نے بے یقینی سے ہاشم کو دیکھا۔
 ”ثبوت کی پروا کسے ہے؟ سعدی پھونکنے کے ساتھ ہی
 گھر نکل گئے گا اور سب کو تارے گا۔“
 ”ان کے تمام نمبرز ہم شیپ کر رہے ہیں، سری انکا
 سے آنے والی کل پکڑی جائے گی۔ ہمیں حکم ہو جائے
 گا۔“

”وہ ای میل کر سکتا ہے، گور چلو کل تم پکڑ بھی لو تو
 وہ تو ان کو سب بتا چکا ہو گا۔ اتنا عرصہ اس کو اس لیے قید
 میں رکھا تھا کہ وہ ہمارے راز نہ کھولے، گور اب۔“ وہ
 شدید پریشان تھی ہاشم نے اچھے سے ابرو اٹھائی۔
 ”آپ کے خیال میں اسے اتنا عرصہ اس لیے مقید
 رکھا کیونکہ میں اس کے منہ کھولنے سے ڈرتا تھا؟ میں
 نے؟“
 ”ظاہر ہے، ہمیں ہی نقصان ہو گا اس کا منہ کھلنے
 سے۔“

”مئی اگر میں اس سے ڈرتا ہوں تو شیرو کے بجائے
 میں نے اس کو گولیاں ماری ہوں تیں، مگر میں نے تب

بھی بار بار شیرو سے کہا تھا کہ سعدی کو سنبھال لوں گا۔
 مئی! اس کے منہ کھولنے میں ہمارا کوئی نقصان نہیں
 ہے۔“ صوفیہ کی پشت پہ ہانڈ پھیلانے، وہ مطمئن سا
 بیٹھا تھا۔

”تو پھر؟ ہم نے کیوں اسے اتنا عرصہ خاموش
 کرائے رکھا؟“

”کیونکہ پول کہہ انہی فیملی کو خطرے میں ڈالے گا۔
 مجھے اس کی فیملی کی فکر تھی۔ میں نہیں چاہتا کہ ان
 لوگوں کے ساتھ مزید کچھ برا ہو۔ لیکن اگر وہ بولے گا تو
 ظاہر ہے مجھے ان سب کو ”فکس“ کرنا پڑے گا جتنے
 لوگوں کو تارے گا اتنے لوگ ہمارے نشانے آجائیں
 گئے۔“ ہمیں کوئی نقصان نہیں ہو سکتا مئی، ”وہ اس
 وقت Vulnerable ہے۔“

جواہرات بالکل ساکت سی ہو کر اسے دیکھے گئی۔
 ”ایک قاتل ہونے کی حیثیت سے تمہیں یہ ڈر نہیں
 ہے کہ اگر وہ تمہارے قاتل کے راز کھول دے تو تم دنیا
 میں منہ دکھانے کے قاتل نہیں رہو گے؟“ اس کی
 آواز میں اس کا اپنا اندر دہنی ڈر قابو تھا۔
 ”مئی۔!“ اس نے حیرت بھری مسکراہٹ سے
 یں کو دیکھا۔ ”وہ مجھ پہ الزام لگائے گا تو کیا دنیا اس پہ
 یقین کرے گی؟“

”It would be his word
 against mine!“

وہ کون ہے؟ سچ کو ٹیک میل کرنے والا ایک گارڈ کو
 قتل کرنے والا، گور اس کے لیے مسند قاتل نے اس
 کے بارے میں اعتراف جرم میں کہا تھا کہ وہ منشیات
 کی خرید و فروخت میں ملوث تھا۔ ایسے شخص کی کیا
 کریڈیٹیلی ہوتی ہے؟ گور میں کیا ہوں؟ شہر کے بااثر
 وکلاء میں سے ایک۔۔۔ آئل لابی کا کنٹریولر۔
 Philanthropist۔۔۔ جس کو بھی کسی گمنام
 کیس میں مطلوب نہیں قرار دیا گیا۔ میں وائٹ کار
 باعزت آدمی ہوں، میری ایک کریڈیٹیلی ہے۔ میرے
 مقابلے پہ اس کی بات کا کون یقین کرے گا؟ فرق اس
 سے نہیں پڑتا کہ کیا کہا جا رہا ہے فرق اس سے پڑتا ہے

کہ کون کہہ رہا ہے۔ کوٹ سے تادیبہ کرو جھاڑتے ہوئے اس نے بے نیازی سے کہا تھا۔ جواہرات وغیرہ سے کرسی پر بیٹھی اس کا دل غمخیز ہوا تھا۔
 ”فرق اس سے تمہیں پڑنا کہ آپ کے کون سے راز کس کے پاس ہیں۔ فرق اس سے پڑنا ہے کہ آپ کے محرم راز کی کئی بیعتیں کیا ہے۔“ وہ خود سے بولی گئی۔
 ایک سکون سا تھا جو اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لیتا گیا۔
 ”لیکن اس کی فیملی تو اس کا یقین کرے گی ہاشم! پھر کیا ہوگا؟“

”پھر؟“ وہ کوٹ کا ٹین بند کرتے ہوئے اٹھا اور سجدگی سے مل کر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”پھر ہاشم سب سنبھال لے گا۔“ اور ڈرنے تک روم کی طرف بڑھ گیا۔ جواہرات بھی اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھ گئی۔ ایک طویل سرد اور سنسنی خیز رات اپنے اختتام کو پہنچی تھی۔



صرف احساس ندامت! آگ سجدہ اور چشم تر لے خدا کتنا آسان ہے منانا تجھ کو اگلی فجر۔ دھند صاحب تھی بالکل ندامت مغرب۔ بادل بھی عقاب تھے اور آسمان بالکل صاف تھا۔ ابھی فجر میں چند ساعتیں باقی تھیں۔ ایسے میں نئے گھر میں حسین رضائی میں لپٹی آنکھیں موندے بے خبر سو رہی تھی۔ ماتھے پہ کٹے پل کھمبے تھے اور باقی جیسے پر پھیلے تھے۔ ایک میزنگ کی ہیئت کی مخلوق اس کے کندھے پہ چپکے سے آئی تھی اور اس نے اپنی ہی سونڈ کے ذریعے حنہ کے دل کو پکڑا اور پھر اس پہ گرو لگائی۔ ایک دو تین۔ حنہ بے خبر سوئی رہی۔ ساری دنیا سوئی رہی۔
 ”اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے۔ اٹھو اور خبردار کرو۔“

دلفعتا! ایک جھٹکے سے حنہ کی آنکھیں کھلیں۔ اس نے اوڑھ لپیٹ کر دیکھا۔ پھر آس پاس ہاتھ مارا۔ مواصلات اٹھا کر روشن کیا۔ کیا وہ اللارم سے اٹھی تھی؟

پانچ اللارم لگائے تھے اس نے کمرے پہلے اللارم کے بیچے میں ابھی چار منٹ رہتے تھے۔ پھر وہ کس چیز سے اٹھی؟ لڑان کی آواز سے؟ مگر لڑان میں ابھی دس منٹ تھے۔ پہلی لڑان تو ابھی ہوئی ہی نہیں تھی۔

”اور اپنے رب کی ہی بڑائی بیان کرو۔“
 حسین سن رہی تھی۔ کوئی آواز اس کو سنائی دی تھی۔ بھولی ہوئی سورۃ المدثر جو اس کو چلتے میں بھی یاد نہ آئی، آج سوتے میں یاد آئی تھی۔ وہ مخلوق بھی خاموشی سے اس کے دل کو جھرنے بیٹھی رہی۔

”سب تعریف اس اللہ کی جس نے ہمیں بارہ دنوں کے بعد زندہ کر کے اٹھایا۔ اور اسی کی طرف ہم نے پلٹنا ہے۔“ وہ اللہ کا نام لیتے ہوئے ایک دم اٹھ بیٹھی۔ دل کو ہانڈے ہوئے ٹین گھروں میں سے ایک جھانکے سے لپٹی۔

حنہ کچھ دیر وہیں بیٹھی رہی۔ وہ کیسے اٹھ گئی؟ آج آنکھیں کھولتے آسے موت کیوں نہیں پڑی؟ احساسِ ذمہ داری تھا کیا کیا؟

”اور اپنے گھروں کو پاک صاف رکھو اور ہر قسم کی گندگی سے اپنے آپ کو دور رکھو۔“

وہ سر جھٹک کر بستر سے اٹھی اور جب وہ سبک کے اوپر کھڑی ہوئی کھول کر دیکھ کر گئی تو دل پہ دو سری گھر بھی جھٹکے سے ٹوٹ گئی۔ آدمی بیگ کر وہ باہر نکلی اور جائے نماز اٹھانے لگی۔ پھر رکی۔ لوں! جلدی سے الساری کی طرف بڑھی۔ اس دن درزی سے دو نئے سرویوں کے جوڑے سل کر آئے تھے۔ اب وہ ان لوگوں میں سے نہیں رہی تھی جو نیا جوڑا کسی کے گھر جاتے ہوئے پہلی دفعہ نہیں گئے۔ ”کہہ کر الساری میں سنبھال کر رکھ لیجئے ہیں۔ نیا جوڑا سب سے پہلے نماز میں پہننا ہوتا ہے۔ اس نے بل برش کیے، چوٹی گوندھی۔ نیا لباس پہنا۔ سلیپتے سے دوپٹہ چہرے کے گرد لپیٹا۔ اور جائے نماز آگڑی ہوئی۔ اللہ اکبر کہہ کر جیسے ہی رفع یدین کیا، دل پہ گئی تیسری گھر بھی ٹوٹ گئی۔ مگر وہ مخلوق بارہ ماٹنے کو تیار نہ تھی۔ وہ اس کے کان میں بولنے لگی۔ اس کو جھٹکے دن کے کام یاد

کروانے لگی۔ ذہن میں خشک ڈالا کہ یہ دوسری رکعت ہے یا پہلی؟ اس میں بیٹھنا ہے یا نہیں بیٹھنا؟ پھر اٹھنا کا چھوڑ دھالنے لگی۔ ٹھیک سے علاج حل چکا تھا۔

آخر ذرا بھی لوگ آجاتے تھیں ورنہ اس سے بدی ہو گیا ہوتی کوئی؟ اعوذ باللہ مجھ سے کرو دیتا ہے۔

باقی کی نماز سکون سے پڑھی گئی۔

سلام پھیر کر جب اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا مانگے دل میں کوئی عجیب سی خوشی بھری تھی۔ بار بار اور اور دہرائی تھی۔ وہ کیسے اٹھ گئی؟ اور آف۔ یہ اٹھ جانے میں کتنا مڑا تھا۔ کتنا سکون تھا۔ اس اندھیرے میں اپنی اندھیر زندگی کے بارے میں اس کو روولے سے باتیں کرنا کتنا اچھا لگ رہا تھا۔

(اے اللہ۔ اے اللہ۔ سب تعریف آپ کے لیے ہی ہے۔ آپ نے مجھے جمہور سے دی۔ رسول اللہ میں حجرہ اٹھی۔ اے اللہ۔) زندگی میں پہلی دفعہ حسین یوسف کی سمجھ میں آیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیوں من کو بھرتی اور کہتے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہیں۔ کیوں رحمت فرماتے سے پہلے آخری ساتوں میں۔ وہ فرماتے رہے تھے نماز نماز نماز۔ اور یہ کیفیت۔ یہ وہی ”کچھ“ مسکا ہے جو فرما اور تجھ پہ اکتا ہے۔

”ہر شخص اپنے کلمے ہوئے اعمال کے بدلے میں

سے قصر کاروار جیسا سفر نہیں نظر آتا تھا مگر اسے وہ بھڑو لگانا بھی نہیں تھا۔

(کیا چیز نے کرنی تھیں جنم میں؟ وہ کہیں گے۔ نہ تھے ہم نماز پڑھنے والے۔ نہ تھے ہم نماز پڑھنے والے۔)

اس نے آنکھیں بند کر کے سر ہوا کو محسوس کرنا چاہا۔ آج۔ اسے کچھ بہتر مل گیا تھا۔ حسین کے خیال میں وہ اب بھی اللہ سے وہی محبت نہیں کرتی تھی جیسے کرنی چاہیے، مگر وہ اب اللہ تعالیٰ سے ایک تعلق ضرور بنانا چاہتی تھی۔ اللہ کے سامنے اس کا امپریشن ٹھیک ہو جائے۔ اللہ اس کی تعریف کرے۔ اس کے دل میں۔ سب سے بدی تھی وہ تھی۔ اور وہ جو اللہ کو پسند ہے۔ بھری نماز۔ اس کو اس نماز سے محبت ہو گئی تھی۔ آج اسے اعلا محبت اور اولی محبت میں فرق سمجھ میں آیا تھا۔

ٹھنڈی ہوا میں کڑی حسین نے آج۔ ہاں آج اس نے ہام کاروار کو دل سے جانے دیا تھا۔ مرض عشق کی جس برف نے اس کے دل کو جمادیا تھا بھری پہلی کرن نے اسے پگھلایا تھا۔ آج حسین یوسف آزاد ہو گئی تھی۔ وہ اپنے دل کی مالک بنی تھی یا نہیں مگر اس نے اس سائر کے تجھے سے اپنا دل ضرور چھڑایا تھا۔

بلہ کال ابھی تک جا سنی آسٹن۔ وہ دیک رہا تھا اور زمین پہ پتے پتے بڑے بڑے سندھوں کو اپنے اشاروں پہ چلا رہا تھا اور۔ نیچے آگے۔ پیچھے۔



کچھ اب سمجھنے لگی ہے جاں بھی بدل چلا رنگ آسٹن بھی جو رات بھاری تھی نکل گئی ہے جو دن کڑا تھا کڑ گیا وہ صبح ہی آسٹن اسوں کے تھلے سا جھللا تا سو ج آسٹن پہ چکا تھا کہ سارے شہر نے پھل کر اٹھرائی لی۔ کوئی جمہور سا ٹولہ دھند سی چھٹی۔

اس اونچے ہوٹل کا وسیع و کشادہ مرکزی بیڈ روم شہرے رنگ میں آراستہ دکھائی دیتا تھا۔ تھیں بیڈوار کیر پورے کڑی کے آگے سے پڑتے تھے اور دھوپ پورے

رہن ہے۔

سولے آسٹن بائو اولوں کے جو جنٹوں میں ہوں گے اور پوچھیں گے بھرموں سے کہ کیا چیز نے لگی تھیں جنم میں۔ (پتہ ہالے) کہیں گے۔

نہ تھے ہم نماز پڑھنے والے۔ (سورۃ الدھر) جانے نماز تہہ کرنے کے وہ اٹھی اور کڑی میں آکھڑی ہوئی۔ پٹ کھول کر سر ہوا کو اس نے اندر آنے دیا۔ وہاں ایک خوب صورت کافی نظر آ رہی تھی۔ نئے ٹھکر

کمرے کو روشن کر رہی تھی۔ شہری ڈورینگ نیبل کے کنارے فارس بیٹھا تھا اور سامنے اسٹول پر بیٹھی خود کو آئینے میں دیکھ کر بال برش کرتی زمر کو دیکھ رہا تھا۔ وہ چہرہ یا میں طرف جھکائے، بالوں کے سروں میں برش چلاتے ہوئے بولی۔

”اب گھر چلتے ہیں بس سے پہلے کہ سب سمجھیں، ہم واقعی بھاگ چکے ہیں۔“

فارس نے بے اختیار سر جھٹکا۔ ”نی اٹھل وہ مجھے اپنے گھر والے کم اور سسرال والے زیادہ لگ رہے ہیں۔“

وہ ہلکا سا ہنس دی اور چہرہ جھکائے بال برش کرتی رہی۔

”جانتا ہے مجھے تمہاری سب سے خوب صورت بات کیا لگتی ہے۔“

”میں بہت۔“

”تمہارے بال۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر تری سے اس کی چند تھکنے والی ٹیسٹیں انگلیوں میں اٹھائیں۔ زمر نے بھوری آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرائی۔

”ہاں میرے بالوں کے کرلز ہمیشہ سب کو پسند رہے ہیں۔“

”نہیں، ان کے کرلز نہیں، مجھے ان کا رنگ پسند ہے۔“

”رنگ؟“ زمر نے ایک دم چونک کر برش رکھ دیا۔

”ہاں۔ ان کا براؤن کالر۔“ (زمر نے بے اختیار

تھوک نگلا مکہ اپنی دھن میں کہہ رہا تھا) ”سعدی اور سیم کے بال بھی براؤن ہیں مگر تمہارا کالر بہت مختلف بہت خوب صورت ہے۔“ وہ نرمی سے اس کے بالوں کو چھو کر کہہ رہا تھا۔ زمر نے ذرا مضطرب وہ ہو کر برش رکھا۔

”میرے بالوں کا رنگ بھی سعدی کی طرح ہے۔“

مطلب میرا اصل کالر۔ یہ چاکلیٹ براؤن تو میں۔

ڈائی کرتی ہوں۔ اور اپنے بال نرمی سے چھڑا لیے۔

فارس کو چند لمبے اس کی بات کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ بس شہری آنکھیں سیریز کر اسے دیکھنے

لگا۔ ”کیا مطلب؟“

”فارس! میرے بال سعدی جیسے ہی ہیں، یہ ذرا زیادہ براؤن میں نے خود کیے ہوئے ہیں۔ مجھے ایسے اچھے لگتے ہیں۔ میرا فون کیا تم نے آف کر دیا تھا؟“ اس نے اپنا فون اٹھاتے ہوئے نشوونما سے پوچھا۔

”ایک منٹ ہے۔ اصلی کالر نہیں ہے؟ مگر جب میں نے تمہاری یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا، تب بھی تمہارے بالوں کا یہی کالر تھا۔“

”میں پانچیس سال کی عمر سے بال ڈائی کر رہی ہوں فارس! پاکستان کی ہر تیسری لڑکی بال ڈائی کرتی ہے۔ آف اتنے مسجود۔“ وہ اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

جب وہ کچھ نہ بولا تو سرائی کر اسے دیکھا وہ ابھی تک اچھے سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”تمہارا مطلب ہے تم سات۔ آٹھ سال سے مجھے دھوکا دے رہی ہو؟ قانوناً اس کی کیا سزا ہوتی ہے؟“

”میں نے کوئی دھوکا نہیں دیا۔ تم نے پہلے کبھی اس بارے میں بات ہی نہیں کی تو میں کیا بتاتی۔“ وہ خفا ہوئی۔

”یہ تمہارے کرلز بھی نقلی ہیں پھر؟“ وہ مشکوک ہو چکا تھا۔

”اف فارس! میرا کچھ بھی نقلی نہیں ہے، صرف ذرا سا کالر ہے۔“ مکہ لٹی میں سر ہلا نا اٹھ کھڑا ہوا۔

”نہیں زمر بی بی۔ آپ نے مجھے اتنے سال دھوکے میں رکھا۔ میں آپ کا ہر ظلم معاف کر سکتا ہوں، مگر یہ نہیں۔ آپ نے تو میرا دل توڑا ہے۔ کیسے لوٹائیں گی آپ مجھے میرے آٹھ سال؟ کیونکہ آج مجھے لگ رہا ہے کہ مجھے آپ سے بالکل بھی محبت نہیں رہی۔“ وہ لٹی میں گردن ہلاتا، ابھی تک تجسس سے کہہ رہا تھا۔ زمر نے گردن موڑ کر تکی سے اسے دیکھا۔

”تکنا بولنا آ گیا ہے تمہیں۔“ وہ ابھی جواب میں کچھ ٹھیکسا کہنے لگا تھا کہ اس کا اپنا موبائل جیب میں تھر تھرائے لگا۔ اس نے نکال کر دیکھا۔ ”آبدار!“ اس نے کل کلٹی۔

جو بات دینے کے لیے جموڑو اور خود اس باوری مثل کے بیڑوم میں آگیا جو ذمہ اور اس کے لیے ندرت نے سیٹ کیا تھا۔ اس نے لیپ ٹاپ نکالا اور اس پہ ایک محفوظ شدہ لنک کھولا۔

جو چین۔ زہرا پتین اس نے سہدی کو بھیجا تھا۔ اس میں جی بی ایس ٹریسر لگا تھا۔ اسکرین پہ وہ جی بی ایس ایکٹو سٹائل دے رہا تھا۔ کل رات سے پہلے تک وہ اس علاقے میں تھا جہاں ہارون عید کا ہوٹل تھا۔ مگر آج صبح۔ وہ اس ہوٹل سے کئی کوس دور۔ ایک پارک میں آکر رک گیا تھا اور ابھی تک ایکٹو تھا۔

سہدی کے پاس آکر وہ پتین تھا تو وہ اتنے ٹکٹوں سے اس پارک میں کیوں بیٹھا تھا؟ یا پھر وہ چین کس کے پاس تھا؟ وہ ایک دم بہت پریشان ہو گیا تھا۔ پچھلے آٹھ ماہ سے اس کو معلوم تھا کہ سہدی یوسف کہاں ہے۔ مگر پہلی دفعہ اس نے سہدی کی لوکیشن کھودی تھی۔ شاید اس نے صبح میں ذمہ کو کل کی ہوئے نمک فارس نے سر دو لول ہاتھوں میں کر لیا۔

پچھلے آٹھ ماہ کی ان تھک محنت کے بعد۔ پہلی دفعہ وہ صرف اپنے زور ذمہ کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا تھا زندگی پہ اس کا بھی حق ہے اور کم از کم کچھ دیر کے لیے ذمہ ساری دنیا سے کٹ کر صرف اس کی باتیں سننے، اس کو وقت دے۔ مگر وہ غلط تھا۔ اس کا زندگی پہ کوئی حق نہیں تھا۔ اس کو صرف اپنا کام کرنا چاہیے تھا۔ اسے اپنے بھائی اور یوی کا انتقام لینا تھا اور سہدی یوسف کو واپس اپنے خاندان تک پہنچانا تھا۔ اسے اپنا نہیں سوچنا تھا۔ وہ تو منحوس تھا۔ اسے ذمہ کا خون نہیں آف کرنا چاہیے تھا۔

اب وہ پھر سے اپنے سنجیدہ اور سیٹ خول میں سمٹ آیا تھا اور کمرے میں ادھر ادھر ٹکٹے ایک بھر ملا رہا تھا۔

”ہاں فریڈن انٹیک ہو؟ اچھا یہ بتاؤ کل شام ہوٹل میں سب خیریت رہی؟“

”میں نے آپ کو کل کی تھی نمبر بند تھا۔ خیریت تھی مگر ہاتھ کاردار کل ادھر آیا ہوا تھا۔ وہ اور اس کے

”میں اس محلے کو اتنی جلدی نہیں ختم کرنے والا واپس آکر اس بارے میں بات کرنا ہوں۔“ اس کا تو واقعی دل ٹوٹ گیا تھا۔ خفا سے لہجے میں کہہ رہا ہر کل گیا۔ اور پھر اپنے دو سرے جموڑے مہیا کل سے کال بیک کی۔ کئی نے فوراً اٹھا لیا تھا اور اس کی گواہ سن کر چکی تھی۔

”تو فارس غازی کا بلا کڈ نمبر“ بھی ہے۔ امید ہے یہ بگ نہیں ہو رہا ہو گا، کیونکہ مجھے آپ سے بہت خاص بات کرنی ہے۔“

”آئندہ میری بیوی سے اس ٹون میں بات مت کیجئے گا۔“ وہ اندر ذمہ سے خفا لہجے میں شکایت کرنے والے فارس غازی سے بالکل مختلف اور سنجیدہ لگ رہا تھا۔ ابدار لہجے بھر کے لیے سمجھ نہیں سکی پھر رات والا اپنا رویہ یاد آیا تو انہوں نے زبان دی۔

”میرے منہ سے نکل گیا تھا میں تو۔“

”وہ مجھے بہت عزیز ہے، اور جتنی عزت میں اس کی کرتا ہوں، آپ سے توقع کرنا ہوں کہ آپ بھی کریں گی۔ اب بتائیے کیا بات تھی؟“ ہموار مگر بے جھجک انداز میں رات والا ادھر اچکا کہہ بولا تھا۔ وہ چند لمحے خاموش رہی۔

”سہدی اور خاور کل جیل توڑ کر فرار ہو گئے ہیں۔ میں نے رات میں آپ کو بہت کلاز کیں۔ مگر آپ کا فون آف تھا۔“ وہ سچے سچے لہجے میں بولا۔

”کیا؟“ وہ ایک دم ششدر رہ گیا۔ پھر بے اختیار پوچھنی سہلی۔ ہوٹلوں پہ بند مٹھی رکھی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ جذبات کو کیسے قابو کرے۔

”ہاتھم لے پایا کو بتایا ہے کہ وہ انہیں اب تک نہیں ڈھونڈ پائے۔ اب معلوم نہیں ڈھونڈ کر چھپا لیا ہے یا واقعی وہ دونوں لاپتہ ہو چکے ہیں۔“

فارس نے کچھ کہنے بنا فون رکھ دیا اور جب وہ واپس کمرے میں گیا تو بالکل خاموش تھا۔



گھر واپس آکر اس نے ذمہ کو سب کے سوالوں کے

آوی رہا ہر اکے وقت ہاتھوں کی طرح اوہ اوہر بھاگ رہے تھے۔ کچھ معلوم نہیں ہو سکا، مگر وہ کسی کو ڈھونڈ رہے تھے جیسے۔

”ٹھیک ہے، آنکھیں کھلی رکھو اور مجھے رپورٹ دیتے رہنا۔“ اس نے اسی اضطراب سے فون بند کیا۔ فریڈ تھا لیڈ میں سیٹل ہونے کا خواہش مند ایک بری ہو جانے والا اس کا جیل کا ساتھی تھا۔ اس نے اسے سری لنکا میں سیٹل ہونے کی پیشکش کی تھی۔

(احمد شفیق سے بارون عید تک سفارش کروانا، اپنا نام آنے بغیر اور امر کو مشکوک کیے بغیر بہت آسان تھا) اور بدلے میں ”رپورٹ“ نامی تھی۔ اب وہ کچھ عرصے سے اسی ہوٹل میں کام کر رہا تھا۔ اس کی رسائی بکن کے نیچے نئی جیل تک تو نہ تھی، مگر جہاں تک اس کی آنکھیں جالی تھیں وہ عذاری کو خبر دے دیا کرتا تھا۔

اب اس نے ایک اور نمبر ملایا۔ ”عزیزت! تم ہسپتال میں ٹائٹ ڈیوٹی پر تھے کل رات؟ اوکے گڈ۔ تمہارے سامنے والی بلڈنگ میں رات کو کیا صبح میں کوئی آیا ہے؟“ اگر کوئی حرکت نظر آئے، کوئی آمد رفت ہو تو مجھے خبر رکھ۔“

وہ ایک ایک کر کے ہاشم کارواری، ملکی وغیر ملکی جیلوں کے قریب موجود اپنے دوستوں کو فون کر رہا تھا۔ وہ اس کی چاروں خفیہ جیلوں کے بارے میں جانتا تھا۔ اگر وہ دونوں مفور قیدی ان جیلوں میں سے کسی میں نہیں لائے گئے تھے تو یقیناً ”ہاشم“ کو ابھی تک نہیں پکڑ سکا تھا۔ لیکن اگر وہ آزاد تھے تو سحری نے فون کیوں نہیں کیا تھا؟ ذمہ کے علاوہ کسی اور کو بھی تو فون کر سکتا تھا۔ وہ یقیناً ”کسی مشکل میں تھا۔“

آٹھ ماہ پہلے یوسف خانہ من نے سحری یوسف کو کھویا تھا مگر فارس غازی نے اسے کل رات کھویا تھا۔ اور اب اس کو ڈھونڈنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ مگر اس سے پہلے اسے ایک کام اور کرنا تھا۔ اپنے چہرے پر لے کر برف، ٹائٹ سہانے کچھ ڈاکو منٹس لے کر تو کسی سے بات کیے بنا وہ مگر سے باہر آ گیا۔ جب وہ گاڑی کو ان لاک کر رہا تھا تو ذمہ اس کے پیچھے باہر آئی۔

”کوئی مسئلہ ہے فارس؟ تم پریشان لگ رہے ہو؟“ میں ٹھیک ہوں۔ تمہارے ڈاکٹر کے پاس جا رہا ہوں۔ ڈونر کے ڈاکو منٹس لے کر۔“ بدقت ذرا سا مسکرا کر فائل لوپر اٹھا کر کھلتی اور گاڑی کے اندر بیٹھا۔ یہ وہ پہلے ہی طے کر چکے تھے زمکی ضرورت نہیں تو صرف وہی جائے گا۔ مگر اتنی جلدی کیا تھی اسے؟ اسے گاڑی باہر نکالنے دیکھ کر ذمہ نے سوچا۔ مگر خیر۔ اسے فارس پہ بھروسہ تھا۔ وہ سنبھال لے گا۔



اس لمحہ خیر و شر میں کہیں اک ساعت ایسی ہے جس میں ہر بات گناہ نہیں ہوتی، سب کاروبار نہیں ہوتا، ڈاکٹر کا کام نے اپنی کر سی سے اٹھ کر خوش دلی سے اس کا استقبال کیا۔ جینز پہ بھورا سوئیٹر پہنے چہرے پہ سجدہ اور برف، ٹائٹ سہانے، وہ سنہری گہری آنکھوں کو ڈاکٹر کا سامنے بولنے سامنے کر سی پہ بیٹھا اور ٹانگہ بٹانگہ جاملے قائل اپنے سامنے رکھ لیا۔

”مجھے خوشی ہے کہ آپ سے بلاخر ملاقات ہو رہی ہے۔ بہت سنا تھا آپ کے بارے میں۔“ وہ خوش دلی سے بولے تھے۔ اس کے لیے کافی آرزو کرنی چاہی مگر اس نے انکار کر دیا۔

”جو بھی بری باتیں سنی ہیں۔ آپ نے وہ سب درست ہیں۔“ وہ مسرور ٹھوٹے کر بولا تھا۔

”نہیں اچھی بھی سنی ہیں۔ خیر۔“ وہ جلد دعا پہ آ گئے۔

”ذمہ اپنے بارے میں بہت لاپرواہی برتی ہیں۔ انہیں بہت سہلے نرا اصلاحت کروا دیتا تھا جیسے تھا۔ خیر وہ کہہ رہی تھیں کہ آپ کہیں کسی ڈونر کی رپورٹس ہیں، اہل سے کولتے ہیں ٹیسٹس؟“ عینک لگاتے ہوئے انہوں نے رپورٹس کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر فارس نے کلنگڈ ان کی طرف نہیں بڑھائے۔

”میں اپنے تجربات خود کیا کرتا ہوں۔ کیا آپ کو مری نہیں لگ رہی؟“ تھے ہوئے وہ عجب سے بولا اور کھڑکی کھول دی، بھورا پائس آکر بیٹھا۔ ڈاکٹر کا سامنے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔ پھر سر جھٹک کر عینک اتار کے رکھی۔

تمہارے اوپر تھی ہے۔ مجھ سے جموٹ مت بولنا سوچ
 سچ بتاؤ۔ کارڈارڈ نے کیا کرنے کے لیے کہا تھا تم سے؟
 ڈاکٹر قاسم نے چند گہرے سانس لیے۔ روشنی کا
 سرخ دھبہ ابھی تک شرٹ پی پر ابھرا تھا۔ وقت وہ کہنے
 لگے۔

”سبز کارڈارڈ نے کہا تھا کہ میں اس کی دوا بدل دوں
 کسی طرح اس کا گردہ ضائع ہو جائے اور اس کو دوا پارہ
 سرجری کروانی پڑے گی۔ اس سب میں لگ کر وہ
 تمہارے کیس کو وقت نہیں دے پائے گی اور وہ اپنی
 مرضی کے وکیل کو تمہارے ساتھ جوڑ دیں گے۔ مگر
 میں نے۔۔۔ دیکھو۔۔۔ میں برا آدمی نہیں ہوں۔۔۔ میں
 نے ایسا نہیں کیا۔“

”مجھے پتا ہے تم نے ایسا نہیں کیا۔“ وہ درشتی سے
 اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ”حالانکہ دو سرے ڈاکٹرز
 نے بھی اس سے یہی کہا کہ گردہ ضائع ہو گیا ہے، مگر
 چونکہ وہ جس پر اعتبار کرتی ہے اس پر مکمل اعتبار کرتی
 ہے، سو یقیناً وہ صرف ان ہی ڈاکٹرز کے پاس گئی ہوگی
 جن کے پاس تم نے اسے بھیجا ہوگا۔“

”تمہیں کیسے پتا اس کا گردہ ضائع نہیں ہوا؟“
 ”کیونکہ جس ڈونر کو میں جانتا ہوں۔ اس کا عضو
 کبھی روجیکٹ نہیں ہو سکتا۔ اسے زمریت عزیز
 تھی اس کی قرابانی ایسے ضائع نہیں ہو سکتی۔“
 ڈاکٹر قاسم نے کمری سانس لے کر اثبات میں سر کو
 خم کیا۔ ”سعدی یوسف۔ آف کورس۔ اس کا گردہ
 ٹھیک ہے۔ وہ پرنوکٹ سچ تھا۔ وہ چند سال اور چل
 جائے گا۔ تمہارے۔“

”اور یقیناً تم نے زمر کی دوا بھی بدلی ہے؟ کیونکہ وہ
 زرد اور تیار لگنے لگی ہے۔“
 ”مجھے چند جموںی علامتیں ڈالنی تھیں، تاکہ اسے
 محسوس ہو کہ وہ تیار ہے۔ کیونکہ مجھے اپنی پھٹنٹ مت
 عزیز ہے۔ میں نے بہت وقتوں سے سبز کارڈارڈ کو ٹالے
 رکھا ہے۔“

”ظاہر ہے، تم ایسا نہ کرتے تو تمہیں تمہارے وہ
 کروٹوں روپے کیسے ملتے؟ تمہیں اپنی نظر میں اچھا
 بھی تو بننا تھا اس لیے تم نے زمر کو نقصان نہیں

پہنچایا۔“

”آئی ایم سوری۔ پلیز اس گمن کو میرے اوپر سے
 ہٹاؤ۔ میں زمر سے معافی مانگ لوں گا میں اسے سب
 سچ بتا دوں گا۔“

فارس نے کھڑکی کی طرف رخ کر کے ہاتھ سے
 اشارہ کیا۔ اگلے ہی لمحے سرخ لیزر لائٹ ڈاکٹر قاسم کی
 شرٹ سے غائب ہو گئی۔ انہوں نے سکون کا سانس
 لیا۔ نشوونما کرنا تھے۔ آیا ہیڈ۔ پوچھا۔

”تم زمر کو کچھ نہیں بتاؤ گے ابھی کچھ عرصہ
 نہیں۔ صرف اتنا کہو گے کہ تم کوئی نئی دوا استعمال کرنا
 چاہتے ہو جس سے شاید اس کا تقریباً ناکارہ گردہ کام
 کرنے لگے۔ کوئی بھی وجہ گھڑ لیتا۔ تم ان کاموں میں
 ماہر ہو۔“ ڈاکٹر قاسم کو حیرت کا ہنسا کاٹا۔

”مجھے اسے بتانا ہے اب میں اس سے مزید نہیں
 چھپا سکتا۔ میں برا آدمی نہیں ہوں۔ میں نے پیشہ زمر
 کو نقصان پہنچایا ہے۔“

”نہیں، تم اسے کچھ نہیں بتاؤ گے۔ جس چیز کا میں
 انتظار کر رہا ہوں اس میں ابھی بڑا وقت ہے سب تک
 زمر کو نہیں معلوم ہونا چاہیے۔“

”فارس غازی! تم مجھے گل نہیں کرنے والے،
 بھلے تم مجھے اپنے اساتذہ سے کتنا ہی ڈراؤ۔“ وہ بھی
 سعدی سے کہتے آگے کو جھکے۔ ”تم مجھے اب اپنے
 اشاروں پہ نہیں چلا سکتے۔“ لیزر لائٹ ہٹ چلی تھی
 اور لن کا گھوٹا اظہار بحال ہو رہا تھا۔

فارس نے اپنے مخصوص انداز میں سر کو خم دیا اور
 فائل کھولیں۔ ایک کلنڈر نکال کر ان کے سامنے رکھا۔

”مجھے تمہیں اپنے اشاروں پہ چلانے کے لیے
 اساتذہ گمن کی ضرورت ہے بھی نہیں۔ یہ دیکھو۔ یہ
 پچھلے ماہ کا ریکارڈ ہے۔ تم نے ایک افغان نوجوان کا
 علاج کیا تھا جس کا نام ابو فرید حسان تھا۔“ ڈاکٹر قاسم
 نے عینک لگاتے ہوئے انجیب سے اس لسٹ کو دیکھا۔
 ”ہاں میں نے کیا تھا۔ وہ روشنی چیک اپ کے لیے
 آیا تھا۔“

”اور یہ تمہاری چند تصویروں ہیں، اس مریض کے
 ساتھ۔“ اس نے ایک پرنٹ آؤٹ نکال کر ڈاکٹر کے

”نہ کاردار کو تباہی کا نہ زمر کو میں وہی کروں گا جو تم کو گے۔ لیکن اس سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ تم میری بات کا یقین کرو گیو تلو۔ جب میں کہتا ہوں کہ میں نے زمر کو نقصان نہیں پہنچایا کسی تو میں غلط نہیں کہہ رہا فارس غازی۔ میں۔ برا آدمی نہیں ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں جھانک کر وہ کہہ رہے تھے۔

”شاید! فارس آہستہ سے سیدھا ہو کر بیٹھا۔ بہت آہستہ سے۔ ایک دم سے آسمان پہ کوئی تارا اٹوتا تھا۔ یا شاید وہ چاند تھا۔ بہت سے چکر اٹے ہوئے تھے۔ سدا بد لے تھے۔

جب وہ گاڑی میں آکر بیٹھا تو اکنیشن میں چابی گھمانے میں اسے کئی دیر لگی۔ اس کے ہاتھ کے اوپر سویٹیر کی آستین پہ تازہ خون کے چند دبے لگے تھے۔ گیسے بھر کے لیے اس نے سوچا کہ زمر کو تباہے، مگر نہیں۔ اسے اپنا نہیں سوچنا تھا ابھی نہیں۔ نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس نے خود کو ٹھنڈا کرنا چاہا پھر گاڑی چلا دی۔

سڑک پہ نگاہیں مرکوز کیے، ہر شے کو ذہن سے چمکا اور اپنے پرائیویٹ نمبر سے آبدار کو کال ملاتے ہوئے کار ایک طرف روکی۔

”ایک دن میں دو سری دفعہ فارس غازی کی کال سنانا کہ میں بہت اچھی ہوں اور کیوٹ بھی تمہے۔“
 ”آپ کے پاس پرائیویٹ جیٹ ہے نا؟“
 وہ خوشی تھی۔ ”ہمارے پاس دو پرائیویٹ جیٹس ہیں۔ مگر کون؟“

”گڈ۔ میرے پاس بلو پلاسپورٹ ہے۔ اور آپ کے پاس پرائیویٹ جیٹ ہے۔ ایک سوال پوچھوں آپ سے؟“ وہ ذرا ٹھہر کر بولا۔

”آپ میرے ساتھ کولبو چلیں گی؟“
 اور آبدار عید کا سارا وجود لیسے میں برف کا ہوا اور لیسے میں پھل کیل۔ کیل زندگی اسے اتنا خوب صورت سر پر اتروے کی اس نے سوچا ابھی نہ تھا۔
 (باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سانے رکھے۔ وہ ان میں اس مریض کا معائنہ کرتے نظر آرہے تھے۔ مریض کا نام رخ دکھائی دیتا تھا۔ لمبی داڑھی، سر پہ ٹوپی اور چہرہ زرا اجلا ہوا ہاتھ پہ بھی جلنے کا نشان تھا۔
 ”ہاں تو؟“

”تو یہ کہ یہ افغان باشندہ لب تک طور خرم کا بارڈر کراس کر کے واپس چا چکا ہے۔ اور اس کا نام ابو فرید نہیں ہے۔ یہ ایک اداکار ہے، میں نے اس کو یہ جلیہ اپنانے کے لیے کہا تھا تاکہ یہ سٹیڈی پوز سے لی گئی تصاویر میں ابو فرید کی طرح لگے۔ یہ ہے اصلی فرید۔“
 اس نے ایک اور تصویر نکال کر ڈاکٹر کے سامنے ڈالی۔ وہ ایک ذرا چلے ہوئے چہرے والے نوجوان کی تھی۔
 ”تو پھر؟“

”پھر یہ ڈاکٹر قاسم کہ ابو فرید حسان ایک افغانی باشندہ ہے اور یونیورسٹی حملے میں حکومت کو مطلوب ہے۔ وہ بہت گرو ہے۔ وہ۔۔۔ تمہارے پاس کبھی نہیں آیا، لیکن اگر کوئی تمہارے ریکارڈ کی یہ لسٹ دیکھے“
 فرست لرائی۔ ”اور یہ تصاویر دیکھے،“ تو سامنے کیا۔
 تو اسے لگے گا کہ تم نے ایک افغان عسکریت پسند کا علاج کیا ہے۔“

”ایک منٹ۔ میں نے کسی وہشت گرو کا علاج نہیں کیا۔“ ڈاکٹر قاسم کا سر گھومنے لگا۔
 ”تم یہ ثابت نہیں کر سکتے کیونکہ اگر میں اب کس کیمٹی کے کسی رکن یا کسی جرنیل کو یہ تصاویر اور یہ ریکارڈ بھیج دوں تو تم وہشت گروں کے سولت کار ثابت ہو جاؤ گے، وہ کھٹے کے اندر وہ جہیں گھر سے اٹھائیں گے اور فوجی عدالت میں مقدمہ چلا کر تین ماہ میں پھانسی چڑھا دیں گے۔ تم سابق صدر کے بی ایف ایف (مہترن دوست) تو ہو نہیں کہ جہیں کوئی رعایت ملے۔ ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے، تم زمر کو حقیقت بتانا چاہتے ہو؟“

ڈاکٹر قاسم نے بے اختیار سر سرکری کی پشت پہ گرا دیا اور بس بے بسی سے اس کو دیکھے گئے۔ فارس غازی کی سرور نظرس اب بھی ان پہ تھی۔ ہمیں۔ گھڑی کی سوئی تک تک کرنی تھی۔

Downloaded From
Paksociety.com

عمیرہ احمد



آپ حیات کی کمائی ناش کے تیرہ چہلوں میں چھپی ہوئی ہے۔
2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو بچھا کر دیا ہے۔ سالار نے امامہ کو امرنگلز دے دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد باپ نے دے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیوی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری چند ماہ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سرچل جاتا ہے۔

تہ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سولا

220 مارچ 2016

READING
Section

Downloaded From Paksociety.com

- کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی قبیلی کو کیوں مار ڈالا۔
- 6- اسپیلنگ کیلے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤ ٹیم میں ہیں۔ تیرہ سالہ ہنسی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک صرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتا دی۔ ایک اضافی لفظ کے درست بچے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد معطلین اور ذہن بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت غلطیہ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔
- 8- وہ جاتی تھی کہ وہ بددعا بتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کر دی اور ترمیم شدہ باب کارپنٹ نکال کر دیکھا اب اس کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔
- 7- وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر موئے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی اس نے اس بھی انکار کر دیا۔ وہ لڑکی اس موئے ساتھ ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔
- 4- وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

ستروپی قسط

پڑھنا اور لکھنا 221 مارچ 2016

READING
Section

"weiss-nicht-wo" حمین سکندر نے ایک ہی سانس میں رکے بغیر Championship word کے ساتھ کیے۔ کسی روٹ کی طرح ہمارے۔ خلا میں دیکھتے ہوئے۔ یوں جیسے وہ ان حرف کو خلا میں کہیں لکھا دیکھتے ہوئے پڑھ رہا تھا۔ وہ اس مقابلے کا پہلا لفظ تھا جسے اس نے ہمارے اس طرح ادا کیا تھا اور نہ وہ ہر لفظ کو صوح صوح کرے گا تھا یوں جیسے ٹاپ ٹول رہا ہو۔

"An unknown place" (ایک نامعلوم مقام) اس نے لفظ کے سچے کرتے ہی اسی رفتار سے اس کا مطلب بتایا۔ پھر اس کی نظریں pronouncer پر ٹکیں۔ pronouncer کے منہ سے نکلی:

"درست" کی آواز ہال میں گونج اٹھنے والی تالیوں کی آواز میں تم ہو گئی تھی۔ ہال میں اب حاضرین والدین اور بچے اپنی اپنی سیٹوں سے تالیاں بجاتے ہوئے کھڑے ہو رہے تھے۔ وہ 92nd اسپیننگ میل کے نئے فائنل کو خراج تحسین پیش کر رہے تھے جو اسٹیج پر فلیش لائٹس اور بی وی کیمروں کی چکا چوند کر دینے والی روشنیوں میں ساکت کھڑا تھا۔ دم سا دھم۔ لگے۔ اس کی گول آنکھیں کھو منا تک بھول گئی تھیں۔ یوں جیسے وہ ابھی تک اس شاک سے نکل نہ پایا ہو کہ وہ جیت چکا ہے یہ حمین سکندر تھا اور یہ حمین سکندر ہی ہو سکتا تھا۔

تالیوں کی بھرا کر دینے والی گونج اور کیمروں کی خیر کر دینے والی روشنیوں میں اس کو سالنہ تجھے خود کو سنبالا۔ اپنے اعصاب اور حواس پر ایک ہی وقت میں قابو پانے کی کوشش کی اور پھر جو سلا جملہ اس کے سامنے لگے ایک نے حاضرین تک پہنچایا تھا اس نے ان تالیوں کی گونج میں ایک بلند شگاف پیچھے کی آواز کو بھی شامل کیا تھا۔

"وہ مانی گاڑ۔" وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں بول سکا۔ حاضرین کی ہنسی نے جیسے اسے کچھ اور نروس کیا۔ پھر نادوم۔ پھر جوش اور پھر اس نے سر جھکا کر حاضرین کی تالیوں کا جواب دیا۔ پھر ایک قدم آگے بڑھا کر جج کی اس قطار کا جو حاضرین سے کچھ آگے بیٹھے ہوئے تھے، لیکن اب کھڑے تالیاں بجا رہے تھے، پھر اس نے پلٹ کر اس طرف دیکھا تھا جہاں اس کے ماں باپ اور ریسیہ بیٹھے تھے۔ وہ بھی اب سب کے ساتھ کھڑے اس کے لیے تالیاں بجا رہے تھے۔

حمین سکندر تقریباً "بھاگتا ہوا" ان کی طرف گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ سپاٹ لائٹ بھی گئی جو اس سے پہلے اسٹیج پر اس کو فوکس کیے ہوئے تھی۔ وہ تالیاں بجاتی اور آنسو بہاتی امامہ سے آکر لپٹا تھا۔ پھر اس سے الگ ہوتے ہوئے اس نے اسی تیزی سے امامہ کے گالوں پر ہتے ہوئے آنسو دونوں ہاتھوں سے رگڑے پھر ان ہاتھوں کو اپنی شرٹ پر رگڑتے ہوئے وہ سالار سے لپٹ گیا۔

I make you proud

Did "کیا آپ کو مجھ پر فخر ہوا۔" اس نے بیوش کی طرح جواب سے پوچھا۔

Very proud "بہت فخر" اس نے اسے ٹھپکتے ہوئے کہا۔

اس کی آنکھیں چمکیں۔ مسکراہٹ گہری ہوئی۔ پھر وہ ریسیہ کی طرف گیا۔ دونوں ہتھیلیاں پھیلاتے ہوئے اس نے بازو ہوا میں بلند کرتے ہوئے ریسیہ کے پھیلانے ہوئے ہاتھوں پر ہائی فائی کیا۔ اسے گلے میں لٹکا نمبر کارڈ اتار کر اس نے ریسیہ کے گلے میں ڈالا۔ پھر جھک کر اسے تھوڑا سا اٹھایا۔ وہ کھلکھلائی۔ حمین نے اسے نیچے اتارا اور اسی طرح بھاگتا ہوا واپس اسٹیج کے درمیان چلا گیا جہاں میزبان اب اس سے پھریات چیت کرنے کے لیے منتظر کھڑا تھا۔

"آخری لفظ کتنا مشکل تھا؟" بتائی کلمات کے بعد میزبان نے چھوٹے ہی اس سے پوچھا۔ وہ چند سیکنڈز پہلے سب فائنلسٹ سے ہاتھ ملاتے "ان کی مبارک بادیں وصول کرتے ہوئے اس کے پاس پہنچا تھا۔ ہال میں موجود

سب لوگ اب وہاں ششستیں سنبھال چکے تھے اور تقسیم انعامات کی تقریب دیکھنے کے منتظر تھے۔
 ”آخری لفظ تو بے حد آسان تھا۔“ حمین نے بڑے اطمینان سے کندھے اچکا کر کہا۔ ہال میں ہنسنے لگا۔
 ”تو پھر مشکل کیا تھا؟“ میزبان نے چھیڑ چھاڑ والے انداز میں کہا۔
 ”اس سے پہلے پوچھے جانے والے سارے الفاظ۔“ حمین نے بے حد سنجیدگی سے ترکی بہ ترکی کہا۔ ہال میں
 پہلے سے زیادہ اونچا ہنسنہ بلند ہوا۔

”کیوں کہ میں ہر لفظ بھول گیا تھا۔ بس نکلے لگا تا رہا، ہر لفظ کے سچے کرنے کے لیے۔ بس آخری لفظ تھا جو میں
 آ نکھیں سکا، ناک سب بند کرنے کے بھی سچے کر سکتا تھا۔“
 وہ روانی سے کہتا ہال میں نالیاں اور تھپتھپے لگتے رہے۔ وہ اس سچے کی حاضر جوابی خوش مزاجی اور بڑے
 سنجیدگی کی داد دیتے ہوئے منظور ہو رہے تھے، لیکن اس کی بات پر یقین نہیں کر رہے تھے۔ ہال میں بیٹھی ہوئی
 صرف رییسہ بھی جو یہ جانتی تھی کہ وہ حرف بہ حرف ٹھیک کہہ رہا ہے اسے آخری لفظ کے علاوہ واقعی سارے
 لفظ بھولے تھے اور وہ اس کے تاثرات دیکھ کر یہی یہ جان جاتی تھی کہ وہ ایک بار پھر اپنا لفظ سچے کرنا بھول گیا تھا اور
 پھر اپنی کرسی پر بیٹھی وہ اپنی انگلیوں کی پوروں پر اس کے لیے ہل ہی ہل میں دھاکنا شروع کر دیتی۔
 ”اور آخری لفظ اتنا آسان کیوں لگا تھا آپ کو۔“ میزبان نے پھر پوچھا۔

ایک ہاتھ اپنے سینے پر رکھے دوسرے ہاتھ سے رییسہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حمین نے بڑے فخریہ انداز
 میں کہا۔ ”کیونکہ میں اور میری بہن weissnichtwo (نامعلوم مقام) سے آئے ہیں۔“ ہال ایک بار پھر
 تالیوں اور قہقہوں سے گونج اٹھا تھا۔ ہال میں گلی اسکرین پر گلاسز لگائے شہزادائی ہوئی رییسہ ابھری تھی جس کے
 اطراف میں بیٹھے امامہ اور سالار بھی اس کی بات پر ہنس پڑے تھے۔
 حمین نے جو کہا تھا وہ بالکل ٹھیک تھا۔ وہ دونوں جھپٹے کئی ہفتوں سے اس ایک لفظ کا استعمال اپنے لیے اتنا
 باقاعدگی سے کر رہے تھے کہ یہ ان کی روزمرہ کی گفتگو کا حصہ بن گیا تھا۔

رییسہ اور حمین یہ سمجھتے تھے کہ وہ دونوں کسی نامعلوم تصوراتی دنیا سے آئے تھے۔ جو صرف ان دونوں کو جانتا
 تھی ان دونوں کو نظر آتی تھی، کسی دوسرے کو نہیں۔ وہ دونوں (افرحمے) تھے اور یہ ان دونوں کا ذاتی
 خیال تھا۔ یہ جھپٹے کچھ ہفتوں میں پائی جانے والی ان دونوں کی نئی فہنسی کا نام تھا اور یہ کیسے ممکن تھا کہ حمین
 سکندر اپنی اس فہنسی کا نام بھول جاتا جو یک دم اس کے سامنے حقیقت بن کر آئی تھی۔

رییسہ فخریہ انداز میں اپنے اس پارنٹر کو دیکھ رہی تھی جو اس کی طرح weisschtwo سے آیا تھا اور اس
 لفظ کو واقعی آ نکھیں سکا، ناک بند کیے بھی وہ ہرا سکتا تھا۔ pronouncer کے منہ سے اس ایک لفظ کو سنتے ہی
 وہ جان گئی تھی کہ وہ چھپتے چھپتے شپ اس سال حمین سکندر کے نام ہوئے والی ہے بالکل اس طرح جس طرح وہ جھپٹے
 دو سال عتابیہ اور جبریل کے نام رہی تھی۔ ان دونوں نے بھی حمین کی طرح پہلی بار شریک ہو کر اس چھپتے چھپتے
 کو اپنے نام کر لیا تھا۔

spelling Bee کی وہ ایک ٹیٹی امامہ نے اپنے گھر میں رییسہ کے لیے اشارت کی تھی۔ اس کی زبان سیکھنے
 کی صلاحیت (linguistic skills) کو بہتر کرنے کے لیے۔ نئے لفظ سیکھنا۔ ان کے سچے کرنا۔ انہیں
 درست تلفظ کے ساتھ بولنا سکھانا۔ ان کا مفہوم اور پھر روزمرہ کی گفتگو میں ان کا استعمال۔ وہ ایک ٹیٹی بڑھتے
 بڑھتے ان کے لیے ایک ٹیٹی نہیں، روٹین کا ایک حصہ بن گئی تھی اور اس روٹین کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ان چاروں بچوں
 کا (ذخیرہ الفاظ) vocabulary اپنی عمر کے بچوں سے بہت زیادہ اور بہت اچھا تھا۔ مقابلوں میں حصہ لینے کا

خیال بھی انہیں کبھی نہ آتا اگر وہ اپنی vocabulary کی وجہ سے پہلے ہی اپنے اسکول میں نمایاں نہ ہوتے۔
 حمین کی گفتگو کے دوران جو وہ اپنی تیاری ریکٹس کی روٹین کے حوالے سے کر رہا تھا، کمرہ بار بار امامہ اور
 سالار کو ہال میں لگی بڑی اسکرین پر دکھا رہا تھا۔ کیونکہ وہ اس چیپٹن کے والدین تھے جو اس وقت سینٹر اسٹیج پر تھا۔
 ان کے آس پاس بیٹھے دوسرے مقابلے میں حصہ لینے والے بچوں کے والدین وقتاً فوقتاً ”ان سے آکر مل رہے
 تھے۔ وہ مبارکبادیں وصول کر رہے تھے۔ بے حد پرسکون انداز میں ڈیجیٹل مسکر اہٹوں کے ساتھ۔ یوں جیسے
 یہ سب کچھ معمول کی بات ہو، عام بات ہو۔ اور واقعی یہ سب ان کے لیے عام سی بات تھی۔ ان کی لائق اولاد
 نے ان کے لیے یہ سب ”عام سی بات“ ہی کر دیا تھا۔

زندگی میں اب تک ان سب کی وجہ سے ان دونوں کی زندگی میں ایسے بہت سے فخر کے لمحات آئے تھے۔ ایسے
 لمحات جن کی یادوں کو وہ ساری عمر عزیز رکھ سکتے تھے۔

”مئی اگلے سال میں حصہ لوں گی۔“ ان کے درمیان بیٹھی ہوئی ریشہ نے اپنے گلے میں لٹکے، حمین کے
 کارڈ کو ہلاتے ہوئے سرگوشیوں میں امامہ کو اطلاع دی۔ امامہ نے اسے تھکا جیسے تلی بونے کر ہا ہی بھر دی ہو۔
 اسٹیج پر اب حمین کو ٹرائی دی جا رہی تھی۔ ٹائیوں، ٹیٹیوں، فلیش لائٹس کی چکاچوند اور میوزک کی گونج
 میں۔ حاضرین ایک بار پھر کھڑے ہو کر تالیاں بجاتے ہوئے داد دے رہے تھے اور وہاں سے کئی کلومیٹر دور
 واشنگٹن کے ایک قدرے نواحی علاقے کے ایک گھر میں بیٹھے جبریل اور عتیابہ بی بی پر اس پروگرام کی لائیو کوریج
 دیکھتے ہوئے اسی خوشی اور جوش کا حصہ بنے ہوئے تھے جو اسکرین پر انہیں اس ہال میں نظر آ رہا تھا۔ عتیابہ تھوڑی
 دیر پہلے اپنے ٹیسٹ کی تیاری ختم کر کے بیٹھی تھی جس کی وجہ سے وہ امامہ اور سالار کے ساتھ نہیں جاسکی تھی اور
 جبریل اس کے لیے پیچھے رک گیا تھا۔ وہ ٹیسٹ کی تیاری کرتے ہوئے بھی بار بار اپنے کمرے سے نکل کر بی بی
 لائیو میں آ کر بی بی پر صرف حمین سے پوچھا جانے والا لفظ سنتی۔ وہ اور جبریل میرگائٹی انداز میں بیک وقت اس
 لفظ کے سچے کرتے اس سے پہلے کہ حمین اس کے سچے کرنا پھر وہ بیٹھنی سے اپنے چھوٹے بھائی کی وہ ٹیسٹ دیکھتے
 جو اس لفظ کے رد عمل میں آئی اور پھر وہ اسے کوشش کرتے ہوئے دیکھتے، اس لفظ کو spell کرنے کے لیے کہ
 اور ہر صحیح آخری حرف پر ان دونوں کے سینوں سے بیک وقت سانس خارج ہوتا یوں جیسے جان میں جان آگئی ہو
 اور اس کے بعد عتیابہ ایک بار پھر بی بی لائیو سے غائب ہو جاتی۔

اور اب جبکہ اس تیسری ٹرائی کا ان کے گھر ہی آنے کا فیصلہ ہو گیا تھا تو وہ دونوں بے حد خوش تھے۔ ان سب
 کے درمیان مقابلہ ہوتا تھا۔ حد اور قابلیت نہیں، یہ خاصیت ان چاروں میں بھی نہیں تھی۔

بی بی دیکھتے ہوئے گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ جبریل اس وقت اپنے لیے ملک شیک بنانے میں مصروف تھا۔
 عتیابہ اس کے دروازے کی طرف جانے کے بجائے خود دروازے پر چلی گئی۔ کی ہول سے اس نے باہر جھانکا۔
 وہاں تیار ہوا سالہ ایرک کھڑا تھا۔ عتیابہ چند لمحوں کے لیے وہیں کھڑی رہی۔ ابجمن کا شکار۔ وہ اس کا کلاس فیلو
 تھا۔ ان کا ہمسایہ تھا۔ اس کے والدین ان کے فعلی فرینڈز تھے۔ جبریل گھر نہ ہوا تو وہ دروازہ کبھی نہ کھولتی۔ یہ
 اس کے ماں باپ کی ان سب کے لیے اکیلے گھر رہنے کی صورت میں ہدایات تھیں، مگر اس وقت اس کی سمجھ
 میں نہیں آیا کہ وہ دروازہ کھولے یا نہ کھولے۔ وہ باہر کی ہول پر نظریں جمائے یوں کھڑا تھا جیسے اس سوراخ میں
 سے یہ دیکھ رہا ہو کہ اسے اندر سے دیکھا جا رہا تھا اور دیکھنے والا کون تھا یہ بھی۔

”باہر کون ہے؟“ وہ جبریل تھا جو اچانک ہی وہاں آ گیا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر پلٹی پھر اس نے کہا۔
 ”ایرک۔“ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ بے مقصد اور کسی بھی وقت دوستوں یا جاننے
 والوں کو گھر نہیں بلا سکتے تھے، لیکن۔ ایرک کے لیے ان سب کے دل میں ہمدردی تھی۔

”چھا آئے دو شاید اسے بھی ٹیسٹ کا کچھ پوچھنا ہو۔“ جبریل نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ دونوں ہاتھ اپنی چیز کی جیبوں میں ڈالے ایریک نے دروازہ کھلنے پر اپنے امریکن لہجے میں ہمیشہ کی طرح بمشکل انہیں السلام علیکم کہا جسے وہ ہمیشہ ہی کی طرح بمشکل سمجھے۔

”ہمارا کہ ہو۔“ ایریک نے وہیں کھڑے کھڑے جبریل کے پیچھے جھانکتی عنایہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”تھنک یو۔“ جبریل نے بھی اتنا ہی مختصر جواب دیا۔ وہ بات کرتے ہوئے دروازے کے سامنے سے ہٹ گئے۔ ایریک اسی طرح جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالنے اندر آیا۔

”تم نے ٹیسٹ کی تیاری کرنی؟“ عنایہ اس سے پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

”نہیں۔“ وہ چلتے ہوئے لاؤنچ میں آگیا۔ لی وی بروہ اب ایک بار پھر اسی پروگرام کی لائیو کورنج کو دیکھ رہا تھا۔ ”کیوں؟“

”بس ایسے ہی۔“ اس نے عنایہ کی طرف دیکھے بغیر لی وی اسکرین کو دیکھتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ عنایہ نے اسے اسی طرح کھڑے دیکھ کر کہا۔ جبریل تب تک لاؤنچ کے ایک طرف موجود لی وی پر اپنا

میں دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔

”ایرک! تمہاری مٹی کو پتا ہے کہ تمہاں ہو؟“ جبریل کو فرنج میں سے دودھ نکالتے ہوئے اچانک خیال آیا۔

”میرا خیال ہے۔“ ایریک نے جواباً ”کان سے کبھی اڑانے والے انداز میں کہا۔“ ”نہیں نہیں پتا؟“

جبریل دودھ کی بوتل کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے ٹھنکھا۔ اسے پچھلے ہفتے کا خیال آیا تھا جب ایریک کی مٹی اسے

ڈھونڈتے ہوئے وہاں آئی تھیں اور انہوں نے شکایت کی تھی کہ وہ پتے بغیر کھرے نکلا تھا اور وہ اتفاقاً اسے

ڈھونڈنے لگیں تو انہیں پتا چلا وہ کھر رہا تھا ہی نہیں۔ تب ہی وہ ان لوگوں کے گھر آئی تھیں کیونکہ انہیں پتا تھا وہ

انہیں کہیں اور نہیں تو وہاں مل جائے گا۔

”مٹی کھر نہیں ہیں۔“ ایریک نے جبریل کے تکیے ہی انداز کو بھانپ لیا تھا۔

”کہاں گئی ہیں؟“ جبریل کبھی اتنی پوچھ کچھ نہ کرنا اگر یہ ایریک نہ ہوتا تو۔ کہیں نہ کہیں ان سب کو پتا تھا کہ وہ

بعض دفعہ ان سے جھوٹ بولتا تھا اور بڑے اطمینان سے بولتا تھا اور یہ عادت اسے پہلے نہیں تھی۔ ایک سال

پہلے جب اس کا باب زندہ تھا۔

”کسی دوست کے پاس گئی ہیں۔ سبل اور مارک بھی ان کے ساتھ ہیں۔“ اس نے جبریل کو بتایا۔ لی وی پر اب

کورنج ختم ہو کر کرکٹس چل رہے تھے۔

”تم ساتھ نہیں گئے؟“ عنایہ نے اس سے پوچھا۔

”مجھے ٹیسٹ کی تیاری کرنی تھی۔“ اس نے ترکی بہ ترکی کہا۔ عنایہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ اب ری موٹ ہاتھ میں

لیے اس کا معائنہ اس طرح کرنے اور اس کے شیٹوں کو چھونے میں مصروف تھا جیسے زندگی میں پہلی بار ری موٹ

دیکھا ہو۔ عنایہ کی طرف متوجہ نہ ہوتے ہوئے بھی اسے اندازہ تھا وہ اس کی بات پر اسے دیکھ رہی ہوگی۔

”چلو پھر ٹیسٹ کی تیاری کرتے ہیں۔“ عنایہ نے جواباً اسے کہا۔ اسے واقعی تشویش ہوئی تھی کہ ایریک نے

ٹیسٹ کی تیاری نہیں کی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ ایک بار پھر ٹیسٹ میں برا اسکو لینے والا تھا۔

”یہ سب واپس کب آئیں گے؟“ ایریک نے اس کی آفر کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے بات بدلنے کی

کوشش کی۔ ٹیسٹ کی تیاری اس کی زندگی کا مسئلہ نہیں تھا۔ اس کی زندگی کے مسائل کچھ اور تھے۔

”واپس آرہے ہوں گے۔“ عنایہ نے اسے بتایا اور اسے دیکھنے لگی۔ اسے پتا تھا اب وہ بے مقصد بے معنی

سوال کرنا رہے گا تاکہ وہاں بیٹھا رہے تب تک جب تک وہ وہاں سے بھی بے زار نہیں ہو جاتا۔ اسے ایریک پر

ترس آیا تھا۔ پچھلے ایک سال سے ہمیشہ ہی آتا تھا۔ وہ پہلے ایسا نہیں تھا۔ اس کی کلاس کے سب سے بہترین

اسٹوڈنٹس میں سے ایک تھا۔ ایک سال میں وہ اوسط سے بھی کم ہو گیا تھا۔
 ”تم اپنی مٹی کے ساتھ نہیں گئے؟“ عنایہ نے اس سے کہا۔ اس نے ایک لمحہ قبل جبریل کی ملک شیک کی آفر
 رد کی تھی۔

”ہاں میں جاسکتا تھا، لیکن میں نہیں گیا۔ میں کوئی ٹیم کھیل سکتا ہوں۔“ اس نے ایک ہی جملے میں جواب
 اور سوال کیا۔ عنایہ ہچکچائی۔

”نہیں۔“ عنایہ کے بجائے جبریل نے جواب دیتے ہوئے اس کے ہاتھ سے ریموٹ لے لیا تھا۔

”اس وقت ہمارے گھر میں کوئی گیمز نہیں کھیلتا۔ کافی دیر ہو چکی ہے۔“

جبریل نے اس کے قریب صوفے پر بیٹھے ہوئے اسے اپنے گھر کے قوانین نرمی سے بتائے وہ روز گیمز نہیں
 کھیل سکتے تھے۔ وہ رات کو بھی گیمز نہیں کھیل سکتے تھے۔ عام طور پر وہ اس وقت تک ڈنر کر چکے ہوتے، لیکن
 آج جمین کے اس مقابلے میں شرکت کی وجہ سے ڈنر لٹ ہو گیا تھا۔

”لیکن میں تو ایک آؤٹ سائڈر ہوں۔ اور مہمان بھی۔“ اس نے چند لمحے سوچنے کے بعد جبریل سے کہا جو
 اس کی بوی فری این این ایف کا کر بیٹھا تھا۔

”میں تم باہر کے نہیں ہو۔“ جبریل نے جواباً اسے کہا۔ اس کا بول نہیں سکا۔ وہ جیسے ان سے یہی سنتا چاہتا
 تھا۔

”میں ڈنر ٹیبل سیٹ کروں۔ سب آنے والے ہوں گے۔“ عنایہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اب لاؤنج میں ہی
 ایک حصے میں کھلی ہوئی ڈائنگ ٹیبل پر میٹس اور پلیٹیں رکھنے لگی۔ اس کا کچھ دیر وقفہ وقفے سے اسے اور جبریل
 کو دکھانا پھر جیسے اسے وہاں اپنی موجودگی بے مقصد نظر آئی تھی۔ جبریل نیوز لیٹن میں مچو تھا۔ عنایہ ٹیبل سیٹ
 کرنے میں۔ اس کا پھر بھی وہاں سے جانے پر تیار نہیں تھا۔ اس گھر میں زندگی گئی۔ سکون۔ جواب اس کے
 گھر میں نہیں تھا۔

کچھ دیر بے مقصد ہی این این این دیکھتے ہوئے وہ اٹھ کر عنایہ کے پاس آیا اور کچھ کے بغیر خود ہی ٹیبل سیٹ کرنے
 میں اس کی مدد کرنے لگا۔ اٹھ کر سیوں والی ٹیبل پر عنایہ نے سات میٹس لگائے تھے اور اس کے لیے یہ نوٹس کیا
 تھا۔ اس نے جیسے کے بغیر یہ جان لیا تھا کہ وہ وہاں سے کھانا کھا کر جائے گا۔ وہ اکثر ان کے گھر کھانا کھا لیتا تھا۔
 پاکستانی کھانا بھی۔ صرف آنا کھانے کی خواہش میں۔ کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کی ضرورت کے
 تحت۔ اس کے اپنے گھر میں کیورین کھانا ایک اینڈر ہٹا کر فریز کیا کرتی تھی۔ پھر وہ پورا ایک وہی کھانا بار بار گرم
 ہو کر کھایا جاتا۔ ایسا پیشہ سے نہیں تھا۔ ایک سال سے ہو گیا تھا جب سے اس کا باپ ایک حادثے میں ہلاک ہوا
 تھا۔

کیورین وکیل تھی، ایک نامور اور بے حد مصروف وکیل۔ تین بچوں کی باپ کے بغیر اکیلے دیکھ بھال کرنا اور اس
 کے ساتھ ساتھ کیریئر کو بھی سنبھالنا اسے بہت مشکل لگنے لگا تھا۔ وہ نہ جاب بدل سکتی تھی نہ ہی اپنے کیریئر کے اس
 اسٹیج پر اپنا ریٹائرمنٹ۔ گھر میں رہنے والی ماں بننا اس کی خواہشات میں سے تھا بھی نہیں۔ شوہر کی حادثاتی موت
 ایک صدمہ تھا۔ وہ اور جیمز پندرہ سال سے اکٹھے تھے اور ایک مثالی جوڑا تھے۔ پندرہ سال کی رفاقت کے بعد
 اچانک ایک دن پھر اکیلے ہو جانا تکلیف دہ تھا، لیکن مستقبل کا عدم تحفظ ایک اور مسئلہ تھا۔ وہ مشرقی عورت نہیں
 تھی کہ صرف بچوں کو اپنا ساسھی اور زندگی کا مقصد سمجھتے ہوئے صرف انہیں کافی سمجھتی اور ان ہی کے سوارے
 اپنی زندگی گزار سکتی۔ اسے اپنی زندگی میں کسی ساسھی کی تلاش اور ضرورت بھی تھی جو جیمز کے کار کرائس کے چھ
 ماہ بعد ایک کو لیگ کی شکل میں مل گیا تھا۔

زندگی بالکل نارمل نہیں ہوئی، لیکن کچھ بہتر ہونے لگی تھی۔ کم از کم کیریولین کے لیے۔ اس کے دونوں چڑواں بچے چھ سال کے تھے۔ اور ایرک دس سال کا تھا جب کار کے حادثے میں جیمز کی موت واقع ہوئی تھی۔ سبن اور یارک سنبھل گئے تھے۔ وہ ابھی چھوٹے تھے اور جیمز کے ساتھ ان کی وابستگی ویسی نہیں تھی جیسی ایرک کی تھی۔ وہ باپ کے ساتھ حد سے زیادہ اٹھ چڑھا تھا۔

وہ لوگ جس suburb میں رہ رہے تھے وہاں پندرہ بیس گھروں میں رہنے والے ہمارے ہی لوگ پروفیشنلز اور اعلیٰ قابلیت کے حامل تھے۔ کچھ دوسری قومیت سے تعلق رکھتے تھے جیسے سالار اور امامہ کا خاندان جو ایرک کے بالکل ساتھ والے گھر میں تھے۔ ان کا لانا مشترکہ تھا۔ ایرک کی پیدائش سے بھی پہلے سے جیمز نے وہ گھر قسطوں پر لیا تھا لیکن سالار اور اس کا خاندان تقریباً "بھائی" سال پہلے وہاں آکر رہنا شروع ہوا تھا۔ سالار اور جیمز کسی فنانسز فرم میں کچھ عرصہ کام کر چکے تھے اور ایک دوسرے کو بہت عرصے سے جانتے تھے۔ دونوں خاندانوں میں میل ملاپ بڑھنے کی وجہ سالار کے بچوں کا اسی اسکول ایڈمیشن بھی، جہاں ایرک تھا۔ عتایہ ایرک کی کلاس میں تھی۔ یہ ان دونوں کے درمیان ہونے والی دوستی کا آغاز تھا۔ اگر اسے دوستی کہا جاسکتا تو۔ عتایہ بہت اگلی تھلک رہنے والی بچی تھی۔ وہ بہت نرم خور اور شائستہ تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ بہت سرورج سنبھل کر بات کرنے والی۔

ایرک بھی بے حد باتنی نہیں تھا لیکن لاابالی تھا۔ شرارتی۔ خوش مزاج۔ دوستانہ عادات رکھنے والا ایک امریکن بچہ۔ وہ عتایہ کی طرف اس کی غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے متوجہ ہوا تھا۔ اس نے دونوں میں اس کلاس میں آکر دوھاک بٹھائی تھی۔ وہ ان کی کلاس کی پہلی سیاہ بالوں اور سیاہ آنکھوں والی دوھیارنگت کی لڑکی تھی اور اپنی لمبی خم دار پگھلوں کی وجہ سے پہچانی جاسکتی تھی۔ ایرک کو وہ "دکھوت" لگتی تھی۔ اس لیے بھی کیونکہ وہ کلاس کی دوسری لڑکیوں کی طرح ہر وقت پٹ پٹو پٹو نظر میں آتی تھی۔ یہی ہر ایک سے بحث کرنی نظر آتی تھی۔ اس کو اپنا دوست جاننے کی کوشش ایرک کی طرف سے ہوتی تھی اور ایک سال تک جاری رہی تھی۔ وہ عتایہ کے گھر بھی آتا جاتا تھا لیکن یہ سب کچھ رسمی تھا۔ اس کی فیملی کے لوگ دوسرے ہمسایوں کے بچوں کی طرح اس سے بھی اچھے طریقے سے ملتے تھے لیکن یہاں بڑے لطفی اسے کبھی محسوس نہیں ہوتی کہ وہ عتایہ کو اپنی کرل فرینڈ کہہ سکتا۔

"وہ لوگ مسلم ہیں اور مسلم ایسے ہی ریزروڈ ہوتے ہیں۔" اس نے ایک بار اپنے باپ سے عتایہ اور اس کے والدین کے حوالے سے بچے چوڑے سوالات کیے تھے اور اس کے باپ نے بڑے اچھے طریقے سے اسے سمجھایا تھا۔

ڈیڑھ سال گزرنے کے بعد سب کچھ ڈرامائی انداز میں بدلا تھا۔ اس کے باپ کی موت کے بعد عتایہ نے پہلی بار خود اس سے بات چیت کرنے کی کوشش کی تھی۔ جب وہ تقریباً "دو پختے" کے بعد پہلی بار اسکول گیا تھا اور اسکول جانے کے باوجود وہ ہر کلاس میں کچھ بھی کام کے بغیر خالی ذہن کے ساتھ بیٹھا رہا تھا۔ اس کے تمام فرینڈز اور کلاس فیلوز نے باری باری اس کو کسلی دینے کی کوشش کی تھی اور پھر اپنے روزمرہ کے معاملات میں مصروف ہو گئے تھے لیکن ایرک اگلے کئی دن اسکول جاتے ہوئے بھی دوسرے بچوں کی طرح معمول کی سرگرمیوں میں خود کو مصروف نہیں رکھ سکا تھا اور یہی وہ وقت تھا جب عتایہ اور اس کی دوستی شروع ہوئی تھی۔ وہ کلاس ورک میں اس کی مدد کرنے لگی تھی۔ وہ جانتا تھا اور محسوس کر سکتا تھا کہ وہ ہمدردی تھی جو عتایہ اور اس کی فیملی کو یکدم اسے اپنی توجہ دینے پر مجبور کر رہی تھی اور اس ہمدردی نے بڑے عجیب انداز میں اسے ان لوگوں کا محتاج کیا تھا۔

سالار کا خاندان وہ واحد خاندان اور گھر نہیں تھا جہاں ایرک کا آنا جانا تھا۔ وہ اپنے آس پاس کے ان تمام گھروں

میں ہی جاتا تھا جہاں اس کے ہم عمر بچے تھے۔ جس جگہ وہ رہتا تھا وہاں مختلف مذاہب اور مختلف قومیتوں کے لوگ رہتے تھے۔ ایک آدھ اعتراف۔ چند چائنیز۔ اکا دکا عرب۔ یہودی۔ اور پھر سالار اور امامہ کا گھر۔ اور ان سب گھروں میں وہ اگر کسی گھر کی طرف مچھتا تو وہ یہی آخری گھر تھا۔

ان کا گھر ویسا ہی گھر تھا جیسا سبھی اس کے باپ کی زندگی میں اس کا اپنا گھر تھا۔ اس کے ال باپ بے حد مصروف ہونے کے باوجود ایریک پر تو جھرتے تھے خاص طور پر اس کا باپ جو خود اکلوتا تھا۔ اور اب کی ویلن پوری کوشش کے باوجود ایریک کو اتنی توجہ نہیں دے سکتی تھی۔ وہ سبل اور مارک کو زیادہ توجہ کا مستحق سمجھتی تھی، کیونکہ وہ سب سے چھوٹے تھے اور اگر وہ ایسا سمجھتی تھی تو یہ غلط بھی نہیں تھا۔ اور ایریک جیسے اپنے خور سے بچھے ہوئے ایک سیارے کی طرح اس خاندان کے سیارے میں آیا تھا۔ ان سے متاثر۔ ان کا حصہ بن جانے کی خواہش میں۔

حمین اور رینیہ کے ساتھ امامہ اور سالار کی آمد پر ان کا بے حد پر جوش طریقے سے استقبال کیا گیا تھا اور استقبال کرنے والوں میں ایریک بھی تھا۔ کچھ دیر کے لیے وہاں ان کے ساتھ حمین سے خوش گپیاں کرتے وہ یہ بھول گیا تھا کہ وہ کہاں موجود ہے۔

کھانے کی میز پر ان کے ساتھ کھانا کھاتے اور خوش گپیاں کرتے ہوئے ڈور بیل بچنے پر بھی ایریک کو یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ کیو لین ہوگی۔ وہ بے حد ناخوش تھی اور بیشک کی طرح ان کے گھر آنے پر اس نے معمول کے انداز میں خوش گوار رسمی جملوں کا تبادلہ بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے اندر آتے ہی ایریک کا پوچھا تھا اور ایریک کے وہاں ہونے کی تصدیق ہونے پر وہ اندر آئی تھی اور اس نے لاؤنچ میں کھڑے کھڑے ایریک کو ڈانٹنا شروع کر دیا تھا۔ وہ سبل اور مارک کو اس کے پاس چھوڑ کر کسی دوست کے ساتھ ڈنر پر گئی تھی اور وہ سبل اور مارک کے سوتے ہی گھر سے نکل آیا تھا اور اب جب کیو لین واپس آئی تو اس نے سبل اور مارک دونوں کو گھر میں روتے ہوئے پریشان اور ایریک کو وہاں سے غائب پایا تھا۔

ایرک نے ماں کی ڈانٹ پونکار خاموشی سے سنی تھی۔ شرمندگی اگر اسے ہوتی تھی تو صرف اس بات کی کہ اس کا جھوٹ ان سب کے سامنے کھلا تھا جو اس نے مارک اور سبل کے حوالے سے بولا تھا۔ کیو لین سخت مزاج نہیں تھی لیکن پچھلے کچھ عرصہ سے اس کے اور ایریک کے درمیان عجیب سی سروہمی آگئی تھی وہ جانتی تھی۔ ایریک جیمز کی موت کی وجہ سے اپ سیٹ تھا لیکن وہ اس بات سے بے زار ہو چکی تھی۔

وہ گیارہ سال کا لڑکا تھا وہ چاہتی تھی وہ اپنی ذمہ داریاں محسوس کرے اور اگر کچھ ذمہ داریاں اپنے سر نہیں لے سکتا تو کم از کم مزید کوئی مسئلہ بھی پیدا نہ کرے۔ ایریک کو ماں سے تب تک ہمدردی رہی تھی جب تک اس نے کیو لین کے سنے پارنر کو نہیں دیکھا تھا۔ باپ کی موت سے بڑا صدمہ یہ تھا کہ کوئی اور اس کے باپ کی جگہ لینے والا تھا۔ اس کے اور کیو لین کے درمیان سروہمی اور کشیدگی کی بنیاد وہی جی تھی جیسے کیو لین بوجھ نہیں پاتی تھی۔

ایرک کے جانے کے کچھ دیر بعد بھی وہاں خاموشی ہی رہی تھی یہ کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ اس ساری صورت حال پر کس رد عمل کا اظہار کرے۔ ایرک کے ساتھ سب کو ہمدردی تھی لیکن اب ان کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے اپنے گھر سے دور کیسے رکھیں۔ خاص طور پر ایسی صورت حال میں جب کیو لین کو اس سبل جیل پر اعتراض بھی نہیں تھا اور وہ خود بھی کئی بار ایمر جینسی کی صورت میں سبل اور مارک کو ان کے پاس چھوڑ جاتی تھی۔

”انتا اچھا بچہ تھا۔ پہلے کبھی جھوٹ بولتے نہیں دیکھا میں نے اسے۔ پتا نہیں اب کیا ہو گیا ہے اسے۔“

نیل سے برتن اٹھاتے ہوئے امامہ نے جیسے تبصرہ کیا تھا۔

”جیمز کی موت نے ایسا کر دیا ہے اسے“ سالار نے میز سے اٹھتے ہوئے اس کے تبصرے کے جواب میں کہا۔

برتن سنگ میں رکھتے ہوئے امامہ عجیب انداز میں ٹھنڈی بڑی تھی۔ دو دن بعد سالار کا طبی معائنہ ہونا تھا۔ پہلے ہر تین ماہ کے بعد اس کا طبی معائنہ ہوتا تھا۔ اب اس بار چھ ماہ کے بعد۔ یہ دیکھا جاتا تھا کہ اس کے داغ میں موجود ٹیو مرکس حالت میں تھا۔ بڑھنے لگا تھا؟ گھٹنے لگا تھا؟ اس کے داغ میں کوئی اور ٹیو مرکس تو نہیں بن گیا تھا۔ ٹیو مرز نے کچھ اور میگز کو تو متاثر کرنا نہیں شروع کر دیا تھا۔ CBC، MRI، LP، BPT، TMT، CTS پتا نہیں کتنے ٹیسٹس تھے جن کی رپورٹس وہ دم سادھے دیکھتی رہتی تھی۔ ہر کلینر رپورٹ اس کا سانس بحال کر دیتی۔ کوئی معمولی سی بھی خراب رپورٹ اسے بے حال کر دیتی۔ زندگی جیسے پھر تین ماہ کے دائرے میں سمٹ کر آئی تھی۔ تین ماہ کے بعد وہ میڈیکل چیک اپ ہوتا۔ اور پھر وہ تین ماہ کے لیے جینے لگی اور جب جب میڈیکل چیک اپ کی تاریخیں قریب آنے لگتیں امامہ کی بدحواسی میں بھی اضافہ ہونے لگتا۔

اور یہ سب کچھ تین سال سے ہو رہا تھا اور تین سال سے ٹھیک تھا۔ اس کا آئرشن کامیاب رہا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس کی ذہنی صلاحیتوں پر بھی کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ چھوٹے موٹے اثرات آتے تھے لیکن وہ ایسے نہیں تھے کہ انہیں تشویش لاحق ہوتی لیکن اس کے باوجود امامہ ہاشم کو لگتا تھا زندگی بدل گئی ہے۔ اور اب سالار کی زبان سے جیمز کی موت کا ذکر سن کر اور اس موت نے اس کے سینے کو کیسے متاثر کیا تھا۔ وہ ایک بار پھر اسی طرح ٹنجد ہو گئی تھی۔ چند گھنٹے پہلے ہونے والی تقریب یک دم جیسے اس کے داغ سے محو ہو گئی تھی۔ وہ چیک اپ جو دو دن بعد ہونے والا تھا اگر وہ ٹھیک رہتا تو پھر اس کا چیک اپ تین کے بجائے چھ ماہ کے بعد ہوتا۔ سالار کی نہیں جیسے اس کی اپنی زندگی کی معیاد تین سے چھ ماہ بڑھنے والی تھی۔

پکن میں سنگ کے سامنے کھڑے اس نے لاؤنج میں بیٹھے سالار کو دیکھا۔ اس کے گرد بیٹھے اس سے خوش گپوں میں مصروف اپنے بچوں کو دیکھا۔

وہ خوش قسمت تھی کہ وہ اب بھی ان کی زندگیوں میں تھا۔ جتنا جانتا۔ جتنا مسکراتا۔ خوش باش، صحت مند۔ کم از کم کوئی اب اسے دیکھ کر یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اسے کوئی بیماری تھی اور ایسی بیماری تھی۔ وہ صرف اپنی سرجری کے بعد صحت یابی اور علاج کے دوران ہی میں بیمار لگتا تھا۔ سرجری کے لیے سر کے بال صاف کر دینے کی وجہ سے بھی اور اس کے بعد ہونے والے علاج کی وجہ سے بھی۔

تب اس کے چہرے پر یک دم چھریاں سی آئی تھیں۔ بہت کم وقت میں اس کا وزن بہت زیادہ کم ہوا تھا۔ وہ شاید اس کا نتیجہ تھیں۔ چھ سات ماہہ ایک کے بعد ایک چھوٹے بڑے انفیکشنز کا شکار ہوتا رہا تھا۔ وہ سرجری کے بعد واپس پاکستان آنا چاہتی تھی لیکن آ نہیں سکی۔ وہ اسے وہاں اس طرح اکیلے یہ جنگ لڑنے کے لیے چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ وہ کام چھوڑ کر گھر بیٹھ کر آرام کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اور یہ آپشن اس کے پاس تھا بھی نہیں۔ سرجری کے ایک ہفتے بعد وہ دوبارہ STI کے پروجیکٹس لیے بیٹھا تھا۔ اور وہ صرف بیٹھ کر اسے دیکھتی رہی تھی۔

تیار داری۔ عیادت۔ دیکھ بھال۔ ان لفظوں کو سالار سکندر نے بے معنی کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ حتی المقدور اپنی ذمہ داری خود اٹھا رہا تھا۔ جیسے ساری عمر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ پھر بھی اسے تنہا چھوڑ دینے پر تیار نہیں تھی۔ چھ سات ماہ کے بعد وہ بالآخر صحت مند ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس کے نئے بال آگ آئے تھے۔ اس کا وزن بڑھ گیا تھا۔ اس کے چہرے سے وہ چھریاں غائب ہو گئی تھیں جو راتوں رات آئی تھیں۔ آنکھوں کے گرد حلقے اور چہرے کی پھیلاہٹ بھی چلی گئی تھی۔ وہ اب ویسا ہی سالار نظر آتا تھا جیسا اس بیماری کی تشخیص سے پہلے تھا۔

کھینچنے ٹیڈل بر جا ٹنگ کرنے والا۔ اٹھارہ اٹھارہ کھینچنے لگا تا کام کرنے کی صلاحیت رکھنے والا۔ بارہ ماہے والا۔ چھوٹی موٹی لکھنے کو بتائے بغیر سہہ جانے والا۔ لیکن وہ ٹیو سراس کے اندر موجود تھا۔ ایک خاموش آتش فشاں کی طرح۔ اثرات کے بغیر۔ حرکت کے بغیر۔ لیکن اپنا بھیا نکو جو در قرار رکھتے ہوئے۔ جیسے موت جو نظر نہ آتے ہوئے بھی ہوتی ہے۔ کبھی بھی اسکتی ہے اور کہیں بھی آجاتی ہے۔

ڈاکٹر زکریا تھے اس کی صحت کی بحالی ناقابل یقین اور قابل رشک ہے امام ہاشم پھر بھی مطمئن ہونے سے قاصر تھی۔ وہ اپنے کسی خدشے کو ختم نہیں کر سکتی تھی۔ اپنے کسی خوف کا کلا نہیں گھونٹ سکتی تھی۔ تین سال خیر خیریت سے گزر جانے کے باوجود وہ آج بھی اسی ذہنی کیفیت میں تھی۔ سالار نہیں تھا۔ اس نے اپنی زندگی اور بیماری دونوں کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے پاس سوچنے کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ وہ اس زندگی سے خوش اور مطمئن تھا جو وہ گزار رہا تھا۔ وہ خوش اور مطمئن نہیں تھی۔ اس کے پاس سوچنے کے لیے بہت وقت تھا۔ اس کا دن مصروفیات میں گزر جاتا تھا۔ مگر اس کی راتیں اب بھی سوچوں میں گزرتی تھیں۔ اور وہ بے خواب راتیں تب تب بڑھنے لگتی تھیں جب اس کے میڈیکل چیک اپ کی تاریخیں قریب آنے لگتی تھیں۔ وہ لاکھ کوشش کے باوجود اپنے باغ سے وہ تاریخیں جھٹک نہیں پاتی تھی۔ جیسے وقت یک دم الٹی لگتی بن کر چلنے لگتا تھا۔ اسے یاد نہیں تھا کہ زندگی کے یہ تین سال اس نے سالار کی زندگی اور صحت کے علاوہ کسی اور چیز کے بارے میں اس قدر سوچتے ہوئے گزارے تھے۔ ساری ضروریات، خواہشات یک دم کہیں غائب ہو گئی تھیں۔ وہ جیسے یہ بھول ہی گئی تھی کہ اس کو کیا پسند تھا کیا نہیں۔ سالار کے ساتھ گزارے ہوئے شادی کے شروع کے دس سالوں میں اس نے دنیا کی ہر نعمت چکھ لی تھی۔ ہر آسائش دیکھی تھی۔ لگھوری کارز سے برائے ٹیوٹ ہلینڈ کے سفر تک۔ سونے کے زیورات سے لے کر ہیروں تک۔ سب وہ آدھی دنیا اس کے ساتھ گھومی تھی۔ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کی تمنا اس نے کی ہو اور سالار نے اسے تمنا رہنے دیا ہو۔ وہ اپنی زندگی کے ان دس سالوں پر میو پل کی کہانی لکھ سکتی تھی۔ لیکن ایسی زندگی گزارنے کے بعد بھی امام ہاشم کو زندگی کی سب سے بڑی نعمت زندگی ہی لگی تھی۔

”اس شخص۔۔۔ کی زندگی۔۔۔ وہ اس کے پاس تھا تو دنیا کی کوئی اور چیز نہ ہونے کے باوجود بھی وہ خوش رہ سکتی تھی۔ نہ سکتی تھی۔ نہ سکتی تھی۔ پائی اور کچھ بھی نہ ہوتا۔ مہنگے کپڑے، زیورات، آسائشات، مگر کچھ بھی نہ ہوتا۔ صرف اس کا ساتھ اس کے ساتھ رہتا تو وہ خوش رہ سکتی تھی۔ جینے کے لیے بس اتنا کافی تھا اور اب ایک بار پھر اس کے میڈیکل چیک اپ کی تاریخ قریب تھی ایک بار پھر اس کی نہیں غائب ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

لاڈن میں حمین کی کسی بات پر ہنسنے ہوئے سالار کا چہرہ دیکھتے ہوئے اسے اس کی سرجری کے بعد پہلی بار اسے دیکھنا یاد آیا تھا۔ آٹھ مہینے کی سرجری کے بعد پہلی بار اسے دیکھنا۔ پھر اگلی صبح اسپتال جا کر اسے دوبارہ دیکھنا۔ وہ یاد نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن وہ بھولی نہیں پاتی تھی۔ وہ تب بھی اس کے چہرے پر نظریں جمائے اسے دیکھتے ہوئے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھے بیٹھی تھی، جب وہ ہوش میں آیا تھا۔ اس کے متورم پیوٹے ہلنے لگے تھے۔ وہ آنکھیں کھولنے کی جلد جھد کر رہا تھا۔

”سالار۔ سالار۔!“ وہ بے اختیار اسے پکارنے لگی تھی۔ ایک بار۔ دو بار۔ کئی بار۔ اس نے بالآخر آنکھیں کھول دی تھیں۔ سوتی ہوئی سرخ آنکھیں۔ وہ غنڈکی میں تھا اور اس کیفیت سے لڑ رہا تھا۔ اس نے سالار کا چہرہ چھوا ایک بار پھر اس کا نام پکارتے ہوئے۔

اس بار سالار نے اسے دیکھا تھا۔ گردن ذرا سی موڑتے ہوئے لیکن ان آنکھوں میں اس کے لیے کوئی پہچان، کوئی اثر نہیں تھا۔ وہ صرف اسے دیکھ رہا تھا۔ پہچاننے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔

امامہ کو جیسے دھوکا لگا تھا۔ کیا وہ واقعی اسے پہچان نہیں پاتا تھا۔ ڈاکٹرز نے اس خدشے کا اظہار آپریشن سے پہلے کیا تھا کہ اس کی یادداشت جاسکتی ہے۔ آپریشن کے محفمات میں سے یہ ایک تھا۔ اس کے باوجود وہ شدید مدد سے کا شکار ہوئی تھی۔ گنگبوم بخوبی وہ سرد ہاتھ پیروں کے ساتھ ان آنکھوں کو دیکھتی رہی تھی جو اسے ایک اجنبی کی طرح دیکھ رہی تھیں۔ پھر جیسے ان آنکھوں میں چمک آئی شروع ہوئی۔ جیسے اس کا عکس ابھرنا شروع ہوا۔ اس کی پلکیں اب ساکت نہیں تھیں۔ وہ جھپکنے لگی تھیں۔ انوسیت کا احساس دیتے ہوئے۔ بیڈ پر اس کے ہاتھ کے نیچے موجود سالار کے ہاتھ میں حرکت ہوئی تھی۔ وہ اس کا نام اب بھی نہیں لے پاتا تھا لیکن اس کے ہاتھ کا لمس شناخت کر رہا تھا۔ وہ عمل ظاہر کر رہا تھا۔ تین سال گزرنے کے بعد بھی امامہ اس سرجری سے پہلے اور اس سرجری کے بعد کا ایک ایک لمحہ گنوا سکتی تھی۔ وہ سب کچھ جیسے اس کے ذہن پر انمٹ نقوش کی طرح نقش تھا۔

سالار کی زبان سے جو پہلا لفظ نکلا تھا وہ اس کا نام نہیں تھا۔ وہ ”الحمد للہ“ تھا۔ اور امامہ کو پہلی بار الحمد للہ کا مطلب سمجھ میں آیا تھا۔ اس نے امامہ کا نام اگلے جملے میں لیا تھا اور امامہ کو لگا اس نے زندگی میں پہلی بار اپنا نام سنا ہو۔ زندگی میں پہلی بار اسے اپنا نام خوب صورت لگا تھا۔ اس نے پہلی چیز پانی مانگی تھی اور امامہ کو لگا دنیا میں سب سے قیمتی چیز پانی ہی تو ہے اور اس نے کلمہ پڑھا تھا۔ کوئی مرتے ہوئے تو کلمہ پڑھتا ہے۔ پھر زندہ ہو جانے پر اس نے کلمہ پڑھتے ہوئے کسی کو پہلی بار دیکھا تھا اور اس سب کے دوران سالار نے امامہ کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ وہ لہس۔ لہس نہیں تھا۔ جنت تھی جو ہاتھ میں تھی۔

”تمہیں نہیں آتا یہاں؟“ سالار نے ایک دم اسے مخاطب کیا۔ وہ ابھی ابھی بچکن کے سنک سے ٹیک لگائے ہوئے تھی۔ کھڑی تھی۔ دور تھی اس لیے خود پر قابو بھی پانگتی تھی۔ آنسو بھی پھسکا گئی تھی۔

”ہاں۔ میں آتی ہوں۔“ اس نے پلٹ کر سنک میں باقی برتن بھی رکھے۔ میں سب باتیں تو ”میں“ سے بھی سن رہی ہوں۔“ اس نے کہا تھا۔

”مئی! اگلے سال ریمبرہ جائے گی؟“ سہیلنگھلی ”میں۔“ حمین نے وہاں بیٹھے۔ وہ اعلان کیا تھا جو ریمبرہ اس سے پہلے ہی اس تک پہنچا چکی تھی۔ امامہ نے ٹوٹی بند کرتے ہوئے پلٹ کر دیکھا۔ وہ خود کو سنبھال چکی تھی لیکن حمین کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

”ریمبرہ کیا کرے گی؟“ اس نے صرف ریمبرہ کا نام سنا تھا۔

”مئی! میں بھی یہ شرافی جیت کر لاؤں گی۔“ ریمبرہ نے اس بار خود امامہ کو منصوبے کے بجائے مقصد بتایا۔



عائشہ عابدین اپنے باپ کے انتقال کے سات ماہ بعد پیدا ہوئی تھی۔ تین بہنوں میں سب سے چھوٹی تھی اور تینوں بہنوں کی عمر میں زیادہ وقفہ نہیں تھا۔ اس کے والدین نہ صرف خود ڈاکٹرز تھے بلکہ ڈاکٹرز کے ایک نامور خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ عائشہ کی ماں نورین الہی نے اپنی بیٹی کو تھوڑے عرصے کے لیے پاکستان میں اپنی ماں کے پاس بھیج دیا تھا۔ وہ امریکہ میں میڈیسن جیسے پروفیشن سے منسلک ہوئے تھے۔ دو بیٹیوں کے ساتھ اس کو زائیدہ بھی کو شوہر کی اچانک موت کے بعد پیدا ہونے والے حالات میں سنبھال نہیں سکتی تھیں۔ عائشہ اگلے پانچ سال پاکستان ہی میں رہی۔ حالانکہ نورین الہی۔ اس کو سال چھ مہینے وہاں رکھنا چاہتی تھیں لیکن عائشہ کی نانی اور نانا کو اس سے اتنی انسیت ہو گئی تھی۔ اور وہ بھی ان کے ساتھ اتنی خوش اور مطمئن تھی کہ نورین خیال آنے پر بھی اسے واپس نہیں لے جا سکیں۔ دو چھوٹی بچیوں کے ساتھ امریکہ میں زندگی ایک آرٹھویڈک سرجن کے طور پر ویسے ہی اتنی مستثنیٰ تھی۔ شوہر کی موت کے بعد۔ کہ وہ چاہتیں بھی تو عائشہ کو اپنے ساتھ لے جانے پر

بھی وہ اس کی پرورش کی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتی تھیں۔
 پانچ سال کے بعد بالآخر وہ عائدہ کو امریکہ اپنے پاس لے آئیں لیکن عائدہ کو وہاں دل نہ لگا۔ وہ اپنی دونوں بڑی
 بہنوں سے مانوس نہیں تھی۔ نورین الٹی بہت مصروف تھیں اور عائدہ کے لیے کسی کے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ دو
 سال کسی نہ کسی طرح وہاں گزارتی رہی لیکن سات سال کی عمر میں نورین کو ایک بار پھر۔ اس کی ضد پر اسے
 واپس پاکستان بھیجنا پڑا لیکن اس بار نورین کو اس کے رہن سہن کے حوالے سے فکر ہونے لگی تھی۔ وہ اور ان کی
 دونوں بیٹیاں اور توہمے سے زیادہ سسرال اور مکہ امریکہ میں مقیم تھے اور وہ عائدہ کو بھی مستقل طور پر امریکہ
 میں ہی رکھنا کرنا چاہتی تھیں، کیونکہ پاکستان میں اب ان کے صرف والدین رہ گئے تھے جو پاکستان چھوڑ کر اپنے
 بیٹوں یا بیٹیوں کے پاس امریکہ آنے پر تیار نہیں تھے۔

سات سال کی عمر میں اسے واپس پاکستان بھیجنے کے باوجود اس بار نورین اسے سال میں دو بار امریکہ بلاتی رہیں۔
 ان کی کوشش تھی عائدہ اور اس کی بہنوں نریمان اور رائتمہ میں لگاؤ پیدا ہو جائے۔ ان کی کوشش کامیاب ثابت
 ہوئی تھی۔ عائدہ اور اس کی دونوں بہنیں اب ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہونے لگی تھیں اور عائدہ کو اب
 امریکہ اتنا اجنبی نہیں لگتا تھا جتنا اس کو شروع میں لگتا تھا۔

دس سال کی عمر میں عائدہ ایک بار پھر امریکہ آئی تھی اور اس بار اسے وہاں رہنے میں پہلے جیسے مسئلے پیش نہیں
 آئے تھے لیکن اب ایک نیا مسئلہ پیش تھا۔ وہ اسکول میں جا کر پریشان ہونے لگی تھی۔ وہ پاکستان میں بھی
 کواپو کیشن میں پڑھتی رہی تھی مگر وہاں اور سال کے ماحول میں فرق تھا۔ نورین اسکول کے حوالے سے کچھ نہیں
 کر سکتی تھیں۔ یہ مسئلہ ان کی بڑی دونوں بیٹیوں کو پیش نہیں آیا تھا۔ وہ عائدہ کی طرح کلاس میں چھوٹی چھوٹی باتوں
 پر پریشان نہیں ہوتی تھیں۔ نہ ہی برہم ہوتی تھیں۔ عائدہ کو اسکول اچھا نہیں لگتا تھا۔ نورین کے پاس ایک
 راستہ یہ تھا کہ وہ ایسے وہاں کسی اسلامک اسکول بھیجیں۔ وہ اس راستے کو استعمال نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ وہ اس عمر
 میں اسے اتنی با مقصد زندگی دینا نہیں چاہتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ کچھ عرصہ یہاں رہنے کے بعد خود ہی ٹھیک ہونا
 شروع ہو جائے گی۔ ایک سال بعد بھی جب عائدہ بہتر ہونے کے بجائے زیادہ پریشان ہونا شروع ہوئی اور اس کے
 گریڈ ز اور خراب ہونے لگے تو نورین کو اسے ایک بار پھر پاکستان بھیجنا پڑا تھا۔ وہ اب اسے اولیہ لڑکے کے بعد وہاں بلوانا
 چاہتی تھیں، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس وقت تک کچھ سمجھ دار ہو جائے گی اور وہاں چھوڑ کر آسانی سے سمجھ سکے
 گی۔

تیرہ سال کی عمر میں عائدہ عابدین ایک بار پھر امریکہ رہنے ہونے کے لیے آئی تھی لیکن اس بار وہاں اپنے لیے
 ایک نیا مسئلہ دیکھ رہی تھی، امریکہ اسے اسلامی ملک نہیں لگ رہا تھا۔ وہاں کی مخصوص آزادی اس کے لیے پریشان
 کن تھی۔ وہاں لباس اور زبان کے معاملے میں رور رکھنے والی آزادی اسے ہولانے لگی تھی لیکن ان میں سب
 سے بڑا چیز اس کے لیے یہ تھا کہ وہاں حجاب میں بھی اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتی تھی جو اس نے پاکستان میں
 لیتا شروع کیا تھا اور جس سے نورین خوش نہیں تھیں۔

اس بار نورین نے بالآخر گلے ٹیک دیے تھے۔ یہ مان لیا تھا کہ عائدہ کو امریکہ میں اب کوئی مستقبل نہیں تھا۔
 وہ پاکستان میں ہی رہنا چاہتی تھی اور وہاں پیش آنے والے تمام چھوٹے بڑے مسائل کے ساتھ خوش تھی۔
 انہوں نے عائدہ کو ایک بار پھر امریکہ سے واپس پاکستان بھیج دیا تھا۔ یہ عائدہ عابدین کا انتخاب تھا کہ اسے اپنی
 زندگی نانا نانی کے طریقے سے ایک اسلامی ملک میں گزارنی ہے۔ ایک نو عمر کے طور پر امریکہ کی ترقی سے متاثر
 ہونے اور وہاں رہائش کا اختیار رکھنے کے باوجود عائدہ عابدین ایک پرسکون اچھی زندگی کا خواب لے کر ایک بار پھر
 پاکستان لوٹی تھی جہاں وہ اپنے جیسے لوگوں کے درمیان زندگی گزارتی۔

عائشہ کے نانائی نے اسے کالونٹ میں پرچمانے کے باوجود زیادہ بے باک انداز میں اس کی پرورش نہیں کی تھی۔ عائشہ کو انہوں نے گھر میں ایک ایسے مولوی سے قرآن پاک پڑھایا تھا جو کسی کم فہم رکھنے والا کوئی روایتی مولوی نہیں تھا۔ وہ ایک اچھے ادارے کے طلبہ کو قرآن اور حدیث کی تربیت دیتا تھا۔ خود عائشہ کے نانائی بھی دین اور دنیا کی بہت سمجھ رکھتے تھے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ ملنے جلنے کے شوقین اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ دینی اور اخلاقی قدروں کے حساب سے قدامت پسند تھے لیکن یہ قدامت پرستی دین کے ان معنوں میں نہیں تھی جو انہوں نے عائشہ کو دیا تھا۔

عائشہ عابدین ایک ایسے ماحول میں جہاں دین کی سمجھ بوجھ اور اس میں گہری دلچسپی کے ساتھ پیدا ہوئی تھی جہاں ہر حرام اور حلال کی تمواروں سے ڈرانے کے بجائے دلیل اور منطق سے اچھائی اور برائی سمجھائی جاتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ عائشہ اپنے مذہب سے بے حد جذباتی لگاؤ رکھتی تھی۔

وہ پانچ وقت نماز یا قاعدہ کی سے پڑھتی تھی۔ حجاب بھی اوڑھتی تھی۔ روزے بھی رکھتی تھی۔ اپنے نانائے کی ساتھ سچ بھی کر چکی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ فنون لطیفہ کی ہر صنف میں بھی دلچسپی رکھتی تھی۔ سینٹنگز بنا لیتی تھی۔ اسکول میں پورے لباس کے ساتھ پیرا کی کے مقابلوں میں بھی حصہ لیتی تھی۔ ہر وہ کام کرتی تھی جس میں اسے دلچسپی ہوئی اور جس کی اسے اپنے نانائے سے اجازت ملتی تھی۔

امر کی معاشرے کا حصہ نہ بننے کے باوجود نورین کو یہ تسلیم کرنے میں عار نہیں تھا کہ ان کی بیٹی کی تربیت بہت اچھی ہوئی تھی اور اس کا سہرا اپنے والدین کو صرف وہی نہیں دیتی تھیں۔ ان کے خاندان اور سرال کے وہ سب لوگ دیتے تھے جو عائشہ سے کبھی مل سکتے تھے۔

نورین نے اپنی بڑی دونوں بیٹیوں کو بھی بڑی توجہ اور محنت سے بالا تھا۔ انہوں نے انہیں امریکہ میں رہتے ہوئے اپنے کچھ اور مذہب سے جتنا قریب رکھنے کی کوشش کر سکتی تھیں اتنا رکھا تھا۔ سکران کا زندگی گزارنے کا انداز بہت آزاد تھا۔ اور نورین کو یہ اس لیے کبھی قابل اعتراض نہیں لگا تھا کیونکہ ان کی بیٹیاں محدود حدود سے کبھی آگے نہیں بڑھیں جو ان کے لیے کبھی پریشانی کا باعث بنتی تو ان کے اطمینان کے لیے انتہائی کافی تھا کہ وہ نہ صرف تعلیمی لحاظ سے بہت اچھی تھیں بلکہ امریکہ میں پلنے بڑھنے والی دوسری پاکستانی لڑکیوں کی نسبت ان کی زیادہ فرماں بردار اور بروا کرتے والی تھیں۔

لیکن انہیں ان دونوں میں اور عائشہ کی تربیت میں تب فرق سمجھ میں آیا جب عائشہ امریکا ان کے پاس رہنے کے لیے آئی یا وہ پاکستان رہنے آئیں۔

انہیں یہ احساس ہوا کہ وہ ”بہنی“ کی ماں ہیں۔ عائشہ ان کے آگے پیچھے پھرتی تھی۔ ان کے پاس بیٹھی رہتی۔ ان کی باتیں توجہ سے سنتی۔ ان کے لیے کھانے پینا اور اس سب کے بدلے میں اسے نورین سے کچھ بھی نہیں چاہیے ہوتا تھا۔ وہ یہ سب عاداتا کرتی تھی اور یہ سب اس نے ان ہی والدین سے سیکھا تھا جو نورین کے ماں باپ تھے۔

نورین اپنے ماں باپ کی اس حوالے سے بے حد احسان مند اور ممنون تھیں کہ انہوں نے اس کی بیٹی کی صرف تربیت ہی اچھی نہیں کی تھی بلکہ اسے بہت اچھے اداروں سے تعلیم دلوا رہے تھے کہ نورین کی خواہش تھی کہ عائشہ ڈاکٹر بنتی کیونکہ ان کی بڑی دونوں بیٹیوں میں سے کسی کو میڈیسن میں دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی وہ ڈاکٹر بننا چاہتی تھیں۔ عائشہ کو بھی میڈیسن میں بہت زیادہ دلچسپی نہیں تھی اور شاید ماں کی خواہش نہ ہوتی تو وہ میڈیسن کے بجائے آرکیٹیکٹ بنا چاہتی لیکن نورین کی خواہش کو مقدم سمجھتے ہوئے اس نے زندگی کے بہت سارے مقاصد بدل دیے تھے۔ شاید کہیں وہ اپنی ماں کی وہ حلقی بھی دور کرنا چاہتی تھی جو بار بار امریکہ جا کر بھی وہاں ایڈجسٹ نہ

ہونے اور پھر واپس آنے پر وہ اپنی ماں کے دل میں پیدا کرتی رہی تھی۔
 نورین اس لیے بھی اسے میڈیسن پڑھانا چاہتی تھیں، کیونکہ ان کا خیال تھا اگر عائشہ کو دوبارہ کبھی امریکہ آنا
 پڑا تو اس کے پاس ایک اچھی پروفیشنل ڈگری ہوگی تو اسے نوکری کے مسئلے نہیں ہوں گے۔ میڈیکل پڑھانے کا
 وہ خواب جو نورین نے اس کے لیے دیکھا تھا وہ عائشہ عابدین کی زندگی کا سب سے بھی ایک خواب ثابت ہوا تھا۔



وہ اگلی صبح پھر ان کے دروازے پر کھڑا تھا۔ بچوں کو اسکول گئے ابھی صرف گھنٹہ ہی ہوا تھا اور امامہ نے لائٹری
 سے کپڑے نکال کر چند منٹ پہلے ڈرائیو میں ڈالے تھے۔ اسے آج گیارہ صاف کرنا تھا اور تیل بچتے پر اس کے
 بارے میں سوچتے ہوئے نکلی تھی تو اس نے ایرک کو سامنے کھڑا پایا تھا۔

امامہ نے دروازہ کھول دیا تھا لیکن وہ دروازے سے ہٹی نہیں تھی۔ ایرک نے عیوش کی طرح جانے مخصوص انداز
 میں سلام کیا تھا جو اس نے ان ہی سے سیکھا تھا۔ امامہ نے سلام کا جواب دیا لیکن وہ پھر بھی وہیں کھڑی رہی تھی۔
 راستہ روکے اور اس پر نظریں جمائے۔

”آب اندر آئے تو نہیں کہیں گی؟“ ایرک نے بالآخر کہا۔

”تم اسکول نہیں گئے؟“ امامہ نے اس کا سوال گول کرتے ہوئے جواب دیا ”اس سے پوچھا۔“

”تو دراصل؟“ ایرک نے چند لمحوں کے جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی پھر وہی جواب دیا جو وہ سمجھ رہی تھی۔
 ”کیوں؟“

”میری طبیعت خراب ہے۔“ ایرک نے نظریں ملائے بغیر کہا۔

”طبیعت کو کیا ہوا؟“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی یکدم نرم پڑی۔

”مجھے لگتا ہے مجھے کینسر ہے۔“ ایرک نے بے حد اطمینان کے ساتھ کہا۔

وہ کچھ لمحوں کے لیے ہکا بکا رہ گئی تھی۔

”فار گاڈ سیک۔“ اس نے بالآخر اپنے خواس پر قابو پایا۔ ”جو بھی منہ میں آئے بول دیتے ہو۔ سوچتے نہیں کیا
 کہتا ہے اور کیا نہیں۔ ایسے ہوتا ہے کینسر۔“

وہ اسے ڈانٹتی ہی چلی گئی۔ ایرک کو ابوی ہوئی۔ اسے امامہ سے ہمدردی کی توقع تھی جو پہلے ملتی رہی تھی۔

”آپ کو کسے پتا مجھے کینسر نہیں ہے؟“ اس نے بالآخر امامہ سے کہا۔

وہ اس کی شکل دیکھ کر رہ گئی۔ اس کی شکل بے حد معصوم تھی۔ جاکلیٹ براؤن چمک دار ریشمی بال جو کنگھی
 کے بغیر بکھرے ہوئے تھے اور اسی رنگ کی آنکھیں جو پہلے شرارت سے چمکتی رہتی تھیں۔ اب ان میں ایک الجھن
 بھری ادا سی تھی۔

امامہ سے کوئی جواب نہیں بن پڑا تھا۔ جواب دے سکتی تھی لیکن گیارہ سال کے اس بچے کو کیا جواب دیتی جو
 پہلے ہی زندگی کے سبق سیکھ نہیں پاتا تھا۔

خاموشی سے اس نے راستہ چھوڑا اور ایجن کی ڈوریاں کمرے کے گرد کتے ہوئے دروازہ کھلا چھوڑ کر اندر چلی گئی۔
 ایرک نے اندر آتے ہوئے دروازہ بند کیا۔ کئی لگائی۔ لوں جیسے وہ اس کا ہاتھ گھر تھا پھر وہ بھی لاؤنج میں آ گیا تھا۔

امامہ کچن کاؤنٹر پر کنگ کا بہت سا سامان پھیلائے کھڑی تھی وہ اپنے کام میں مصروف رہی کاؤنٹر پر بڑے
 سیل فون سے کسی صورت کی تلاوت ہو رہی تھی جو وہ کام کرتے ہوئے سن رہی تھی۔ ایرک نے بھی لاؤنج میں آکر
 کمرے میں بلند ہونے والی آیات کی آواز سنی۔ چند لمحوں کے لیے اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ کھڑا رہے۔ بیٹھ

جائے بات کرے نہ کرے۔

اس نے جبریل کو کئی بار تلاوت کرتے سنا تھا اور وہ جب بھی تلاوت کر رہا ہوتا، کوئی اور بات نہیں کرتا تھا اس کے پاس کوئی اور اونچی آواز نہیں ہوتی۔ اس نے کہا یا کہ سیل فون پر چلنے والی تلاوت کے دوران اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس کی یہ مشکل امام نے آسان کی۔ اس نے سیل فون پر وہ تلاوت بند کر دی۔

”جبریل کی آواز ہے؟“ ایریک نے جیسے تصدیق والے انداز میں پوچھا۔
”ہاں۔“

”بہت پیاری ہے۔“

امام اس بار مسکرائی۔

”میں بھی سیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ۔ قرآن۔“ ایریک نے جیسے اس سناٹی دینے والی چیز کے لیے بالآخر موزوں لفظ تلاش کیا۔ امام خاموش رہی۔
”میں سیکھ سکتا ہوں کیا؟“

اس نے امام کو خاموشی پر سوال کیا۔ ایک اور عجیب سوال۔ امام نے سوچا کبھی کبھی اس کے سوال بھی مشکل میں ڈال دیتے ہیں۔ اسے غلط فہمی تھی کہ اسے مشکل میں ڈالنے والے سارے سوال صرف حنین کے پاس ہی تھے۔

”دیکھی ہو تو سب کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔“ اس نے اپنے جواب کو حتی المقدور مناسب کر کے پیش کیا۔

”آپ سیکھا سکتی ہیں؟“ اس کا گلا سوال اس سے بھی زیادہ گھما دینے والا تھا۔

”نہیں۔ میں نہیں سیکھا سکتی۔“ امام نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ وہ مطلب سمجھا تھا نہایت نہیں۔

”جبریل سیکھا سکتا ہے؟“ اس نے متبادل حل پیش کیا۔

”وہ بہت مصروف ہے۔ اسے اپنی اسکول ختم کرنا ہے اس سال۔“ امام نے جیسے ہانا پیش کیا۔

”میں انتظار کر سکتا ہوں۔“ ایریک کے پاس بھی متبادل حل تھا۔

امام نے اس بار اس گفتگو سے بچنے کے لیے ایک کیبنٹ کھول کر کچھ ڈھونڈنا شروع کیا ایریک نے اس موضوع گفتگو میں اس کی عدم دلچسپی محسوس کرتے ہوئے موضوع بدلنے کی کوشش کا آغاز کیا۔

”حنین اپنے بیڈروم میں کیوں نہیں لے گیا اسے؟“ وہ اب لاؤنج کے درمیان رکھی میز پر پڑی حنین کی

اسپیننگ می ٹرائی کی طرف متوجہ تھا۔ امام نے ہلٹ کر اسے دیکھا۔

”آج اس کے کچھ دوست مدعو ہیں یہاں گھر پر۔ ان ہی کو دکھانے کے لیے رکھی ہے۔“ اس نے اتھوں کی

ٹوکری سے ایک انداز نکالتے ہوئے جواب دیا۔

”اوہ پارٹی ہے۔“ ایریک نے خوشی کا اظہار کیا۔ یا کم از کم خوش دکھائی دینے کی کوشش کی۔ ”میں انوائسڈ ہوں

کیا؟“ اس نے اگلے جملے کو پھر سوال میں بدلا۔

وہ ایک پیالے میں اینڈے توڑ کر ڈالتے ڈالتے رکھی۔ ”تم پہلے ہی یہاں ہو۔“ خوش مزاجی سے کہے گئے اس جملے

میں ایسا کچھ نہیں تھا جو ایریک کو برا لگتا لیکن اسے برا لگتا تھا۔

”آپ کو میرا یہاں آنا اچھا نہیں لگتا؟“ لاؤنج کے درمیان میں کھڑے کھڑے اس نے امام سے پوچھا۔

”جسٹ بول کر آنا اچھا نہیں لگتا۔“ اس بار اس کے جواب نے چند لمحوں کے لیے ایریک کو لاجواب کیا۔ اس

نے ہونٹ کانٹے ہوئے امام کو دیکھا پھر اس ٹرائی کو جو درمیانی سینٹر پر پڑی تھی۔

اسے اندازہ تھا کہ وہ کس جسٹ کا ڈر کر رہی تھی اور اسے یہ بھی پتا تھا کہ رات ہونے والے واقعہ کے بعد

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

امامہ اس سے یہ ضرور کہتی۔ وہ اسے اچھی طرح جانتا تھا کم از کم اتنا تو اب انڈے بھینٹتے ہوئے امامہ نے ایک اچھی نظر اس پر ڈالی، ٹیڈی شرٹ اور نیلی جینز کے ساتھ جو گرہ پینے بھرے بالوں کے ساتھ سر جھکانے والوں ہاتھ جینز کی جیبوں میں ڈالے ایک جو گرہ کی نوک سے فرش کو رکڑتے ہوئے وہ پتا نہیں گہری سوچ میں تھا یا شرمندگی میں۔ امامہ کو بے اختیار اس پر ترس آیا۔

”ناشتا کیا ہے؟“ وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ ایرک نے نفی میں سر ہلایا۔ امامہ نے اس سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ ناشتا کرے گا یا نہیں۔ وہ اس کے لیے ناشتا بنانے لگی تھی۔ ایرک کو بھی پتا تھا وہ کیا کر رہی ہے۔

”آپ مجھے پتہ ہی بنا دیں۔“ وہ جانتی تھی وہ پراٹھا کھانا چاہتا تھا وہ ان کے گھر کی بار پراٹھا کھا چکا تھا۔

”میں اسے وہاں لگا دیتا ہوں۔“ ایرک نے درمیانی سینئر برٹانی کے برابر میں بڑے سرٹیفکیٹ کو اٹھائے ہوئے اسے دیوار پر لگانے کی پیش کش کی وہ جیسے اپنے اور امامہ کے درمیان ملاقات کے شروع میں ہی آنے والی تخی کو ختم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں مت لگاؤ۔“ امامہ نے اسے روکا۔

”کیوں؟“ اس نے الجھ کر پوچھا۔ ”آپ کو فخر نہیں ہے حمن پر؟“

وہ اس کی بات پر کچن میں کام کرتے کرتے ہنسی۔ وہ اس سے یہ نہیں کہہ سکی کہ اگر وہ اپنے بچوں کے سرٹیفکیٹس، ٹرافیاں اور اعزازات کو اپنے گھر کی دیواروں پر لگاتی تو اس کے گھر میں کوئی جگہ خالی نہ چھتی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ایسی ہی قابل اولاد دی تھی۔

”حمن کے لیا کو پسند نہیں ہے۔“ اس نے پراٹھے کے لیے بیڑا بناتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“ وہ تجسس ہوا۔

”یہ اپنے کارناموں کی نشانیوں کو ہر وقت دیواروں پر لٹکا دیکھیں گے آتے جاتے ہوئے تو ان کے مانگوں کو ساتویں آسمان سے کیسے نیچے اتاریں گے ہم۔“ اسے سالار کی بات یاد آئی تھی۔ جو اس نے پہلی بار جبریل کے کسی سرٹیفکیٹ کو دیوار پر لگانے کی اس کی کوشش کے جواب میں کہی تھی۔

”کوئی کتنی بھی بڑی اچھو منٹ والا دن ہو۔ جو میں گھنٹے کے بعد ماضی بن جاتا ہے اور ماضی کے ڈھنڈورے پیٹنے والے لوگ بھی مستقبل کے بارے میں نہیں سوچتے۔“ اس نے سالار کی بات سن و عن دہرائی تھی پتا نہیں ایرک کی سمجھ میں آئی یا نہیں۔ لیکن اس نے مزید کسی سوال کے بغیر وہ سرٹیفکیٹ اسی میز پر رکھ دیا تھا۔

”مسز سالار آپ مجھے پسند نہیں کرتیں؟“ وہ اس کے اگلے سوال پر بری طرح جوگی۔

”سب تمہیں بہت پسند کرتے ہیں پھر میں تمہیں پسند کیوں نہیں کر دوں گی۔“ اس نے بڑے حقل سے جیسے اسے سمجھایا۔

”آپ مجھے ایڈاپٹ کر سکتی ہیں؟“ گلا سوال اتنا اچانک تھا کہ وہ پراٹھا بھول کر اس کی شکل دیکھنے لگی۔ وہ بے حد شجیدہ تھا۔ چند لمحوں کے لیے اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ وہ کیا کہے پھر وہ ہنس پڑی تھی۔ ایرک کو اس کی ہنسی اچھی نہیں لگی۔

”ایرک تمہاری مٹی ہیں۔ دو۔ بن بھائی ہیں۔ ایک نیلی ہے۔“

”پلیز۔“ ایرک نے پتو بے تالی سے اس کی بات کاٹ کر جیسے پلیز کہہ کر اس کی منت کی تھی۔

”تمہاری مٹی تم سے بہت تیار کرتی ہیں ایرک! وہ کبھی بھی تمہیں کسی دوسرے کو نہیں دیں گی اور تمہیں ان کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کے پاس جانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“ امامہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”مئی کے پاس ایک بوائے فریڈ ہے۔ وہ جلد ہی ان سے شادی بھی کر لیں گی۔ کیا آپ تب مجھے ایڈاپٹ کر سکتی ہیں؟“ اس نے جیسے اس مسئلے کا بھی حل نکالا تھا۔
 ”تم کیوں چاہتے ہو ہمارے پاس آنا؟“ وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔
 ”کیونکہ یہ مجھے کمر لگتا ہے۔“

بہت مختصر جملے میں اس بچے کا ہر نفسیاتی مسئلہ چھپا تھا۔ وہ کس تلاش میں کہاں کہاں پھر رہا تھا۔ امامہ کا دل اور پگھلا کر کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا کوئی حل نہیں ہوتا۔ چاہے عقل کی ہر گنجی نگالیں کچھ مائلے نہیں کھلتے۔
 ”تم اپنی مہمی کو چھوڑ کر ہمارے پاس آنا چاہتے ہو۔ یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔“ امامہ نے جیسے جذباتی بلیک میلنگ کی کوشش کی تھی۔

”مئی مجھے چھوڑ دیں گی۔ میں نے آپ کو بتایا ہے۔ نانا ان کا بوائے فریڈ ہے۔“ ایریک کے پاس اس جذباتی حربہ کا جواب تھا۔

”وہ شادی کر لیں۔ بوائے فریڈ کے ساتھ رہنے لگیں۔ کچھ بھی ہو۔ تم ان کے بیٹھی رہو گے۔ تم سے ان کی محبت کم نہیں ہوگی۔ وہ تمہیں اور تمہارے دونوں بہن بھائیوں کو اپنی زندگی سے نکال نہیں سکتیں۔“ اس نے کیوولین کی وکالت کر کے ایریک کی مایوسی کو جیسے اور بڑھایا۔

”میں عتیا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ اس کے اگلے جملے نے امامہ کا دل غ جیسے گھما دیا تھا۔ وہ اگلے کئی لمحے بول ہی نہیں سکی تھی۔ وہ ان لوگوں سے اٹھ جڑ تھا ان لوگوں کو پسند کرتا تھا لیکن وہ اس طرح اس انداز میں ان کے خاندان کا حصہ بننے کا سوچ سکتا تھا۔ اس کا اندازہ اسے نہیں تھا۔
 ”یہ بھی نہیں ہو سکتا۔“ اس نے بالا تر اس سے کہا۔

”کیوں؟“ وہ بے تاب ہوا۔

”تم ابھی اس طرح کی باتیں کرنے کے لیے مت چھوٹے ہو۔“ اس سے زیادہ مناسب جواب نہیں سوچا

تھا۔ ”جب میں بڑا ہو جاؤں گا تب شادی کر سکتا ہوں اس سے؟“

”نہیں۔“ اس بار اس نے صاف گوئی سے کہا۔

”کیوں؟“ وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔

”اس سے شادی کیوں کرنا چاہتے ہو تم؟“ وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

”کیونکہ میں اسے پسند کرتا ہوں۔“

”لیکن ہو سکتا ہے وہ تمہیں اتنا پسند نہ کرتی ہو کہ تم سے شادی کرنے پر تیار ہو جائے۔“ ایریک کے چہرے پر

ایک رنگ آکر گزر گیا۔

”کیا اس نے آپ سے ایسا کہا؟“ اس نے ایک بڑکانہ سوال کیا تھا۔

”نہیں اس نے مجھ سے نہیں کہا۔ وہ بہت چھوٹی ہے۔ تمہیں پسند یا پسند کرنے کے بارے میں وہ ابھی سوچ

بھی نہیں سکتی۔ لیکن یہ میں تم سے کہہ رہی ہوں ایریک! کہ اس طرح کی باتیں کرنا اور سوچنا چھوڑ دو۔ ورنہ

شاید ہمارے لیے تم سے ملنا جانا ممکن نہیں رہے گا۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ ترش ہوئی تھی اور یہ ضروری تھا

وہ نہیں چاہتی تھی وہ ایسی کوئی بات عتیا سے بھی کرے۔

”آپ مجھ سے خفا نہ ہوں۔ اگر آپ ایسا نہیں چاہتیں تو میں عتیا سے شادی نہیں کروں گا لیکن میں اس

سے پیار کرتا ہوں۔“ ایریک اس کی تنگی سے کچھ پریشان ہوا لیکن پھر بھی اسے اپنے دل کی کیفیت بتانے بغیر نہیں

رہ سکا۔ وہ بے اختیار ایسی سانس لے کر رہ گئی۔ وہ اس معاشرے کے وہ چھینچھوڑ تھے جو اس سمیت ہر مسلمان ماں

کو ڈراتے تھے۔

”تم کیا کر سکتے ہو عنایہ کے لیے؟“ اس نے بے حد سنجیدگی سے ایرک سے پوچھا۔
”سب کچھ۔“ اسے وہی جواب ملا جس کی اسے توقع تھی۔

”اوکے پھر اسکول جاؤ یا قاعدگی سے۔۔۔ دل لگا کر پڑھو۔ اپنا کوئی کیریئر بناؤ۔۔۔ عنایہ کسی ایسے لڑکے کو تو کبھی پسند کر سکتی جو باقاعدگی سے اسکول نہ جاتا ہو۔ اپنی ماں کی بات نہ مانتا ہو۔ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی پروا نہ کرتا ہو۔ جو اسٹڈیز کو سنجیدگی سے لیتا ہی نہ ہو۔ اور پھر جھوٹ بولتا ہو۔“

ایرک کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ امامہ نے جیسے ویسے کنڈیشن اس کی زندگی کی پہلی محبت کا تیا بنا کر دیا تھا۔ وہاں ایک دم خاموشی چھائی تھی۔ امامہ اب بھی بچپن میں کام میں مصروف تھی۔ ایرک کا ناشتہ تیار کر کے اس نے نیبل پر رکھ دیا تھا۔ وہ بہت دیر خاموش رہا پھر اس نے امامہ سے کہا۔
”میں اپنے آپ کو ٹھیک کر لوں گا۔“

”یہ بہت احمقا ہو گا ایرک۔ لیکن اس کے ساتھ تمہیں ایک اور وعدہ بھی کرنا ہے مجھ سے۔“
”کیا؟“ وہ الجھا۔

”جب تک تمہاری اسکول پاس کر کے یونیورسٹی میں نہیں چلے جاتے تم عنایہ سے اس طرح کی کوئی بات نہیں کرو گے۔ میں نہیں چاہتی وہ تم سے مکمل طور پر خفا ہو جائے۔“
”میں وعدہ کرتا ہوں۔ میں ایسا ہی کروں گا۔“

ایرک نے بھی اسی سنجیدگی سے امامہ سے کہا تھا جس سنجیدگی سے وہ اس سے بات کر رہی تھی۔ وہ اپنا چہرہ اور کانٹا پکڑے کرسی پر بیٹھا پراٹھا کھانے کی تیاری میں تھا۔

”اور جب تک تم یونیورسٹی نہیں پہنچ جاتے ہم دوبارہ اس ایٹھ پر بات نہیں کریں گے۔ محبت۔ شادی۔۔۔ عنایہ۔“ امامہ نے جیسے ان تین چیزوں کے درمیان ڈون لگاتے ہوئے اس سے کہا تھا۔ وہ معمول کی طرح یہ بات بھی مان گیا تھا۔

امامہ کا خیال تھا۔ اس نے حلقہ قلمی بند باندھ دیا تھا۔ تھوڑا عرصہ مزید گزر جانے پر وہ اپنے باپ کی موت کو بھول جانے کے بعد ٹھیک ہو جاتا۔ اس سے عنایہ اور اس سے متعلقہ ہونے والی ساری گفتگو بھول جاتا۔ اس نے ایرک کی اس بات پر حیرت کو ایک امریکن سٹیج کی پچکانہ گفتگو سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا ایرک ایک عام امریکن بچہ نہیں تھا۔
* * *

احسن سعد کا باپ اس بات پر ہمیشہ فخر کرتا تھا کہ اس کا بیٹا آج کے زمانے میں پاکستان کے بہترین انٹلکٹس میڈیم اور کوالٹی ایجوکیشن اداروں میں پڑھنے کے باوجود ایک سچا اور پکا مسلمان تھا۔ داڑھی رکھتا تھا۔ پانچ وقت کی نماز مسجد میں پڑھتا تھا۔ حج اور عمرے کی سعادت اپنے شوق سے حاصل کر چکا تھا۔ لڑکیوں سے کوسوں دور بھاگتا تھا۔ کسی ایسی سرگرمی میں ملوث نہیں تھا جو ”حرام“ تھی اور ماں باپ کا فریضہ بردار تھا۔ دن کو دن اور رات کو رات کہنے والی سعادت مند ہی اور اس کے ساتھ ساتھ پڑھائی میں شروع سے اب تک اس نے اسکا لرشپ حاصل کی تھی۔ صرف وہی نہیں ان کی دونوں چھوٹی بیٹیاں بھی جو بڑے بھائی ہی کی طرح تربیتی طور پر باعمل ہونے کے ساتھ ساتھ پوزیشن ہولڈرز تھیں۔

سعد اور اس کی بیوی اس بات پر جتنا فخر کرتے وہ کم تھا اور یہ فخر وہ پر ملا لوگوں تک پہنچاتے بھی تھے۔ ان کے حلقہ احباب میں زیادہ تر لوگ ان ہی کی طرح کنزرویٹو اور مذہبی تھے لیکن کم لوگ ایسے تھے جن کے بچے ان کے بچوں کی طرح حلاق فائق ہوتے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ والدین کے اتنے فرماں بردار ہوتے۔

باندھتا تھا۔ ان کا گھر ان کے سوشل سرکل میں ایک آئیڈیل گھر سمجھا جاتا تھا ایسا آئیڈیل گھر جیسا گھر اور فیملی سب بنانا چاہتے۔ لیکن یہ صرف اس کی ماں کا خاندان تھا جو اس آئیڈیل گھر کی کھوکھی بنیادوں سے واقف تھا اور احسن سعد کے باپ کو پسند نہیں کرتا تھا۔

سعد نے ایک سنت امیر اور اچھے خاندان میں شادی کی تھی لیکن اس کے بعد اس نے اپنی بیوی کو ایک اچھی اور نیک مسلمان عورت بنانے کے لیے جو کچھ کیا تھا۔ وہ اس کے خاندان سے پوشیدہ نہیں تھا۔ اگر شادی کے پہلے ہی سال احسن سیدانہ؛ گیا ہوتا تو اس کی بیوی کے ماں باپ اپنی بیٹی کی علیحدگی کر دیا جیسے ہوتے۔ کئی بار احسن کی پیدائش کے بعد بھی معاملات اس حد تک جاتے رہے کہ طلاق ہو جاتی لیکن سعد اور اس کے گھر والوں کا شور شرابا ہمیشہ انہیں کمزور کر دیتا۔ سعد اپنی بیوی کو ایک باجواب فرماں بردار دین سے قریب اور دنیا سے دور رہنے والی بیوی بنانا چاہتا تھا، اور یہ وہ مطالبہ تھا جو وہ مذہب کا نام استعمال کرتے ہوئے کرتا تھا۔

سعد میں اس کے علاوہ کوئی خرابی نہیں تھی کہ وہ اپنی بیوی کو اس سانچے میں ڈھالنے کے لیے ہر حربہ استعمال کر سکتا تھا۔ گالم گلوچ لے کر مار کٹائی تک اور ماں باپ کے گھر جانے پر پابندی لگانے سے گھر میں قید کر دینے تک۔ اور خاندانوں کے بڑے جب بھی ان مسائل پر آکھٹے ہوئے سعد اپنے ہر رویے کا حوالہ اسلام سے لے کر آتا۔ وہ شوہر تھا۔ بیوی کو ایسے طریقے اختیار کروانا نہیں چاہتا تھا۔ اسلامی طریقے پر رکھنا چاہتا تھا۔ کیا بیوی کا خاندان اپنی بیٹی کو بے راہ روکھنا چاہتا تھا۔ اس کی بیوی کے سیکے والوں کے پاس ہزاروں لیبوں کے باوجود سعد کے قرآن وحدیث اور مذہبی حوالوں کا جواب نہیں تھا۔ وہ روشن خیال بڑھے لکھے تھے مگر ان کے پاس صرف دنیاوی تعلیم تھی۔ ان کے پاس دین کا علم ہوتا تو وہ سعد کے قرآن وحدیث کے حوالوں کا سباق وسباق بھی اسے بتا دیتے۔ سعد کی بیوی اس سے گھر میں چھوٹی تھی اور ہر بار اس کے گھر والے اسے کچھ اور وقت صبر اور برداشت کے ساتھ گزارنے کا کہتے اور سعد کی کچھ اور فرماں برداری اختیار کرنے کی نصیحت کرتے۔ ان سب کا خیال تھا وقت گزرنے اور سچے ہونے کے ساتھ ساتھ سعد بدلتا جائے گا۔

وقت بدلنے کے ساتھ سعد نہیں بدلتا تھا۔ اس کی بیوی بدلتی چلی گئی تھی۔ اس نے ذہنی طور پر یہ مان لیا تھا کہ وہ شادی سے پہلے واقعی اسلام سے دور تھی اور دین کی تعلیمات وہی تھیں جو سعد اس کے کانوں میں ڈالتا تھا اور اسے واقعی وہی کرنا چاہیے جو اس کا شوہر کہتا تھا۔ ویسا ہی رہے۔ ویسی خدمت۔ ویسی فرماں برداری۔ ایک اسٹیج وہ آ گیا تھا جب دونوں میاں بیوی سوچ کے حساب سے ایک جیسے ہو گئے تھے۔ اس کی بیوی بھی سعد کی طرح لوگوں پر اپنے فتوے نافذ کرنے لگی تھی وہ دوسروں کے بارے میں اپنے فتووں کا کھلا اظہار کرتی تھی۔ وہ کسی کی ذرا بھی ایسی چیز کو برداشت نہیں کر پاتی تھی جو اسے غیر اسلامی لگتی۔ ان کا خیال تھا اسلام انہیں اس کا حکم دیتا تھا کہ جو علم ان کے پاس ہے وہ دوسروں تک پہنچائیں۔ جو خلاف اسلام کام وہ روک سکتے ہیں۔ اسے روک دیں جسے برا کہہ سکتے ہیں۔ اسے برانہ نہیں بلکہ سب کے سامنے اس طرح مطلق کریں کہ اگلا شرم سے پانی پانی ہو جائے۔ اسلام میں ”حکم“ کے علاوہ ”حکمت“ نام کی بھی ایک چیز ہے۔ وہ اس سے ناواقف تھے۔ وہ میاں بیوی اس بات پر شکر ادا کرتے تھے کہ اللہ نے انہیں یہ توفیق عطا کی کہ وہ لوگوں کو کھینچ کھینچ کر مذہب کی طرف لا رہے تھے۔ راہ ہدایت کی طرف راغب کر رہے تھے۔

ان دونوں کی ازدواجی زندگی میں اگر کسی بات پر ان کا کبھی اتفاق ہوا تھا تو وہ صرف یہی ایک بات تھی۔ ان دونوں میاں بیوی کے درمیان کسی اور چیز پر زندگی میں بھی اتفاق نہیں ہوا تھا مگر سعد کی بیوی ہر اس چیز پر جو اس کے شوہر کو ناگوار کرتی تھی صرف خاموش رہتا سیکھ گئی تھی۔ خاموشی اختیار نہ کرنے اور اختلاف رائے کرنے کا نتیجہ وہ شادی کے ابتدائی سالوں میں بہت بری طرح بھگت چکی تھی۔ اس کے اور سعد کے درمیان اتنے سال گزر جانے

دوسری عبادتوں میں چھپ جائیں۔۔۔ سب سے خوف ناک بات یہ تھی کہ اس گھر میں رہنے والے کسی فرد کو یہ احساس ہی نہیں تھا کہ ان میں بہت سے نقائص تھے ان میں سے ہر ایک اپنے آپ کو پرفیکٹ سمجھ رہا تھا۔۔۔ دوسروں کے لیے ایک رول ماڈل۔۔۔ اللہ سے قریب۔۔۔

احسن سعد بھی اپنے آپ کو کامل سمجھتا تھا۔ سب پرانیوں سے میرا۔۔۔ سب اچھائیوں کا منبع۔۔۔ اس پر اپنے باپ کی سوچ اور کردار کی گہری چھاپ تھی جو اس سے عشق کرتا تھا کیونکہ وہ اس کی واحد نرینہ اولاد تھی۔۔۔ احسن سعد نے باپ سے بہت کچھ وراثت میں لیا تھا۔ شکل و صورت، ذہانت، مزاج، عادات۔۔۔ لیکن جو سب سے بڑی چیز احسن سعد نے باپ سے لی تھی وہ منافقت تھی۔ اس کی پہچان نہ رکھتے ہوئے بھی۔۔۔ اسے ماڈرن عورت اور امریکہ سے نفرت تھی۔۔۔ وہ انہیں گناہ اور برائی کی جڑ سمجھتا تھا۔۔۔ اور وہ ایک ماڈرن عورت سے شادی کرنا چاہتا تھا جس کے پاس امریکن شہریت بھی ہو۔۔۔ اور وہ امریکہ میں اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا باپ ٹھیک ہوتا تھا احسن جس چیز کی بھی تمنا کرتا تھا۔ وہ اسے مل جاتی تھی۔۔۔ یہ دونوں چیزیں بھی اسے ملنے والی تھیں۔ اس کی خوش قسمتی ایک اور خاندان کی بد قسمتی میں بدلنے والی تھی۔

”تمہیں بتا ہے JB لڑکیاں تمہیں ہاٹ سمجھتی ہیں۔“

ایک لڑکے کے لیے ڈزینیل بر خاموشی چھا گئی تھی وہ ایسا ہی غیر متوقع جملہ تھا جو حمین نے پاستا کھاتے ہوئے اپنے تیرہ سالہ بڑے بھائی کے گوش گزار کیا تھا۔ اماں، سالار، عنایہ، رئیسہ نے بیک وقت حمین کو دکھا پھر چہرل کو جو سن ہوا تھا۔ وہ شرمندگی نہیں غصہ تھا جو حمین کے ان بے لاگ تبصروں پر اکثر آجاتا تھا۔

”وہ مجھے بھی کول کتی ہیں لیکن تمہیں تو ہاٹ سمجھتی ہیں۔ کس قدر افسوس کی بات ہے نا۔“

We Deals in All kind of Vegetable, Flower & Herbs Seeds

SKUSeeds
New Pakistan

سکائی سیدز



ہمارے ہاں ہر قسم کے موٹی پھولوں، بزیوں اور جڑی بوٹیوں کے **IMPORTED F1** سبز
مکلی وغیرہ مکلی کاڑھنک کی کھادیں، باغبانی کے آلات اور گلاب، دمنیاں ہیں

مذاقین حضرت سے گلاب کے پک
آپ کی روایت کیلئے ان روایت کے پک
کی روایت کیلئے پک

Contact No.
04235422359
03159291660
03324111426

www.skyseeds.pk ہمارے کارڈنک سے Related) ایشیا ہے شاہجگ کارڈنک Add کریں

Place Order کے سٹیشن پر لنگ کریں آپ کا آن لائن آرڈر ہم تک پہنچ جائے گا اور ہم

کے ذریعے Cash on Delivery ہر آپ کا آرڈر آپ تک پہنچا دیں گے۔

89 Vegetable Market Allama Iqbal Town Multan Road Lahore

Facebook: www.facebook.com/skyseeds Website: www.skyseeds.com

2016 مارچ 241

READING
Section

اس نے ماں باپ کی نظروں کی برواکی تھی نہ ہی جبریل کے سرخ ہوتے چہرے کی۔ اس نے اپنے تہرے کے بعد اپنی بات جاری رکھتے ہوئے لڑکیوں کی نظریں اپنے ایشیٹس پر افسوس کا اظہار بھی اسی سانس میں کیا تھا۔

”Will you please shut up“

”تم خاموش نہیں رہ سکتے؟“ جبریل نے اس دفعہ کچھ سخت لہجے میں اسے روکنے کی کوشش کی۔ ماں باپ کی موجودگی کا لحاظ کرتے ہوئے اس نے اسے شٹ اپ کرنے کے بجائے ان دونوں لفظوں کو توڑ کر کے بلا واسطہ اسے ٹوٹا۔

”Oh one more twister“

حمین نے یوں غماہر کیا جیسے اس نے اسے کوئی بڑا ہی مشکل لفظ کہہ دیا تھا جس سے وہ واقف ہی نہیں تھا۔
”حمین۔“ اس بار امام نے اسے تنبیہ کی وہ صبر پھڑکی سوتے والی اس پارٹی کو بھٹکانے کی کوشش تھی۔ جو حمین نے اپنے کلاس فیلوز۔ کو دی تھی۔

”میں غلط نہیں کہہ رہا مہی۔“ حمین نے اس کی تنبیہ کو جیسے ہوا میں اڑایا اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میری جاننے والی ہر لڑکی کا جبریل پر کرش ہے۔“

جبریل نے اس بار ہاتھ میں پکڑا ہوا کاٹنا پلیٹ میں رکھ دیا پر یہ جیسے اس کے صبر کے پیمانے کے لبریز ہو جانے کی نشانی تھی۔

”یہاں تک میری گریل فرینڈز بھی۔“

”فرینڈز! سالار نے ٹوٹا۔“

”جو بھی ہو۔“ اس نے اسی انداز میں بات جاری رکھی۔ ”میں ابو آروں کی۔“

حمین نے اس بار جبریل کو رشک بھری نظروں سے دیکھا۔ امامہ اپنی بے انتہا کوشش کے باوجود اپنی ہنسی پر قابو نہیں پاسکی۔ اسے حمین کی گفتگو سے زیادہ جبریل کے رد عمل پر ہنسی آ رہی تھی جس کی اب کان کنی تو یوں تک سرخ ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ وہ ماں کے ہنسنے پر کچھ اور جڑ بڑھا تھا۔

”تو تمہارا کیا خیال ہے گون سی تمہارے جو اسے لڑکیوں میں پاپولر کرتی ہے؟“ سالار نے صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کی اس نے بڑی سنجیدگی سے حمین سے یوں سوال کیا جیسے یہ کوئی بڑا فلسفیانہ سوال تھا۔

”میں اس بارے میں پہلے ہی سوچ چکا ہوں۔“ حمین نے اپنے کانٹے کی نوک پاستا کے درمیان پھرتے ہوئے سالار کے فلسفیانہ سوال کا اسی فلسفیانہ انداز میں جواب دینے کی کوشش کی۔

”اس کی بہت سی ریزن ہیں۔ لڑکیاں ان لڑکیوں کو پسند نہیں کرتیں جو بہت بولتے ہیں اور JB بالکل بات نہیں کرتا۔“

”اور۔“ سالار نے سالار کا ایک کھڑا کھاتے ہوئے آگے بولنے کی ترغیب دی۔

”اور لڑکیاں ان لڑکیوں کو پسند کرتی ہیں جو لمبے دیے رہتے ہیں اور JB ان میں یہ بات بھی ہے۔“

اس نے اسے بھائی کا مجربہ کرنا شروع کر دیا تھا۔

”اور لڑکیوں کو وہ لڑکے اچھے لگتے ہیں جو ان کی کبھی نہ ختم ہونے والی باتیں سن سکتے ہوں اور JB سب کی باتیں سنتا ہے خواہ وہ کتنی ہی احمق ہوں۔“

اس بار سالار کو بھی ہنسی آئی جو اس نے گلا صاف کر کے چھائی۔ عتانیہ اور ریمہ چپ چاپ کھانا کھاتے ہوئے حمین کے جملے سنیں پھر جبریل کے تاثرات دیکھیں وہ بڑا بھائی تھا۔ یہ چھوٹا بھائی تھا اور وہ سمجھ نہیں پاری تھیں کہ وہ اس قابل اعتراض گفتگو میں حصہ کیسے لیں۔

”اور لڑکیاں ان لڑکیوں کو پسند کرتی ہیں جو گڈ لکنگ ہوں۔“ حمین اسی طرح روانی سے کہتے ہوئے اس بار انکا۔ اور یہاں میرے اور JB کے درمیان موازنہ کیا جائے تو ہم دونوں ہر لحاظ سے یکساں گڈ لکنگ ہیں۔“

اس نے بات پھر گھمائی اس بار بالآخر جبریل نے اسے ٹوکا۔
 ”گھمیں پتا ہے حمین لڑکیاں ان لڑکوں کو پسند کرتی ہیں جو ایڈٹ نہیں ہوتے۔“ اس کا اشارہ حمین کی سمجھ گیا تھا۔

”ہاں یہ اسی صورت ممکن ہے اگر لڑکیاں خود احمق نہ ہوں۔“
 ”پاپا! اس بار عنایہ نے سالار کو یکراں کہا تھا۔ اور اس نے حمین کے تبصرے پر احتجاج کیا تھا۔
 ”تم ان دونوں لڑکیوں کے بارے میں کیا کہو گے؟“ سالار نے بے حد سنجیدگی سے اس سے پوچھا۔
 ”تین کس پاپا! آپ ممی کو لڑکیوں کی صف سے کیوں نکال رہے ہیں۔“ حمین نے سوال کا جواب گول کیا اور بے حد معصومیت سے سالار سے پوچھا، ”وہ اسماٹ نہیں تھا سہ اسماٹ تھا۔ ہو سہیاد اور موقع شناس تھا۔ بات کہنا پڑنا مسہیادنا اس عمر میں بھی جانتا تھا۔“

”حمین! اس کرو۔“ امامہ نے اس بار اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے اس سے کہا۔ اس کی واقعی سمجھ میں نہیں آیا تھا، وہ اسے ڈانٹنے یا اس کی باتوں پر ہنسے۔

وہ جو بھی کہہ رہا تھا۔ غلط نہیں تھا۔ جبریل تیرہ سال کی عمر میں بھی اپنے قد کا ٹھہ کی وجہ سے بڑا لگتا تھا۔ وہ حمین کی طرح زیادہ دلا پتلا نہیں تھا۔ حمین ٹھیک کہہ رہا تھا کہ لڑکیاں اسے ہاٹ سمجھتی تھیں۔ جو ایک بات حمین نے لڑکیوں کے اسے پسند کرنے کی وجوہات میں نہیں لکھوائی تھی۔ وہ اس کی خوب صورت آواز تھی۔ جو اب آہستہ آہستہ بھاری، سردانہ ہونے لگی تھی۔ اس کی آنکھیں سالار کی آنکھیں تھیں۔ بڑی سیاہ اور بے حد گہری۔ وہ اسی کی طرح بے حد متحمل مزاج تھا۔ حمین کی طرح بے مقصد ہونے کی عادت نہیں تھی اسے۔ اور وہ اگر لڑکیوں میں مقبول تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سب کے لیے ایک ”پہیلی“ تھا۔ حمین کی شخصیت ”مقتناطیس“ تھی۔ حمین کو اپنے چارم کا پتا تھا اور وہ اس کا صحیح وقت پر استعمال کرنا جانتا تھا جبریل اپنی کشش سے بے خبر تھا اور اسے اس کشش کو استعمال کرنے میں دلچسپی تھی بھی نہیں۔ لیکن دنیا میں اگر کوئی خاموشی اور متحمل مزاجی کے اس پھاڑ میں شگاف ڈال کر اسے برہم کر سکتا تھا تو وہ حمین تھا۔ JB کو تنگ کرنا اس کی زندگی کا دلچسپ اور پسندیدہ ترین کام تھا۔ وہ اسے بھائی کہتا ایک سال پہلے چھوڑ چکا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا JB کہتا کول تھا بھائی کہتا کول نہیں تھا اور حمین کی زندگی کی ترجیحات میں سے ایک یہ تھی کہ وہ ہر چیز میں سے کول نہیں نکالتا تھا۔

”پاپا! جب میں اسپیننگ بلی جیت کر آؤں گی تو میں بھی اپنے سارے کلاس فیلوز کو بلاؤں گی۔“
 رئیسہ نے اس گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے سالار کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس کا ذہن پچھلی شام سے اس ایک ٹرائی کے حصول میں اٹکا ہوا تھا جو اس گھر میں تین بار آچکی تھی اور اب اصولی طور پر اسے جو بھی ہار لائے کی ذمہ داری اس کے کندھے پر خود بخود آتی تھی۔ وہ جبریل کے بعد اس گھر کی سب سے ذمہ دار اور بلیک ضرورت سے زیادہ ذمہ دار بنی تھی۔ وہ جبریل کی طرح خود ہر کام کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لینے کی کوشش کرتی تھی۔ اور پھر پوری لگن اور تن دہی سے اس کام کو کرنے میں مصروف ہو جاتی تھی۔ وہ ان تینوں کی طرح غیر معمولی ذہین نہیں تھی لیکن اب وہ ڈیڑھ سالہ جتنی بھی نہیں رہی تھی جو گونگی نہ ہوتے ہوئے بھی بول ہی نہ پاتی۔

امامہ کے ساتھ ساتھ ان تینوں نے بھی کمزوریاں رکھنے والی رئیسہ کو ذہین بنانے کے لیے بہت محنت کی تھی۔ اور اب وہ وہ کارنامہ انجام دیکھنے کے لیے بے تاب تھی جو ان تینوں نے کیا تھا۔ شیش لیول کے اس مقابلے کو جیت کر جو تھی بار ٹرائی اس گھر میں لانے کا۔ اس ساری لائم لائٹ کا فوس بننے کا جو اس نے اپنے بہن بھائیوں کو ان فتوحات کے بعد ملنے دیکھی تھی۔

رئیسہ سالار زندگی میں کوئی بڑا کام کرنا چاہتی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ اس کی قسمت میں ”صرف“ بڑے کام لکھے ہیں۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

تکیہ حقیقی

دو سراخا سے سجدہ اور رعب دار بھی تھے۔ تینوں کی ان سے جان جاتی تھی۔ ان سے چھوٹے نٹ کھٹ سے بلال عرف بلو اور نبی عرف مولیٰ جزواں تھے۔ جو عقل کے کھوڑے زیادہ تر کھانے پینے کے لیے دوڑاتے تھے۔ لی اے قائل ایہ میں بس قائل قبول نمبر لے کر پہنچ چکے تھے۔ بٹ صاحب کا آخری نمونہ شیخ عرف قنہ تھا۔ وہ ان دونوں سے چار سال چھوٹا تھا۔ یہ مشرک کا اسٹوڈنٹ تھا۔ گول گول آنکھیں اوپر سے گول گول چشمہ لگائے زیادہ تر پڑھائی یا قنہ انگیزوں میں مصروف پایا جاتا تھا۔ ذوق ہونے کی وجہ سے بڑے بھائی کا منظور نظر بھی تھا۔ بلو اور مولیٰ جی بھر کر اس سے خار کھاتے تھے۔ کیونکہ ان دونوں کو جلال بھائی سے زیادہ ڈانٹ اسی کی وجہ سے پڑتی تھی۔ لیکن یہ بھی صحیح تھا کہ بعض اوقات ان کے خطاب سے بچانا بھی وہی تھا اس لیے اس کے ساتھ بنائے رکھنے میں ہی عاقبت تھی۔

جلال بھائی پندرہ سال کے تھے جب اچانک دل کا دورہ پڑنے سے والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد وہی اپنی اماں اور بھائیوں کا سارا سنبھالنے کا امتحان جیسے تیسرے دیا اور پھر اپنے والد کی کپڑے کی دکان سنبھال لی۔ گھریلو حالات بڑی مشکل سے گزارہ کرنے والے تھے۔ اماں نے ان کو گھرداری میں بھی تقریباً ماہر کر دیا تھا۔ جلال بھائی خود تو زیادہ نہ پڑھ سکے لیکن بھائیوں کو پڑھانے کا خون تھا ان کا خیال تھا کہ یہ دونوں پڑھ لکھ کر گھرداری میں ان کا ہاتھ بنا سکیں گے مگر یہی چیز ان کو بھائی سے خار دلاتی تھی۔ جس کی وجہ سے اکثر ڈانٹ بھی پڑتی تھی۔ لیکن بھائی بھی اپنے نام کے ایک ہی تھے۔ جس دن قاریغ نظر آئے ان دونوں کو

”یا اللہ تو بڑا رحیم و کریم ہے ہم پر رحم فرما!“ بلونمایت خشوع و خضوع سے پہ آواز بلند دعائیں کر رہا تھا۔

”یا اللہ! ہمیں ایسی بھابھی عطا فرما جو بڑے بھابھی کو ہم سے علیحدہ کر دے (آمین)۔“ پیچھے کورس میں شیخ اور مولیٰ باجماعت بولے۔

”یا اللہ! ہماری بھابھی بھائی کو ہم سے جدا کر دے۔“ اب پیچھے سے آمین کے بجائے مولیٰ کی جھنجھلائی ہوئی آواز آئی۔

”اوتے خبیث! تو بھابھی کی فرمائش کر رہا ہے یا فرعون کے دور کے جاوگروں کی جو بھابیوں میں قنہ ڈال دے؟“

”یا اللہ! تو بھائی کی لکر کی بھابھی بھیج۔“ بلو دوبارہ شروع ہو گیا۔

”بھائی! بھائی جان کی شادی پر میں شہرہ پلا ہوں گا۔“ شیخ دعا بھول بھال کر پھر جھلا بھولا کو یہ دخل اندازی ایک آنکھ نہ بھائی۔ اس نے بھی دعا چھوڑ چھاڑا اپنا رخ مبارک پیچھے موڑا اور مولیٰ سے کہنے لگا۔

”یار مولیٰ! پہلے اس لڑکے کے سرے کے پھول جا کے ساڑھن آئیں۔“ اور لاڑا صاحب (شیخ) خطرو بھانپتے ہی کمر پھاڑ کر کے جا چکے تھے۔



اندرون شہر لاہور کے رہنے والے فاروق بٹ صاحب کے چار ہی بیٹے تھے۔ سب سے بڑے جلال بٹ جنہیں وہ تینوں مشرکہ طور پر جلا دے کہتے تھے کیونکہ ایک تو وہ ان سے تقریباً بارہ سال بڑے تھے

اکثر جلاوطنی سارے کام ان سے کرواتے اور بچن میں کوئی نہ کوئی خاص کھانا بناتے عام دنوں میں تو کام والی سے روحو کرکام کروالیا جاتا تو تک وہ بھی چھڑوں کے گھر روزانہ نہیں آتی تھی۔ کپڑے آٹو تک مشین میں اٹوار کے اٹوار دھو لیے جاتے۔ کھانا بھی کام والی کا فٹیں کر کے اور کبھی بازار سے آجاتا۔ لیکن چھٹی والے دن بھائی خود تو کام کرتے ہی ساتھ ان تینوں کو

دکان پر تھمیت لیتے تھے۔ دو سال پہلے اہلی کی وفات کے بعد اب اس گھر میں عورت نامی چیز تاپید تھی۔ ایسے میں ان سب کو اس کا حل بھائی کی شادی میں نظر آتا جس کے فی الحال دور دور تک کوئی امکانات نہیں تھے۔



اٹوار کا دن تھا اور ان سب کی شامت کا بھی اٹوار کو



READING
Section

بھی سمیٹ لیتے اور کتھے پن میں تو ان تینوں میں زبردست اتفاق تھا۔

موبلی اور نیپون کے بارے بچے بڑی مشکل سے فرزند دھو کر بلکہ خود نہا کر کرکڑے دہرے ہو رہے تھے بلو وانہر لگاتا الگ سرسبز کر رہا تھا تقریباً دو بچے طوعاً و کرہاً گھر کی صفائیوں سے نجات ملی تو بچن کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔ جلال بھائی جو بھی تھا کھانا بہر حال بہت اچھا بناتے تھے اب چکن کڑا ہی بنانے کے بعد کف موڑے سلاٹ بنانے میں مصروف تھے اور ان کی پروا نہیں جاری تھیں۔

”بھائی سے جو کوئی کام انسانوں کی طرح کر لیں۔“
”بھائی افضل میں انسانوں کے بجائے پانچوں کی طرح کتنا چاہ رہے ہیں۔“ موبلی نیپون کے گلن میں کھسا۔
نیپون کی کھی کھی شروع ہو گئی۔ بھائی نے جلالی نظروں سے نیپون کو دیکھا تو فوراً ”وانت اندر ہو گئے۔“

”اب اگر ڈسٹنگ ہو گئی ہو تو ٹیمبل پر برتن لگا دیا وہ بھی میں لگاؤں۔“ بھائی کی بدھاڑ ستانی ہوئی۔ دونوں نے فوراً برتن ٹیمبل پر رکھے۔ نیپون نے کندے ڈسٹر سے ہاتھ صاف کیے اور اسی لمحے بھائی کی نظر اس پر پڑی۔
”ہاشم اللہ! اوگنڈی کے سرواڑے تھے کوئی صاف کپڑا نہیں ملا ہے کندے ہاتھ صاف کرنے کے لیے یا پانی سے دھونے سے ہاتھوں میں خارش ہو جائے گی۔“ فوراً اس اجنبی دور بچے کی بے عزتی پر نیپون کا منہ لنگ کر ڈش سے لگ گیا۔ جبکہ بلو اور موبلی اسے ملنے والے خطابات پر یں بلیغ ہو گئے تھے۔



رات ان تینوں کو بھائی نے سخت الفاظ میں تنبیہ کی تھی کہ وہ پڑھائی پر توجہ دیں ورنہ پڑھائی چھوڑا کر دو گلن پر ٹھانڈوں کا اور نیتہ جتنا وہ سرواڑے بیٹھے تھے کہ اب کیا کیا جائے۔

”ارے یہ اپنا فتنہ نیپون کس دن کام آئے گا۔ اس کا دل غ دیکھے بھی بڑا چلنا ہے ان فتنہ انگیزوں میں۔“ اس

بات پر نیپون نے تھملا کر دونوں کو گھورا اور احتجاجاً ”واک آؤٹ کرنے لگا۔ لیکن موبلی نے اسے زبردستی بلو کی گود میں ہی گرا لیا۔“

”ابے بار مجھے اتنا بڑا کا کا نہیں چاہیے۔“ بلو نے اسے پیچھدھکیا۔

”مجھے بھی آپ کی گود میں آنے کا کوئی شوق نہیں۔“ فوجھٹنے اتر لیا۔

”ارے! تم بعد میں لڑنا مرنے پہلے بھائی جان کا کوئی حل سوچو، قسم سے زندگی عذاب ہو گئی ہے لڑکیوں والے کام کرتے کرتے میرا تو اب بالکل دھو پٹہ لینے کو دل کرتا ہے یار۔“ بلو کے اپنے ہی رونے تھے۔

”تو اور کیا بھائی جان خود تو شادی کرنے کے لیے تیار نہیں اور ہماری بھری جوتلی کو روک لگا میں گے۔ پانچ نیپون پچھ ایسا سوچو کہ وہ شادی کر کے الگ ہو جائیں اور پھر ہم زندگی انجوائے کریں۔“ ٹھنڈی ٹھنڈی اشار سائیس موبلی بھر رہا تھا۔

”ٹھنڈی برادر ان آپ کی ان ہی شراکتیوں کی وجہ سے آپ کو ڈانٹ رہتی ہے اور اس مرتبہ میں آپ کی کسی سازش کا حصہ نہیں بنوں گا۔“ نیپون نے کڑوے بادام جیسی بات شہد میں ڈبے لیے جس کی۔

”بھتا دلغ آپ کا سااڑشوں میں چلنا ہے اتنا پڑھائی میں چلائے تو کج فرسٹ آئے۔“ منہ پھٹ نیپون نے انہیں اسی بات کی توجیح تھی لہذا دونوں بغیر کوئی لحاظ کیے کھٹنوں سمیت نیپون پر حملہ توڑ ہو چکے تھے۔

”اوکے اب اگر مجھے مزید مارا تو میں بھائی جان کے پاس جا کر آپ کی شکایت کروں گا۔ نیپون اپنا بھوکو کرتا ہوا وارننگ دے رہا تھا۔ جس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ کشن اپنی اپنی جگہ رکھے اور جو کڑیاں مار کر بیٹھ گئے۔ نیپون نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

”اب یہ ڈیڑھ من کا سر ہلانا بند کر اور اپنی گز بھری زبان کو زحمت دے۔“ جو ہا نیپون نے پہلے ایک بڑا ہڈا دو سموسے، فروٹ چاٹ اور یوس کی فرمائش کر دی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ہتھیار



”وہ جی یہ بھائی جان نے قرابلی کا گوشت بھیجا ہے“

صوفے پر بیٹھے ہوئے ہاسکٹ ان کے ہاتھ میں تھما دی۔ گوشت کی سجاوٹ دیکھ کر ثانی کی رنگ خراقت پھڑک اٹھی۔

”ہاں تم یہ گوشت ہلے سے تو ڈر کر لائے ہو جو تو کڑی میں سجا یا ہے۔ دو چار چاندی کے ورق بھی لگا دیتے۔“ دونوں پر گھڑول پانی پڑا تھا مکہ دونوں بھی بڑھٹ تھے۔ وائٹ نکال کر خواستگاروں کو دیکھنے لگے۔

اتنے میں مریم بلیٹی گولڈرنگ لے لے اندر آئیں اور ان دونوں کی پانچویں مزہ چرنے لگیں۔ ”ہوئے والی بھابھی“ کے احرام میں فوراً کھڑے ہو گئے۔

”جی سلام، علیکم۔“ کورس میں سلام کیا گیا۔
 ”و علیکم السلام“ آپ کمرے کیل ہیں؟
 ”جی۔“ حراگتی سے کہا گیا۔ پھر سمجھ میں آئی تو بلو اپنی ہانگے لگا۔

”بس جی ہم تو واقعی“ کمرے بندے“ ہیں بس کبھی غور نہیں کیا۔“

”ہیں بیباغور کرنے والی کوئی بات بھی نہیں میرا مطلب ہے کہ آپ کمرے کیل ہیں بیٹھ جائیں۔“ بلیٹی مریم فوراً بولیں۔ (وہ تھری خیر) اب سمجھ گیا ثانی کی بیٹی ”نوئے“ کی جگہ ”رے“ بولتی تھیں۔

حال احوال کے بعد ثانی مریم بلیٹی کو ان کے بارے میں بتانے لگیں۔

”اڑے مزیم ہٹا! یہ دونوں اپنے قانون کے“
 ”کاکے“ ہیں وہی جوڑے (بڑوں)۔ کاکے“ خاصے جزیروئے اس تعارف پر۔

”کلیں مجھے ہا ہے جب ہم ان کی شاپ پر گئے تھے تو آپ نے بتایا تھا اور پھر یہ بولو بھائی تو ہمیں اپنی گاڑی پر گھڑ بھی بھروسہ لے آئے تھے۔“

اور پھر جو باتیں شروع ہوئیں تو ثانی نے کھانا کھلا کر ہی جانے کی اجازت دی۔
 پھر وہ ایولوں کہ دو چار بار ثانی کے گھر جا کر ان کے کام

ثانی قاطعہ رشتے میں ان کی دور پرے کی بھائی تھیں۔

وہ بیوہ تھیں اور باقی مریم ان کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ اندرون شہر میں ذاتی گھر تھا۔ انہوں نے شوہر کی وفات کے بعد نیچے والا پورشن کرائے پر اٹھا دیا اور خود اوپر والے پورشن میں شفٹ ہو گئیں اس طرح ان کی گزر بسر ہو رہی تھی۔ نیچے کی سہولتوں سے نظر احتساب بلیٹی مریم پر پڑی تھی۔ والدین کی وفات کے بعد کبھی کبھار ثانی ان کی مزاج پر کسی کے لیے تشریف لاتی تھیں۔ کیونکہ

انوں تو اکلوتی تھیں انہوں کی طرف سے ایکسچانجے اور وہ بھی دیار غیر میں کئی سالوں سے تھے ثانی جب تشریف لائیں ان چٹروں میں اچھے خاصے کپڑے نکال کر جاتی تھیں۔ سرحال اب وہی ان کے مسئلے کا حل نکال سکتی تھیں۔ چنانچہ بقو عید پر ان کے گھر جانا طے پایا تاکہ

گوشت دینے کے بدلے بلیٹی مریم اور ان کے متعلق دیگر معلومات اکٹھی کی جا سکیں۔ چنانچہ ان کی خفیہ تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ قرابلی کا گوشت بڑے اہتمام سے فروٹ ہاسکٹ میں سجا یا گیا تھا۔ اس کے اوپر پھولوں کی دو چار چٹیاں بھی لٹکی تھیں اور

اب بلو اور موٹی پوری تیاری کے ساتھ ان کے گھر کے سامنے کھڑے تھے۔ بیٹھیوں کا دروازہ کھلا تھا۔ اوپر کا دروازہ بند تھا۔ بیٹھیوں پہلا نکلتے ہی زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا۔ دروازہ پھٹتے ہی دروازہ کھل گیا

نتیجتاً ”بلو“ گرتے گرتے پھلا۔
 ”اسلام، علیکم ثانی جان!“ زور و شور سے سلام

بھارا گیا۔
 ”و علیکم اسلام! جیتے ہو۔ جیتے ہو۔“ سر پر ہاتھ پھیر کر ہنسا نائل جو گھٹنے بھر کی محنت سے بنایا گیا تھا

تیار کیا گیا۔ البتہ بڑے بھی نالیلو کر لہ کر رہ گیا۔
 ”ہوڑھٹ ہٹا! آج او حرا کاڑتے کیسے بھول گئے؟“

ثانی اندرون لاہور یوں کی خاص زبان ”ر“ کی جگہ ”و“

بلوئے نذر سے پیر پر ہمارا توڑ پھڑا کر آنکھیں کھول دیں
تو۔ زبان کو بریک لگی بھائی مسکراتے ہوئے انہیں دیکھ
رہے تھے۔ نیچو کو موقع مل گیا۔

”بھائی پلیز آپ اب بھابھی لے آئیں ورنہ یہ تو
مجھے سڑے توں اور گندے انڈے کھلا کھلا کر مار دیں
گے“ ان دونوں کی تو آنکھیں لٹل پڑیں اس کی سن
ترتیاں سن کر۔

”اور نالو پلیز آپ باہمی مریم کو ہماری بھابھی بنا دیں۔
ہم ان کو بہت خوش رکھیں گے آپ کو بھی کہیں نہیں
جانے دیں گے“ نیچو نالی کے کھٹے کو نذر نذر سے
ہلاتے ہوئے ملکہ جذبات کو بھی بات دے رہا تھا۔
”آئے ہائے کم بخت نازے! میرا گھنٹا چھوڑے گا تو
کچھ کڑوں کی نالی پلا پہلے نہیں جانا اب تو رے گا کیا؟“
نیچو نے فٹ سے طشتا چھوڑ دیا۔

اب تینوں بھائی پاجامات ہاتھ جوڑے بھائی جان
کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ بھائی جان نے نالی کی
طرف دیکھا تو انہوں نے سر ہلا کر تائید کی۔ بھائی جان
نے ہاں کرنے کی دیر تھی کہ تینوں نے کمو بند کر کے
پاجامات بھنگ ڈال ڈالا۔

ناالی کو اس بات کی خوشی تھی کہ ”منڈے“ نے ان
کی لالچ رکھ لی ہے۔ نیچو کو اس بات کی خوشی تھی کہ اب
اسے گھر کا کام نہیں کرنا پڑے گا جبکہ بلو اور مولیٰ اس
بات پر خوش تھے کہ وہ اب کتوارے نہیں مرس گئے
جلال بھائی کی ایک ”گلی جٹی ہاں“ نے ان کے گھر میں
خوشیاں بکھیر دی تھیں۔



سرورق کی شخصیت

ماڈل	فریڈا اعجاز
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی	سوی رضا

کرنے پڑے چن کا پائپ ٹھیک کیا۔ میڈیوں کی
رینگ کو رنگ کیا، پانچہ روم کا قتل ٹھیک کیا اور اسی
طرح (اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو گھر میں کسی کام کرتے
کس پر عیش آتے تھے) اور اسی طرح کے چھوٹے
سوٹے کاموں نے نالی کو ان کا گرویدہ کر دیا۔ (اگر بھائی
جان اتنی پھرتی سے کام کرتے دیکھ لیتے تو مارے
صدے کے بے ہوش ہو جاتے) ابھی وہ اگلا قدم
اٹھانے کا سوچ ہی رہے تھے کہ بھائی جان کے
ایکسیلنڈ نے ان سب کے ہوش اڑا دیے۔

بھائی جان کو اچھی خاصی چوٹیں آئی تھیں۔ بانو
فریڈا جو ہو گیا تھا۔ ان تینوں کی تو ماٹو نہیں دس حرام ہو
گئیں۔ وہ تینوں ان کی پیٹی سے لگ کر بیٹھ گئے تھے۔
گھر کا نظام الگ درہم برہم ہو گیا۔ اب ان تینوں کو
بھائی جان کی شدت سے نذر ہوئی تھی۔ تینوں لڑنا
جنگلنا ہنسا مسکراتا تک بھول چکے تھے۔ اس مشکل
وقت میں نالی گھر آگئیں اور گھر کا نظام باہمی مریم کی مدد
سے سنبھالا تو انہیں کچھ حوصلہ ملا اور بلوئے و کلن
سنبھالی تو عقل ٹھکانے آئی کہ یہ سب بھائی جان نے
کس قدر اچھے طریقے سے سنبھال رکھا تھا تقریباً
چند روز بعد طبیعت سنبھال چکی تھی۔ اس تمام عرصے
میں مریم باہمی نے گھر پڑے اچھے طریقے سے سنبھالا
تھا۔

اس وقت وہ تینوں اور نالی ہسپتال میں بھائی جان
کے کمرے میں تھے جب نرس نے اطلاع دی کہ آج
شام تک انہیں ڈسچارج کر دیا جائے گا۔

”مجھے تو اب احساس ہوا ہے کہ ہمارے بھائی ہماری
باہمی ہی نہیں مابھی ہیں۔“ (سوئے ہوئے بھائی جان
نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔) مگر اس کی گوہر
افشائیاں رکھنے میں ہی نہیں آ رہی تھیں۔

”بے شک جلاو بھائی نے ہم سے ماسیوں کی طرح
کام کروایا اور خود تائیں کی طرح ہمارے لیے کھانے
پکائے ڈھونڈیوں کی طرح کپڑے دھوئے اور استری ہم
سے کروائی مگر بیشہ ہمارا خیال رکھا ہماری کوئی کیا نہیں
تھیں مگر انہوں نے کیا بن کر دکھایا (لاحول ولاقوة)

فرحین اظفر

عین الکر

اس کا نام نین تارا تھا۔
اور شاید اس کی زندگی کی مختصر ترین کہانی یہی تھی
کہ وہ صرف نام کی نین تارا تھی۔ ساقی وہ سچ کسی کی
آنکھوں کا تارا نہ تھی نہ بن سکی تھی۔ ہاں البتہ اور
بہت کچھ تھی، یعنی کسی کی آنکھ کا پل تو کسی کی آنکھ کا
کنکر، کسی کے نینوں کا تیکا تھی تو کسی کی کچھ اور۔۔۔
خود اس کے ذہن میں کبھی کبھار کہیں بھولے بیٹھے



READING
Section

کیے۔ محلِ قتل، قسمت کے حصول، بڑے بڑے پول
مگر، مرنا کیانہ کرنا کہ مصداق اس خطرے کی کھنٹی کو
رکھنا ہی پڑا۔ اب اتنی سی بات بھی اس کی خوش
نصیبی میں لکھی گئی کہ ماں باپ کی لادلی تھی تو وہی
اس کا نام رکھ گئے تھے۔ ورنہ شاید بعد میں رکھا جاتا
(اگر کسی کو رکھنے کا خیال آجائے تو۔ تو بس۔ ٹھوڑی۔
کھڑی۔ کم بخت۔ ایسا ہی کچھ ہوگا۔ یا پھر شاید۔
شاید۔ اللہ معافی۔ اللہ بچائی وغیرہ وغیرہ۔)

جس عمر میں اس نے آنا کو نہ ہٹا اور چائے پینا
شروع کیا۔ اس عمر میں عام حالات میں لڑکیاں سرخی
منڈانی رہتی ہیں۔ کہ کڑے لگانا اور بات بات پر بوسوں
میں بھاگنے کی ضروری کام ہوتے ہیں اور یہی ضروری
باتیں۔ مگر وہ تو عام حالات کی پیداوار تھی ہی نہیں۔ تو
جس عمر میں اس نے چائے پینا شروع کی۔ آیا اس
وقت اس پر بڑا ترس کھا تھا۔
”اُری سیکھنا۔ کچھ خوفِ خدا کر لے۔ تجھے رب وا
واسطہ۔“

وہ بڑا چار سا بوندہ تھا۔ خوفِ خدا سے خود تو کانپتا
تھا۔ مگر اپنے خوف سے اپنی زلفی کو کبھی ہلا بھی نہیں
سکا۔ کانپتا کرنا تو وہاں کی بات۔
”تو میں نے کیا کیا ہے۔ سچی ہے۔ چہنچہن سے کام
نہیں کیے گی تو بڑے ہو کر لوگوں نے مجھے ہی باتیں
سنائی ہیں کہ پرانی لڑکی سمجھا تب ہی کچھ نہیں سکھایا۔“
اس کا دودھ دوا نہیں اور بے حد معمولی کپڑوں پر کیا
گیا، خرچا تالی نے اتنی چلدی و صولنا شروع کر دیا کہ
محلے کی کچھ عورتیں گھر آئیں، اسے باورچی خانہ میں
کھینچے دیکھا تو تالی کو باقاعدہ ”باتیں“ سنائی ہوئی دلائیں
ہوئیں۔ پر تالی کو شرم نہ آئی۔

”لوگوں کا کیا ہے۔ بس محلے تو کھنڈی پر بھی چہنچہن نہ
لین دے شوہر ہے۔“ وہ بڑے آرام سے ہاتھ بھاڑ کر
سک جاتی۔ لیکن نین تارا کی جان نہ کٹی۔ شروع
شروع میں اس کا ہاتھ جل جاتا۔ بھی گرم کھینچنے بڑ
جاتے۔ تو وہ بڑا سسک سسک کر رہتی۔ تیا دیکھ لیتا تو

خیال آجائے کہ اس کا نین تارا کے بجائے نین جلی
ہونا تو کتنا اچھا ہوتا۔ یا پھر آشوب چشم۔ اس نے اتنے
آنسو بہائے تھے کہ اب اگر کسی روز بنا دے اس کا
دن گزر جاتا تو رات تک خوشی کے آنسو نکل پڑتے۔
اور یوں اس نمکین پانی کو بھی بس نینوں سے بہہ نکلنے کی
عادت سی پڑ گئی تھی۔ دل اپنی رفتار سے دھڑکتا رہتا۔
چہرے پر ایک شکن نہ آئی آپہنیں نین بہائے چلی
جاتیں۔

شعور کی بیڑھیاں ملے کرتے کرتے چھبیسواں
آن لگا تھا۔ اور گزرے ہوئے ان چھبیس سالوں میں
اس کے اندر بس اتنی ہی تبدیلی آئی تھی کہ اس نے خود
پر رحم کھانا چھوڑ کر، خود سے لڑنا شروع کر دیا تھا۔ اور
اس لڑائی میں اس کی عقل و شعور کے مد مقابل ایک
نہیں کئی ایک دشمن صف آرا تھے۔ حالات، قسمت،
انہ عزت نفس اور سب سے بڑھ کر اس کا اپنا دل۔ جو
بہت حساس تھا۔
کیوں بچتی۔

شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس نے
جب آٹھ کھولی تب سے اب تک
حالات و واقعات کبھی اس کے حق میں نہیں رہے۔
پیدائش کے وقت ماں کا چل بسا اور کچھ ہی عرصے بعد
ایک ٹرنک حوالے میں باپ کا دنیا سے من موڑ جانا۔
اس سے وابستہ غیر معمولی حالات کا تو یہی نقطہ آغاز
تھا۔ جہاں سے اس کے وجود پر محسوس کا لہہ لگا۔ اور یہ
وہ ڈھبہ تھا۔ جن کی سبھی انتہا ہوتی ہے۔ جس پر لگ
جائے اسے اپنے ساتھ قبر تک لے کر جاتی ہے۔ یہی
وجہ تھی کہ فقط چھ ماہ کی بی بی پالنے میں ہی پالائی دودھ کے
لے چلتی بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی۔ نہ کوئی بہن نہ
بھائی۔

خالہ، نانی تو شتم پشتم گھر کو دلائیں بھانگیں۔ پھوپھو
نے نگاہیں پڑھیں، چچا کے پاس دو بیٹیاں بیٹھے ہی موجود
تھیں۔ سو قرعہ قاتل بہت بیچ بچا کر بھی نکالیا کے نام نکلا۔
تالی نے اکیلے میں تو نکالیا کے بہت لے لیے بھید بھلاؤ

جلدی جلدی چاہے کہ جو شہ دینے لگی۔ تب جانے کیسے
 تائی کو اچانک اس کا خیال آیا۔
 ”تارا تئی نار۔ آجا تو یسی چکھ لے ایک آدھ
 دانہ۔“

اس موان۔ آفر اسے قطعاً ”حیرت نہ ہوئی۔
 جب سے اس نے سمجھ آری کے سن میں قدم رکھ کر
 پورے گھر کا نظام اپنے نازک کندھوں پر اٹھایا تھا اور
 جب سے تائی کو بلڈ پریشر اور شوگر نے اپنے دام میں
 جکڑا تھا تب سے وہ اس پر زور کی ذرا رحم کھا جاتی تھیں۔
 ورنہ کھانا پینا تو گھر میں شروع سے اچھا تھا، لیکن بچپن
 میں جب تائی نے اس کے گالوں پر جھٹک دکھلائی
 گلابیوں کی چھب دیکھی تھی۔ تب سے فریح میں تالا
 لگا رہنے لگا تھا۔ دودھ، چوس، پھل اور خشک میوہ جات
 کی گھر میں کمی نہیں تھی، لیکن کینوں کے دل میں
 ضرور کسی شے کی شدید کمی تھی اور شاید اس شے کا نام
 خدا تری تھا۔

تو بات کیا ہو رہی تھی کہ اتنے خراب حالات
 میں لینے والی نیک بی بی کے خوابوں میں بھی اس دن
 سے ایک شہزادہ لہنے لگا جو سائوں سے اپنے بھائی بھائی
 سا لگا تو تھا، لیکن بھائی بن نہیں سکا۔ تو پھر وہ اکھڑ
 بد مزاج اور بد فعل سا لڑکا سے تھلی کے کن لخت میں
 مہلن ہو کر نلنے لگا جب وہ ٹھکن سے چور ہو کر بستہ
 کرتی اور نمدا شرارت سے دور جا کھڑی ہوتی۔ تب
 بے خود ہو کر نل ہی دل میں بند آنکھوں اور مسکراتے
 لبوں کے ساتھ وہ سوچتی اور سوچتی ہی چلی جاتی۔ کوئی
 محبت سے اس کے ہل سلا رہا ہے اور اس عمل میں
 اتنی نرمی ہے کہ اس کی ملائمت سے آنکھیں بند ہوئی
 جاتی ہیں۔ کوئی آہستگی سے اس کی ہتھیلیوں کو اپنی
 پوروں میں لے کر دھانپا ہے اور دن بھر کی ٹھکن اتر
 جاتی ہے۔ کوئی بے حد دھیرے سے اس کے سائوں لے
 بیروں کے سفید زرد ٹکوسے۔

اول ہوں۔ پیر نہیں۔ پیر دوانا اچھا نہیں لگتا۔
 اپنے آپ سے بولتی، شرابی، لہانی کب تیر کی واویلوں

مرہم لگا تا پاس بٹھا کر پار کرتا، بڑی دیر تک چھوٹکیں
 مار مار کر دل بہلاتا رہتا لیکن کب تک۔ اس کی
 چھوٹکیں نین نار کے زخم پر مرہم تو تائی کے سلگتے دل
 میں شعلے بھڑکنے کا سا کام کرنے لگیں۔

اس نے اپنے زخم تیا کو دکھانے چھوڑ دیے۔ پھر
 تائی کو بتانا چھوڑا اور اب تو خیر وہ اتنی ماہر ہو گئی تھی کہ
 اول تو ہاتھ جلتا ہی نہ۔ اور اگر جل بھی جاتا تو کپے آبلے
 کو خود ہی ہاتھ سے رکڑ کر چھوڑ ڈالتی۔ تھوڑی دیر کی
 جلن اور پھر سب سیٹ ہو جاتا۔



اس کی کوئی سہیلی نہ تھی کہ اس سے دکھ سکھ بات
 لیتی۔ تائی کا بھی صرف ایک ہی بیٹا تھا جو عمر میں اس
 سے چھ سال بڑا تھا۔ میٹرک تک اس نے پرائیویٹ
 تعلیم حاصل کر لی تھی۔ اور بس اتنی ہی بہت تھی۔ تائی
 کے نزدیک۔ کوئی بڑی ایب نار دل ہی تھائی تھی۔ جو
 ہمیشہ غم خوار، ہمدرد اور ہمزاد ساسھی کی طرح اس کی
 ساتھ رہی تھی۔ کم سے کم بھی لگا سن تو اٹھارہ سال
 تک۔ اس کے بعد اس کی اس قدر رو بھی پھینکی زندگی
 میں مٹھاس کا ایک روزن خود بخود کھلا۔ ایک دن اچانک
 بڑی زور دار آواز میں۔ جیسے تیز آمدھی طوفان والی
 رات میں اکیلے گھر کی کھڑکی کھل جاتی ہے۔

وہ ایسا ہی ایک دن تھا۔ جاڑا اپنے عروج پر تھا۔
 دھوپ کلسندی سے آٹھے سخن تک رہنے کے بعد
 وہیں بڑی اونگھ رہی تھی۔ ذرا دیر میں آٹھے سخن سے
 ہی واپسی کے لیے اٹھ جاتی۔ اس نے پھرتی سے
 چارپائیاں کھینچیں اور کیڑوں سے بھری پرات لاکے
 درمیان میں رکھی۔ پھر تائی کو توڑ لگادی۔ تائی جو
 اندر کمرے میں اپنی اکلوتی اولاد نرنہ اپنے پیٹھاپے
 کے سارے غم و غور سے راز داری سے کوئی بات
 کرتی رضائی میں کھسرتی جا رہی تھی۔ اٹھ کر حلد کے
 ساتھ ہی دھوپ میں رسمی چارپائی پر آٹھی۔ ساتھ
 ساتھ کیڑوں سے بھی کھل جاری ہو گیا۔ وہ اندر

میں اتر جاتی۔ اسے پتا تک نہ چلا اور پھر خواب میں وہ
منظر وہی ایک منظر زندہ ہوتا جس نے اس کا دل موہ لیا
تھا۔ لوٹ لیا تھا۔

اس روز جاڑے کی شہری دھوپ میں ہوا سے
اڑتے اڑتے ہل اور ہوا ہی آنکھوں نے اس کے دل پر
اس انداز میں شب خون مارا تھا کہ وہ منہ کھولے بس
دیکھتی رہ گئی تھی۔



بڑی مشکل سے تالی کے بلانے پر ڈرتے
چھوہکتے ہوئے اگر اس نے ایک کیڑا اٹھایا تھا اور
انہی دھنگ سے ہاتھوں میں سنبھال بھی نہ سکتی تھی کہ
وہ ہاتھ سے لڑکا اور زمین پر گر گیا۔ اور تالی کا پڑنا حلد
ایک ساتھ اٹھانے سے جھکے تو ان کے سر آپس میں
کرا گئے۔

”انسب“ زور کی چوٹ لگی تھی۔ اس کے منہ
سے ”سی“ نکلی تو حلد نے ذرا کی ذرا آنکھوں میں ترس
بھر کے اسے دیکھا۔

وہ زمین پر بیٹھی تھی اور یہ پلنگ پر بیٹھ کر اس کی
طرف جھکا تھا۔ وہیں۔ بس وہیں وہ ادوات پیش کئی
جس نے اس کی ٹینڈرں اجاڑ کر راتیں آباد کیں یا پھر
اس کا بھولین اجاڑ کر خواب آپلو کسے۔ زندگی
گزارنے کے لیے یہ ایک اچھی مصروفیت تھی۔ کبھی
خواب میں دکھاتا تو کبھی حقیقت میں اور پھر بے انتہا
خاموش نظروں سے بے حد آہستگی اور احتیاط کے
ساتھ مسکرا دیتا۔ یہی اس کی دنیا تھی اور اسی دنیا میں
زندگی اٹھی تھی۔

ہاں تو بات کیا ہو رہی تھی کہ یہی اس کی دنیا تھی اور
اسی دنیا میں زندگی جی تو اٹھی۔ زندگی کو لوگ پالی کے
پلٹے سے پونسی تو تیشہ نہیں دیتے نا! کچھ تو بات ہوتی
ہے جو بات کی جاتی ہے۔

رہے ہیں۔
”کیوں بھئی۔“ حالانکہ وہ بیٹیوں کی ماں نہیں
تھیں، لیکن ایک حد تک وہ جوان کی ماں تو تھیں نا!

اسی لیے کوئی بات کرتے کرتے اندر آئیں اور
بولتے بولتے مین تارا کے سر پر ہی کن پنچیس اتنی
جلدی اتنے نزدیک کہ اسے ہاتھ میں پکڑی کاپی کا ورقہ
(ورق) پلٹنے کی مہلت نہ ملی اور ظلم کی ساری سیاہی
زندگی بھر کے لیے اس کی شکل پر پوت دی گئی کیوں کہ
پورے کھنڈر ایک ہی نام وہی حرف و سچے کے ساتھ
بکھرے ہوئے تھے۔

”حلد۔ حلد۔ حلد۔“ تالی نے آنکھیں سکوڑ کر
چند لمحوں کے بعد تارا کو چھوشت نہ ہونی ہی تارا کو دکھا
پھر اس کے بعد تو اللہ دے اور بندہ لے آڑے
ہاتھوں، لیکن سیدھی پلاسٹک کی سخت چیلوں پر تالی
نے اسے رکھ لیا۔ اور اس وقت تک نہ چھوڑا جب
تک خود حلد نے کمرے میں آکر تالی کا ہاتھ نہیں
پکڑ لیا۔ ورنہ مین ممکن تھا کہ بچپن سے مار کھا کھا کر
پلٹنے والی مین تارا کو اتنی چوٹ نہ لگتی، لیکن بڑھاپے کی
دہلیز پر قدم رکھتی تالی کو اتنی محنت کرتے کرتے غص
ضرور آجائے اس رات مین تارا نے کئی آنکھوں
دیکھے گئے خواب کو خود آنسوؤں کے دریا میں بھلایا۔

”کچھ خواب شرمندہ تعبیر ہونے کے لیے نہیں
دیکھے جاتے۔ صرف خواب ہوتے ہیں اور خواب ہی
رہتے ہیں کیوں کہ وہ زندگی نہیں ہوتے۔ فقط زندگی
کرنے کا بہانہ ہوتے ہیں۔“ اور یہ کسی زندگی تھی
جس میں اسے کسی بہانے تک کو توڑنے کی اجازت
نہیں تھی کہ یہ بہانے باز خواب کسی اور کی ٹینڈرں
اجاڑنے لگے تھے۔ مین تارا کے منہ سے ساری
رات ٹوٹے مارے بھی اس کی دنیا میں وہاں کوئی
کھٹا نہ سہا سکتا۔



حلد کو بھی مطالعے کی خیر لگتی تھی اور تالی کو بھی
لیکن تالی نے پتا نہیں کس انداز میں کیا کہ کرا نہیں

تالی بھی چند مہینوں۔ فقط چند مہینوں میں بھارت
گئیں کہ مین تارا کے مین تاروں کی طرح چمک

مطلع کیا تھا کہ بجائے اس سے پوچھنے کے وہ دونوں ہی اسے بری طرح نظر انداز کرنے لگے۔

تائی کی جھڑکیوں اور پھٹکاووں میں اضافہ ہو چلا اور اس کے خوابوں کے جل جھجے مقبرے پر غم آنکھوں کی سیلن سے پیش بڑھتی رہی۔ وہ خود اس کا وجود اس کی اتا اور عزت نفس مزید دو سال اور تین مہینے تک حقارت بھری نظروں سے گھاس لے لگاتے ہوئے اودھ مے سے ہو گئے۔ دو سال اور تین مہینے بعد گھر کے آگن میں حاید کی نئی ٹولی بولمن نے قدم رکھا۔ کسی کی دنیا کہا ہوتی تو کسی کی بالکل دیرانہ۔ اودھ مری میں تارا اور اودھ جلی اس کی آنکھیں اس روز مکمل مودہ اور راکھ کا ڈھیر قرار پائیں۔ اس نے کسی مشین کی طرح اس شادی اور اس کی تیار یوں میں حصہ لیا تھا اور مشین بھی وہ جو آرڈر پر بنوائی گئی ہو یا کسی بے حد ترقی یافتہ ملک سے منگے داموں فائن کر سٹی میں سکورٹ (سٹل) کر کے خریدی گئی ہو۔

اس مشین کی کیا کوالٹی ہوتی ہے معلوم ہے نا۔ وارنٹی و گارنٹی سمیت۔ چونہ رکھی ہے نہ چھکتی ہے نہ چلتی ہے نہ گرم ہوتی ہے نہ خراب۔ جسے وہ لڑکھ اور ڈیل فیر سے فرق نہیں پڑتا اور پھر وہ تو بین تارا تھی جو ایک ایسی مشین بن چکی تھی جو گھر کا فیوڈ آؤ جانے کے بعد بھی کام کرتی رہتی ہے سو وہ بھی کرتی رہی۔ کرتی رہی۔ کام میں جتی رہی اس وقت بھی جب رخصتی کے بعد چھٹکن کے باعث تلیا تائی اور دوسرے مہمانوں کا فیوڈ آؤ کیا۔

اس نے تازہ دودھ پتی دم دے کر ایک ایک کے ہاتھوں تک پونچائی بستر سے کھینے اتارے ٹکالے اور اپنے ہاتھوں سے اوجھڑی بنی اور دھکی ہوئی رضائیاں ڈالیں کہ تائی کے مشورے اور ضد پر شادی تم جاڑے کے موسم میں رکھی گئی تھی۔ تمام مہمانوں کو ان کے بستروں تک رہنمائی کر کے آتش دان میں سے سرے سے باہر رکھ کر سلگایا۔ سارے کمروں میں اس کی مشینی محنت سے گرما نش بھر گئی اور سب لوگ دودھ پتی

کی راحت لے کر گرم بستروں میں گھسے کچھ اسے دعا میں دیتے اور کچھ اس کی خاموش محنت کو معنی خیز اشاروں سے اگارت کرتے پتھری کی بولوں میں اتر گئے تب اس نے اپنی ساکت، ٹھکی آنکھوں میں پتھر کا شائبہ ڈھونڈنا چاہا مگر ناکام رہی۔ تھک کر ٹھنڈی چھلی چھت پر بے نیم پختہ کرے میں جو عرصہ دراز سے اس کے نام سے منسوب تھا رکھی جھانکا چارپائی پر تالوئی سے گر گئی۔ کھیل۔ کھیل۔ کھیل کہ وہ لاکھ بن جاتی پر مشین نہیں گئی۔ تھی تو انسان ہی نا!

شادی کے بعد کے دن گزرتے ہی دلہن کے چوٹیلے اور نئی ٹولی ساسوں کے چاؤ پورے ہوئے۔ دلہن بیگم نے بلور جی خانے میں قدم رکھا اور جیسے عین تارا کی زندگی میں ایک نئی آناش آگئی۔ اسے لگا جیسے تائی خود کو اپنی ہو سکی سانس سمجھتے اور ماتے ہوئے اس پر تنقید اور بے جا روک ٹوک کو اپنا حق سمجھتی تھی۔ اسی طرح ان کی سو خود اس پر باہر مہیاں لگانے کو اپنا حق اور حق سے زیادہ فرض سمجھنے لگی تھی۔

نہن تارا تو پہلے ہی قسمت حالات اور تائی کے ہاتھوں مار کھائی ہوئی تھی۔ اس صورت حال سے گھبرائی نہیں تو اور کیا کرتی۔ اپنے خیل میں بند ہوئی چلی گئی اور نئی دلہن یعنی شہبہ جیسے جیسے پرانی ہوئی تھی۔ بالکل ہی جا لے سے باہر آئی گئی اور جب کوئی بالکل ہی اپنے دائرے اخلاقیات اور حدود سے تجاوز کر جائے تو پھر اسے واپس اندر لانے کے لیے براہ راست اسے کچھ کرنا پڑتا ہے جس نے اسے بنایا ہوتا ہے۔ چاہے وہ انسان ہو یا کوئی مشین جس کی خرابی اور پر کار عمل میں رکاوٹ کو صرف اس کا تخلیق کار ہی سمجھ سکتا ہے اور دوبارہ قفل قفل حالت میں واپس لاسکتا ہے۔

جس دن سے شہبہ کا بچہ بھاری ہونے کی خبر ملی۔ پورے گھوٹ بلکہ انڈس پروس میں بھی اس کی گونج سنی گئی اور وہی تائی جسے شہبہ نے اپنی دھاری کھوار کے بل پر کھلے لگا رکھا تھا۔ واری صدقے جاتی دن

یہ شہدہ محسوس ماری۔ ”تایا نے چونک کر انہیں دیکھا۔ زندگی میں پہلی بار تائی نے عین تارا جیسا۔ انداز کسی اور کے لیے اور خاص کر اپنی جیتی بسو کے لیے اپنا کیا تھا۔

”ایک تو دنیا سے اڑو کھاکم کرنے لگی ہے۔ پھر پیدا کر کے اور اوپر سے یہ فضول بات علاج میں بھٹانے کی تو سب کے ساتھ ساتھ اپنا اور اپنے خصم کا بھی علاج خراب کرے گی۔“

”ہونہ۔ صرف خرابی۔ الٹ گیا ہے علاج اس کا۔ آج دلہہ ہر میں بھی نین اٹا راکو اکیلے دیکھ کر ہاتھ نہیں کیا ایسی ہی سیدھی بیوا اس کر رہی تھی۔“

”اللہ ہدایت دے اس کو بھی اور ہم سب کو بھی۔“ نیم تارک کمرے میں صرف نگرانی آگ کی تپش باقی رہ گئی اور تائی کے گل میں ایک ہدایت یافتہ سوچ۔ ”کاش سیکھتے یہ ہدایت تو جب مانگ لیتی جب تو نے خود نین تارا کا بیچارہ کیا تھا۔“



کوئی لمحہ زندگی میں اس طرح وارد ہوتا ہے کہ اپنے وقت پر تو وہ بڑا محسوس ہوا اور سخت لگتا ہے مگر بعد میں وہی لمحہ ہمارے لیے مبارک ثابت ہوتا ہے اور پھر ہم زندگی بھر اس لمحے کا اپنی یادداشت اور اہٹکوں سے قرض ادا کرتے رہتے ہیں۔ نین تارا کی زندگی میں بھی ایسا ہی ایک لمحہ ایک رات میں اچانک ہی وارد ہوا تھا اور پھر اس کے بعد اس کی زندگی بدل گیا۔

اس رات جب سہ پہر سے ہی گھرے گلے باواوں نے عرش کا سینہ ڈھانپ رکھا تھا اور وہ گھر کی واحد فرد تھی۔ جس کا گروہمت پر ہونے کی وجہ سے بے حد سرد اور زخم خوردہ ساتیبن سے ڈھکا ہوا تھا۔

گر میوں میں سلوان بھانوں اس جھلتے کمرے کو ٹھنڈا کر دیتا تھا اور سردیوں کی بجائے جھڑی میں سردیوں سے بھری ٹھنوں میں سے کہیں سے بھی کبھی بھی کوئی ٹھنڈی برف پانی کی دھارا اس کا کنوڑ بجم

رات بسو کے چاؤ چوٹیلے کرنے لگی۔ شہدہ کچھ اور چوڑی ہو گئی اور نین تارا کچھ اور سسڑ کر چوٹی برابر وہ

کبھی سردی کبھی بیواں میں تو کبھی ہاتھوں میں دھبہ نام نہاد کنوڑی کے جھوٹے چکر میں نے شہدہ کو اپنے ہی گھر میں قماشنا کر رکھ دیا۔ اب تو تائی بھی اس کے ڈھکوسلوں سے گھبرانے لگی تھی۔

”تو۔ باب جیسا بزرگ گھر میں موجود ہے اور یہ کم بخت جب دیکھو تو دم پر ہاتھ دھرے ہائے ہائے کرنی کرے سے نکل آتی ہے۔“ نین تارا سختی تو کبھی سر جھکا لیتی اور تندی سے اپنے کام میں بخت جاتی اور کبھی جو اکیلی ہوتی تو دب دیا کر ذرا سا نین تارک سے اس نے کب سوچا تھا کہ زندگی میں ایسے ایسے مواقع پر بھی ہنسا بڑے گل ہر انسان بناواں ہے۔ وہ بھی تو نہیں جانتا کہ اسے زندگی میں کب کب اور کہاں کہاں ہنسا ہے اور کس کس بات کو روزنا ہے۔



ہرگز روتے دن کے ساتھ شہدہ کی نہ صرف جسمانی بلکہ ذہنی حالت بھی ابتر ہوتی چلی گئی۔ سہلے اندر ہی اندر کچھ رہتی اور پھر پھپھتی تو ایک دم پریشگر کی مانند اپنا سارا گرم لہہ سانسے والے برؤل دیتی اور اس گرم طبع کی تپش تلے جھلنے والی اکثر وہ جھڑنیں تارا ہوتی۔ اس کا تھکا ہوا سر اور سرگے لب سوائے شہدہ کا دل چلانے کے اور کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ وہ اسنے سے بھی اس قدر تپ جاتی کہ بس نہ چٹا کہ کس طرح پاؤ پھڑ کر اسے گھر سے باہر کر دے۔

”یہ اچھا نہیں ہوا سیکھ! اس نے لوں کے کلن میں پھونک دیا ہے کہ نین تارا اپنے جلد سے۔“ انہیں بات کھل کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ جاڑا اپنے جین پر تھا اور تائی سیکھ دھوڑ رشتا میں لپٹی بیٹھی تھی پھر جی آتش رواں میں سلگتی لکڑیوں کی جج اس نے اپنے اعصاب پر محسوس کی تھی۔

”اے دفع دور بھائ میں جائے میری طرف سے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

چھو جاتی جس کی ٹھنڈک کو محسوس کرتا اس کا وجود بچے
 پور پتی خانے میں چلے کے پاس کھڑا ہو کے بھی
 نکلیا نارہتا۔

”ہمارے! تم ابھی تک اپنے کمرے میں نہیں گئیں
 اور۔“ ست روی سے کھڑاؤ کی طرح پلاسٹک کی
 سخت چٹیل کو زمین پر کھس کھس کھینتی شلہہ اسے
 کچن میں دیکھ کر کے بغیر وہ نہیں سکی پھر جواب کا انتظار
 کیے بغیر خود ہی بولی۔

”چھاپا چلو۔ اب جانے سے پہلے ذرا اپنے بھائی کو
 گرم دودھ دے جاؤ۔ میں ابھی آ رہی ہوں۔“ عین تارا
 نے کمری سانس بھر کر اپنی بوسیدہ چادر کو گالوں کے گرد
 کچھ اور پینٹا اور نیا دستا نے موسٹر اور شال سے لدی
 پھندی شلہہ کو عین پار کر کے دوسری طرف جاتے
 ہوئے ٹھنڈے دیکھا پھر دودھ کا گلاس لے کر دستک
 دے کر دروازے سے اندر گئی۔ سامنے ہی بستر پر نیم
 دراز حامد جو تک اٹھا۔

”ہمارے تم ابھی تک جاگ رہی ہو۔ جاؤ بھی سو
 جاؤ۔“ اس نے بے حد معمول کے سے انداز میں وہ
 بول کے جن میں ہمدردی کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ کمرے
 میں آتش دہان کی وجہ سے ہر طرف سی حدت تھی۔

وہ بس اتنی ہی دیر ٹھہری، چٹنی دیر میں حامد نے دودھ
 ختم کیا اور عین اس لمحے جب وہ حامد سے دودھ کا گلاس
 لینے ذرا کی ذرا جھکی، پیچھے سے شلہہ نے اس کی کمر
 میں جو دروازہ دھاڑے ٹھولا۔ چھوٹے سے کمرے میں
 رکھے گئے بڑے سارے بیڑے اور دروازے کے درمیان
 معمولی فاصلہ ہونے کی وجہ سے عین تارا کو ذرا دھکا سا
 لگا اور وہ بالکل بے اختیار بستر حامد کے اوپر۔

”ہاں۔ ہاں۔“ شلہہ نے بول لینے لیں پر ہاتھ
 رکھا۔ جیسے اس نے پتا نہیں کتابچہ کتنا ٹھنڈا اور غیر
 متوقع منظور کیا۔

”دیکھا کر ہے ہو تم دونوں یہ سب۔“ عین تارا اسم
 کے پیچھے ہی اور حامد دھاڑ کر کھڑا ہوا۔
 ”تو کیا کہہ رہی ہے کیا یہ سب۔“
 ”میں نے کیا کہا ہے۔ جو دیکھا ہے وہی کہہ رہی

ہوں۔ ہائے اور یہ۔ میں لٹ گئی۔ ہائے لہل آ کے دیکھ
 لو۔“ عین تارا کی آنکھیں لہل آئیں۔ وہ سر سے سر
 تک تھر تھر کپکپ گئی۔ ایک لمحے میں ایک ہنگامہ کھڑا
 ہو گیا۔
 عین تارا نے زندگی میں بڑے بڑے الزام سے
 تھے۔ بہت بار کھائی تھی، لیکن یہ تھمت یہ بہت سنا اس
 کی برداشت سے باہر اس کے ضبط سے بھی بڑا تھا۔
 اور عین تو کسی کو نہیں تھا۔ نہ تیار نہ تالی اور نہ حامد
 کو۔ کمرہ بھلی پار اپنے دماغ میں کچھ بولنا چاہتی تھی۔
 کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن پھر پھڑکتے لیں سے چند بے
 معنی کواؤنڈل کے سوا کچھ بھی نہیں لگا اور لن آوازوں
 پر بھی شلہہ کے دلوٹے قابل آ رہے تھے۔ تب ہی
 حامد کی بو کھلائی ہوئی مڑا گئی نے ہوش سنبھالا اور اس کی
 ایک زوردار دھاڑ نے شلہہ کی بولتی بند کر دی۔

”دیکو اس رنڈ کر شلہہ! میں تو ابھی کے ابھی تیرا قصہ
 ختم کر دوں گا۔ عین لفظ بیل کے۔ خواب جواب ایک
 توار بھی نکلی۔“ کمرے میں دھنڈاتے ہوئے دنگے کے
 گتے پر کسی نے پیر رکھ کر توار کو بند کر دیا۔

شلہہ کسی تاکن کی طرح سانسوں کی جگہ پھنکارا
 بھرتی، کبھی حامد اور کبھی پیچھے کی طرف کھڑکھڑا ہوتی عین
 تارا کو دیکھ رہی تھی۔

”کو لٹھ کی بندری باڈر اس خوف کھا لے تجھے لینے
 محسوس کی بھی پرواہ نہیں۔ اپنے دل کی جلن بجھانے کے
 لیے کسی عیب کی چادر پلید کر دی ہے تو۔“ عمارت
 آمیز انداز میں بولتا وہ دونوں بانڈوں میں اپنے بے بس
 تماشائی بننے بل بل کو سمیٹ کر پھر نکل گیا۔ اور پیچھے
 اس کا عتاب سنے کو عین تارا گئی ایللی۔



وقت کا وارمت ظالم ہوتا ہے جب کسی کے منہ پر
 لگتا ہے تو صرف حاضر، آنکھ اور لب ہی نہیں پورے
 وجود پر ڈھ ڈال دیتا ہے۔ کمرے کی دیوار میں کبھی
 لرزتی کانچی عین تارا کو یوں ہی دکھا تھا کہ اس کے چہرے
 پر بھی وقت اور حالات کا سب سے زور دار طمانچہ

چھانچوں چھانچ برس رہا تھا۔ حامد نے اہل کے پیچھے نکل کر محن میں داخل۔
تڑتڑ برستی ٹیخ ٹھنڈی بارش میں وہ دائیں ہاتھ سے اپنا گل دہائے محن میں بھرے پانی میں شہو شہو کرتی کسی بد بوی کی مانند دوانہ کھول کر رستے اندر سرے میں کم ہو گئی۔

سات گھنٹے۔ سات گھنٹے سات صدیوں کی مانند یوں گزرے تھے۔ گویا بھاری لوہے کے ڈنڈے کو تھامے دو پیمانوں کے درمیان تھے ہوئے رستے پر چل کر گزرے ہوں، مگر پھر بھی ان سات گھنٹوں کے اذیت ناک انتظار کا انجم حاصل نہیں ہوا۔
حامد بے شک باپ بن گیا لیکن اس کی بیٹی کی ماں اپنی اولاد کی شکل دیکھے بنا دنیا سے رخصت ہو گئی۔

وہ گاؤں کی بہت پر لائی واپی تھی۔ بے حد تجربہ کار۔ جس کی انگلیوں پر پورے ہنڈی کے زھاؤں کا حساب رہتا تھا۔ جس سے جس طوفانی رات میں تارے اپنے اڑھ جلمے چہرے پر بڑے ٹھنڈے پانی کی جلموں کو محسوس کرتے اس کے گھر کا دروازہ پینڈا اس رات کو کسی کے ”قاسم“ ہونے کی لوید نہ تھی اور پھر میں تارا۔ اسے دیکھ کر تو واپی فریادوں سے ہی دہل کر رہ گئی۔

”پر ابھی تو اس کا قیام نہیں ہوا۔“
”مزنواں تو گل گیا واپی ماں۔ چھٹی کر۔ بہنواری لڑکی کے منہ سے ایسی کھلی ڈلی بات کسی انہونی کے ہونے کی لوید ہی تھی۔“

”رب خیر کہتا سی۔“ واپی ماں نے نین سے زیادہ خود کو تسلی دی تھی اور پتا چھانا کھول کہانی میں شرابور نین کو بھی چھاتے تپنے لے لیا تھا۔ پھر حامد تالی اور تالیانے نے دیکھا نین تارا اس طرح پوری رات مصلیٰ پر بیٹھی اپنے جلمے ہونے چہرے کی ساری تکلیف بھلائے اس عورت کی تکلیف نل جانے کی دعا مانگتی رہی۔

جیسے جیسے شہدہ کی کراہیں بڑھتی گئیں۔ نین تارا کی ہچکچاہٹ بلند ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ ایک وقت میں تالی کو خود اٹھ کر اسے گلے سے لگا کر تسلی دینی پڑی اور

بڑنے ہی والا ہے۔ لیکن۔ کون سا وقت کس کے لیے گیارہ تم کرنا ہے۔ یہ فیصلہ کرنے والے ہم کون ہوتے ہیں بلکہ یہ کیا؟ سب ہی فیصلے کرنے کے لیے ٹھوٹک بجانے کے لیے، کوئے کو ہیرا اور سوئے کو کنڈن بنانے کے لیے وہ بیٹھا ہے اوپر۔ اللہ جو سب سے عظیم بھی ہے اور باخبر بھی۔

”گور تو۔ تمہری یہ جمل۔ تجھے تو میں ابھی سبق سکھاتی ہوں۔“ خالی کمرے میں وہ جانے والے سب سے آسان شکار پر شہدہ کی نظر اب پڑی تھی۔ اس کا ذہنی وجود جو زمین پر ایک ایک قدم احسان بوجھ کے رکھتا تھا اس وقت شمال چھٹی کے ساتھ آتش دان کی طرف لڑکھ اس نے کھینچ کر ایک سلگتی کلڑی اس میں سے نکالی اور اہل نہیں تارا کی طرف نکلی۔

کلڑی موٹی اور بھاری تھی۔ گرم تھی۔ انگارہ سی دکتی ہوئی۔ اس کے دن پورے ہونے والے تھے۔ وجود بے ڈھب، چال غیر متوازن اور اس پر غیض کے اٹھان کی چڑھتی چھٹی۔ قدم بھر دوڑ جب وہ نین تارا تک پہنچی۔ نین تارا بری طرح ڈر کر دیوار سے جا لگی اور ٹھیک اسی لمحے شہدہ کے وجود میں درد کی ایسی زور وار کاٹتی ہوئی لہر دوڑی کہ اس کی کراہ نکل گئی۔ ذرا سا جھک کر اس نے خود کو سنبھالنا چاہا۔ اس سے نین تارا نے بھی اس کی تکلیف اور بے بسی کو محسوس کیا۔ وہ ذرا سا آگے کی طرف جھکی اور شہدہ کے ہاتھ سے کلڑی چھوٹ کر سیدھی اس کے گل سے جا لگی۔

”ہائے اللہ۔“ تکلیف سے نین تارا تڑپ سی گئی۔ چہرے پر جیسے کسی نے جلتا انگارہ ڈال دیا تھا۔ اس نے دوہری ہوتے ہوئے بوسیدہ شل کا گولہ بنا کر منہ پر رکھا اور زمین پر گر گئی شہدہ کو دیکھا۔ بس لمحوں کا فیصلہ تھا اور زندگی بھر کا کھیل۔

”تالی لیاں۔ تالی لیاں۔“ کمرے کا دروازہ دھاڑ سے کھلا اور آدھے چہرے پر چادر کا گولہ بنا کر رکھی نین تارا اڑتی ہوئی اندر نکلی۔

”بھرجالی کی حالت خراب ہو گئی۔ آپ جانیں میں واپی کو بلائی ہوں، یاہل برسا شروع ہو چکے تھے۔ مینہ۔“

یہ اجنبی منظر اس گھر کے افراد نے ہی نہیں دیکھا تھا۔ جبری لڑائیوں کے بعد وہاں نے بھی پہلی بار ہی دیکھا تھا۔ جبری لڑائیوں کے بعد وہاں نے کمرے میں چھائی خاموشی تو ڈر کر سب سے پہلے تائی کو آوازی۔

”سکینہ! اری او سکینہ۔“ ساتھ ہی کسی نئے فرشتے نے معصوم باریک آواز میں رو کر وادی کو پکارا تھا۔ سکینہ تائی بڑبڑ کر اندر پہنچی۔ نین تارے جانے نماز سمیٹی۔ حامد نے کرسی سے اٹھ کر وادے کو دیکھا۔ تاپا بھی کھنکھارنا ہوا اپنے کمرے سے نکلا گیا سب ہی کو اس خوش خیال منظر کا انتظار تھا جب تائی بجلی آسمانوں اور مسکراتے لیوں سے بچے کو نے کر کرے سے برآمد ہوتی اور مبارک سلامت کا شور مچاتی لیکن۔

شور تو چپا مگر مبارک سلامت کا نہیں۔ تائی کے بین کان۔ تاپا ہڑبٹایا۔ حامد کے حواس چھوٹے اور نین تارا کے ہاتھ سے جانے ٹھانے۔



”رے یہ آپ کی بیٹی کو کیا ہوا بہن۔“ یہ بھی قل کے چاولوں کی کھرجن بھی نہیں نکلی تھی کہ دادا یا ساسا ایک سوال اس عورت کے لیوں پر آیا۔ جو ہفتہ پہلے نین تارا کو کسی رشتے کے سلسلے میں دیکھنے لگی تھی۔

”وہ یہ۔۔۔ یہ۔“ تائی زندگی میں پہلی بار ہی گڑبڑائی تھی یا شاید اس بری طرح سے کہ۔ پاس بیٹھی نین تارا کو خود اٹھ کر ان کی مدد کو آنا پڑا۔

”نگاری اونچی کر کے دھونی دے رہی تھی۔ تو۔۔۔ بھر مڑ گیا اور تھوڑی سی راکھ منہ پر پڑ گئی۔“ وہ اواسی سے مسکرائی۔ اچھا بھلا چوڑا ہوتا سا ہوا۔

”نگاری میں سے راکھ گرنی، لیکن راکھ کا جلا ایسا تو نہیں ہوتا۔“ الفاظ تو کچھ اور تھے مگر معصوم ہی تھا کہ انہیں اس کی بات پر برتی برابر یقین میں آیا۔

”وہ صرف راکھ نہیں تھی اس میں ایک جتنا کونکہ بھی تھا۔“ اس کے لہجے کی بے رحمی پر عورت صرف جھری جھری لے کر ”سی۔ سی۔ سی۔“ کر کے

گئی۔

”تو کوئی دوا لگائی۔ ایسے تو نشان پڑ جائے گا اور۔۔۔ تمہارا چہرہ بہت برا لگے گا۔“ ان کی ہمدردانہ بات نے تائی کے دل میں کوئی اللام سا بھایا اور اس اللام کی آواز اتنی کراری تھی کہ وہ موقع محل کا لحاظ کیے بغیر پوچھ بیٹھیں لیکن برادر است نہیں۔

”وہ جن لوگوں کا آپ نے کہا تھا انہیں کھلا دیجئے گا۔ ذرا ٹھہر جائیں۔ گھر میں فوننگی ہوئی ہے اور ابھی۔“

”وہ اب کہاں آئیں گے۔“ عورت کچھ زیادہ ہی منہ پھٹ تھی یا کچھ (بات تو ایک ہی ہے)۔

”بلکہ وہ تو اب شاید اسے پہچاننے سے ہی انکار کر دیں۔“ تائی نے گھبرا کر نین تارا کو تلاش کیا مگر وہ دوسری طرف بڑھ چکی تھی۔



چند دن گھر میں سوگ رہا۔ پھر زندگی اپنی ڈگر پر چل پڑی۔ آج مرے کل دو سرفان ساسی کا نام ہے لیکن یہ تھا کہ مضمی لہہا کی قلعاریوں نے زیادہ دن آنکھیں نم نہیں رہنے دیں۔

یوں بھی بیٹی چلی جائے تو ہیکے والے یاد کرتے دوتے ہیں۔ بہو مرے تو شوہر ہوں گو دوسری گھر میں ستانے لگتی ہیں۔ گھر کا کام بچوں کی دیکھ بھال اور مردکی ذمہ داری کے علاوہ بھی یہاں ایسی کوئی کہانی تھی تو نہیں۔ کیوں کہ گھر کے کام سے لے کر بچی کی ذمہ داری تک نین تارا سب ہی کچھ سنبھال رہی تھی۔ اس کے چہرے کا ڈھنگ مگر تھا۔ جس کی اب سب کو بروا تھی سوائے خود اس کے۔ نتیجہ۔ ذمہ بڑ گیا۔ گھرا ہو گیا اور چوہو بھیا یک لگنے لگا۔ اب یوں تھا کہ جب وہ مسکرا کر بچی کو پچھارتی تو صرف بچی قلعاریاں مارتی سارا گھر نظریں چڑھاتا۔

”حق ہا۔ سکینہ! بہت برا کر گئی شاہد۔“ وہ برآمدے میں سلانی مشین رکھے اس پر اپنی آنکھیں گاڑے جھکی ہوئی تھی۔ اس کی ہی فرمائش پر ہفتہ بھر

کرایے دیکھا۔ وہی نین مارا جو کچھ دیر پہلے عجیب سی لگتی تھی۔ اب مکمل اور خوب صورت لگ رہی تھی۔

”یہ کبھی مت سمجھنا کہ تم سے شادی، شادی کے منہ کا کوئی کٹافہ ہے جسے میں نے زندگی بھر ادا کرتے رہنے کا سوچ کر تم سے شادی کی۔“ ”ہوسوی جوڑے کا زرارہ گھونگھٹ اس کا چہرہ جیسا ہے قاصر تھا، لیکن حامد کو اس کے چہرے کی پروا تھی بھی نہیں۔

”یہ بدلہ ہے اس احسان کا۔ جو اسیہہ کو اپنے سینے سے لگا کر تم نے کیا ہے مجھ پر۔“ ”وہ واقعی احسان مند تھا۔ نین مارا کا سر جھک گیا۔

”لیکن میں نے اس لیے تو اس سے محبت نہیں کی تھی۔ میں تو سمجھتی تھی کہ وہ جھگڑی۔ جس گھر میں جس شخص کے سامنے ساری زندگی اس نے جی اچھا کب اور ایسے جیسے الفاظ ادا کیے تھے اس کے سامنے اتنی بڑی بات۔

”میں تو۔ کیا میں تو۔“ حامد اسے آکھتا تھا۔ اسے بولنا برا۔

”میں تو اسے صرف بھانا چاہتی تھی دوسری نین مارا اپنے سے۔“ حامد چپ کا چپ رہ گیا۔ اتنی دیر اور بڑھل لڑکی سے اس گری بات کی امید جو نہیں تھی۔

”تمہارا شکر یہ۔“ اس نے نین مارا کے ہاتھ کی پشت پر سولایا۔

”میں نے تمہیں اپنایا میں نے۔ کیوں کہ ایسا صرف تم ہی کر سکتی تھیں۔“ وہ سلوگی بھری محبت سے مسکرا دیا۔ نین مارا کا دل شاد ہو گیا۔ نین مارا کی سچ نین مارا بن گئی تھی۔ اس کے نین خوشی سے وک رہے تھے اس نے محبت کے بارے کو آنگ میں سجایا تھا۔

پہلے تیار نے اسے سلامتی مشین میں موڑ لگا کر دی تھی اور اس نے ہفتہ بھر میں کئی ایک کپڑے ننھی اسیہہ کے لیے ہی ڈالے تھے۔

”کتے تو صحیح ہیں آپ۔ مجھے تو بس اب اس کا گھر بسانے کی فکر لگ گئی ہے۔ کون آئے گا اسے پانے۔ اس جیلے ہوئے منہ کے ساتھ۔“ تین چوتھائی گندی رنگت پر کتھی اور مڑے کپڑے جیسا ایک چوتھائی چرو لیے وہ سنجیدگی کپڑے میں لگ جانے والا کوئی غلط بخیر۔ اوپر رہی تھی۔ دروازے کے باہر آکر کے حامد نے نظر بھر کر اس کی طرف دیکھا اس سے اس کا چہرہ معمول سے زیادہ بگڑا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس نے نظر جھکا لیا۔

”سب تو کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔ اس کے ہوتے میں حامد کے لیے دوسری زندگی کی بات بھی نہیں کر سکتی۔ سب مجھے ہی برا بھلا کہیں گے۔“ ”تائی سیکینہ کے الفاظ میں ہمدردی سے زیادہ بچھتاوا تھا۔ تب ہی حامد اندر داخل ہوا۔

”میں نے کوئی دوسری دیکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے اہل!“

”ہیں۔؟“ ”میں حق بقی رہ گئی۔“

”کیا کہہ رہا ہے تو۔ جھٹلا ہوا ہے کیا۔“

”جھک کہہ رہا ہے بالکل۔“ ”تایا بھی فوراً“ ملنے والے جھٹکے سے سنبھلے اور بات کو آگے بڑھایا۔

”حامد کو بھلے دوسری ہوئی مل جائے۔ اچھی سے اچھی لیکن اگر اس کی بیٹی کو کوئی مجھ جیسی مل گئی تا تو اس کا حال بھی ویسا ہی ہوگا۔ جیسا اپنی نین مارا کا ہوا ہے۔“ ”جگ کی تیاری کے لیے مورچہ سنبھالتی تائی، تائی کے اس طے پروں ڈھے گئی۔ رہی سہی کسر حامد نے پوری کر دی۔

”تائی بیٹی کو نین مارا اپنے سے بھلانے کے لیے، مجھے نین مارا کو ہی اپنانا ہوگا۔“ اس نے کمرے کا لوہہ بھڑا دو واہ پورا کھول دیا۔ سامنے ہی اسیہہ کو گود میں بھرے نین مارا آگے گد گد رہی تھی۔ حامد نے دوبارہ نظر بھر



Downloaded From
paksociety.com

تمثیلہ زاہد

مقام اور سبب

”فیصل بھائی تیری شادی کر رہے ہیں۔“
وہ جو خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی
کسمپاسا کرا گئی۔

”اتنی اچھی نیند کا ستیا ہاں کر دیا صبح صبح کیوں
میرے کانوں میں صور پھونک رہی ہو؟“ تاسخت
کو ذلت زدہ اور ہی گئی۔

”تمہاری نیند کئی چولے میں۔ اتنی اچھی خبر سنا رہی
ہوں اور موصوفہ کو دن کے ایک بجے نیند کی پڑی

پڑاؤ خواتین ڈائجسٹ 259 مارچ 2016

READING
Section

مصروف بے پروا انداز میں کندھے اچکاتے ہوئے بولی تھی۔
 ”کس قدر مفلو پرست ہیں نائی امی۔“ اس کے انداز میں ناست تھا۔

”اس میں مفلو پرستی کی کیا بات ہے، آج کل ہر شخص ہی اپنا قائمہ دیکھتا ہے۔ بات کروے پادام کی طرح کڑوی ضرور ہے لیکن یہی حقیقت ہے۔ نائی امی یہ وہ عورت ہیں۔ سنی کے ساتھ انہیں اپنا مستقبل بھی محفوظ نظر آ رہا ہوگا۔ چیز بھی نہیں دینا پڑ رہا۔ ان کی سفید پوش فیملی ہے۔ اس سے اچھا رشتہ انہیں کہاں ملے گا۔“ وہ چلتوزے کی گری اپنے منہ میں رکھ کر بولی۔

”یہی کائنات کی عمری کیا ہے۔ اسے اس سے بہتر آئین مل سکتا تھا۔ خوب صورت ہے، کم عمر بھی۔ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بجائے شادی کے چکروں میں بڑکئی ہے۔“

آج کل بی کام کے پھیرے ہوئے تھے۔ وہ دونوں ساتھ ہی پھیرے جارہی تھیں، وہ جانتی تھی کہ اپنی لے کر ناس کا خواب ہے لیکن لے کر محدود وسائل کی وجہ سے وہ اپنا خواب پورا نہیں کر سکتی۔ کلج کی طرح خاندان کے سارے لوگ انہی آنکھوں میں اس کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتے تھے۔ کائنات کے کشور لہجے نے کسی کو آگے بڑھنے کی ہمت نہ دی اور اب یہ دو دفعہ کا طلاق یافتہ موم۔ دونوں میں کوئی جوڑ نہ تھا۔ نہ عمر نہ شکل۔ بس ایک دولت کی چادر تھامے کھڑے فیصل بھائی تصور ہی میں اسے زہر لگ رہے تھے۔

”میں کروں گی کائنات سے بات۔“ حنائے دل ہی دل میں عزم کیا۔

اور پھر اگلے ہی روز وہ نوٹس کے ہالے گھر سے کچھ فاصلے پر موجود نائی امی کے گھر جا پہنچی۔ اس کے دلغ میں کئی سوالات نے پہل چار کھی گئی۔

”یہ کیا حاجت ہے۔“ وہ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

”ہے۔“ ندا اپنے ہونٹ سکیڑتے ہوئے بولی۔ ”ویسے اب فیصل بھائی کو شادی کے نام پر توبہ کر گئی چاہیے۔ شادی کا بندھن انہیں راس نہیں آتا۔ دونوں بچپن خوب چھان بین کے بعد اکلوتے بھائی کی دلہن لاتی ہیں اور نتیجہ وہی صرف لڑائی جھگڑے اور پھر طلاق۔“

حنائے دل بے باول کا جو ڈانباتے ہوئے بولی۔
 ”تب کی بارتیجہ سو فیصد نکلنے والا ہے۔“ ندا اپنے مخصوص رازدارانہ لہجے میں بولی۔

”وہ ایسے کہ فیصل بھائی کا اپنا کارنامہ ہے۔ اس بار انہوں نے ہنوں کی مشکل آسان کر دی۔ جانتی ہو لڑکی کون ہے؟“

سنوگی تو ماٹوں کو ہاتھ لگاؤ گی۔ جناب اپنی نائی کی بیٹی کائنات۔“

”نہیں۔ نہیں۔ کیا سچ میں۔ لیکن کیسے؟ فیصل بھائی اور کائنات میں خاصا آج ڈیفرنس ہے۔“ اس نے سچ سچ اپنے کانوں کو ہاتھ لگا لیے تھے۔ کائنات جیسی منفرد سوچ رکھنے والی لڑکی سے ایسی توقع نہ تھی۔

”وہ ایسے جناب دو ماہ پہلے ناصر بھائی کی شادی میں فیصل بھائی کائنات کو دیکھتے ہی دیوانے ہو گئے۔ اب تو چٹ مکتی ہنسی باہ کا چکر چل رہا ہے۔“

”ویسے کائنات باؤلی تو نہیں ہو گئی۔ وہ مان کیسے گئی؟“ اسے حیرت کا شدید جھکا لگا تھا۔ دلغ اب بھی یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔

”باؤلی نہیں، عقل مند کو۔ چھکا مارنے کی اسے ویسے ہی عادت ہے۔ خاندان میں اس بار بھی چھکا ہی

مارا ہے۔ سنا ہے فیصل بھائی اس کے عشق میں ایسے بھجول ہوئے کہ اپنی جائیداد تک کائنات کے نام کرنے کو تیار ہیں۔“

”کیا نائی امی راضی ہیں؟“ حنا کا انداز رازدارانہ تھا۔

”تو اور کیا۔ جب میاں ہوئی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔“ ندا اپنی مٹھی میں بند چلتوزے کھاتے ہوئے

”معلوم نہیں۔“ وہ اپنے ہاتھوں کو پھر سے تراشنے میں مصروف ہو گئی۔ جیسے وہ اس وقت دنیا کا سب سے اہم کام کر رہی ہو۔

”متم خوش نہیں کائنات تو انکار کرو۔ جانتی ہو فیصل بھائی طلاق یافتہ مردوں۔ دیوار اپنی بد مزاجی کی وجہ سے اپنی بیویوں کو چھوڑ چکے ہیں۔ کیا ضمانت ہے اب کی بار وہ اس شادی کو نبھائیں گے۔ کیوں اپنی زندگی کا جوا جانے سے بوجھے کھیل رہی ہو۔“

”ضمانت تو کسی چیز کی بھی نہیں۔ اور تم زندگی میں ایک بار یہ جوا ہر لڑکی کو کسی ہارجیت کے فیصلے کے بغیر کھیلنا ہی پڑتا ہے۔“ وہ اپنے ہاتھوں کو تراش چکی تھی اور اپنی چھوٹی سی کٹ میں فائبر رکھ رہی تھی۔

”تم نے اس کے روشن چہرے کی طرف دیکھا جنہاں اسے دکھ، تکلیف اور ایک دے غبار کی شدت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ یہ سب کہتے کہتے کائنات کے دیکتے گال اور آنکھوں کی نمی حنا طے سے محسوس کر رہی تھی۔ وہ جانتی تھی اس کو مل لڑکی نے زندگی میں بہت کم عمری سے ہی کھنکھائیاں دیکھ لی تھیں۔ اسے اب زندگی کی سختیاں چھیلنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ وہ اس وقت اسے کسی مضبوط پھاڑکی طرح کھڑے دیکھ رہی تھی جو اپنے وجود پر بے شمار پتھر سیٹھے بیٹھی تھی۔“

”تم کہو تو تالی ای سے میں بات کروں؟“ اس نے کائنات کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ دھیرے سے رکھ کر کہا۔

”نہیں۔“ وہ تیزی سے اپنا ہاتھ سرکا کر کھڑی

”کیسی حماقت۔؟“ ناخن تراشتے ہوئے اس کا لہجہ پرسکون تھا۔ وہ اس کے بدلے تیور پر بھی نہ چونکی تھی۔ شاید اس کی سرشت میں چونکا دینے کی عادت تھی۔

”تم تو ایسے بن رہی ہو جیسے کچھ خبر ہی نہیں۔“ حنا اس کے برابر میں بیٹھ گئی اور اپنا پرس کندھے سے اتار کر رکھ دیا۔

”مجھے الہام نہیں ہوتا۔“ کائنات اس کی طرف نظر اٹھائے بغیر بولی۔

”تم بتا بڑا فیصلہ کرتے ہوئے کچھ تو عقل سے کام لیتیں۔“

”کیسا فیصلہ؟“

”فیصل بھائی اور تم۔“ وہ چٹکائی۔

”ہاں۔ ابھی بات طے نہیں ہوئی۔ طے ہونے کے بعد میں نے سوچا تمہیں خبر دوں گی۔“ وہ اپنے مخصوص نرم اور شیطانی لہجے میں بولی۔

”متم مزہ کیا خبر دوں گی؟ خیر تو خاندان میں گزشتہ کئی روز سے گردش کر رہی ہیں۔“ اس کا انداز مضحکہ خیز تھا۔

”کیسی خبر۔؟“ قائل کرتے ہاتھ لمحے بھر کو رکے تھے۔

”نہی کہ فیصل بھائی تمہارے عشق میں دیوانے ہو گئے ہیں۔“ لہجہ میں طنز تھا۔

”میرے عشق میں تو اور بھی لوگ دیوانے ہیں۔“ کائنات نے ایک معنی خیز نظر حنا پر ڈالی تو اسے ایسا لگا جیسے اس کا دل گتے بھر کے لیے تم گتیا ہو۔

”کیا تم اس رشتے سے خوش ہو؟“ حنا کی نظریں اس کے کپکپاتے ہاتھوں پر ٹکی تھیں جسے اس نے نرمی سے تمام لیا تھا۔

”مجھ سے زیادہ لہلہ خوش ہیں۔“ اس نے مختصراً کہہ کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

”طبعی تم خوش نہیں۔“ حنا سے نظروں ہی نظروں میں کہہ رہی تھی۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

مضمون

عمرہ احمد

ہو گئی۔

جہیز نہ ملنے کا غم نہ ہوتا تو شاید میں ذرا سا صبر کر لیتی۔ ہاں شاید مجھ سے سوائے سچی محبت کے اور کسی کو کچھ نہ ملتا تھا۔ نہ دل و دولت سے پر جہیز نہ قیمتی آرائشیں۔ میں سچ مجھ دار میں نہ کھڑی ہوتی تو شاید ذرا سا صبر کر لیتی۔ اگر وہ مفاد پرست نہ ہوتا تو۔

”مختار“ دونوں نے کمرے کے دروازے کی جانب ایک ساتھ مڑ کر دیکھا۔ تللی امی چالنے کی ترسے تھامے تھاکو پکارتے ہوئے اندر داخل ہو رہی تھیں۔
”تمہارے لیے سوسے مل کر لائی ہوں۔ کل ہی

اس کا مزید بیٹھنا محال ہو گیا۔ وہ اپنے من میں ہوتے بیروں کو ٹھٹھکی ہوئی بیرونی دروازے کی جانب بڑھی۔ سن ہوتے دلگ اور مفلوج جسم نے اس کی قوتیں چھین لی تھیں۔

بنائے تھے۔ اب مٹھائی تو ہے نہیں یہ سوتی کا حلوہ بنا کر لائی ہوں۔ لو کھاکے منہ بیٹھا کر لو ان شاء اللہ کل مٹھائی کا ڈیالے کر خود آؤں گی۔ تمہاری امی کا بھی اپنے ہاتھوں سے خود منہ بیٹھا کر لوں گی۔ وہ خوشی سے نہل ہو کر سوچی کا حلوہ چمچے بھر کر اس کے منہ میں ڈالتے ہوئے بولیں۔ ”تتا تللی امی کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی تو وہ پھر بولیں۔

”مختار بیٹا۔ کدھر چل دیں۔ روکو تو سہی۔ میں نے برائی مٹھائی ہے کھاکے جانا۔“ تللی امی نے اسے جلتے دیکھ کر پکارا۔

”لو بتاؤ بھلا۔ خوشی میں مٹھائی کا سبب تو بتایا ہی نہیں۔ فیصل ہے نا اس نے رشتہ بھیجا تھا۔ ابھی ان کا پھر جواب مانگنے کے لیے فون آیا تھا اور میں نے ہاں کر دی ہے۔ بس اب اللہ جلد اس فرض سے مجھے سبکدوش کر دے گا۔ پھر فیصل کہہ رہا تھا کہ ہم سب شادی کے بعد عمرے پر جائیں گے۔ پڑائیک بچہ ہے۔ ہماری سفید پوشی کا احساس ہے اس کو۔ شادی کے سارے انتظامات فائبر اشار ہو مل میں خود ہی کر لے گا۔ بڑی نصیب والی بچی ہے میری کائنات۔“ وہ پیار سے کائنات کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بول رہی تھیں پھر جو لمے پر سر بھی بڑھایا دیکھنے کی خاطر محذرت کر کے اٹھ گئیں۔

”بس چلتی ہوں تللی امی بیو کے سے کاشف بھائی کا فون آنے والا ہے۔ امی نے گھبراہٹیں جلدی آنے کا کہا تھا۔“ بھائی کا نام لیتے ہوئے اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ جھکی نظروں سے وہ زمین کو تلکے جارہی تھی۔ سرری طرح چکرا رہا تھا۔ وہ جلد اس ماحول سے بھاگنا چاہتی تھی۔ لیکن قدموں نے زمین تھام لی تھی۔ ”چلو اچھی بات ہے“ میری طرف سے پوچھنا۔ کاشف بیٹا ٹھیک تو ہے نا۔ جب سے وہاں شادی کی ہے آیا ہی نہیں۔ چلو خیر ہے۔ امی سے کہنا مٹھائی لے کر آؤں گی۔“ وہ اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ اندر بیٹھا مفاد پرستی کا بت چخ چخ کر اس کے وجود کو بھنجوڑ رہا تھا۔

”مبارک ہو کائنات۔ کروڑ پتی کی بیگم بننے جارہی ہو۔ ویسے معاف کرنا فیصل بھائی میں سوائے دولت مند ہونے کے۔ کوئی اور خوبی ہمیں نظر نہیں آتی۔ محض جہیز نہ دینے کی خاطر۔ کس قدر مفاد پرست ہو تم لوگ۔ ذرا سا صبر کر لیتیں تو۔“

مفاد پرست۔ کون۔؟
وہ یا پھر میں۔؟
میرا دل مجھ سے سوال کر رہا تھا۔ ایسا سوال جس کا جواب میرے لب کہنے سے گزرا ہے۔ تھے میرے پاس میرے سوال کا جواب نہیں۔ کیا آپ مجھے جواب دے سکتے ہیں۔

”ذرا سا صبر۔“ کائنات نے اس کی بات کاٹ کر عجیب انداز میں قہقہہ لگایا۔ ”ٹھیک کہتی ہو۔ ذرا سا صبر کر لیتی اگر اپنے عشق میں پاگل کاشف کا انکار نہ ملتی تو۔ شاید ذرا سا صبر کر لیتی اگر کاشف کے گھر والوں کو





اجنبی شام،

دُھند چھائی ہے جھیلوں پر
 اُڑ رہے ہیں پرند ٹیلوں پر
 سب کا رخ ہے نشیمنوں کی طرف
 بیتوں کی طرف، بنوں کی طرف
 اپنے گلوں کو لے کر چرواہے
 سرمدی بیتوں میں جا پہنچے
 دلِ ناکام میں کہاں جاؤں؟
 اجنبی شام میں کہاں جاؤں؟

بحون ایلیا

ہر قدم پر نت نئے سانچے میں ڈھل جلتے ہیں لوگ
 دیکھتے ہی دیکھتے کتے بدل جاتے ہیں لوگ

کس لیے کہیے کسی گم گشتہ جنت کی تلاش
 جب کہ مٹی کے کھلونوں پہل جاتے ہیں لوگ

اپنے ملتے ملتے سیریز ڈھلے آہستہ خرام
 جلتے کس منزل کی جانب آج کل جلتے ہیں لوگ

شیخ کی مانند اہل انجن سے بے نیاز
 اکثر اپنی آگ میں پُپ جاپ بل جاتے ہیں لوگ

شاعران کی دوستی کا اب بھی دم بھرتے ہیں آپ
 ٹھوکریں کھا کر تو سننے میں سنبھل جاتے ہیں لوگ

حمایت علی شاعر

ہم چراغِ یقین جلاتے رہے
وقت کو راستہ دکھاتے رہے

زندگی کتنی مختلف تھی مگر
ہم تیرے ساتھ مسکراتے رہے

ہم تیری راہ سے پھرے ہی نہیں
آستانے ہمیں جلاتے رہے

جو تیرے عشق کی امانت تھی
دل سے اب دوڑ گئے بھی جلاتے رہے

زندگی اتنی دل فریب نہ تھی
تم مگر مجھ کو یاد آتے رہے

جانے کس دھن میں عمر بھر قابل
مغفل آرزو سجاتے رہے
قابلِ اجیری

آسماں بھی رہگذر، حدِ سفر کچھ بھی نہیں
اب زماں ہو یا مکان، پیشِ بشر کچھ بھی نہیں

سوچے تو زندگی کی داستاں بھی ہے یہی
دیکھے تو ماحصلِ رقصِ شر کچھ بھی نہیں

لفظِ دل سے کٹ چکے، دلِ درد سے ماکا ہوئے
کتنی پر لطف ہیں تقریریں، اثر کچھ بھی نہیں

وقتِ آخر، دم بخود ہے باغبانِ کہنہ مشق
ہیڑ تو کتنے لگا ڈالے ثمر کچھ بھی نہیں

عشق، حیرت، سرفروشی، زندگی، شرمندگی
جو ہے پہلی بار ہے بارِ دگر کچھ بھی نہیں

آدمی کی بے کراں آزادیوں پر بندشیں
سرحدیں، قویم، علاقے، شہر، گھر کچھ بھی نہیں

عمودِ شام



یوحنا۔ کیا آپ صبح کی سیر کرتے ہیں؟
 کہنا تو نہیں۔ اللہ آپ کو بھیجے کرنا ہوں گل سے
 میں اپنے سیکرٹری کو میرے لیے بھیج دیا کروں گا؟
 نمبر، اتوار۔ کراچی

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،
 سب سے بہتر مل ہے کہ تم فریاد اور مساکین کو کھانا
 کلاؤ اور ہر شخص خواہ شہناسا نہ ہو اسے سلام کرو۔
 (بخاری)

ٹی وی چینلز

ایلیس کے چنڈ چیلے جب اس کے پاس آئے تو دیکھا
 کہ وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھا سگاری دہانتا۔ چیلوں نے
 تشویش کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔
 ”کیا بات ہے آج کل آپ نے شیطان کی سرگردمیوں
 سے کنارہ کشی اختیار کر رکھی ہے، کیس آپ کی صحت تو
 نہیں جواب دے سکتی؟“
 یہ سن کر ایلیس نے ہتھیر لگایا اور بولا۔
 ”تشویش کرنے یا گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔
 آج کل میں نے اپنا سارا کام ٹی وی چینل پر کر سونپ
 دیا ہے“
 خدا نامہ۔ اقصیٰ نامہ۔ کراچی

عظیم ماں

تھامس ایڈلین مشہور عالم سائنس دان جب بچہ تھا،
 وہ اسکول سے آیا اور ایک سرسبز لقا قادیانی والدہ کو دیا کہ
 استاد نے دیا ہے کاشی ماں کو دوسے دو۔
 ماں نے کھول کر پڑھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے
 پھر اس نے یہ آواز بلند کر رکھا۔
 ”تمہارا بیٹا ایک جینس ہے، یہ اسکول اس کے لیے
 بہت چھوٹا ہے اور اتنے چھے استاد نہیں کہ اسے پڑھا
 سکیں، سو آپ اسے خود ہی پڑھالیں“
 سائلوں پر جب تھامس ایڈلین ایک سائنس دان
 کے طور پر مشہور عالم ہو گیا تھا اور والدہ وفات پا چکی تھیں۔
 وہ اپنے خاندان کے پرلے کا فزات میں کچھ ڈھونڈ رہا
 تھا کہ اسے وہی خط ملا۔ اس پر لکھا تھا۔
 ”آپ کا بیٹا اتنی سائنسی ذہنی و ذہنی ناکام ہے۔ چاہے
 مزید اسکول میں نہیں رکھ سکتے“
 اس دن ایڈلین نے ڈائری میں لکھا۔
 ”تھامس ایڈلین ایک ذہنی ناکارہ بچہ تھا پر
 ایک عظیم ماں نے اسے صدی کا سب سے بڑا سائنس دان
 بنا دیا“

ربیع الثانی

ربیع الثانی اسلامی سال کا چوتھا مہینہ ہے۔ اسے
 ربیع الآخر کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔
 ربیع الآخر کو اس نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ
 بیان کی گئی ہے کہ جب اس مہینے کا نام رکھا جانے
 لگا تو یہ فصل ربیع یعنی موسم بہار کے آخر میں آیا۔ اس بنا
 پر اس کا نام ربیع الآخر یا ربیع الثانی رکھ دیا گیا۔
 ایک وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اسلام سے قبل
 کی عرب تاریخ میں اہل عرب ربیع الاول اور
 ربیع الثانی دونوں مہینوں میں اپنے گھروں میں قیام

انٹرویو

موسیٰ حارث سے ایک اخبار نویس انٹرویو لے رہا
 تھا۔ دوسرے بہت سے سوالات پر بچنے کے بعد اس نے

کرتے تھے۔ چنانچہ پہلے ہی سے کور بیع الاول اور دوسرے کور بیع الثانی کہا جانے لگا۔
صدف عمران کے ڈی اے سوسائٹی

واصف جنیال

محبوب کی جنما بھی کسی عیب کو ترک و فایر مجبور نہیں کرتی۔ حاصل وفا ہوتی ہے بے وفا ہی کے لیے۔
ادام جس ذات کی لغات کے لیے اپنی ذات کی نمانگ بھی گوارا کرتے ہیں۔ وہی محبوب ہے۔
قال افضل نعمن۔ لا ہود

صحبت مند بڑھاپے کا لازم
ایک صحبت مند خوش حال بوڑھے سے پوچھا گیا۔
"آپ نے جنوں سے پاک صحبت مند بڑھاپا کیسے پایا؟"
"اے تو اس نے جواب دیا۔

"میں نے کبھی اپنے گھر والوں اور تعلق والوں سے ناواحنی اور غصے کو دل میں نہیں رکھا اور کبھی اپنے سے زیادہ مرتبے والے پر حسد نہیں کیا اور نہ کسی کے نقصان پر کبھی خوشی منائی"

(خواتین کا اسلام)
عائشہ انصاری۔ حیدرآباد

دانش فرنگ

۱۔ مبر کرنے والے کے غصے سے ہمیشہ فائدے رہتے رہتے رہتے۔
(جان فدائی دین)
۲۔ ماسر وہ شخص ہوتا ہے جو چھوٹی چھوٹی غلطیاں نہیں کرتا بلکہ بڑی بڑی غلطی کرتا ہے۔
(عجم سٹال برگ)

۳۔ عظمت کی طرف کوئی پھولیں مبرا لاتے نہیں جاتا۔
(فونین)
۴۔ زندگی کا مقصد مسرت نہیں بلکہ تکمیل انسانیت ہے۔
(ہیگن)

۵۔ پرانے خطوط پڑھنے میں مزا اس لیے آتا ہے کہ ہمیں معلوم ہوتا ہے ان کا جواب نہیں دینا پڑے گا۔
(لارڈ ڈیٹرائن)
۶۔ دلے سوراٹا احب۔ فیصل آباد

کاش

میری دنیا کاش تک محدود ہے
لفظ کاش
ایک ایسا بزدل ہے
جو کاش تک
اپنے فہر پھیلاتا ہے
اور میری زمین خواہش پر
اپنا سایہ رکھتا ہے۔

مغزور

اگر ظرف نہ ہو تو عطا انسان کو مغزور بنا دیتی ہے۔
(دعاف علی واصف)
عائشہ۔ گومرہ

کنجوس

اسکاج کے لوگوں کی کنجوس مشہور ہے۔ بی بی سی کے ایک ذہنی آزمائش کے پروگرام میں سوال کیا گیا۔
ایک اسکاج جو ٹاٹا ہیرل کے ایک کمرے میں مقیم ہے۔ صبح جب شوہر کی آکھ کھلتی ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ اس کی بیوی مریگی ہے۔ بتائیے اس صورت حال میں اسکاج شوہر سب سے پہلا کام کیا کرے گا۔ وہ پولیس کو فون کرے گا یا مردہ دفن کرنے والوں کو طلب کرے گا یا...؟

"جناب! وہ سب سے پہلے ہوش کے منبر کو فون کرے گا"
"کس مقصد کے لیے اور کیا بیقیام دے گا؟"
"صبح کا ناشتا صرف ایک شخص کے لیے لے آئے"
"جناب صبح ہے لیکن آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟"
"میں خود ایک اسکاج ہوں"
شایین رضوان۔ کراچی

(سعد اللہ شاہ)
وشال فرمان کراچی

امریکہ

بڑا منفرد مزاج ہے یہ امریکہ
بزرگ شیخ سب کو برابر پیار دیتا ہے
کسی کو حملہ کرنے کے لیے دیتا ہے میزائل
کسی کو ان سے بچنے کے لیے رعداوردیتا ہے
افشال زین - کراچی

شرم تو نہیں آتی،

تہران کی ایک سڑک پر ایک خوبصورت خانم جا
رہی تھی۔ ایک ایرانی نوجوان نے اس کا ہاتھ شروع کر
دیا۔ خانم کو بہت غصہ آیا اودھہ پیچھے مڑ کر بولی۔
"شرم تو نہیں آتی ایک ایسی دویشہ کا ہاتھ چاکرے
ہوئے جس کا نام گوگوش ہے اودھہ آقا فخریوں کی
بیٹی ہے اودھہ کا بیٹی لون نمبر... ہے اودھہ تہران
کے حملہ کوہ گراں میں رہتی ہے۔ گزرا سائیکل - کراچی

لا جواب،

جب بھی لیتا ہوں پڑھنے کے لیے کوئی کتاب
نہیں آجاتی ہے فی العود مجھے خانہ خراب
خوبیاں یوں تو سیس میں ہیں موجود کسی
نہیں لانے میں نہیں اس کا منہ کوئی جواب
پر ستر تنوئی اکرم - کراچی

آنسو

ہم کسی طرح کا بھی ہو
ہر انسان کے آنسو ایک سیسے ہی ہوتے ہیں
(واصف علی واصف)
صبا ارشد - حیدرآباد

سورج کے درکھلے،

کسی کام میں مصروف آدمی سے مشورہ نہ کرو، خواہ
وہ کتنا ہی عقل مند ہو، جو کہ مشورہ نہ کرو
خواہ وہ کتنا ہی بوجہ دار ہو، نہ خوف زدہ سے خواہ
اس کی بیزخواری پر تمہیں مکمل اعتبار ہی کیوں نہ ہو۔
چلاک اودھو شیاؤ نہیں کرواؤں سے نقصان پہنچا
ہے جہاں سے وہ بے فکر ہوتا ہے۔
افشال زین - کوہنگی

جہان،

جب آپ کسی انسان کا مزاج پرکھنا چاہیں تو اس
سے مشورہ لیں۔ آپ اس کے مشورے سے اس کا
انصاف، علم، نیکی اور بدی سب جان جائیں گے۔
ودیشہ زین - تجربہ مارکیٹ

ترکیب

بیگم بیگم! لڑکا پیسے اڑانے لگا ہے۔ جہاں
چھپاتی ہوں ڈھونڈ لیتا ہے؟
میاں - بیگم کی کتاب میں رکو دو۔ امتحان تک
نہیں ڈھونڈ پانے گا؟
ابراہیم شکیل، شفقت ٹیلن

وجہ

دو مکینک گاڑیوں کے بارے میں تبادلہ خیال کر
رہے تھے۔ ایک بولا۔
"تمہیں گاڑیوں کی سیٹوں پر چڑھنے کے کوہا چھے گلے
ہیں یا کپڑے کے؟"
"کپڑے کے؟" دوسرے مکینک نے جواب دیا۔
چڑھنے کے کوہ پراقتہ اچھی طرح صاف نہیں ہوتے؟
شاہینہ عارف - اودھنگی ٹاؤن

شان قدرت،

اللہ تعالیٰ اہمیت دکھا دیتا ہے ہر شے، ہر محنت
کی پھر وہ سب کچھ دکھا کر آدمی سے کہتا ہے اب بتا
تیرا میرے سوا اودھہ ہی کون؟
رازیہ بٹول - محمودی

حالی کی طواری

تسليم شريف

حکے ڈاڑھی سے

دل کی طاعنات و دغائے پر یکساں اثر انداز ہوتی ہے
مضطرب پیشگی بے بسی کو کیا ہی حسین لفظوں سے
سجایا ہے۔ غالب کی شاعری کا حق ادا کر دیا ہے۔

شاعری کی دنیا محض تخیل اور خیالی خیال کی
دنیا ہوتی ہے۔ مبالغہ آمیزی تو بس شاعرانہ رسم ہوتی
ہے مگر کہ سو دانی ایسے بھی ہوتے ہیں جو یہاں بھی نکال دینے
سے نہیں چھوکتے۔ خواہ ان پر شادی ہو نہ کہ تہمت ہی
کیوں نہ لگ جائے۔ پلیں جون ایلیا کو بڑھتے ہیں۔

بات کرتی مجھے مشکل کبھی یا ایسی تو نہ تھی!
جیسی اب ہے تیری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

لے گیا ہمیں کے کون آن تیرا صبر و قرار
بے قراری تجھے لے لے دل کبھی ایسی تو نہ تھی

ایک ہی مژدہ صبح لاتی ہے
صحن میں دھوپ پھیل جاتی ہے

چشم قاتل میری دشمن تھی ہمیشہ لیکن
جیسی اب ہو گئی قاتل کبھی ایسی تو نہ تھی

کیا ستم ہے کہ اب تری صورت
خود کرنے پہ یاد آتی ہے

اس کی آنکھوں نے نہرا جانے کیا کیا چارو
کہ طبیعت میری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

سوچتا ہوں کہ اس کی یاد آخر
اب کسے لات بھر جگاتی ہے

کس رخسار نے کس کے ہے تجھے چمکایا
تاب تجھ میں جس کا کبھی ایسی تو نہ تھی

اس وفا آشنا کی فرقت میں
خواہش خیر کیوں سنا تی ہے

پلٹے کو باں کوئی زرداں میں نیلے مجزل
آئی اعاز سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی

کون اس گھر کی دیکھ مجال کرے
روز اک چہ نہ ٹوٹ جاتی ہے

کس سبب سے تو بگڑتا ہے فقر سے ہر باد
تو تیری خود شامل کبھی ایسی تو نہ تھی

شما جو ریہ

حکے ڈاڑھی سے

سانو، آسنہ، ارم نفاظ

حکے ڈاڑھی سے

احساسات کی دنیا ایک عجیب دنیا ہوتی ہے۔
زندان و مکان کی قد سے آزاد اور جب شاعر لفظوں
سے اس میں رنگ بھر دے تو عجیب مرقعات دست
کی کیفیت ہوتی ہے۔ آخری مقل تاہم بارہادشاہ ظفر
کی اس منزل سے آغاز ہوتا ہے کہ بادشاہ ہو کر گدا،

آج کل کی کہا کبھی اور بھاگتی دونوں زندگی میں
اتنی ہی ذہنت نہیں کہ لے بھر کر انسان خود سے ملے
اور کبھی جب ایسا کلمہ میسر آتا ہے تو انسان ششدر
رہ جاتا ہے۔ ایسے ہی جذبات کو سیدہ نسیم الدین

نے خواہشوں انداز میں تحریر کیا ہے۔

بھیڑ میں خود سے ملنے کا گانا،
 لوگوں کی بھرپور جلی پاؤں چلتے ہوئے
 خود کو تلاش کر رہا ہوں
 شاید تیزی سے مرگ کے کنارے چلتے ہوئے
 کوئی لمحہ سے ٹکرا جائے
 اور سواری کہتے ہوئے
 جب نگاہیں چاروں طرف تو
 چاروں آکھیں میری ہوں

حنا

بچوں کا اپنا ہنامہ

لاہور

مارچ 2016 کا شمارہ شائع ہو گا ہے

مارچ 2016 کے شمارے کی ایک جھلک

☆ "ایک دن حنا کے ساتھ" میں ڈاکٹر ناز امین

اپنے شہزاد کے ساتھ

☆ "میرے ہرجائی" قصہ ہذا کے مکمل ناول،

☆ "کس کے ہاتھ پر لہلاش کروں" صفا عاز

مکمل ناول

☆ "وفا اور الفت" طرح نوری کا ناول

☆ "سات بھگوتے" شہزاد کا ناول

☆ "دلی گڑبڑ" اہرم کا ناول

☆ "پہلویت کہہ اس پار کھین" ناز عاز

کا ناول

☆ "ایک جہاں اور وہ" سہیل

کا ناول ہے انعام کا طرف کارن

☆ "مادامان مینڈا، میرا دشمن، قاتلستان"

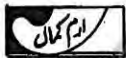
بخت عا اور خانہ حرکت کے ناول



پہا رہے نہیں گنتی کس پہا ری ہا تیں، انشاء تا کہ اور
 وہ تمام مستقل سلسلے جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں

مارچ 2016

شمارہ نویں ہے
 پناہ سے تاب کر



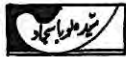
کئی ڈائری سے
 میری ڈائری میں تحریر حسن نقوی کی یہ غزل
 جس کی تڑپوں جادو کر دینے والی ہے، ساپ سب
 قادر بن ہوں گے لیے۔

حال مت پر پھر عشق کرنے کا
 عمر بچنے کی شوق مرنے کا

وہ عبت کی احتیاط کے دن
 ہائے موسم وہ خود سے ڈرنے کا

اب اُسے آئینے سے نفرت ہے
 گل جیسے شوق تھا ستورے کا

عمر بچنے کے مذاق سے مشکل
 ایک لمحہ سوال کرنے کا



کئی ڈائری سے
 کچھ جذبے پورے ہونے کے بعد بھی ادھر سے
 رہ جاتے ہیں سنگراں کے ادھر سے ہونے میں بھی
 بہت بات ہے۔ جیسے یہ غزل ادھر سے جذبوں
 کے ساتھ لوری ہے۔

خدا اب یہ زمانہ شروع سے ہم پر ہنسے لیکن
عجبت کو خدا بخشے کبھی دن تھے ہمارے بھی

معتہ ابھی مجاب سے آگے نہیں گیا
میں آپ وہ جناب سے آگے نہیں گیا

کسی ڈائری سے

اسبرنگ

انتخاب کے لیے بہت سی نظریں غزلوں میں سے
کسی ایک کو چنے ہوئے شہوت میٹر کی یہ غزل اپنے
حالات سے مخالفت کرتی تھی تو دل چاہا کہ آپ سب
قاریوں کی ندرت کی جلتے

سر منزل بھی ہم تو بے اختیار - مٹھے
بہت سنبھل کے پلے پھر بھی بے اختیار مٹھے

خود پلنے سے اپنی بات کہہ کر ہنس دینا
بھی اپنے لادول، ہم ہی ہم گسار مٹھے

لٹ گئے دنیا والوں کے ہاتھوں ہم بھی
اور رملنے کی نظر میں ہم بہتہ ہوشیار مٹھے

کبھی جانا تو بھی آجڑے دیاروں میں
مکمل ہے کہ فضل غزیاں منقبذ مٹھے

میرا اعتبار تو ناوے نو، یا کنارہ کش ہوا
ایسا نہ ہو نخل امید پہ فصل بے اختیار مٹھے

وہی عام سی میں، وہی عام سی خلیاں میں
میں نے بھی کب چاہا تھا کہ موسم اشکبار مٹھے

مدت ہوئی کتاب عجت شروع کیے
لیکن میں پہلے باب سے آگے نہیں گیا

لمبی مسافتیں ہیں مگر اس سوار کا
پاؤں ابھی رکاب سے آگے نہیں گیا

طول قلم کے واسطے میں نے کیا سوال
وہ مختصر جواب سے آگے نہیں گیا

مدد محرومین

میری ڈائری میں تحریر غبار بارہ بگوری کی یہ غزل
ان لوگوں کے نام عجت جن کو تھی دامان کر دی
ہے۔

انڈھیری رات تھی تو چاند بھی تھا اور تارے بھی
میری آنکھوں نے دیکھے ہیں غم کے لیے نظارے بھی

کوئی عیش و مسترت کے طلب گاروں سے کہہ دینا
کہ گردے تھکان ہی راہوں پہ پہلے غم کے مارے بھی

عجت سے الگ رہنا ہی بہتر حضرت ناصح
مگر اکثر سینے ڈوب جاتے ہیں کنارے بھی

دل و جاں تجھ پر مدتے میرے آسو پونچنے والے
مگر آنکھوں کو پھونکنے والے دہریوں بکھر مارے بھی

سچہ میں کا تھی ارباب عجت کی یہ آجائے
کہ دل کے ٹوٹے ہی کوٹ جلتے ہیں ہمارے بھی

وہ کیوں جانیں بھلا جن کے لیے فردوسی ہے دنیا
کہ اس فردوسی میں آباؤں کو ہم کے مارے بھی





سیدہ لویا سجاد کمر وڈپٹا
 دل وہ نگر نہیں جو پھر آباد ہو سکے
 ہچمتاؤ گے سستو یہ بستی اجاڑ کے
 شمر جاوید بسم اللہ پور
 ہم نے ہی مانگا تھا، اُس نے ہی منگنا تھا
 سیدہ ہو تو ایسا ہو، طاقا ہو تو ایسا ہو
 گزیا راجپوت جاتری
 اس کے سب جھوٹ سچ سبھی حسن
 شرط اتنی ہے کہ وہ بولے تو سبھی
 ملائکہ کوثر بسم اللہ پور
 سات سروں کا ہستا دیا تیرے نام
 ہر سر میں رنگ دھنک کا تیرے نام
 جنگل جنگل میں دوڑنے والے سب موسم
 اود ہوا کا سبز دوپٹہ تیرے نام
 سدہ نازی دُعا کسودال
 بہت فرسودہ گتے ہیں مجھے اب پیار کے قفے
 گل و گلزار کی بائیں، لب و درخشا کے قفے
 جیلا عشق و محبت سے کسی کا پیٹ بھرتا ہے
 سُنو تم کو سنا تا ہوں، میں کاروبار کے قفے
 آمنہ عابدہ تحریک
 بر باد یوں کا جائزہ لینے کے واسطے
 وہ پوچھتے ہیں حال میرا کہیں بھی
 فریو شہیر شاہ نکلند
 آتسو ہسا ہسا کہ بھی ہوتے نہیں کم
 کتنی امیر ہوتی ہیں آنکھیں عزیز کی
 کراچی
 فاکہ سہیل
 زمیں پر وہ کے ستارے شکار کرتے ہیں
 مزاج اہل محبت کا آسمانی ہے

نور قطب کراچی
 کسنا رہ دوسرا دیا کا بیسے
 وہ ساتھی ہے مگر قلم نہیں ہے
 نوال افضل گھن لاہور
 اود ضمانت وفا کیا ہوگی
 تم میری سانس گروی دکھ لو نا
 عتیقہ علوی لاہور
 میرا یہ وجود ہر کم سے کم
 کہیں دیت پر کسی قہقی سا
 تو بیٹائے تو میں بنتا کروں
 تو منائے تو میں بٹا کروں
 پاکیزہ اجمی لاہور
 جیا کا دس بیسے شامل نقاب دیا
 میں حرف حرف بکھر گئی اک کتاب دیا
 شائستہ اکبر گدڑ کالونی
 کل دیکھا تھا اک آدمی، انا سگری و حول میں
 تم تھا اپنے آپ میں، جیسے خوشبو پھول میں
 اقرصادق بہاول پور
 تمنا بچ گئی ہو تو دُعا مانگی نہیں جاتی
 رتوں کی بے ثباتی سے صبا مانگی نہیں جاتی
 یہ اپنی بے بسی ہے یا اب بے بسی کہہ لیں
 بلا کا جس ہے لیکن ہوا مانگی نہیں جاتی
 سحرش خان بھٹو کراچی
 ہم نے کب اس کو نہ چاہا عین
 ہم نے کب قول نہ مانے دل کے
 گزیا شاہ کمر وڈپٹا
 ہر حقیقت فریب گنتی ہے
 جب کوئی اعتبار کو بیٹھے

نمزہ اقرار
ان تہمتوں کی گونج تھی جو گونجتی رہی
اک دل کا شور مچتا جو سنا تک نہیں گیا
ذوال افضل گھن
عبت کی طبیعت میں جب تک لڑائی تھی ہے
کہ یہ اقرار کے غفلوں کو سنبھالنے سے نہیں ہٹتی
مدد کو فریاد دیکھ
= جب تمہاریس میں تیری دہیز میں گزراں
نہ ہوا کہ مریشیں ہم نہ ہوا کہ جی آنکھیں ہم
لوسی تھی پہاڑی لہلہ پھرے ہیں دل کو چھلے
دی گوروش نفس ہے وہی فعل عمل کا نام
شاید عارف
اُس سے پھرتا تو آنکھوں کا مقدّم مشر
دل کے پاناں میں تاج بست ہو کا عالم
ذوال فرمان
شود کرتی ہے جب بھی خاموشی
بیشتر میں جا کہ بیٹھ جاتا ہوں
مذرا نامہ واقعی نامہ
اُس کو دیکھے سال ہونے ہیں
سارے خواب حیاں بھٹے ہیں
موسم پھر برسات کا آیا
سارے درد بھان بھٹے ہیں
فرید حنیف
میر اب بھی مان لے تو مقدّم کی حقیقت
جو ہے وہ بھی مزدی ہے جو گداوہ بھی مزدی
مادری
نہ لوجھو عہد اُلفت، ہیں اک خواب پریشان تھا
نہ دل کو راہ پر لائے، نہ دل کا مدد ساجھے
حدین زینب
ترا لطف و رحمتیں، نہ قرار شرح غم سے
کہ ہیں دل میں وہ جیسے بھی جو مال تک نہ پہنچے
سیدہ نسبت ذہرا
قسم تمہاری بہت غم اُٹھا چکا ہوں
غلط تھا دعوا صبر و تکلیب، آجاؤ

گڑیا خاہ
غم عاشقی تیرا شکر ہے
میں کہاں کہاں سے گزرا گیا
گھیلانی سسٹرز
میری مسرا کو دانا تو خیر ممکن ہے
مگر حیات کی لنگار کون دے کے کھا
فصیل آتش و آہیں بہت بلند ہی
بدلتے وقت کی رفتار کون دے کے
فرزادہ منتقل
کچھ سفر ایسے ہوتے ہیں جس میں
پاؤں نہیں دل چمکتے ہیں
ساجدہ شہزاد
کب نظر میں آئے گی بے داغ برسنے کی بہار
خون کے دھچکے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد
دل تو پا جا پڑے تمکنت دل نے بہت ہی نہ دی
کچھ گئے شکر ہے بھی کر لیتے مٹا جاتوں کے بعد
مسرت اسلم، فرحت اشرف گھن
تھے بہت بے درد بے غم درد عشق کے
تیس بہت بے مہر میں مہرباں راتوں کے بعد
ان سے جو کہنے گئے تھے فین جاں صدقے کیے
اُن کہی وہ تھی وہ بات سب باتوں کے بعد
انجل
اب میر نہیں فرمت کے وہ دن رات ہیں
نے اُڑی جلتے کہاں مہر صر حالات میں
کیسے اڑتے ہونے لہوں کا تعاقب کیے مابش
دوستی اب تو یہی نگر ہے دن رات، ہمیں
سیدہ حارثہ
تمہارے بعد وہ لے بھی بار بار آئے
خود اپنے آپ کو دیکھا تو ڈر گئے ہم بھی
بس ایک وقت کے بیٹے میں بس گئے دونوں
کہاں تھی صحبت، کہاں گئے ہم بھی



مارچ 2016
کے شمارے کی ایک جہت

بہنوں کا
شعاع
آینا ماہنامہ



مارچ 2016
شمارہ نمبر
ہو گیا ہے

To Download visit
paksociety.com

ۛ "محبت مارچ کا موسم" ساغر رضا کا مکمل ناول،
 ۛ "محبت ماگتی ہے گواہی" فردانہ کول کا مکمل ناول،
 ۛ "ذمے خیر ہوں میں" ام ایمان قاسمی کا مکمل ناول، ۛ ہاملا حیات فنکارہ "مانڈی لوز" سے ملاقات،
 ۛ رشانہ گارعدان کا سلسلے دار ناول "ایک تھی مثال"، ۛ "جب تھو سے ناتا جوڑا ہے" قارئین کا سلسلہ،
 ۛ نیلہ عزیز کا سلسلے دار ناول "رقیب کیل"، ۛ معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ "دستک"،
 ۛ "بیارے نمی بختگی کی بیاری باتیں" امداد بی بی بختگی،
 ۛ "سپاہ حاشیہ"،
 ۛ "ساز یہ مجال طارق، امت اعجاز شفران، سدرہ حیات، ۛ محلا آپ کے مسکرائیں، آئینہ خانے میں، کلکتا کی سپ،
 نادیہ صدیقی، بخت مگر اور مانڈی لوز کے افسانے، موسم کے کچان اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،
 شعاع کا شمارہ پڑھ کر اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا، ہم منتظر ہیں۔

شعاع کا مارچ 2016 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

READING
Section



ہی بہت اچھا لکھا۔ ہمیں پوری توقع ہے کہ مریم فرزانہ اور سعیدہ کا آگے چل کر بہترین لکھنے والوں میں شمار ہوگا۔ سعیدہ ہمارے پاس آپ کا ایڈریس نہیں ہے۔ اپنا ایڈریس بھجوائیں تاکہ آپ کو اعزازیہ بھجوا سکیں۔

سعیدہ عبد الجبار۔ میرپور خاص سندھ

جب میں نے ہوش سنبھالا تو اپنے ارد گرد اس کو پایا، وجہ یہ کہ میری والدہ کو مطالبہ کا بہت شغف ہے۔ ”عہد الست“ نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ میں تمہ دل سے تزیلہ ریاض کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے بہترین الفاظ میں شاندار عنوان پر قلم اٹھایا اور یورپ میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے واقعات اور حالات سے روشناس کروایا، میں نے اپنی ایم فل کلاس کی پریزنٹیشن کے لیے جب محسن حامد کے ناول کی فلاسفی پر غور کیا تو مجھے ”عہد الست“ کے مطالبے نے بہت متاثر کیا، حقیقت کے سنے دروا ہوتے اور میں نے اپنی پریزنٹیشن میں عہد الست کے ریفرنس دیے تو مجھے بہت پذیرائی ملی اور اس کے لیے میں خواتین ڈائجسٹ کی پوری ٹیم کی ممنون ہوں۔ فروری کا رسالہ ہاتھ میں ہے، سروسق سے خوب صورت ماڈل کی تصویر یہ پچھو دیکھ کے لیے نگاہ چھڑجاتی ہے اور دل سے آواز آتی ہے کیا بھی میری تصویر میں اس کا حصہ بن سکتی ہے تو مدعا کہتا ہے! NO -

نئی سنی سے صحیح معنوں میں مستفید ہونے کے بعد میں نے ”آب کا پلورچی خانہ میں قدم رکھا“ اور چکن آلیٹ سے خود کو بھرپور ناشتہ کروایا۔ ”موسم کے پکوان“ سے بھی زبان کو چٹکارہ دیا اور پھر برے ”نمل“ کی طرف، یعنی نمرواحمہ کے توہم شروع سے مدعاہ ہیں۔ زمر اور اس کی فیملی کا جو آپس میں مدح کا تعلق ہے وہ بہت حیران کن ہے لیکن مجھے ان سوس جین کے کردار کو دیکھ کے ہوتا ہے جو ذہن سے لیکن اس کی زندگی بہت ڈسٹرب ہے اور وہ گھر میں بیچارہ بیٹی دکھائی دیتی ہے۔ اس ناول سے میں نے ہر دفعہ اپنے اندر نئی مدح محسوس کی نمرواحمہ نے قرآن کی تفسیر اتنے سادہ الفاظ میں بیان کی ہے کہ سیدہ حاملہ میں اتر جاتی ہے۔

عمیرہ احمد ”آب حیات“ واقعی آپ حیات کی طرح ہے جس کو بڑھنے کے بعد جینے کی خواہش ہوا سوسے پاک بینک کا جو نظریہ عمیرہ احمد نے پیش کیا ہے وہ ہمارے



ناگزیر محبتوں



خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com

یعنی ملک لاہور

آب لوگ جس طرح مجھے معیار کا ادب ہم جیسی گھر جیسی لڑکیوں اور خواتین تک پہنچا رہے ہیں نہایت ہی قابل تعریف ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے کئی پہلوؤں میں کامیابی اور رہنمائی ان شماروں سے پائی ہے۔

میں آپ کی تمہ دل سے ممنون ہوں، آپ نے میری حقیر سی کوشش ”پردوش“ کو قابل اشاعت سمجھا۔ لب تو زندگی بھر کا ساتھ ہے۔ مجھے بالکل پتا نہیں تھا کہ کہانی چھپنے کے ساتھ ساتھ معاوضہ بھی مل سکتا ہے۔

ج - پیاری بیٹی! امتحان میں آپ کی کامیابی کے لیے دعا گو ہیں۔ ادارہ خواتین ڈائجسٹ نے ہمیشہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ براہ ہم کچھ نئے نام ضرور شامل کرتے ہیں۔ فروری کے شمارے میں مریم لکھن عباسی، فرزانہ کھل اور سعیدہ اصغر نے نام شامل تھے۔ تینوں نے

معاشرے میں رائج ہونا شاید بہت مشکل ہے لیکن اگر ایسا ہو جائے تو یہ ہم مسلمانوں کی بہت بڑی انجیوٹ ہو سکتی ہے۔

باقی تمام کمائیاں ٹھیک تھیں۔ یکسانیت کا شکار محسوس ہوتی ہیں ناجائز کیلنڈر یا بہت پہلے آپ کے رسالے میں ایک مثل ناول چھاپنا "تو تبتی" وہ بہترین تھا اس نظریہ کو میں اپنے کان کے اٹیچر پر پیش کر دیا۔

ج۔ سمجھا آپ نے بہت اچھا خط لکھا ہے۔ اردو بھی آپ کی ٹھیک ٹھاک ہے بس ٹھوڑی سی لفظی محسوس ہوتی۔ کہ صرف دو کمائیاں پر بھروسہ کیا ہے آپ نے کمائیاں میں یکسانیت والی بات سے ہم متفق نہیں کیونکہ پرچے میں جو افسانے تھے اور ان کے موضوعات بالکل مختلف تھے۔ مکمل ناول اور ٹائٹل بھی نہ صرف موضوع کے لحاظ سے بلکہ انداز بیان کے لحاظ سے ابھی مختلف تھا۔

تقریباً ریاض کے عہد است کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے انہوں نے جتنی خوب صورتی سے کہ عورت کا مقام اور مقصد بتایا ہے اور ایک اہم موضوع کو پیش کیا وہ قابل داد ہے۔ ٹائٹل پر آپ کی تصویر لگ سکتی ہے شرط یہ ہے کہ کسی پروفیشنل فنوٹر افر سے بنوائی جائے۔

ایمان جلیانی۔ گاؤں دریا خان جلیانی

میں آپ کے تینوں رسالوں کی نو سالہ پرانی خاموش

قاری ہوں مگر خط پہلی بار لکھ رہی ہوں مجھے پتا نہیں تھا کہ خط لکھتے ہوئے مجھے اتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا مگر میں بہنوں کی تنقید الگ ان کے تبصرے الگ کہ خوش نہ ہو وہ تمہارا خط شامل نہیں کریں گے۔ پر مجھے کسی کی پراہ نہیں کوئی کیا بھی کہے کیونکہ میرے بابا میرے ساتھ ہیں۔ بیشک کی طرح مثل کی یہ قطع بھی شان دار تھی۔ تمہاری با مثل میں تو آپ نے ہمیں سکھو بھی بتایا۔ جب حکین سدھر سکتی ہے تو ہم کیوں نہیں۔"

ج۔ ایمان با آپ کے بابا بھی نہیں ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ اپنی بہنوں کی تنقید اور بہنوں کی پروا نہ کریں اور آئندہ خط لکھیں تو کسی کو بھی پہلے سے نہ بتائیں دوسری بات یہ کہ حرف ایک کمائی پر نہیں بلکہ پورے پرچے کے بارے میں اپنی رائے لکھیں۔

رفتہ رفتہ جین ریمبو۔ کراچی

تلبندہ (حیرہ) کے بارے میں پڑھا بہت اچھا لگا اور ملالہ کی تصویر بہت بری لگی سب سے پہلے اس کی تصویر کو نکال کر جلاؤ! "مثل" کی بات اگر لکھنا شروع کریں تو ختم نہ ہو۔ "ذست جنون" کی خوش نصیب کا کردار مجھے بہت چھانگا۔ "آب حیات" "مشر آشوب" بھی اچھے چل رہے ہیں۔ "راشدہ رفتہ" کا ناول (عہدہ وادی ہادی) میں وادی کا کردار کمال کا تھا پورے ناول کو پڑھتے وقت چہرے پر مسکراہٹ ہی رہی۔ اور افسانے بھی اچھے تھے۔ اور میری اور میری کزنز سونیا کلیم صدف عارفین "فرحت نوید کی طرف سے آپ کو اور آپ کے ادارے کو پر غلوس سلام۔ ج۔ پیاری رفتہ! آپ کو شاہہ پسند آیا۔ بس ہماری محنت وصول ہو گئی۔ مزید ہر ماہ اپنی رائے لکھیں۔ ہم شکر رہیں گے۔ سونیا! صدف اور فرحت کو ہمارا سلام بھی پہنچاویں۔

سین احمد۔ دہری ضلع سکھر

سورق بہت اچھا لگا خاص طور پر ماڈل کی آنکھیں۔ سب سے پہلے "مثل" پڑھا۔ نموا احمد سے پوچھتا ہے کہ ان کے پاس اتنی کم عمری میں ایسا دلچ کاماں سے آگیا۔ مجھے یہ رسالے پڑھتے ہوئے تقریباً 20 سال ہونے والے ہیں۔ اور آج اتنے سوالوں بعد اگر مجھے کسی کمائی کے خاص کردار میں اپنی واضح جھلک نظر آتی ہے تو وہ نموا احمد کے "مثل" کی "حکین" ہے۔ آپنی نموا احمد تک میرا بیٹھام پہنچاؤ جتنے گا کہ پلیز اس کمائی میں کوئی بیوی یا بیویوں نہ بنائیں۔ یہ ایک ٹیبل میں کمائی سے اور پوری کمائی میں ایک ٹیبل کی حدود دکھائی گئی ہے کہ وہ کسی طرح ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں۔ اس لیے اس کمائی کا انجام ابھی ٹیبل والا ہونا چاہیے۔

شمارے کی دوسری جان "آب حیات" میں ہے عہدہ دہی آپ سے کچھ کہتا ہے۔ پہلی بات یہ کہ ناول میں استعمال کیے گئے انگریزی کے الفاظ کا مطلب اگر آپ ساتھ ہی لکھ دیں تو سب کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ ایک اہم بات "مثل" میں نموا احمد جس طرح چھوٹی چھوٹی باتوں کے ذریعے قارئین کو غلط باتوں پر نوک دہی ہیں اسی طرح اگر وہ اس ناول کے درمیان ایسے نکتے کو

نمر و آبی کا شکر یہ ادا کروں۔ میری کزن عظمیٰ صرف دیکھ کر کن کن روشنی پڑھتی ہے مگر "یادرم" کہانی اس نے ساری پڑھی اب وہ کہہ رہی ہے کہ سیمروہی اس کا اگلا حصہ جلد لکھیں۔

بج۔ سید عابد میرا یادرم کا دوسرا حصہ لکھیں۔ یہ ہمارے دیکر قارئین کی بھی فرمائش ہے۔ اب یہ میرا برصغیر ہے کہ وہ یادرم کا دوسرا حصہ لکھتی ہیں یا آپ کے لیے کوئی نئی تحریر لے کر آتی ہیں۔

طاہر گل۔ فادق آباد

کن کن روشنی کے بعد ہم نے سب سے پہلے نعل بڑھا۔ حنہ کو اس کی ٹیچر نے نماز کی اہمیت کا احساس بہت اچھے طریقے سے دلایا۔ یعنی ہماری امی تو ویسے ہی ہماری دھلائی کر دیں نمک مرچ کوٹنے والے ڈنڈے کے ساتھ اگر ایک نماز بھی چھوڑیں تو۔ سعدی یوسف کے ہاتھوں قتل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ نمرہ احمد جی ہم آپ سے ملنا چاہتے ہیں؟ اور عمیرہ احمد جی پلیز میں بھی سالار کو مرتے نہیں دیکھ سکتی۔ "مہشر آشوب" امت العزیز اتنی جلدی نائل کا اختتام۔ وجہ؟ باقی سلسلے اور افسانے بہت اچھے تھے۔

2۔ چلیں طاہر ایسے ایک بات تو بتائیں امی دھلائی نمک مرچ لگا کر کھتی ہیں یا سادہ ڈنڈا ہوتا ہے۔ اور طاہر ہماری تو تمام قارئین سے گزارش ہے کہ بھاری شاعری کو بخش دیں۔ اب اور کیا کہیں۔ نمرہ سے براہ آپ کی ملاقات خواہمیں ذرا دلچسپی میں ہو جاتی ہے یہ کافی نہیں؟ امت العزیز شہزاد کا نائل فطری انداز میں اختتام پذیر

ہو رہا ہے اگر بلاوجہ طویل کیا جاتا تو دلچسپی ختم ہو جاتی۔

ام او ایس۔ کراچی

میں آپ کی توجہ ایک بہت ہی اہم بات کی طرف دلانا چاہتی ہوں۔ وہ بات یہ ہے کہ کچھ راسخزاد اپنے ناولز میں بہتر مرگ پر نزع کے عالم میں اپنے ہیرو ہیروئنز سے اظہار محبت کرواتی ہیں۔ یعنی جیتے جی جو اظہار نہ کر سکیے وہ مرتے دم کر دیا۔ اور یوں ان کے تئیں محبت سرخرو ہو گئی۔ اول تو یہ ناخرم کی محبت کو پروموٹ کرنا ہی نہایت خطرناک بات ہے۔ پھر یہ ناخرم کی محبت کا مرتے دم اظہار کروانا۔ ایک مسلمان کا مرتے وقت کلمہ پڑھنا کتنا ضروری ہے اور

حضرات کے بارے میں بات کر لیں جو عزیزین کاٹوں کی طرز پر مسجد میں لاؤڈ اسپیکر پر فحش پڑھتے ہیں تو بہت اچھا ہو گا۔

خط کاٹنی لبا ہو گیا۔ لیکن آمد ریاض کا نائل "دشت جنوں" آغاز سے ہی بہترین لگ رہا ہے۔

آخر میں ایک قاری بہن "فرحت عباس ضلع جنگ" کے سوال کا جواب دینا چاہوں گی۔ پہلی بات کہ پالی اسٹیل کے برتن میں گرم کیا کریں کیونکہ وہ کالا نہیں ہوتا۔ صرف سلور کا برتن ہی پالی گرم کرنے سے کالا ہوتا ہے میرے خیال سے) تو اگر آپ سلور کے برتن میں پالی گرم کرتی ہیں تو اس کو صاف کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ مجھے بتا ہے کہ آپ اس میں ایک دفعہ پالک اپال لیں۔ (آزاد کو لکھ لیں یہ میرا ذاتی تجربہ ہے) پالی اور کوئی طریقہ مجھے نہیں پتا افسوس۔

اجما جی اب اجازت دیکھا رات زیادہ ہو گئی ہے اسی لیے غلطیاں بھی زیادہ ہو رہی ہیں۔

بج۔ سید! آپ کا خط طویل تو ہے مگر اچھا بھی ہے خصوصاً یہ جو آپ نے لکھا کہ خط بے شک شائع نہ ہو مقصد تو اپنے خیالات آپ تک پہنچانا ہے۔ ہم آپ کے خیالات ہی تو جانتا چاہتے ہیں۔

غلطیوں کا تعلق دن اور رات سے نہیں ہوتا بہت سارے روشنیوں میں رہنے والے دن کے اجالوں میں بھی بڑی بڑی غلطیاں کر جیتے ہیں۔ اور غلطی تو ویسے ہی ابن آدم کی سرشت میں شامل ہے۔ انسان غلطی کرنا ہے۔ نام ہوتا ہے لیکن غلطی پر اڑ جانا البتہ شیطان کی طرف سے ہے۔

نمرہ اور عمیرہ تک آپ کے پیناٹ پیناٹ ہے ہیں۔ عمیرہ کے نائل میں جہاں انگریزی الفاظ کا استعمال ہوتا ہے وہاں ترجمہ بھی ساتھ ہوتا ہے۔

سجیل۔ نامعلوم شہر

میری موست فیورٹ راسخزاد عمیرہ احمد، نمرہ احمد، ساتھ رضا، فرحت اشتیاق، راحت، جبین، فاخرہ، جبین، نمرہ جی اور محرم ساجد ہیں۔ عمیرہ بھی ہنسی کرٹ ہو۔ آپ حیات بھی میں بھی نہیں بھول پاؤں گی اور جس کہانی نے خط لکھنے پر مجبور کیا وہ ہے "نمل" ہر قسط شاندار انٹرنیٹنگ "امپریو" میرے پاس الفاظ میں ہیں کہ میں کیسے

مستحسن ہے۔ ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص بھی اس حال میں مرے کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی کے دل سے شادیت رہتا ہو ضرور جنت میں داخل ہوگا۔ ایک اور حدیث میں ارشاد ہے کہ سچے کو شروع میں جب وہ بولنا کیے گئے تو لا الہ الا اللہ یاد کراؤ اور جب مرنے کا وقت آئے جب بھی لا الہ الا اللہ کی تلقین کرو۔ کیا مسلمان ہونے کے ناطے ہمیں یہ نسب دینا ہے کہ ہم ایسی فیصلہ کن گمراہی میں جب ہمارے سارے قہر و خشکی منائل آتا ہیں اس وقت ایسی راہبیت باتوں میں لگے رہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ مرنے کے بعد کس قدر دشوار گھاٹیوں کا سامنا کرنا ہے۔ قبر میں منکر کبیر کے سوالوں کے جوابات دینا، حشر میں تمام مسلمانوں کا میدان میں جمع ہونا، حساب کتاب دینا، سورج کا سوا نیزے پر ہونا۔ پل صراط کا امتحان کیسی کیسی مشکلات کا سامنا ہونے والا ہے اور ہم اپنی معصوم بچیوں کو کیا کھارہے ہیں۔ اگر کوئی ان تمہارے متاثر ہو کر محبت کو نبی مقصد حیات سمجھ لے تو لکھنے والوں اور چھاپنے والوں دونوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ اگر کوئی بات گراں گزری ہو تو معذرت۔

ج۔ محترم ام اوبس! آپ کی کوئی بھی بات ہرگز ہم پر گراں نہیں گزری۔ آپ نے جو لکھا وہ سچ ہے۔ بہت سی کہانیاں محض تخیل دانی اور افسانوی ہوتی ہیں جن کا حقیقت سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ اور چونکہ انسان حقیقت سے زیادہ خیالوں کی دنیا میں رہنا پسند کرتا ہے۔ اسی لیے ایسی کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ وگرنہ جن حقیقتوں کی جانب آپ نے اشارہ کیا ہے۔ وہ اتنی ہوش اڑانے والی ہیں کہ مرنے وقت انسان کو دنیا کو بھلا دیتی ہیں۔ بحیثیت مسلمان

ہم اور وہ تمام راسخ جو ایسی کہانیاں لکھتی ہیں، وہ بھی ان پر پورا ایمان رکھتی ہیں اور ایسی ہی موت کی تمنائیں ہیں کہ دل و دماغ میں وقت رخصت پروردگار کے سوا کوئی نہ ہو۔ آئندہ اس ضمن میں مزید احتیاط برتیں گے۔

یا سمن فیعمہ مگر انوالہ

اگر عمیرہ جی نے سالار کو مار دیا تو یاد رکھیے گا احتجاج صرف عمران خان کو ہی نہیں کرنا آتا ہمیں بھی کرنا آتا ہے ہم سب قاری نہیں تو جیتے جی ہی مر جائیں گی۔ نمل میں

یہ کیا کیا۔ اب دار اب فارس کو کیوں پسند کرنا شروع ہوئی ہے۔ فار ۲ اور زم رکی نوک جو تکست اچھی لگتی ہے منظر کیا کہ فارس بھی باہر گیا۔ اس لائن کو تو پڑھ کر دلخ سنانے میں آیا اور یہ سو پہلی رات بھی جب سعدی یوسف نے سعدی یوسف کو کھویا تھا۔ اب پلینر سعدی کے ساتھ کچھ برامت سمجھنے کا۔ اور اب بات کرتے ہیں دشت جنوں کی تو ویلڈن آہستہ جی میرا تو دل کرتا ہے آپ کے شام کو دیکھ کر آؤں کیا نظارہ ہو گا اس علاقے کا جس لڑکی کو خنجر سے مارا گیا تھا وہ شاید حوادہ کی بیوی ہی ہوگی۔ یا پھر وہ لڑکی ہی ہو آہوشمنی اور دوسرے جب سے میں نے دشت جنوں کو پڑھا ہے، مجھے بھی دسامہ کی طرح رات کو ڈر لگنے لگا ہے۔ دیسے کوئی تو ہے؟

ج۔ یا سمن! آہوشمنی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ جس طرح جسم روح کے بغیر بے جان ہوتا ہے اسی طرح روح جسم کے بغیر کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتی اس لیے کہ روح ایک غیر مادی چیز ہے۔ اور ابھی تو ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ روح ہے یا کوئی حقیقی لڑکی ہے۔ اس کے پیچھے کیا راز ہے؟ دسامہ تو اس لیے ڈر رہا ہے کہ وہ ضرور اعصاب کا مالک ہے، آپ کو ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ویسے بھی بھوت، دھوس، پریاں یہ سب کہانیاں ہیں۔ آج تک ان کا کوئی ٹھوس ثبوت سامنے نہیں آیا۔

جی ہاں، نروا احمد شادی شمعہ ہیں۔ بہت کم عمری میں ان کی شادی ہوئی تھی۔

مگر یا راجپوت۔ جاتری ننگانہ صاحب

میرے چوتیس پیچیس لیٹرز میں سے تین لیٹرز شامل ہوتے۔ پر بھی یہ نہیں سوچا کہ آئندہ نہیں لکھا۔

کئی بار دکھایا ہے ہمیں آئینہ وقت نے

ڈرتے جو ہار سے ہم بے کار بن کر جیتے

اور ہاں پہلے نو لیٹرز میں سے تو کوئی شامل ہی نہیں ہوا

تھا۔ آج ہی میں نے ستمبر 2015 میں "مگنوں کی پنجر" کے عنوان سے پھونسا انسانہ بھیجا تھا۔ لیکن جواب ہنوز

نہاں ہے۔

ج۔ مگر یا! آپ نے ہمیں اتنے ڈھیر سارے خط لکھے اور

صرف تین خط شائع ہوئے۔ جبکہ پہلے خط تو شائع ہی نہیں

ہوئے آپ کی ہمت کے ساتھ ساتھ محبت کے بھی دل سے محظوظ ہو گئے یقین کریں کہ ہمیں بھی آپ بہت عزیز ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے اتنے سارے خطوط کے ذخیرہ میں سے کس کا خط شامل کریں اور کس کا نہ کریں۔ براہ یہ ایک امتحان ہوتا ہے۔ ہمارے لیے۔
افسانے کے لیے آپ کے لیے مشورہ ہے کہ آپ مزید کچھ لکھ کر بھجوائیں۔

سارہ و حمن۔ کوٹ نجیب اللہ ہری پور

خط لکھنے کی دو جوہات ہیں ایک یہ کہ آپنی مجھے آپ سے ایک سوال پوچھنا تھا وہ یہ کہ کیا آپ سید لڑکی کی شادی کسی غیر سید لڑکے سے ہو سکتی ہے یا نہیں؟ لڑکا چاہے کسی بھی ذات سے تعلق رکھتا ہو مگر وہ سید نہ ہو۔ کیا قرآن میں اس کا کہیں ذکر ہے یا حدیث میں۔ پلیز پلیز مجھے قرآن وحدیث کی مدد سنی میں ضرور جواب دیجئے گا۔ میں شدت سے انتظار کروں گی۔

دوسری وجہ نمبر نمبر کا نائل (محل) ہے۔ نمبر سچی کو اتنا زبردست نائل لکھنے پر بہت بہت مبارکباد۔

راج : پیاری سارہ! آپ اس کا فتویٰ کسی مفتی صاحب سے لیں۔ وہ آپ کو دلائل کے ساتھ صحیح فتویٰ دیں گے۔ ہمارے ناقص علم کے مطابق جہاں تک ہم نے قرآن وحدیث کا مطالعہ کیا ہے قرآن پاک میں اس کی ممانعت نہیں کی گئی ہے۔ نہ ہی کوئی ایسی حدیث ہماری نظر سے گزری ہے۔ جس میں سید لڑکی کا نکاح غیر سید سے کرنے سے منع کیا گیا ہو۔ اسلام میں رشتہ کرنے کا معیار تقویٰ ہے۔ نیک پر تیز گار اور رزق حلال کمانے والا مسلمان سب سے بہتر ہے۔

نویا شہ۔ لاہور

فروری کا شمارہ ہاتھ میں آتے ہی حیرت کا جھٹکا لگا کہ میڈیا یا بیسی میاں بھی راج کر رہی ہے کیا؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ ماڈل کرل بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ لیکن پھر بھی کچھ اوچھورا سا تھا۔ عورت بغیر روٹی یا چادر کے مکمل لگتی ہے کیا؟ کرن کرن روشنی نے دل کو جھکا دیا۔ ماہرہ خان سے ملاقات اچھی رہی (امید تو نہیں تھی اس ملاقات کی تاہم) سب سے پہلے رشتہ جنوں اسرار سے بھری کمانی نے اپنے چہرہ میں ایسا جکڑا کہ آپوشمنی صحیح

میں ہی لگنے لگی۔ اور خوش نصیب کی کمانی صرف خوش نصیب کی نہیں ہر دوسرے فروری کمانی ہے معاشرے کے اور یہ خیال ذہن میں رکھیں کہ لگا بٹول شاعر۔

جو لہ بکا نہ اس کا ہی غم کیوں کیا گیا جو کچھ ملا تھا اس کی خوشی کیوں نہیں ہوئی راشدہ رخت کا نائل بھی اچھا تھا۔ شہر آشوب اپنے نام کی مناسبت سے گوڑے دمھی کر گیا۔ امدن عزیز میں آپ کو اپنی بچی والی سہیلی بتاؤں گی اگر آپ میرب کے

ساتھ کچھ برانہ ہونے دیں۔ اجیہ کو اچھا خاصا سبق دیں۔ سار کو فرحت آپنی کے بہنو (عالی) میں بدل دیں اور انکل وقار کو اور دمھی نہ کریں جمیل بن کر مدت دکھ دیکھ لے آج جیات میں سالار اور لاندہ نے جس طرح اپنے بچوں کی تربیت کی ہے کاش سب ماں باپ ایسی تربیت کریں۔ اور نسل پر بھروسے بغیر خطا عمل ہو سکتا ہے کیا؟ بیکے تو نمبو احمد سے ایک گزارش ہے کہ وہ قرآن پاک کی تفسیر لکھیں پلیز آپنی اس پر سوچیں ضرور انار اس کے باہر آنے کی خوشی میں ہم نے بھی چاہتے پائی اڈائی سین کمانی کا آخری تقرو پڑھ کرل تادی سہلی کے لیے غم زدہ رہا۔

راج : دنیا سب سے پہلے تو آپ کی لکھائی کی تعریف کریں گے بہت صاف ستھری موتیوں جیسی لکھائی ہے۔ پھر آپ نے مطر چھوڑ کر لکھا ہے بھی قابل تعریف ہے۔

اب آپ کے سوال کا جواب کہ جو ماں اس کی خوشی کیوں نہ ہوئی تو اس کا سیدھا سا جواب ہے کہ انسان بنیادی طور پر ناشکر اور اداغ ہوا ہے بہت کم لوگ ہیں جو شکر کرتے ہیں اور اللہ کی رضا میں راضی رہتے ہیں۔

سہلی کے لیے دل غم زدہ نہ کریں۔ وہ قابل تو ہے لیکن اس نے اپنے دفاع میں کُل کیا ہے اور اپنی جان و مال کی حفاظت کے لیے اپنے دفاع میں کُل جانتے ہے۔

امت العزیز شہزادی کی والی سہیلی بننے کی تیاری کر لیں۔ انہوں نے آپ فرمائش کی سو فیصد تعمیل کی ہے۔

ابھی نمبر احمد بہت کم عمر ہیں۔ قرآن پاک کی تفسیر لکھنا بہت بڑا کام ہے۔ شاید چندہ میں سال بعد وہ اس کے لیے سوچ سکیں۔

ثویبہ کنول۔ کراچی

فرحت اشتیاق! ماہانہ ملک راحت جبین، ثروت نذیر ہماری پسندیدہ مصنفین تھیں۔ جو اب بھولے سے بھی

منازا یوسف - کراچی

سب سے پہلے بات کرلوں گی "نمل" کی۔ ان مع العسر یرا۔ "نمو احمد نے اتنی خوب صورتی سے اس آیت کی تشریح سجدی کے ذریعے کر دئی ہے۔ مگر مجھے بری شاہنوں کے ساتھ موجود آسمانوں کی قدر محسوس ہوئی۔ "نما شکر" نعمتوں کو کھٹائی ہے۔ "کتنا خوب صورت جملہ ہے واقعی عورت کا" "صل" اس کا "مگر" ہی ہے خواہ وہ ڈاکٹر ہو یا سائنس دان۔ "آب حیات" عمیرہ احمد بہت ہی خوب صورتی سے لے کر آگے بڑھ رہی ہیں۔ اب کے تمام افسانے ہی سنجیدہ سنجیدہ سے نئے مکر معیاری تھے۔

"مریض عبت" بہت ہی خوب صورت لفظوں سے نگہ دیا ہوا افسانہ تھا۔ "فیصلہ" بھی خوب صورت کہانی تھی۔

"عمیرہ" بلدی اور دادی "ناول کا نام بڑھ کر لگا کہ یہ مزاحیہ ناول ہو گا مگر یہ قدرے سنجیدہ مگر بہت خوب صورت ناول تھا۔

"چن پر دو سیال" بڑھ کر لگا کہ شاید غلطی سے ایمل رضا کا نام شائع ہو گیا۔ اتنی ہلکی پھلکی مزاح سے بھر پور "حجر" وہ بھی اتنے کمرے موضوعات پر لکھنے والی رائٹرز کے قلم سے۔ زبردست بھی۔ ایمل تو اس میدان میں بھی بازی لے لیں۔ مجھے ایمل رضا کا "یہ انداز" اس "انداز حجر" سے بھی زیادہ پسند آیا۔ جٹ اور بٹ کو بطور مرکزی کردار لے کر ایمل ایک اور ناول لکھیں۔

"دشت جنوں" بہت ہی خوب صورت اضافہ ہے۔ خوش نصیب کا کردار کافی دلچسپ ہے۔ لگتا ہے یہ ناول بھی کامیابیوں کے زینے پر چڑھنے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔

ج : پیاری منازا اس سے پہلے آپ کے جتنے بھی خطوط موصول ہوئے تھے وہ ہم نے بڑھ ضرور لیے تھے یہ الگ بات کہ شائع نہ ہو سکے خط شائع نہ ہونے کی کئی وجوہات ہوتی ہیں مگر پھر بھی آپ سے معذرت کیے لیتے ہیں۔ شمارہ پسند کرنے کا شکریہ۔

سرت الطاف احمد - کراچی

"دشت جنوں" آمنہ ریاض کا یہ ناول بہت ایکساٹنگ

نہیں لکھتیں۔ ہم نے یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ نئی کو پیاری ہوئیں مگر یہ وقتا میں کہ بشری سعید کو کیا ہوا ہے؟ سفل کر اور رقص جنوں جیسی لانا دل تحریروں کی خالق کیوں خاموش ہیں۔ آپ پلیز ان سے کہیں وہ کوئی ناول ہی لکھ دیں۔ ان جیسا کوئی نہیں لکھ سکتا۔

ج : تو یہ بشری سعید کی تحریریں ہمیں بھی اتنی ہی پسند ہیں جتنی آپ کو اور ہر بار جب ان سے فون پر بات ہوتی ہے ہم ان سے یہی کہتے ہیں کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو ضائع نہ

کریں کچھ لکھیں لیکن غم دور اور انہیں ملت تو لینے دے۔ پہلے والدہ کی پیاری پھر ان کی وفات سے۔ اب ان کے والد صاحب بیمار ہیں۔ ایک حادثے میں نیچے کی ٹانگ فریکچر ہو گئی۔

انہوں نے دو ناول "لیلا دھاری" اور "فسوں کا" شروع کر رکھے ہیں۔

آپ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی عافیت میں رکھے اور وہ پرسکون ہو کر اپنے ناول مکمل کر لیں۔ آمین۔

مرحمت ارشد - رحیمپور خان

ہم آپ سے کہتے ہی خاکیں نہ ہوں لیکن آپ کے اس "اصل" خاص جریدے (خواتین) سے منہ نہیں موڑ سکتے۔ آپ اب اسے ہماری کمزوری کردار میں یا ڈھٹالی یا پھر مستقل مزاجی سمجھی ہم تو ایسے ہی۔

"آب حیات" واقعی لا جواب ہے اور حسین واقعی میں سالار کی ہی کہانی لگتا ہے۔ میرا احمد کا ناول شروع کریں کیونکہ ہم نے اپنی رائے آپ کے کہنے پر ہی "طشت ازہام" کی ہے۔ ڈھیروں ڈھیروں نمونہ جی جیسی رائٹرز کے لیے جو قرآن و احادیث بھی یوں بیان کرتی ہیں کہ آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہیں۔

آپ کے تمام ادارے والوں کے لیے ڈھیروں دعائیں۔ اللہ آپ کو اپنی امان میں رکھے۔ (آمین)

ج : اوہ بے چاری مریم اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ اگر انسان اپنے راز کی حفاظت خود کرے تو کون ہے جو طے تھے دینے کی ہمت کرے گا۔ چلیں جناب! خوش ہو جائیں اور بے چاری بننا چھوڑیں۔ بہادر بنیں۔

لوگوں کے درمیان کچھ ہی عرصہ میں ارم شہابی بھی آنے والی ہے۔ بس دعا کیجئے گا۔
ج : پیاری ارم! اللہ تعالیٰ آپ کے خالو کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ (آمین) آپ کی تحریروں کے شکر میں کیونکہ لکھائی سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت اچھا لکھ سکتی ہیں۔ اپنی کہانی پورے اعجاز سے سجوائیں۔ اچھی تحریروں کا ہم سے بڑا قدر دان کون ہو سکتا ہے۔

مرحوم لاہور

رسالہ آج ہی لائی ہوں، جواب دے رہی ہوں۔ ویسے ہی میں ساگ اہل لیں وہ بالکل سفید ہو جائے گی۔ آپ کو کیا بتاؤں کہ مجھے رسالے پڑھنے کا کتنا جنون تھا۔ سچی چوری چھپے کن بوں میں چھپا کر پڑھنے کے برائے پڑھنا کبھی رات کو چھت پر سب کے سونے کے بعد پڑھتی تھی میاں جی کی

ڈانٹ کہ کروا لیں ہوش کی دنیا میں آجاؤ۔ بچوں کو بڑھا دو کہ ان کے سالانہ جیمر زور ہے ہیں۔ یہ بعد میں بڑھ لے تا مگر اتنا انتظار وہ بھی میں کر لیں۔ نا ممکن شعاع پڑھ لیا ہے۔ خواتین پڑھ رہی ہوں اور بچوں کا دل دسرا پیچھے ہے۔ ماشاء اللہ بچے بھی لائق ہیں، گورنمنٹ ہولڈرز اور پڑھائی میں خود ہوں اور ماہم اور شائیم کی کہانی جس میں آخری قسط ہے وہ رسالہ منگوانے کا طریقہ بتا دیں۔

ج : پیاری مرحوم اسلوبی علی بیٹ کی کہانی ”دل کے رستے دشوار بہت تھے“ کی قسط اگست 2011ء میں شائع ہوئی تھی۔ شعاع کا یہ شمارہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ جنون کسی بھی چیز کا ہو برا ہو یا اچھا، اس کا راہ سب سے بہترین ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ آپ کا جنون فرائض کے درمیان حاصل نہیں ہوا اور آپ اپنے بچوں کو خود پڑھاتی ہیں۔ ہمیں بھی آپ کی کوئی بات بڑی پسند آئی۔ یہ اندیشہ مت پالیں کہ خط شعاع ہو گا کہ نہیں۔ ہم آپ کی رائے اور تبصرے سے آگاہ ہو گئے۔ یہ کافی نہیں؟

لا رہا نہ نوب۔ چونیاں ضلع قصور

ٹائٹل یہ سب سے جان دار اور توجہ طلب ماڈل کی آنکھیں ہمیں ڈریس کا کٹر بھی ٹائٹل اینڈ کول تھا۔ مصنفین کے سروے میں شکست سہارا اور نمبر احمد سے لکھوائے۔ نمبر آپ عمل کے دو صفحے کم کر دیں مگر سروے میں ضرور شامل ہوں۔

اور تجسس سے بھر پور ہے۔ وسامہ کی اسٹوری کافی بڑی رنگ ہے۔ معاویہ کا اسٹونگ کردار بہت ہی انٹرنٹنگ ہے۔ منظر کار کردار بہت زیادہ انٹریگنگ۔ خوش نصیب اور کیف کا کردار کچھ خاص دل کو نہیں بھایا وہی روایتی اسٹوری محسوس ہوئی۔ ”آب حیات“ کی یہ قسط پڑھ کر دل بہت دیر تک بو بھل رہا۔ لاسٹ کے صفحے بہت ہی بے دلی اور سرسری سے پڑھے۔ عبیرہ وادی ہادی موضوع میں کوئی نیا پن نہیں تھا، البتہ وادی کا کردار بہت زیادہ پسند آیا ”شہر آشوب“ آخری قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔

”جن برید سیماں“ ہلکی پھلکی سو فی اسٹوری ضرور پسند آئی اگر اینڈ میں عثمان اور فرحان اپنی ماں کو چھوڑ کر امریکہ نہ جاتے۔ اینڈ پڑھ کر پورے ناول کا چارم ختم ہو گیا۔

تفشی ہی محسوس ہوئی۔ ”نمل“ ٹاپ آف دی لسٹ رہا اور پورے شمارے کی جان بھی۔ زمر اور فارس کی نوک جھونک بہت مزادیتی ہے۔

افسانوں میں ”عام اور خاص“ بہت ہی متاثر کن تحریر تھی، بہت پسند آئی۔ ”تعداد“ موضوع بہت ہی جان دار تھا پڑھ کر اچھا لگا۔ ”مریض محبت“ طرز تحریر بہت اثر انگیز تھی، قابل تعریف تحریر تھی۔ باقی کے مسئلے سلسلے بھی اپنی مثال آپ تھے لیکن ناول کچھ خاص دل کو نہیں بھلائے۔ ڈیز آئی بلیز فرحت اشتیاق سے کچھ لکھو امیں نال۔ مارچ کے شمارے کا شدت سے انتظار رہے گا۔

ج : پیاری مرتنا سب سے پہلے بہن کی شادی کیا مبارک ہائے۔ ہمیں تو آپ کی طرف سے تشویش ہو رہی تھی کہ کہاں غائب ہو گئیں۔ چلو شکر کہ آپ آئیں تو سہی۔ غیر حاضری کی وجہ بھی معلوم ہوئی۔ اتنی مصروفیت میں سے ہمارے لیے وقت نکالا۔ اس کا شکریہ۔

ارم شہابی کھوکھو۔ کنوی پاک سندھ

میں آج جس وجہ سے قلم اٹھانے پر مجبور ہوئی ہوں۔ وہ ہے جولائی 1999ء کا شمارہ خواتین ڈائجسٹ۔ یہ مجھے ادھر ادھر کہیں سے مل گیا عبیرہ احمد، اس نام نے مجھے چونکا دیا، بس یوں سمجھیں ان ہی کے نام نے آج مرے اندر قلم اٹھانے کی طاقت پیدا کی ہے۔ جب میں نے 1999ء والا ناول پڑھا تو ناول لکھ کر شائع کرنے کا سوچا ہوا جنون دوبارہ جاگ اٹھا تو انتظار کیجیے اب عقرب اب آپ

کہ اتنی ہی محنت کے ضائع ہونے سے ٹوٹ جاتا ہے۔
یہاں تو زندگی ضائع ہو جاتی ہے اور کچھ اثر نہیں ہوتا۔ یعنی
دل کو مضبوط کر۔ اتنی اتنی ہی بات دل پہ لگاؤ کی تو پھر جس ہی
لی آپ نے زندگی۔

راشدہ رفعت کا ناول اجماع تہ مگر اب ان کی تحریریں پور
سی ہو گئی ہیں۔ مکالمہ تو قسم ہی ہو گیا ہے تقریباً۔ ان کی
کمانی میں لمبے سے پیرا گراف ہوتے ہیں۔ بس۔ ان کا عمر
ایمان والا ناول اور ”رپ دل کے تلے“ بے حد دلچسپ
اور یادگار تحریریں تھیں۔

ایمل رضائے اپنے مخصوص انداز سے ہٹ کر لکھا۔
بہی مسکراتی یہ تبدیلی اچھی لگی۔ ورنہ تو ان کی تحریر پڑھنے
کے بعد۔ کماؤ ہوگی بے وقوف ہیروئن۔ بہت غصہ آیا۔
جو بھی تھا اسے اپنی اولاد کو نقل نہیں کرنا چاہیے تھا۔ نمل
پر بات کرنے کے لیے تو الفاظ ہی نہیں ہیں۔ ہر قسط میں
پچیس قرآن مجید کے متعلق کچھ نیا سیکھنے کو ملتا ہے۔ سورۃ
الم تشریح کی ان آیات کے بارے میں میری بہت پرانی
کنفیوژن ختم ہوئی۔ بعد اور ساتھ میں یقیناً ”فرق ہے
بات سمجھنے کی ہے۔ عمیدہ جی یہ نہیں ہونا چاہیے۔
سالار ہماری دس سالہ پرانی محبت ہے (پیر کمال) اگر ایسا کچھ
ہوا تو ہم بھی سالار کے ساتھ ہی ختم ہو جائیں گے۔

یہ نصیب۔ سلیم آخر کہاں گم ہو گئی ہیں بلیر انہیں
ڈھونڈنے۔ غلطوں میں صرف مدبرہ آپا کے خواب ہی پڑھتی
ہوں یا کوئی بہت دلچسپ خط ہو تو۔ نسبت زہرا آپ ماشاء
اللہ تقریباً ”شعاع خواتین“ کے ہر سوسے میں شامل ہوتی
ہیں۔ اس بار نہیں بھی ہوئیں تو کیا؟ آپ نے تو خواتین کی
اینٹ سے اینٹ بجادی بار۔ آئندہ سلسلہ وار ناول ساتھ
رضا کا ہونا چاہیے۔ ٹوٹ کر لیں۔ فرحت اشتیاق کہاں رہ
گیا وہ ناول جو آپ لکھ رہی تھیں۔ نایاب جیلانی کی بھی
تحریر شامل کیجیے۔ وہ بھی اب اچھا اور میچور لکھنے لگی
ہیں۔ فرحت عباس نے جھنگ سے جو سوال پوچھا تھا تو
پیاری بہن آپ کا لیے ہوئے برتن میں ایک دودن کی باسی
(تین مٹھی) لسی چائی کی رات بھر کے لیے بھر کر رکھ دیں
برتن صاف ہو جائے گا۔ لیکن جس بھی استعمال کیا جاسکتا
ہے۔

بج : پیاری لاریب شاہ زیب! اتنا نازک دل ہے آپ کا

قارئین متوجہ ہوں!

- 1- خواتین ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لگانے میں
بجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کا قدا استعمال
کریں۔
- 2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کا قدا استعمال کر سکتے
ہیں۔
- 3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور سٹے کی پشت پر پینٹ سٹیک
دوسری طرف بریز کر رکھیں۔
- 4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا
کھل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔
- 5- سوسے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، تا قائل اشاعت
کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔
- 6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی
کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔
- 7- خواتین ڈائجسٹ کے لیے افسانے، غلط سلسلوں کے لیے
انتخاب، اشعار وغیرہ دو دن قبل پتے پر جرحی کر دیا جائے۔

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور اردو اخبار خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے
حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی وی ڈی ویڈیو میں۔ ڈراما ٹورنالی ٹیلی
اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پیشتر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

خبریں ویریں

دُصفہ سہیل

کی وجہ سے بہت خوش ہوں (اجھا! جب کہ ٹی وی اداکارائیں تو فلم میں جانے کے لیے۔ بے چین ہیں بھئی) جب سب ٹی وی پر کام کر رہے تھے، میں اس وقت فلم میں مصروف تھی اور اب جب سب فلم کی طرف رخ کر رہے ہیں تو میں ٹی وی کی طرف واپس آ گئی ہوں (یہ اطلاع ہے کہ ٹی وی؟) مجھے موجوں کے خلاف چلنا پسند ہے۔“



انکار

ہمایوں سعید کو میٹس بحث نے اپنی پنجابی فلم دشمن میں لیتا چاہا تو ہماریوں نے ہائی بھلی لیکن اب اپنے پروڈکشن ہاؤس کی مصروفیات کی وجہ سے ہماریوں نے معذرت کر لی ہے (کیوں ہائی بھرتے وقت آپ کے پاس مصروفیت نہیں تھی؟) ہماریوں اس پارے میں سمجھتے ہیں کہ رواں برس اپنی پروڈکشن میں تین فلمیں پیش کرنا چاہتے ہیں (جس کے ہیرو یقیناً ہماریوں ہی

تبدیلی

ایسے وقت میں جب ٹی وی کے لوگ فلم کی طرف جا رہے ہیں وہیں کچھ ایسے فنکار بھی ہیں جو فلم کے ساتھ ساتھ ٹی وی پر بھی آ رہے ہیں میٹا بھی ان میں ایک ہیں لوکارا و گلور کارا میٹا شیع اپنے سپر سٹ کاروں کے ساتھ پاکستانی ہلی ووڈ اور ہالی ووڈ فلموں میں کام کر چکی ہیں لیکن اب پھر میٹا شیع ٹی وی پر اپنے فن کے جوہر دکھانے آ رہی ہیں۔ وہ ایک براہ کوشی وی چینل کے تحت بننے والے ڈرامے میں کام کر رہی ہیں۔ تاریخی پس منظر میں بننے والے اس ڈرامے میں میٹا مارالی کے روپ میں ناظرین کو نظر آئیں گی۔ یہ ایک انقلابی تاریخی ڈراما ہے جس میں دو سو سال پرانے دور کی عکاسی کرتے ہوئے برصغیر کے شاہی خاندانوں کی ثقافت اور زندگی کو دکھایا گیا ہے۔ میٹا اس پارے میں کئی ہیں کہ میں سات برس بعد ٹی وی پر واپس آئے



ہوں گے۔ اس لیے انہوں نے شان کی فلم ارٹھ نو میں کام کرنے سے بھی معذرت کر لی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی فلم ”جولنی پھر نہیں آتی“ کا سیکوئل بھی بنا رہے ہیں جس کی کہانی واسع چوہدری لکھ رہے ہیں (پھر تو اپنا کردار بھی لکھا ہو گا۔؟) اس کے ساتھ ساتھ ہمایوں ظلیل الرحمان قمر کے اسکرپٹ پر بھی کام کر رہے ہیں۔

خوش خبری

بچپن سے سنتے آ رہے ہیں کہ دودھ پیو پڑیاں مضبوط ہوتی ہیں، بچوں کو مار مار کر دودھ پینے پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ لیکن اب۔۔۔ اب نئی تحقیق یہ بتا رہی ہے کہ چائے پینے سے پڑیاں مضبوط ہوتی ہیں۔ (تمام چائے کے رسا اپنی پڑیاں چیک کر لیں۔) اور کوئٹہ کی ہڈی سمیت دیگر پڑیوں کے ٹوٹنے کے امکان کم ہو جاتے ہیں۔ ماہرین کہتے ہیں کہ پڑیاں ٹوٹنے سے بچاؤ کی احتیاطی تدابیر میں چائے کو بھی شامل کر لیتا چاہیے۔ (تو جنتاب اب چائے کے شوقین خواتین و حضرات بلا روک ٹوک ڈنٹے کی چوٹ پر بے فکر ہو کے چائے پئیں) خیال رہے تحقیق میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ مقدار تین پیالی سے زیادہ نہ ہو۔

فائدہ

یونیورسٹی آف ٹش کوئٹہ کے ماہرین نے تجربہ کر کے یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ آیا دوسروں پر رقم خرچ کرنے سے بڑھا ہوا بلڈ پریشر کم ہو سکتا ہے یا نہیں۔ یہ بات 1999ء میں کی گئی ایک ریسرچ میں بھی ثابت ہو گئی تھی کہ دوسروں کی مدد کر کے ہم صحت مند رہ سکتے ہیں۔ یعنی دوسروں کی مدد اور جسمانی صحت کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ (جب سی تو اسلام میں حقوق العباد اور ضرورت مند کی مدد پر زور دیا گیا ہے) اس ریسرچ کے مطابق جب آپ کسی کی مدد کرتے ہیں تو آپ کو اندرونی سکون ملتا ہے۔ اور اگر وہ آپ کا کوئی قریبی عزیز ہو تو آپ زیادہ خوش اور اطمینان محسوس

کرتے ہیں جو آپ کے بلڈ پریشر کو بھی کم کرتا ہے اور آپ کو ذہنی تناؤ سے بھی نجات دیتا ہے۔ کچھ ادھر ادھر سے

☆ اس بار جاتے سال کی خوشی پر دھوم دھڑکا کچھ زیادہ ہی رہا۔ خیر اس میں خرابی کوئی نہیں ہے۔ پورپ والوں نے ہمیں جو بھی دیا، اچھا ہی دیا۔ اس لیے اچھا ہی ہو گا ورنہ پہلے تو یہ تھا کہ لوگ عمر کا ایک سال کم ہونے پر بھی ہو جاتے تھے اب تو یہ فلسفہ ہے، جانے والی چیز کا غم کیا کریں۔

(ذمہ داری۔۔۔ عبد اللہ طارق سمیل)

☆ وقت آج ہے وقت کچھ موجود ہے۔ آج سے پہلے افسوس تھا۔ آج کے بعد حسرت ہوگی۔ زندگی ”آج کو“ نبھانے کے کام ہے آج کا دن، صرف آج کا دن طعمہ موجود ہے جو لوگ آج میں بیٹہ کر گزرے۔ کل کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا جو آج میں بیٹہ کر مستقبل کے خواب دیکھتے ہیں مگر سب بے وقوف کوئی نہیں ہوتا۔

(زیر پو اٹھ۔۔۔ جاوید چوہدری)

☆ پاکستان کے آزاد کمانڈے والے اور کارپوریٹ سرمایہ سے جہنم لینے والے میڈیا کا ظہور گیا وہ مقبر کے طوفان افغانستان اور عراق پر امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے حملوں کے بعد ہو۔ چونکہ اس وقت مغرب کے میڈیا وائس وویل اور مجریہ نگاروں کی نفرت کا صرف اور صرف ایک ہی موضوع تھا ”طالبان“۔ دنیا کا ہر ظلم، جہالت، مجبور اور یرت اس کے ساتھ وابستہ کر دی گئی پاکستان میں میڈیا نے جس کو مطعون کرنا ہوتا اسے طالبان کا خیر خواہ اور ایجنٹ کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ کئی میڈیا کے ذریعے مشرف کے ہم نواؤں و دانشوروں اور مجریہ نگاروں نے لوگوں کو بتایا کہ اگر ہم امریکہ کا ساتھ نہ دیتے تو ہمارا اور ابراہن جانا۔ امریکہ یا ایسی کا ساتھ دینے کے بعد جو ہم پر ہوتی وہ ایک نہیں کئی تو اور اپنا پھیل گیا ہے۔ (اور یا مقبول جان۔۔۔ اے راز)

اپ کا باورچی خانہ

۱۱ ماہ

مہمان اچانک ہی آتے ہیں، کبھی تو ایک ایک دن میں دو دو آجاتے ہیں، کھانے کی کوبت تو کم آتی ہے البتہ ریفریجیشنٹ خوب چلتے ہیں، میں شاہی کباب، نعل تو کبھی بھڑا تو کبھی تھے کے سمو سے تیار کر کے اکثر فریز رکھتی ہوں، ٹنڈٹ گزاسی رکھی، ڈھبھی آٹچہ (تھے

ہوئے سہی) نعل کباب تلنے کے لیے ڈالے، یہ تلنے میں 20/15 منٹ کیے ہیں، دوسری طرف نمکو بسکٹ ٹرے میں سیٹ کیے، دوسرے چولہے پہ چلے، چڑھائی — کباب فریائی ہونے تک ٹرے سج گئی، چائے بن گئی، آنے والا ابھی سلام دعا ہی کر رہا ہوتا ہے میری ٹرے حاضر ہو جاتی ہے، اگر بھڑا فریز ہے تو ٹنڈٹ اولن لگایا، جما ہوا بھڑا رکھا، 20 منٹ میں وہ بھی تیار۔ ان کے کتنے ہی مہمان تو شرمندہ ہو جاتے ہیں کہ بھابھی بہت اہتمام کرتی ہیں اور یہ مسکرائے جاتے ہیں۔

اگر کھانے کا موقع ہو تو یہی کباب کھانے میں نکالتی ہوں، ساتھ گھر کا پکا ہوا کھانا چاول ساں جو بھی ہو، رائیہ، چٹنی، مسلاہ، لوتی یا ستر خون بن گیا۔ پیٹھے میں میں اس ڈش کو فوقیت دیتی ہوں جسے گرم کھلایا جانا ہو، جیسے کھونے والی سویاں، مٹلوہ جات وغیرہ۔ سویوں کی ترکیب لکھ رہی ہوں جو بہت پسند کی جاتی ہیں۔

کھونے والی سویاں

- ایک پکٹ
- ایک ماؤ
- آدھا ماؤ
- حسب پسند
- 3 کھانے کے پیچ
- 3 عدد
- 2 عدد
- ایک کھانے کا پیچ

- سویاں
- دودھ
- کھویا
- چٹنی
- ٹھنڈا
- چھوٹی الائچی
- لونگ
- بادام کی گرمی
- ترکیب :

سبھی گرم کر کے الائچی اور لونگ کڑکڑائیں پھر سویاں

1 - کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟ پسند ناپسند غذا، نیت غذا، نیت یا گھروالوں کی صحت؟ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غذا نیت کے بغیر غذا بے فائدہ ہے، لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ ہے کہ جب ہم کوئی تیز مسالے والی چٹنی اور خوب تری (گھی) والی کوئی ترکیب آزماتے ہیں تو وہ کھانا "سٹرنٹ غذا" تو کھلا سکتا ہے، غذا نیت سے بھرپور نہیں۔ پھر پسند و ناپسند میں غذا نیت کہاں رہ گئی؟ آپ بتائیں ذرا — کڑھی چاول، قورسے، بریا نیاں، ککے، روٹ اور میکرونی، پاستا جیسے کھانے کہاں غذا نیت سے بھرپور کے جائیں گے؟ جبکہ سنتے بھی ہفتے میں کم از کم ایک بار ہوں؟ لہذا میں تو کہوں گی کہ ہمارے ہاں پسند ناپسند دیکھی جاتی ہے، غذا نیت کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اگر میں ساوے چاول یا "بلبلے کھانے" جو نارمل مرچ کے ساتھ ہوں، بغیر تیز مرچ کے چٹنی رائٹھے، کے سامنے رکھ دوں تو اسے کون پوچھے گا؟ (بتائیں میاں صاحب!)

2 - کھانے کا وقت ہے گھر میں اچانک مہمان آگئے ہیں کسی ایسی ڈش کی ترکیب بتائیں جو فوری طور پر تیار کر کے مہمانوں کی تواضع کر سکیں۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں نے کھانا بنانا شادی کے بعد سیکھا اور دو سووں کو دیکھ دیکھ کر سیکھا، میں ریفریجیشنٹ تو کئی طرح کی بنا لیتی تھی، کھانا باقاعدہ لگانا نہیں آتا تھا، (بہسی کم عمری میں شادی ہو گئی تھی، کیسے سیکھتے؟) پھر خود پکاتا اس وقت شروع کیا جب لیکن علیحدہ ہوا اور اب عرصہ چار سال سے لپکار رہی ہوں اور اپنے میاں صاحب کے دل پہ راج کر رہی ہوں۔ (آہم)

اب آتے ہیں اصل سوال کی طرف، ہمارے ہاں

اشیا :

آلو
کلونجی، پیٹسی دانہ، سونف ایک ایک چائے کا چمچ
بلدی نمک لال مرچ حسب پسند

گھر کا بنا ہوا تیل کا اجارہ 2 کھانے کے چمچ (چاہیں تو اضافہ کر لیں)

پتلی میں تقریباً 3 گلاس پانی کے ساتھ آلو تمام مسالا جات ڈال کر خمدادیں۔ شروع میں آٹھ تیز رکھیں، جب پانی کم ہونے لگے اور آلو گل جائیں تو آٹھ دھیمی کر دیں، پھر چمچ سے آلو اچھی طرح پھیل کر چھوٹے ٹکڑے کر لیں۔ آخر میں گھر کا بنا ہوا ڈال کر کس کر دیں اور پھوریوں کے ساتھ پیش کریں۔ (اجارہ کا تیل بھی ضرور ڈالنا ہے تو ڈالنا بہتر)

5 - سینے میں تپتی باہر کھانا کھاتی ہیں؟

گھر سے باہر کھانا نہ پھینچے پسند ہے نہ میاں صاحب کو بلکہ میں تو کستی ہوں جتنی رقم باہر اک وقت کھانے پہ لگتی ہے اتنی میں گھر میں ہی دو تین اچھی ڈشز تیار ہو جائیں۔ ہاں آٹس کریم کھانے باہر چلے جاتے ہیں، کبھی شاپنگ ڈیوٹیوں میں دیر ہو جائے تو میری صحن کے خیال سے کھانا پیک کروا لینے ہیں اور کھاتے گھر آ کے ہی ہیں (نقاب میں ہاتھ منہ تک لے جانا بڑا عجیب سا لگتا ہے)

6 - پکانے کے لیے ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کو مد نظر رکھتی ہیں؟

یہ بات بالکل درست ہے کہ ہر پھل یا سبزی اس کے موسم میں ہی اچھی لگتی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو رب تعالیٰ مختلف موسم نہ بناتا، ان کے حساب سے پھل سبزیوں سے نوازتا۔ اب آپ سزی ہوئی گرمی میں پائے نہیں کھا سکتیں اور نہ ہی سوپ سے لطف اندوز ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح سخت سردی میں شلیم جو بھی مگاجر کی جگہ کر لیتے اور بھنڈی / اردی کھانا عجیب لگتا ہے، اور یہ میرے تجربے کی بات ہے کہ بے موسم کی سبزی بازار میں خواہ کتنی ہی اچھی مل رہی ہو، پکاؤ تو اس کا ذائقہ نہیں ہوتا جو اصل موسم کا ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ سب سرد خانوں کی رکھی ہوئی ہوتی ہیں۔

چھوٹے ٹکڑے کر کے ڈال دیں، جب تھوڑی سرخ ہو جائیں تو دودھ ڈال دیں، ساتھ تھوڑا سا لپائی، تھوڑی دیر چمچ چلائیں پھر کھویا ڈال دیں (مسل کس مشتمل ہلاتی)۔
— رہیں اور آٹھ دھیمی رکھیں، جب سویاں پھول جائیں تو چھٹی ڈال دیں اور اچھی طرح کس کر کے دم پر رکھ دیں۔

یہ ابھی کم از کم 15 منٹ دم پر رہیں گی۔ تب تک آپ کے مہمان کھانے سے انصاف کریں، آپ کا بیٹھا بھی تیار۔ ڈش میں گرم گرم نکال کر پیش کریں اور داو پیٹیں۔ اوپر سے بادام کی گری چھڑکانا نہ بھولے گا۔

3 - چکن خاتون خانہ کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے، آپ چکن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں۔ بطور خاتون خانہ میرا اکثر وقت چکن میں گزرتا ہے اس لیے صفائی وغیرہ ساتھ ساتھ ہوتی رہتی ہے۔ مجھے سلیب بکھری ہوئی، بہت بری لگتی ہے، ہر چیز ہاتھ کے ہاتھ ٹھکانے کرتی ہوں۔ اور اگر جو بھی میرے میاں صاحب کا چکن سے گزر ہو جائے تو بس۔ ایسی اتنی پھینکتی ہے کہ میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔

ہفتہ وار تفصیلی صفائی بچوں کو (بھئی اپنی) ساتھ لگا کر کرتی ہوں سو جلدی منت جاتی ہوں۔ (آپ بھی یہ ترکیب آزمائیں)

4 - صبح ناشتے میں آپ کیا بناتی ہیں، ایسی خصوصی ڈش جو آپ بہت اچھی بناتی ہیں؟

صبح توجسب کو اپنے ٹھکانوں (اسکول / جاب) بھاگنے کی جلدی ہوتی ہے، لہذا ناشتہ بڑے کے ساتھ انڈے / شد / نیم یا کھن پر ہی مشتمل ہوتا ہے (بنانے کا وقت جو نہیں ہوتا) اکثر مایونیز میں باریک کٹی بند گوبھی اور اواکل چکن ڈال کر نمک کالی مرچ کے ساتھ سینڈویچ تیار کرتی ہوں۔ (آمیروزہ رات سے بنانا پڑتا ہے) صبح تو بس یہ لگتا اور ناشتہ تیار چھٹی والے دن ناشتہ میں اہتمام ہوتا ہے۔ بھی بازار کی حلہ پوری پر اٹھے چھولے۔ کبھی گھر میں ہی پھوری بھائی بنا لیتی ہوں۔ یا گھر کے پر اٹھے اور اہلیت (میاں جی کا من پسند ناشتہ۔ اور میں بنانے کی چور۔ بھئی صبح) ان سب کی ترکیب توجسب کو ہی آتی ہیں۔ بھائی کی ترکیب لکھ دیتی ہوں۔ یہ کچھ اچھا لگتا ہے اور بہت پسند کی جاتی ہے۔

موسم کے پیکوانے

خالد جیلانی

چھٹی اور ناشتا

کالی مرچ، نمک اور مرفی شامل کر کے ذرا سی دیر بخننے کو چھوڑیں۔ سب انڈوں کو الگ کسی پیالے میں پیسٹ لیں اچھی طرح اور مسالے میں ملائے ہوئے ساتھ ساتھ چمچ بھی چلاتی جائیں پھر تیل اوپر آجائے تک بھونیں۔ گما گرم پیراشموں اور چائے کے ساتھ نوش فرمائیں۔

کالی مرچ قیمہ اور روغنی روٹی

اجزا :
 قیمہ
 پراسن اورک
 پس کالی مرچ
 ہری مرچ
 لال کئی مرچ
 نمک
 تیل

آدھا کلو
 ایک ایک کھانے کا چمچ
 ایک کھانے کا چمچ
 چار سے پانچ عدد
 آدھا چائے کا چمچ
 حسب ذائقہ
 تین کھانے کے چمچ

ترکیب :

ایک دیکھی میں قیمے میں پانی ڈال کر لسن اورک کالی مرچ، لال کئی مرچ، ہری مرچیں اور نمک ڈال کر چھادیں جب پانی خشک ہونے لگے تو اس میں تیل ڈال کر قیمے کو اچھے طریقے سے بھونیں جب پانی خشک ہو جائے اور قیمہ گل جائے تو ہر ادھیہ اوپر سے ڈال کر سوئگ ڈش میں نکالیں اور گرم گرم روغنی روٹی کے ساتھ لطف اندوز ہوں۔ روغنی روٹی خست ہوتی ہے اور اسے اٹنے کے اندر کئی ڈال کر گوندھا جانا ہے ایک پاؤ آٹے میں تین چمچے کئی ڈال کر تھوڑا پانی اور نمک ملا کر قدرے سخت آٹا گوندھ لیں اور پیڑے بنا کر روٹی کی طرح تیل لیں اور قدرے ہلکی آج پکائیں تاکہ روٹی سنہری اور خست ہو۔

آلو کی ترکاری پوریوں اور سوچی کا حلوہ

چھٹی کا دن اور حلوہ پوری کا ناشتہ نہ ہو یہ ممکن نہیں

کہتے ہیں کہ صبح کا ناشتا بادشاہ کی طرح کرنا چاہیے اور ناشتہ بھر پور ہونا چاہیے۔ چھٹی کے دن کا آغاز اگر بھر پور ناشتے سے ہو تو چھٹی کا مزہ بدلا ہوا جانا ہے ایسے میں سب گھروالوں کی پسند و ناپسند کا خیال کر کے ایسا ناشتا بنانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ہم نے یہاں آپ کی اسی مشکل کو ختم کرنے کے لیے ہم کچھ ایسی چیزوں کی ترکیبیں دی ہیں جنہیں آپ چھٹی کے دن ناشتے میں بنا سکتی ہیں اور اگر وقت ہو تو چھٹی کے علاوہ بھی بنائیں۔ گھروالے بہت خوش ہوں گے

چکن اور انڈے کا خاگینہ

اجزا :
 مرفی
 انڈے
 پیاز
 نمک
 ہری مرچیں
 لال کئی مرچ
 پس کالی مرچ
 ہلدی
 نمک
 تیل

ایک پاؤ
 چھ سے آٹھ عدد
 دو عدد
 دو عدد
 چار سے چھ عدد
 ایک کھانے کا چمچ
 آدھا چائے کا چمچ
 آدھا چائے کا چمچ
 حسب ذائقہ
 حسب ضرورت

ترکیب :

مرفی کو ایک دیکھی میں پانی ڈال کر ہل لیں اور پھر اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیں۔ پیاز کو ہلکا سنرا کر کے اس میں نمک اور ہری مرچیں باریک کٹ کر شامل کر دیں۔ اب اس کو ذرا سی دیر بھونیں پھر اس میں لال کئی مرچ بھی

ایسے میں فضا نیت اور ڈالتے سے بھرور آو کی ترکیبی

پوریوں اور طوطہ مت مزادتا ہے۔

ضروری اجزا :

- آو
- پس مالل مرچ
- ہلدی
- کلوچی
- سونف
- نمک
- تیل
- ترکیب :

- آوہا کلو
- ایک کھانے کا چمچ
- ایک چائے کا چمچ
- آوہا چائے کا چمچ
- آوہا چائے کا چمچ
- حسب ذائقہ
- حسب ضرورت

آو کو چمیل کر چھوٹے ککڑوں میں کٹ لیں پھر ایک دیکھی میں آو ڈال کر پانی اتار ڈالیں کہ آو گل جائیں ساتھ ہی اس میں مالل مرچ، ہلدی، کلوچی، سونف، نمک ڈال دیں۔ جب آو گل جائیں تو انہیں ہلکے ہاتھ سے گھونٹ لیں اور آکر چائیں تو اس میں تھوڑا سا اچار سالابھی شامل کر لیں۔ تیار ہو جانے پر پوریوں کے ساتھ تھل فرمائیں۔

پوریوں بنانے کے اجزا :

- فائن آٹا
- نمک
- تیل
- نیم گرم پانی
- سچی
- ترکیب :

- آوہا کلو
- آوہا چائے کا چمچ
- تین سے چار کھانے کے چمچ
- حسب ضرورت
- تلنے کے لیے

ایک تیلے میں آٹا، نمک اور تیل ڈال کر گرم پانی سے آٹا گوندھ کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اب اس کے چھوٹے چھوٹے بیڑے بنا کر اور سے تھوڑا تیل لگا کر کچھ دیر کے لیے رکھ دیں۔ کڑا ہی میں سچی گرم کر کے پوری تیل کرتی لیں۔

طوطہ بنانے کے اجزا :

- سونی
- چینی

- ایک کپ
- دو کپ

اللہ بھی
زردے کا رنگ
سچی
پانی
ترکیب :

ایک دیکھی میں تین کپ پانی ڈال کر چینی اور زردے کا رنگ ڈال کر تیرہ بنانے کو رکھ دیں۔ اب الگ سے دیکھی میں سچی ڈال کر لالچی کڑکڑائیں پھر اس میں سچی ڈال کر بھوئیں۔ جب سچی بھن جائے اور اس میں سے خوشبو آنے لگے تو آج بھلی کر کے اس میں شیر ڈال دیں۔ پھر اس کو تھوڑا بھون کر سوگ ڈش میں نکال لیں اور مزے دار ناشتے کی داد وصول کریں۔

دل پسند فرنی چانپ

- ضروری اجزا :
- نمک
- بکرے کی چانپ
- دی
- ہری مرچ چوپ
- زیرہ پاؤڈر
- کالی مرچ
- کئی مالل مرچ
- سرکہ
- گرم سالاب
- انڈے
- ترکیب :

- حسب ذائقہ
- ایک کلو
- ایک پاؤ
- چھ عدد
- ایک چائے کا چمچ
- دو چائے کے چمچے
- آدھ چائے کا چمچ
- دو کھانے کے چمچے
- آدھ چائے کا چمچ
- دو عدد

چانپوں۔ سارے سالے لگا کے دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں پھر چھینے ہوئے انڈوں میں ڈال کے فرنی کریں آج بھلی رکھیں۔ آدھ گھنٹہ فرنی کریں۔ مزید ار فرنی چانپ تیار ہے پودینے کی چٹنی کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔



تعلیمی اور تعلیمی

عابد کراچی

میرا تعلق ایک تعلیم یافتہ فیملی سے ہے۔ خاندان میں سب لوگ بڑے عمدوں پر فائز ہیں، بھائی بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سول سروس میں ہیں، سمجھ میں نہیں آیا بات کہاں سے شروع کروں۔ میٹ پر چیٹنگ سے ایک لڑکے سے میری دوستی ہوئی۔ دونوں نے فون نمبر کا تبادلہ بھی کیا پھر ہماری روزانہ گفتگوں بات ہوئی۔ میں نے اسے گھر پر دعوت کر کے سب گھروالوں سے ملوایا۔ وہ بہت ذہین اور خوش شکل تھا۔ سب نے اس کو پسند کیا۔ لیکن گھروالوں نے مجھ پر واضح کر دیا کہ دوستی کا یہ سلسلہ آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ کیونکہ اس کا تعلق ایک غریب فیملی سے تھا۔ وہ اپنے گھر میں سب سے بڑا تھا۔ اس سے چھوٹی تین بہنیں اور بھائی تھے۔ والد کی چھوٹی سی دکان تھی۔ اس نے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے وہ ٹیوشن پڑھاتا تھا۔ گھروالوں کا خیال تھا۔ میں ان کے ماحول میں انٹر جسٹ نہیں کر پاؤں گی۔ ویسے بھی اسے تعلیم مکمل کر کے چاہیے ہی نہ ہوئے کے لیے کم از کم پانچ سال درکار تھے۔ لیکن وہ کہتا تھا کہ وہ مجھے بہت چاہتا ہے میرے بچے زندہ نہیں رہ سکتا اور سچ تو یہ ہے کہ دو سال کی بات چیت کے بعد ہم اتنے قریب آگئے تھے کہ مجھے بھی اس کے سوا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ اس دوران رضائے مجھے بتایا کہ جرمی کا ایک تعلیمی ادارہ اسکالر شپ دے رہا ہے اگر میں اس کی مدد کروں تو وہ باہر جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔ وہ کچھ بن کر میرا ہاتھ مانگے گا تو میرے گھروالے انکار نہیں کر سکیں گے۔ میرے بھائی جرمی میں پاکستانی سفارت خانے میں کام کرتے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ بھائی یہ اسکالر شپ دلانے میں اس کی مدد کریں۔ یہاں ایک بات بتا دوں کہ باوجود میرے شدید اصرار کے رضائے مجھے نہ تو سمجھی اپنے گھروالوں سے ملوایا اور نہ ہی میرے بارے میں کوئی بات کی۔ جب بھی میں کہتی اس کا ایک ہی جواب ہوتا کہ اس کے گھروالے بہت کنٹرولڈ ہیں، شادی سے پہلے وہ مجھے اپنے گھر نہیں لے جا سکتا۔ بھائی نے اسکالر شپ دلادی تو وہ جرمی چلا گیا۔ جرمی جانے کے اخراجات بھی میں نے ہی اپنے بینک اکاؤنٹ سے دیے۔ جرمی جانے کے بعد اس نے شروع شروع میں تو رابطہ رکھا پھر آہستہ آہستہ اس میں کمی آتی گئی۔ اب تین سال گزر چکے ہیں۔ وہ تعلیم مکمل کر کے وہاں جا رہا ہے۔ مجھ سے رابطہ مکمل طور پر منقطع کر چکا ہے، پہلے تو مصروفیت کے بہانے بنا کرتا رہا۔ اب صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اس کا واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور وہ شادی بھی وہیں کرے گا۔ اور میں تمام رشتوں کو انکار کرتی رہی۔ ہمارے خاندان میں قریبی رشتہ داروں اور کزنز کو اس کے بارے میں پتا ہے سب سمجھتے ہیں کہ میرا اس سے انکی جمنٹ ہو چکی ہے پانچ سال تک جس کو چاہا جس کے لیے اتنی قربانیاں دیں اس نے ایک ٹل میں۔ بارے۔۔۔ اب میں کیا کروں؟ کیسے بھلاؤں اس کو؟

ج: شادی سے پہلے کی تمہیں عموماً اسی اختتام کو پہنچتی ہیں وہ لڑکا ہو سکتا ہے کہ آپ کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہو لیکن یہ طے شدہ ہے کہ وہ شادی کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ نہ ہی اسے آپ سے کوئی لگاؤ تھا۔ اور یہ بات واضح بھی تھی لیکن آپ نے اس حقیقت کو جاننے تو مجھے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ گھروالوں کے سمجھانے کے باوجود آپ اسی راستہ پر چلتی رہیں۔ اگر وہ آپ کے ساتھ سنجیدہ ہو تا تو کم از کم اسے گھروالوں سے آپ کا ذکر تو کرنا آپ کی فیملی سے ملوایا۔ باہر جانے سے پہلے اپنے گھروالوں کو آپ کے گھر لے کر آنا لیکن اس نے اپنے گھروالوں سے اس سلسلہ میں بات کرنا بھی ٹھوکر مارا نہ کیا۔ آپ کا دکھ اپنی جگہ بجایا ہے کیونکہ آپ اس کے ساتھ سنجیدہ تھیں۔ اچھی بہن! اس کو بھلانا مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔ تمہوڑی سی خود اعتمادی سے کام لیں اور یہ سوچیں کہ جو شخص آپ سے محبت نہیں کرتا تھا۔ آپ کے ساتھ تخلص نہیں تھا۔ اس کے لیے کیا دوتا۔ اگر وہ آپ سے شادی کر بھی لیتا تو ایسا خود غرض اور مطلبی انسان آپ کو کیا دے سکتا تھا۔ آپ اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ بڑھی لکھی ہیں۔ قبول صورت، یقیناً اس بات کی مستحق ہیں کہ آپ کو ایک محبت کرنے والے تخلص شخص کا ساتھ نصیب ہو۔

س۔ میں ایک لڑکے کو پسند کرتی ہوں میں ہی نہیں وہ بھی پسند کرتا ہے ہم دونوں کو دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں ان کی شادی ان کی کزن سے ہو گئی وہ شادی نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن ان کی والدہ کا اصرار تھا انہوں نے کہا کہ یہ شادی کر لو اور اپنی مرضی کی شادی بھی کر لیتا ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔ جب ان کی شادی کی بات شروع

ہوئی۔ تو انہوں نے میری امی سے مشورہ کیا کہ اب میں کیا کروں؟ میری امی نے اس وقت شاید معاملہ رفع دفع کرنے کے لیے ہی کہا کہ تم شادی کر لو پھر بعد میں دیکھیں گے کیا کرنا ہے۔ شادی کے بعد بھی ہمارا رابطہ برقرار رہا۔ ان کی بیوی نے بھی کہا کہ آپ اپنی مرضی سے شادی کر لیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آخر میری امی اور ہم دونوں کی کوششوں سے بات یہاں تک پہنچی کہ ہماری شادی طے ہو گئی۔ ابو مجبوراً راضی تھے دل سے نہیں بات تب بگڑی جب میرے گھر والوں نے میرے چاچے سے بات کی تو انہوں نے صاف کہہ دیا کہ اگر آپ لوگ یہ شادی کریں گے تو ہمارا آپ سے ہر طرح کا تعلق ختم۔ ہم آپ سے کوئی رابطہ نہیں کریں گے۔ اب یہاں آکر جو میری امی اور ابو راضی تھے وہ بھی پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ عدنان بھائی میں سخت پریشان کا شکار ہوں۔

ج۔ اچھی بہن! مناسب تو یہی ہے کہ آپ اس کو نقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیں اور اپنے گھر والوں کے سامنے سر جھکا دیں لیکن اگر آپ خود کو اس سلسلے میں مجبور پاتی ہیں تو آپ کے گھر والوں کو اس بارے میں سوچنا چاہیے۔ آپ اپنے بیویوں پر کھڑی ہیں۔ سمجھ دار ہیں۔ آگے اگر کوئی مسئلہ پیش آتا ہے تو اسے سنبھالنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہیں اور سب سے بڑی بات کہ وہ لڑکا بھی آپ کے ساتھ مخلص ہے اور آپ کو آپ کے والدین کی رضامندی سے باقاعدہ شادی کر کے لے جانا چاہتا ہے۔ آپ اپنی والدہ کو سمجھائیں اگر وہ راضی ہیں تو خاندان کی پروا نہ کریں زندگی آپ نے گزارنی ہے خاندان والوں نے نہیں۔

اربیہ گوجر والا

س۔ دو سال پہلے میری بہن کی شادی ہوئی۔ شادی سے پہلے وہ دونوں ساتھ بڑھتے تھے۔ چار سال تک یونیورسٹی میں ساتھ رہا۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ تعلیم مکمل ہونے پر لڑکے نے جاب کر لی اور اس کے گھر والوں نے ہمارے گھر آکر رشہ مانگا، پہلے لڑکے نے کہا تھا کہ اس کے والدین خاندان سے باہر شادی پر رضامند نہیں ہیں لیکن وہ خود ان کو مانا کر لایا۔ ہمارے گھر والوں کو تو پہلے ہی اعتراض نہیں تھا بہن ایک بڑے برائے اسکول میں پڑھاتی تھی۔ اچھی سلیری تھی۔ اس نے کہا کہ وہ شادی کے بعد جاب نہیں چھوڑے گی۔ لڑکے کے گھر والوں کو اس بات پر بھی اعتراض تھا لیکن وہ اپنے بیٹے کی وجہ سے خاموش رہے۔ شادی ہو گئی لیکن بہن کی سرسرا والوں سے ایک دن بھی نہیں بنی۔ چھ ماہ بعد انہوں نے علیحدہ گھر کرانے لے لیا۔ اب میری بہن گھر آکر بیٹھ گئی ہے اس کا کہنا ہے کہ اس کا شوہر لڑکیوں سے دوستی رکھتا ہے اس نے موبائل پر مختلف لڑکیوں کے میسج پڑھے ہیں۔ وہ اس سے طلاق لینا چاہتی ہے۔ گھر والے بہت پریشان ہیں۔

ج۔ محبت کی شادیوں میں یہ بڑی خرابی ہوتی ہے کہ لڑکیاں عموماً یہ توقع رکھتی ہیں کہ وہ شادی سے پہلے والا محبوب رہے گا جو بات بات پر تعریفیں کرے گا۔ وہ ٹھنڈے جانے پر گھٹنوں منائے گا۔ ذرا سی تکلیف رہے چینی کا اظہار کرے گا اور پھولوں کے پتے دے کر محبت کا اظہار کرتا رہے گا۔ شادی کے بعد عملی زندگی میں ان چیزوں کی مخالفت ہوتی ہے نہ فرصت دوسری طرف لڑکے بھی بیوی سے اسی توجہ کے طالب ہوتے ہیں جو شادی سے پہلے انہیں حاصل تھی لیکن شادی کے بعد عموماً لڑکیاں شوہر سے ہی نہیں خود سے بھی لاپرواہ ہو جاتی ہیں۔ وہ پہلے کی طرح خود پر توجہ نہیں دے سکتیں۔ چنانچہ لڑکے عموماً دوسری لڑکیوں کی طرف متوجہ ہونے لگتے ہیں۔

ضروری نہیں کہ آپ کے بہنوئی ان لڑکیوں کے ساتھ سنجیدہ ہوں۔ موبائل پر میسج دیکھ کر اتنا بڑا فیصلہ حماقت ہے۔ آپ اپنی بہن کو سمجھائیں وہ اپنا گھر پرمانہ کریں۔ شادی اور طلاق بچوں کا کھیل نہیں ہے۔



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

بھی ہو جاتی ہے، جس طرح جسم کو خوراک کی ضرورت ہے اسی طرح بالوں کی جڑوں کو بھی نرم رکھنے کے لیے تیل کی ضرورت ہے۔ اس بات کو اپنی عادت بنائیں۔ اگر زیادہ نہیں تو ہفتے میں ایک بار ضرور سونے سے پہلے بالوں کی جڑوں میں کسی اچھے تیل کی ماس کرئیں۔

صائمہ سرگودھا

س۔ میرا مسئلہ بڑھا ہوا پیٹ ہے، جس کے بارے میں پریشن ہونا فطری بات ہے۔ پہلے تو احساس نہیں تھا، میٹرک کے بعد یہ آہستہ آہستہ بڑھ گیا۔ بہت کچھ کیا ہے کھانا بھی کم کیا ہے، رسی بھی کھتی ہوں لیکن لگاتار نہیں ہوا۔

ج۔ صائمہ سب سے پہلے آپ قبض رو تو جڑیں۔ قبض کے لیے سب سے بہترین نسخہ یہ ہے کہ صبح سویرے نماز منہ دو گلاس پانی پی لیں۔ اس کے علاوہ پینٹا ۴ آمود اور دوسرے پھل باقاعدگی سے استعمال کریں۔ قبض دور ہوگا تو پیٹ خود بخود کم ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ پیٹ کم کرنے کے لیے ایک آزمودہ نسخہ لکھ رہی ہوں جس نے بھی اس پر عمل کیا ہے ۴ سے فائدہ ہوا ہے۔

گمراہ اس لیے کہ پیٹ کو اندر کی طرف کریں اور ایک سے دس تک ٹیکس پھر گمراہ اس منہ کے ذریعے خارج کریں۔ یہ عمل چلتے پھرتے کھانا پکارتے، پی وی دیکھتے کسی

بھی وقت کیا جاسکتا ہے۔ دن میں کم از کم سو بار یہ عمل کریں۔ جلد ہی نتائج برآمد ہوں گے۔ چہرے کی مائی اور دلکشی کے لیے بین میں عرق گلاب ملا کر گاڑھا پیٹ بنائیں اور سارا دن اسی سے منہ دھوئیں۔ ہر دو دن پیٹ استعمال کریں۔ ایک ہفتے بعد آپ کا چہرہ اتنا گھرمائے گا کہ آپ خود تیراں رہ جائیں گی۔



شیمینہ عصب کراچی

س۔ میرے سر میں بے انتہا خشکی ہے، بہت سے شیپو استعمال کیے ہیں، لیکن وہ کسی طرح دور نہیں ہوتی۔ خشکی کی وجہ سے میرے ہاتھ پر کیل بھی لگنے لگے ہیں۔ کیا آپ کوئی علاج تجویز کر سکتی ہیں اور ہاں مجھے قبض کی بھی شکایت رہتی ہے۔

ج۔ چہرے پر دانے، قبض اور بالوں کی خشکی دونوں کی وجہ سے ہو جاتے ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے نظام ہضم کو درست کرنے کی فکر کریں۔ روزانہ صبح مناسب ورزش کریں۔ ایک گلاس پانی خالی پیٹ میں اس کے علاوہ دن میں بھی پینا زیادہ پانی پی سکیں۔ اتنا اچھا ہے کھانے میں زیادہ سے زیادہ سبز پھلوں اور پھلوں کا استعمال قبض کو دور کر سکتا ہے۔

جہاں تک بالوں کی خشکی کا سوال ہے۔ خشکی بعض اوقات بالوں کو تیل کی مناسب مقدار نہ ملنے کی وجہ سے

